

دَوْلَتِ عُتْمَانِيَّة

جلد اول

مُرتَبه

ڈاکٹر محمد عزیز

دارالمصنّفین شبلی اکبرمی، شبلی روڈ، اعظم گڑھ (ہند)

بلسلہ تاریخ اسلام

دولتِ عثمانیہ

جلد اول

از عثمان اول ۶۸۷ھ / ۱۲۸۸ء تا مصطفیٰ رابع ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء

سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل

مرتبہ

ڈاکٹر محمد عزیز، پی، اے، ڈی

سابق رفیق دارالمصنفین، اعظم گڑھ

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، شبلی روڈ، اعظم گڑھ (ہند)

جملہ حقوق محفوظ

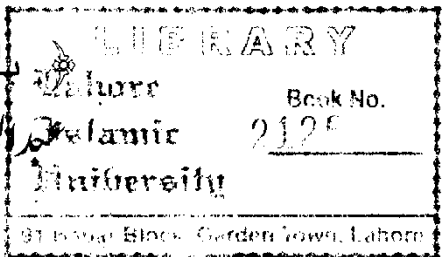
۶۵	سلسلہ دارالمصنفین نمبر:	۱۷
دولت عثمانیہ جلد اول	نام کتاب :	سیرت نبوی
ڈاکٹر محمد عزیز، پی ایچ ڈی	نام مصنف :	
۳۳۹	صفحات :	
طبع جدید ۲۰۰۹ء	ایڈیشن :	
معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)	مطبع :	
دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)	ناشر :	
۲۰۰ روپے	قیمت :	

ISBN : 978-93-80104-26-3

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. BOX NO. : 19
SHIBLI ROAD, AZAMGARH - 276 001 (U.P.)
e-mail : shibli_academy@rediffmail.com
Website : www.shibliacademy.org

بہت اہتمام

محمد مسلمان ہلالی



فہرست مضامین

دولت عثمانیہ جلد اول

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸	استقلال		تاریخ دولت عثمانیہ
۱۸	عثمان کے کارنامے		از مولانا سید سلیمان ندویؒ
۱۹	فتح بروسہ اور عثمان کی وفات	۱	۱
۲۰	سلطنت		دیباچہ
۲۰	عثمان کا اسلام	۲	۲ - ۴
۲۳	مال خاتون		ترک
۲۴	ذاتی اوصاف	۵	۱۲ - ۵
۲۵	پہلی مسجد	۶	ترک اسلام میں
	اورخان	۹	آل سلجوق
	۶۷۰ھ/۱۲۵۹ء - ۶۲۶ھ/۱۳۲۶ء	۱۰	سلاطنت روم
۲۶	۲۶ - ۳۸		ارطغرل
۲۶	اصلاحات	۱۳	۱۵ - ۱۳
۲۷	فوج	۱۴	پہلا معرکہ
۲۸	یٹی چری	۱۴	سنگ بنیاد
۲۹	جاگیر اور بے ضابطہ بنیادے		عثمان خاں اول
۲۹	تنخواہ دار اور جاگیر دار سوار		۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء - ۶۲۶ھ/۱۳۲۶ء
۳۰	کنجی	۱۶	۲۵ - ۱۶
۳۰	عثمانی فوج کے مخصوص امتیازات	۱۷	قراچہ دھار

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۸	جنگ کسوا	۳۱	پاشا
۵۰	مراد کے کارنامے	۳۱	نائیکومیڈیا اور نائسیا کی فتح
	بایزید اول یلدرم	۳۲	قرآسی پر قبضہ
	۹۱ھ/۱۳۸۹ء - ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء	۳۲	زمانہ امن کے کارنامے
۵۲	۵۲ - ۷۲	۳۳	حکومت کی پالیسی
۵۲	سرویات صبح	۳۳	سلطنت بازنطینی
۵۳	شہنشاہ سے جدید صلح نامہ	۳۵	یورپ میں پہلا قدم
۵۳	اناطولیہ کی فتوحات	۳۶	جان پلیو لوگس
۵۳	قسطظنیہ کا محاصرہ	۳۷	سلیمان پاشا اور اورخان کی وفات
۵۵	ولاچیا		مراد اول
۵۵	بلغاریا کی فتح		۶۰ھ/۱۳۵۹ء - ۹۱ھ/۱۳۸۹ء
۵۵	ویدین اور سلسٹریا	۳۹	۳۹ - ۵۱
۵۲	کرمانیہ	۳۰	ایشیائے کوچک میں بغاوت
۵۷	بقیہ ترکی ریاستیں	۴۰	فتوحات تھریس
۵۷	سلطان بایزید	۴۱	جنگ مارٹیز
۵۷	وقفہ عیش	۴۲	شہنشاہ کی ناکامی
۵۸	صلیبی اتحاد	۴۳	صادوقی کی بغاوت
۵۹	ابتدائی فتوحات	۴۴	فتوحات بلغاریا، مقدونیا و سرویا
۶۰	معرکہ نائیکوپولس	۴۵	امن و اصلاحات کا زمانہ
۶۳	مزید فتوحات	۴۶	اناطولیہ میں سلطنت کی توسیع
۶۴	یونان کی فتح	۴۷	مستحکم حکومتوں کا اتحاد

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۹	ترکی ریاستوں کی اطاعت	۶۴	قطنظیہ کا محاصرہ
	شہنشاہ سے صلح اور	۶۵	حالات کا انقلاب
۷۹	چندر جدید مقبوضات	۶۵	تیور
۷۹	سالونیکا کی فتح	۶۷	سیواس
۸۰	سرویا کی فتح	۶۷	جنگ اٹورہ
۸۰	عیسائی حکومتوں میں ایک نئی تحریک	۷۰	قیدی سلطان
۸۱	بلغراد	۷۱	بایزید کی موت
۸۱	ہونیا ڈے کی کامیابی	۷۲	سلطنت عثمانیہ کا ظاہری خاتمہ
۸۲	صلیبی اتحاد		محمد اول
۸۳	ترکوں کی شکست		۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء - ۸۲۳ھ/۱۴۱۳ء
۸۳	صلح نامہ زسجیدین	۷۳	۷۶ - ۷۳
۸۳	مراد کی تخت سے کنارہ کشی	۷۳	سلطنت کی حالت
۸۳	عیسائیوں کی معاہدہ چکنی	۷۳	شہزادوں کی باہمی جنگ
۸۶	جنگ وارنا	۷۵	محمد کی تخت نشینی
۸۸	اس جنگ کے نتائج	۷۶	ذاتی اوصاف
۸۸	ینی چری کی بغاوت	۷۶	معیار عظمت
۸۹	موریا		مراد ثانی
۹۰	کسودا کی دوسری جنگ		۸۲۳ھ/۱۴۲۱ء - ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء
۹۰	اسکندر بک	۷۷	۷۷ - ۱۹۳
۹۲	مراد کی وفات	۷۷	مراد اور مصطفیٰ کی جنگ
۹۲	اخلاق و اوصاف	۷۸	قطنظیہ کا محاصرہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۱۱	سرویہ پر مکمل قبضہ		محمد فاتح
۱۱۲	یونینیا کی فتح		۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء - ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء
۱۱۳	موریہ پر قبضہ	۹۴	۹۴ - ۱۳۰
۱۱۴	کرمانیہ	۹۴	معصوم بھائی کا قتل
۱۱۵	طرابزون اور سینوپ	۹۴	شہنشاہ قسطنطنیہ سے آویزش
۱۱۵	یونانی مجمع الجزائر	۹۵	قسطنطنیہ کی اہمیت
۱۱۵	کریمیا	۹۶	قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں
۱۱۶	دلاجیا	۹۸	مدافعت کی تیاریاں
۱۱۸	الہانیا اور ہرزگووینیا	۹۹	مغربی یورپ کی سردمہری
۱۱۸	دینس	۱۰۰	محاصرہ
۱۱۹	روڈس کی ناکام مہم	۱۰۲	ستوط قسطنطنیہ
۱۲۰	اوٹرائٹو کی فتح	۱۰۳	فاتح کا داخلہ
۱۲۰	فاتح کی وفات	۱۰۵	عیسائیوں کی مذہبی اور ملی آزادی
۱۲۰	فوجی قابلیت	۱۰۷	قسطنطنیہ کی جدید آبادی
۱۲۱	علوم و فنون کی سرپرستی	۱۰۷	دارالسلطنت
۱۲۲	اخلاق و سیرت	۱۰۷	قسطنطنیہ کے سابق محاصرے
۱۲۵	آئین سلطنت	۱۰۹	جامع ایوب
۱۲۵	ارکان حکومت	۱۰۹	دیگر فتوحات
۱۲۶	دیوان	۱۱۰	یونان
۱۲۶	آغا	۱۱۰	سرویہ
۱۲۶	سنجق بے	۱۱۰	محاصرہ بلغراد

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۴۹	دیوان کا فیصلہ	۱۲۷	علماء
۱۵۰	شام کی فتح	۱۳۰	خونیں قانون
۱۵۱	حلب کا خیر مقدم		بایزید ثانی
۱۵۱	دیگر فتوحات		۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء - ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء
۱۵۱	طومان بے	۱۳۱	۱۳۸ - ۱۳۱
۱۵۲	معرکہ روانیہ	۱۳۲	شہزادہ جم
۱۵۳	قاہرہ میں قتل عام	۱۳۵	اوشرانو
۱۵۳	قرطبے	۱۳۶	ہرز گیوینیا
۱۵۶	طومان بے کا قتل	۱۳۶	ہنگری
۱۵۶	مصر کا نظام حکومت	۱۳۶	بحری فتوحات
۱۵۸	خادم الحرمین الشریفین	۱۳۶	مصر سے صلح
۱۶۰	خلافت	۱۳۷	سلیمان کی بغاوت اور تخت نشینی
۱۶۱	واپسی	۱۳۸	پہلا روسی سفیر
۱۶۱	اسپین سے معاہدہ		سلیم اول
۱۶۲	روڈس پر حملہ کی تیاریاں		۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء - ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء
۱۶۲	وفات	۱۳۹	۱۶۲ - ۱۳۹
	سلیمان اعظم قانونی	۱۴۱	بھائیوں کی بغاوت
	۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء - ۹۷۳ھ/۱۵۶۶ء	۱۴۲	ایران سے جنگ
۱۶۳	۱۶۳ - ۲۰۲	۱۴۴	ایرانیوں کی شکست
۱۶۴	ذاتی اوصاف و اخلاق	۱۴۶	شام و مصر
۱۶۵	بلغراد کی فتح	۱۴۶	دنیا کے اسلام کا انتشار

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸۵	پیری رئیس	۱۶۶	جمہوریہ وینس کا باج گزار ہونا
۱۸۵	سیدی علی	۱۶۶	روڈس کی فتح
۱۸۶	مانا	۱۶۸	مصر اور بنی چری کی بغاوت
۱۸۷	ہنگری کی مہم اور سلیمان کی وفات	۱۶۸	ہنگری کی فتح
۱۸۸	سلطنت عثمانیہ کی وسعت	۱۶۹	ہنگری میں خانہ جنگی
۱۸۹	سلطنت کی انتظامی تقسیم	۱۷۰	فرڈیننڈ کی شکست
۱۹۰	آبادی	۱۷۰	ویانا کا محاصرہ
۱۹۱	فوج	۱۷۳	آسٹریا کی فتح
۱۹۲	محاصل سلطنت	۱۷۳	ہنگری میں ترکی حکومت
۱۹۲	نظام جاگیری	۱۷۴	سلیمان "صاحب قرآن"
۱۹۳	قانون رعایا	۱۷۴	ایران کی مہم
۱۹۳	عام قوانین	۱۷۵	بحری طاقت
۱۹۵	تجارتی مراعات	۱۷۶	بحری قزاق
۱۹۵	علم کی سرپرستی	۱۷۶	خیرالدین پاشا بحری
۱۹۶	صدقات	۱۷۸	فرانس کے ساتھ خصوصی مراعات
۱۹۶	تعمیرات کا ذوق	۱۷۸	جزائر الیچین پر قبضہ
۱۹۷	علمی اور شاعرانہ مذاق	۱۷۹	چارلس سے جنگ کا سلسلہ
۱۹۷	عدل و انصاف	۱۸۰	خیرالدین پاشا کی وفات
۱۹۸	خون کے چند دھبے	۱۸۱	طورنوٹ
۱۹۹	ابراہیم پاشا	۱۸۲	پیالے
۲۰۰	زوال سلطنت کی ابتدا	۱۸۲	پرتگال سے بحری جنگ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۱۶	ہنگری اور آسٹریا سے جنگ		سلیم ثانی
۲۱۶	مراد کا انتقال		۱۵۷۶ھ/۱۵۸۲ء - ۱۵۷۳ھ/۱۵۷۳ء
	محمد ثالث	۲۰۳	۲۰۳ - ۲۰۹
	۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء - ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۲ء	۲۰۴	محمد صوفی کی دو اہم تجویزیں
۲۱۷	۲۱۷ - ۲۲۳	۲۰۶	تونس
۲۱۷	فوج کی شورش	۲۰۶	قبرص کی فتح
۲۱۸	سلسلہ جنگ	۲۰۷	مسیحی اتحاد
۲۲۱	فتح مبین	۲۰۷	جنگ لیپانٹو
۲۲۱	فراری	۲۰۸	دینس سے صلح
۲۲۲	قرہ بازیچی	۲۰۹	تونس کا الحاق
۲۲۳	ایران سے جنگ		مراد ثالث
۲۲۳	وفات		۱۵۸۲ھ/۱۵۷۳ء - ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء
	احمد اول	۲۱۰	۲۱۰ - ۲۱۶
	۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء - ۱۰۲۶ھ/۱۶۱۷ء	۲۱۰	اسو مملکت میں حرم کا دخل
۲۲۳	۲۲۳ - ۲۲۷	۲۱۱	جنگ ایران
۲۲۵	صلح نامہ رستہ و اتوروک		یورپین حکومتوں سے تجارتی اور
۲۲۵	ضعف سلطنت	۲۱۲	سیاسی تعلقات
۲۲۷	وفات	۲۱۳	محمد صوفی کا قتل
	مصطفیٰ اول و عثمان ثانی	۲۱۳	سلطنت کا انتہائی عروج
	۱۰۲۶ھ/۱۶۱۷ء - ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء	۲۱۳	سلطنت کا زوال
۲۲۸	۲۲۸ - ۲۳۱	۲۱۴	فوجی بغاوت اور عام بد نظمی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۲۳	ابراہیم کا قتل	۲۲۹	عثمان ثانی
۲۲۳	ازف کی مہم	۲۳۱	پہلا برطانوی سفیر
۲۲۲	روس سے آویزش		مراد رابع
۲۲۵	کریٹ کی مہم		۱۰۳۲ھ/۱۲۳۱ء - ۱۱۵۰ھ/۱۲۵۱ء
	محمد رابع	۲۳۲	۲۳۲ - ۲۳۰
	۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء - ۱۱۵۰ھ/۱۶۸۷ء	۲۳۲	سلطانہ والدہ
۲۳۷	۲۳۷ - ۲۶۸	۲۳۳	فتنہ بغداد
۲۳۸	محمد کوپرلی	۲۳۴	ایران پر چڑھائی
۲۵۱	احمد کوپرلی	۲۳۵	خون شہید
۲۵۲	آسٹریا سے جنگ	۲۳۶	فکر انتقام
۲۵۳	جنگ سینٹ کاتھرڈ	۲۳۷	شدت انتقام
۲۵۴	اس جنگ کی اہمیت	۲۳۸	مصطفیٰ عظیم کا قتل
۲۵۴	صلح نامہ اسوار	۲۳۸	آریوان کی فتح
۲۵۴	کینڈیا کی فتح	۲۳۸	بغداد کی فتح
۲۵۵	پولینڈ سے جنگ	۲۳۹	ایران سے صلح
۲۵۶	صلح نامہ بوزاکس	۲۳۹	وفات
۲۵۷	تجدید جنگ	۲۴۰	ذاتی اوصاف
۲۵۷	صلح نامہ زرانہ		ابراہیم
۲۵۷	احمد کوپرلی کی وفات		۱۰۳۹ھ/۱۶۳۰ء - ۱۱۵۸ھ/۱۶۴۸ء
۲۵۸	قرہ مصطفیٰ	۲۴۱	۲۴۱ - ۲۳۶
۲۵۹	اوگرین	۲۴۳	ابراہیم کی معزولی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	احمد ثانی	۲۵۹	دیانا کا دوسرا محاصرہ
	۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء-۱۱۰۶ھ/۱۷۰۳ء	۲۶۱	ترکوں کی شکست
۲۷۶	۲۷۷ - ۲۷۶	۲۶۲	قرہ مصطفیٰ کا قتل
	مصطفیٰ ثانی	۲۶۲	شکست دیانا کا اثر
	۱۱۰۶ھ/۱۶۹۹ء-۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء	۲۶۲	سیسی اتحاد
۲۷۸	۲۸۶ - ۲۷	۲۶۲	مزید شکستیں
۲۷۹	جنگ کی تیاری	۲۶۳	سلطان کی معزولی
۲۷۹	ابتدائی فتوحات	۲۶۵	الجزائر و تونس کی آزادی
۲۷۹	زنتا کی شکست	۲۶۷	نظام بنی چری میں تبدیلی
۲۸۰	حسین کو پرہیزی		سلیمان ثانی
۲۸۱	سقوط اوزف		۱۰۹۹ھ/۱۶۸۸ء-۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء
۲۸۲	صلح نامہ کارلووٹز	۲۶۹	۲۷۵ - ۲۶۹
۲۸۳	ملکی اصلاحات	۲۶۹	فوج کی سرکشی
۲۸۴	وال طباطبا پاشا	۲۷۰	ہجوم مصائب
۲۸۵	مصطفیٰ کی معزولی	۲۷۱	مصطفیٰ کو پرہیزی
	احمد ثالث		عیسائی رعایا کے ساتھ
	۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء-۱۱۳۳ھ/۱۷۳۰ء	۲۷۲	مخصوص رعایتیں
۲۸۷	۲۸۷ - ۳۰۰	۲۷۳	مقدونیا کی فتح
۲۸۷	روس سے جدید معاہدہ	۲۷۴	مزید عثمانی فتوحات
-۲۸۸	چارلس سے اعلان جنگ	۲۷۵	سلیمان کی وفات

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۱۲	مشرقی تجویز	۲۸۸	روس سے اعلان جنگ
۳۱۳	آسٹریا کی فیصلہ کن شکست	۲۸۹	زار کا حال زار
۳۱۴	صلح نامہ بلغراد	۲۹۰	صلح نامہ پرتھ
۳۱۴	سوئڈن سے معاہدہ	۲۹۲	مطلبہ جی کا جرم
۳۱۵	فرانس کے لیے مخصوص مراعات	۲۹۳	موریا کی فتح
۳۱۵	یورپین حکومتوں کی باہمی لڑائیاں	۲۹۴	آسٹریا سے جنگ
۳۱۶	مختلف شورشیں	۲۹۵	بلغراد
۳۱۶	ایک سیاسی غلطی	۲۹۶	معاہدہ پارسارود و وینچ
۳۱۷	دہائی تحریک	۲۹۷	جنگ ایران
۳۱۷	وفات	۲۹۹	فوج کی بغاوت اور سلطان کی معزولی
	عثمان ثالث	۳۰۰	پہلا مطبوعہ
	۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء - ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء	۳۰۰	ولاجیا اور مولڈیویا کے یونانی حکام
۳۱۸	۳۱۸		محمود اول
	مصطفی ثالث		۱۱۳۳ھ/۱۷۳۰ء - ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء
	۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء - ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء	۳۰۱	۳۰۱ - ۳۱۷
۳۱۹	۳۱۹ - ۳۲۶	۳۰۲	جنگ ایران
۳۱۹	راغب پاشا	۳۰۳	روی خطرہ
۳۲۰	پرشا سے اتحاد	۳۰۳	قضیہ پولینڈ
۳۲۱	فریڈرک کا تقاضا عہد	۳۰۵	جنگ روس
۳۲۲	کیترائن ثانیہ	۳۰۸	آسٹریا کا فریب
۳۲۳	اعلان جنگ	۳۱۰	آسٹریا کی شکست

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۲۶	وفات	۳۲۳	آغاز جنگ
	عبدالحمید اول	۳۲۴	ابتدائی فتح
	۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء - ۱۲۰۳ھ/۱۸۱۷ء	۳۲۴	روس کی تیاریاں
	۳۲۷ - ۳۲۸	۳۲۵	ابن پاشا کی نااہلی
۳۲۷		۳۲۶	موریامیں روس کی شکست
۳۲۷	ترکوں کی شکست	۳۲۷	عثمانی جہازوں کی بربادی
۳۲۸	صلح نامہ کینارجی	۳۲۸	حسن کی حیرت انگیز کامیابی
۳۵۲	صلح نامہ کینارجی کی اہمیت	۳۲۹	علی بیگ کی بغاوت
۳۵۳	بعض اصلاحات	۳۲۹	ترکوں کی مسلسل شکست
۳۵۴	بغاوتوں کا استیصال	۳۳۰	یورپ کی خدائی
۳۵۵	کیتھرائن کے منصوبے	۳۳۱	فرانس
۳۵۷	سلطنت عثمانیہ کی مجوزہ تقسیم	۳۳۲	انگلستان
۳۵۸	کریمیا پر روس کا قبضہ	۳۳۳	پرشا
۳۶۴	قنطنظیہ کا راستہ	۳۳۶	آسٹریا
۳۶۴	اعلان جنگ	۳۳۰	تقسیم پولینڈ
۳۶۵	انگلستان کا فریب	۳۳۱	صلح کانفرنس
۳۶۵	ترکوں کی ابتدائی شکست	۳۳۲	نچارست کی کانفرنس کی ناکامی
۳۶۶	آسٹریا کا فریب	۳۳۳	حسن زادہ پاشا
۳۶۸	جوزف کی مصلحت خیز شکست	۳۳۳	معرکہ سلسٹریا
۳۶۹	سقوط اوزاکوف	۳۳۵	روسی مظالم
۳۷۱	سلطان کی وفات	۳۳۵	روس سے شکست

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۸۹	بحریہ		سلیم ثالث
۳۸۹	اصلاحات		۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء - ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء
۳۹۰	تعلیم	۳۷۲	۳۷۲ - ۳۱۹
۳۹۰	فوج	۳۷۳	جنگ کا سلسلہ
۳۹۲	بحریہ	۳۷۴	آسٹریا سے صلح
۳۹۳	نپولین	۳۷۴	یونانیوں کی بغاوت
۳۹۵	مالٹا	۳۷۵	ستوپا اسماعیل
۳۹۶	اسکندریہ	۳۷۶	صلح کی گفتگو
۳۹۸	قاہرہ کی مہم	۳۷۷	انگلستان کی نئی پالیسی
۳۹۸	جنگ اہرام	۳۷۹	صلح نامہ یا سی
۳۹۹	جنگ نیل	۳۷۹	کیپتھرائن کی موت
۳۹۹	قیام مصر	۳۸۰	ملکی نظم و نسق
۴۰۰	علمی سرگرمیاں	۳۸۰	پاشا
۴۰۰	مصریوں سے میل جول	۳۸۱	ایمان
۴۰۱	قاہرہ کی بغاوت	۳۸۱	باب عالی کا ضعف
۴۰۱	اعلان جنگ	۳۸۲	رعایا کے مصائب
۴۰۲	شام	۳۸۲	نظام جاگیری کی ابتدی
۴۰۳	جنگ ابو قیر	۳۸۵	مرکزی حکومت
۴۰۴	مصر سر عثمانی تسلط	۳۸۵	دیوان
۴۰۵	فرانس سے صلح	۳۸۶	مخصوص مراعات
۴۰۵	اندرونی شورشیں	۳۸۶	فوج

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۱۶	روس سے جنگ کا سلسلہ	۴۰۶	سرویہ
۴۱۷	سلیم کے خلاف سازش	۴۰۷	ہنی چری کی قتل و غارتگری
۴۱۸	سلیم کی معزولی	۴۰۸	ہنی چری کا استیصال
	مصطفیٰ رابع	۴۰۸	سرویہ کا مطالبہ آزادی
	۱۸۰۸ھ/۱۲۲۳ء - ۱۸۰۷ھ/۱۲۲۲ء	۴۰۹	روس کی جنگی تیاریاں
۴۲۰	۴۲۳-۴۲۰	۴۱۱	سرویہ کی آزادی
۴۲۱	نیولین کی غداری	۴۱۲	فرانس سے اتحاد
۴۲۲	حالات آستانہ	۴۱۲	روس سے اعلان جنگ
۴۲۳	سلیم کا قتل	۴۱۳	برطانیہ کا الٹی میٹم
۴۲۴	مصطفیٰ کی معزولی	۴۱۵	مصر کی ناکام مہم





تاریخ دولت عثمانیہ

دارالمصنفین نے تاریخ اسلام کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کی آخری کڑی تاریخ دولت عثمانیہ ہے، جس کو ہمارے رفیق مولوی محمد عزیز صاحب ایم، اے نے تقریباً سات برس کے محنت و مطالعہ کے بعد لکھا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کی یہ پہلی تاریخ ہو، جو اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اس سے پہلے ہماری زبان میں اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض یورپین مصنفوں کے تراجم اور خیالات تھے۔

اس تاریخ کی دوسری خصوصیت اس کی جامعیت ہے، یعنی یہ کہ ترکوں کی شروع سے موجودہ زمانہ کی پوری تاریخ ہے اور اس لحاظ سے بھی اس کی حیثیت اہم ہے۔

دارالمصنفین کے سلسلہ تاریخ اسلام کی مختلف جلدیں جیسے تیار ہوتی جائیں گی، چھپتی جائیں گی، چنانچہ اس کا پہلا حصہ چھپ چکا ہے، دوسرا زیر طبع ہے۔

تاریخ دولت عثمانیہ دو حصوں میں ختم ہوگی، پہلا حصہ آج شائع ہو رہا ہے اور دوسرا پریس میں جانے کو تیار ہے۔

سید سلیمان
(ناظم دارالمصنفین)

۱۳۵۸ھ شوال



دیباچہ

عثمانی ترک جن کا یہ نام کسی نسل یا قوم کی طرف نہیں بلکہ ان کے پہلے فرماں روا عثمان خان کی طرف منسوب ہے، ایشیائے کوچک میں پہلے خانہ بدوشوں کی حیثیت سے داخل ہوئے، پھر ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ڈیڑھ سو برس کے اندر دنیا کی زبردست طاقتوں میں شمار کی جانے لگی، تین سو برس گزرنے نہ پائے تھے کہ عثمانی سلطنت وسعت اور طاقت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان سلطنت بن گئی، اس کے عروج کا دور مشرق میں سلطان سلیم اول اور مغرب میں سلیمان اعظم کی فتوحات پر ختم ہوتا ہے، جس کی حکومت ایشیا، یورپ اور افریقہ کے وسیع حصوں میں قائم تھی، اس عہد میں عثمانی ترک ایک مرکزی یورپین طاقت تھے، ہنگری ان کے زیر نگیں تھا اور آسٹریا کے پایہ تخت ویانا کی دیواروں تک ان کی فوجیں پہنچ چکی تھیں، ان کی ہیبت سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھی۔

لیکن سلیمان اعظم کی زندگی ہی میں سلطنت کے اندر بعض کم زوریوں کے اسباب پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، جو اس کی وفات کے بعد روز بروز نمایاں ہوتے گئے، سلیمان کے بعد جتنے سلاطین تخت پر بیٹھے، ان میں سے معدودے چند کے علاوہ کسی میں سلطنت

عثمانیہ کی فرماں روائی کی اہلیت جیسی چاہیے نہ تھی، چنانچہ جس طرح آہستہ آہستہ اس سلطنت کا عروج ہوا تھا، اسی آہستگی کے ساتھ اس کا زوال بھی شروع ہوا اور اس کے زوال کی مدت بھی اس کے عہد عروج کی طرح تین سو سال ہے، ان میں سے آخری ڈیڑھ سو برس میں سلطنت عثمانیہ اپنے سے کہیں زیادہ طاقت و سلطنتوں کا مقابلہ کرتی رہی، مگر اندرونی کم زوریوں کے باعث ایسی پے در پے شکستیں اٹھائیں کہ بالآخر ۱۹۱۸ء میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

حال میں جمہوریہ ترکیہ نے اپنے چند سالہ قیام میں ان تمام کم زوریوں کو جو سلطنت عثمانیہ کی تباہی کا باعث ہوئی تھیں، دور کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں اس کی کامیابی تاریخ عالم کے حیرت انگیز کارناموں میں سے ہے، اس نے گذشتہ سلطنت کے کھنڈر پر ایک مستحکم قلعہ تعمیر کر لیا ہے جو ترکی قوم کے عزم کو استقلال کی ایک زندہ مثال ہے یورپ کا ”مرد پیار“ دم توڑنے کے بعد نہ صرف جی اٹھا بلکہ اس کے اندر صحت و شباب کی ساری قوتیں عود کر آئیں تا آن کہ بیسویں صدی کی عیسائی دنیا کو بھی اس معجزہ کا قائل ہونا پڑا۔

ذیل کے صفحات ان ہی واقعات کی تفصیل پر مشتمل ہیں، یہ سرگذشت بارہا بیان ہو چکی ہے، تاہم اپنے اندر کچھ ایسی کیفیت رکھتی ہے کہ تکرار سے جی نہیں گھبراتا ترکوں نے اسلام کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، دفاع و جہاد کے فرض کو جس سرفروشی سے ادا کیا ہے، اس کا اعتراف جتنی بار بھی کیا جائے کم ہے، صرف یہی ایک چیز ہر اس تالیف کے لیے معقول وجہ ہو سکتی ہے، جو عثمانی ترکوں کے کارناموں پر ترتیب دی جائے لیکن اگر اس کے علاوہ صحت روایات کا بھی حتی الامکان پورا پورا اہتمام کیا گیا ہو اور محض واقعات کے بیان کرنے پر قناعت نہ کی گئی ہو، بلکہ اسباب و غلغل کی تلاش بھی رہی ہو اور اس قوم کے عروج و زوال کی تاریخ کا مطالعہ عبرت کی نظر سے کیا گیا ہو تو مرتب کے لیے شاید کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔

ان صفحات کی ترتیب میں عثمانی ترکوں کی تاریخ سے متعلق انگریزی، عربی اور فارسی کی مستند ترین کتابوں نیز بعض منتخب ترکی اور فرانسیسی تاریخوں کے ترجموں سے مدد لی گئی ہے اور تلاش و تحقیق کا کوئی دقیقہ حتی الامکان فرو گذاشت نہیں کیا گیا ہے۔

محمد عزیز (علی گڑھ)

۱۴ اگست ۱۹۳۹ء

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com



ترک

ترک اول چھٹی صدی عیسوی میں روشناس ہوتے ہیں، یہ ایک خانہ بدوش قوم تھی جو مشرقی ایشیا اور وسط ایشیا میں گھومتی پھرتی تھی اور وقتاً فوقتاً مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کی آبادیوں پر حملہ آور ہو کر انہیں ویران کر دیتی تھی، چھٹی صدی عیسوی میں اس نے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی، جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی، اس سلطنت کے بانی کا نام چینی تاریخوں میں ”تومین“ (Tumen) اور ترکی کتبوں میں ”بومین“ (Bumin) درج ہے، تومین ۵۵۲ء میں مر گیا، اس کے بھائی نے جس کا نام ”استامی“ (Istami) تھا، مغرب میں فتوحات حاصل کیں، دونوں بھائی الگ الگ حکومتوں پر حکم ران تھے، اہل چین ان حکومتوں کو شمالی ترکوں کی سلطنت اور مغربی ترکوں کی سلطنت کہتے تھے، پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) میں ان دونوں حکومتوں کو سلطنت چین کی اطاعت قبول کرنی پڑی لیکن ۶۳ھ (۶۸۲ء) میں شمالی ترکوں نے چین کی فرماں روائی سے آزاد ہو کر اپنی سابق خود اختیاری پھر حاصل کر لی ”کتبات اور خان“ جو منگولیا کے دریائے اورخان کے نام سے منسوب ہیں اور ترکی زبان کی قدیم ترین یادگار ہیں، ترکوں کی

اسی شمالی سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں، یہ سلطنت ۱۲۶ھ (۴۴۳ء) تک قائم رہی، مغربی ترکوں میں ”ترگیش“ (Turgesh) کا قبیلہ سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس کے سرداروں نے پہلی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) کے آخر میں خاقان کا لقب اختیار کر لیا تھا لیکن ۱۲۱ھ (۶۳۷ء) میں عربوں نے نصر بن سيار کی قیادت میں ترگیش کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

ترک اسلام میں | ترکوں اور عربوں کے تعلقات پہلی صدی ہجری میں ولید اول کے عہد خلافت سے شروع ہوئے، اسی عہد میں قتیبہ بن مسلم نے یقیزہ، بخارا، سمرقند، خوارزم (خیوا) فرغانہ، شاش (تاشقند) اور کاشغر کے ترکی علاقے فتح کر کے وہاں اسلامی حکومت قائم کی لیکن ان فتوحات کا اثر ترکوں کے قبول اسلام پر بہت کم پڑا اور وہ بدستور بت پرستی کرتے رہے، البتہ سمرقند میں قتیبہ کی بت شکنی نے بت پرستی کا خاتمہ بھی کر دیا، جب قتیبہ وہاں پہنچا تو اسے بہت سے بت خانے نظر آئے جن کی نسبت عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ ان کے ساتھ بے ادبی کرنے والا فوراً ہلاک ہو جائے گا، قتیبہ نے ان بت خانوں میں آگ لگادی، مگر اس پر کچھ آنچ نہ آئی، یہ دیکھ کر بت پرستوں نے اسلام قبول کر لیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے مختصر عہد خلافت ۱۰۱-۹۹ھ مطابق ۷۲۰ء - ۷۱۷ء میں اشاعت اسلام کی خاص طور پر کوشش کی تو من جملہ اور ممالک کے انہوں نے ماوراء النہر کے (ترک) بادشاہوں کو بھی اسلام کی دعوت دی اور ان میں سے بعض اسلام لائے، پھر عبداللہ ابن معمر البشکری کو دعوت اسلام کے لیے ماوراء النہر بھیجا اور وہاں کے بعض قبیلے مسلمان ہو گئے، اس کے بعد خلیفہ ہشام کے عہد (۱۲۵-۱۰۵ھ مطابق ۷۴۳-۷۲۴ء) میں ابو صیداء کی تبلیغ سے ماوراء النہر کے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوئے، سمرقند اور بخارا وغیرہ سے جو ترکستان کے علاقے تھے، جزیرہ اور خراج کی رقمیں بیت المال میں

۱۔ دعوت اسلام از آرنلڈ، مطبوعہ علی گڑھ، ص ۲۳۸ (The Preaching of Islam By T. W. Arnold)

۲۔ فتوح البلدان از بلاذری، مطبوعہ قاہرہ، ص ۳۳۲۔

آئی تھیں، خراج کے سلسلہ میں ترکستان سے لوندیاں اور غلام بھی بھیجے جاتے تھے، جو رفتہ رفتہ اسلام قبول کرنے لگے، پھر بھی معتمد باللہ کی خلافت (۲۲۷-۲۱۸ھ مطابق ۸۴۲-۸۳۳ء) تک ترکوں میں اسلام کی اشاعت عام طور پر بند ہو سکی، سب سے پہلے خلیفہ منصور (۱۵۸-۱۳۶ھ مطابق ۷۷۵-۷۷۴ء) نے ترکوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا لیکن اس کے عہد میں ان کی جماعت بہت قلیل تھی اور فوج اور حکومت میں صرف عربوں اور ایرانیوں کا اقتدار تھا، ہارون الرشید کے زمانہ خلافت میں اہل عرب اور اہل روس کے درمیان جو حریفانہ کشمکش پیدا ہوئی اس نے امین کے زوال کے ساتھ عربوں کی قوت کا بھی خاتمہ کر دیا اور مامون کے عہد میں جس کی ماں ایرانی النسل تھی ایرانیوں کا زور بہت بڑھ گیا، اس کے بعد جب معتمد خلیفہ ہوا تو اس نے ایرانیوں کے اقتدار سے خائف ہو کر ترکوں سے مدد حاصل کرنی چاہی اور چوں کہ اس کی ماں ترک تھی، اس لیے طبعاً اسے ترکوں کی جانب میلان بھی تھا، چنانچہ اس نے ہزاروں ترک غلام خرید کر انہیں اسلامی تعلیم اور فوجی تربیت دی اور اب فوج میں ترکوں کی تعداد اور قوت تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی، مگر لکھتا ہے کہ معتمد نے جو اس خطرناک مثال کا سب سے پہلا بانی ہے، پچاس ہزار سے زیادہ ترکوں کو دارالخلافہ میں لا کر آباد کیا، اس نے ان کے لیے طلاکاری، لباس تجویز کیا اور زریں ٹپکے وردی میں شامل کیے جس کی وجہ سے ترکی دستے دوسری فوجوں سے ممتاز معلوم ہوتے تھے، ہر سال ہزاروں ترک غلام پایہ تخت میں لائے جاتے تھے، ان میں سے کچھ محافظ شاہی دستہ میں شامل کیے جاتے تھے اور باقی فوج میں بھرتی ہوتے تھے، جو اپنی قابلیت میں زیادہ ممتاز ہوتے تھے وہ فوجوں کے سپہ سالار مقرر کیے جاتے تھے، جوں جوں ترکوں کی قوت فوج میں بڑھتی گئی، عربی دستے کم ہوتے گئے، ترکوں کو چوں کہ خلیفہ کی خاص سرپرستی حاصل تھی،

۱۔ تاریخ زوال روم سازگین، جلد ۴، ص ۴۷، مطبوعہ فریڈرک دارن اینڈ کمپنی لندن، ۱۸۹۰ء۔ (Decline and Fall of

اس لیے وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور بغداد کی سڑکوں پر بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے تھے، جس سے اکثر عورتیں اور بچے نگر کر زخمی ہو جاتے تھے اور بعض اوقات مر بھی جاتے تھے، اس لیے بغداد کے باشندے ان کے مظالم سے بہت جلد عاجز آ گئے، جب معتمد کے پاس ان کی شکایتیں کثرت سے پہنچنے لگیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ ترکوں کے لیے بغداد سے باہر ایک چھاؤنی بنائی جائے، اس غرض کے لیے اس نے سامرا کا مقام پسند کیا، جو بغداد سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، یہ مقام اس کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے اس کا نام بدل کر سرمن رائے (جس نے دیکھا خوش ہوا) رکھ دیا، فوجی بارکوں کے علاوہ خلیفہ اور وزراء کے لیے بھی عالی شان محل تیار کیے گئے اور چونکہ معتمد نے بغداد کا قیام ترک کر کے اپنی ترک سپاہ کے ساتھ سامرا میں رہنا شروع کر دیا تھا، اس لیے رعایا کے ہر طبقہ کے لوگ اسی نئے شہر میں آ کر آباد ہونے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں سامرا ایک نہایت پر رونق شہر بن گیا، وہ ۲۲۱ھ سے لے کر ۲۷۹ھ (۸۳۶ تا ۸۹۴ء) تک سات خلفائے عباسیہ کا دار السلطنت رہا، جب معتمد تخت پر بیٹھا تو اس نے سامرا کو چھوڑ کر پھر بغداد کو پایہ تخت بنایا۔

معتمد کی ترک نوازی کی وجہ سے رفتہ رفتہ ترکی شہزادے اور امراء بھی ترکستان سے آ کر سامرا میں آباد ہونے لگے، جن میں بعض بت پرست اور بعض آتش پرست تھے اور بعض مسلمان ہو گئے تھے، دار الخلافت میں رہنے کے بعد غیر مسلم ترکوں میں بھی اسلام پھیلنے لگا اور اس تعلق سے ماوراء النہر کے ترکوں میں جو اپنے وطن میں مقیم تھے، اسلام کی اشاعت ہونے لگی، ترک سرداروں کے اسلام قبول کر لینے سے ان کے جرگے اور قبیلے بھی مسلمان ہوتے گئے، چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں ترک بطوع خاطر بکثرت اسلام میں داخل ہوئے، ۳۴۹ھ (۹۲۰ء) میں دولاک ترک گھرانے (خیمے) مسلمان ہوئے، ابن اثیر کا بیان ہے کہ ماوراء النہر کی ایک ترکی قوم کے دس ہزار گھرانے جو بلا ساغون اور کاشغر کے نواح میں

اسلامی علاقوں پر دھاوے مارا کرتے تھے، صفر ۴۳۵ھ (دسمبر ۱۰۴۳ء) میں اسلام لائے۔
 خلیفہ معتمد کے بعد ترکوں کا اقتدار فوج و حکومت میں روز بروز بڑھتا گیا اور نوبت
 یہاں تک پہنچی کہ خلیفہ بغداد کا عزل و نصب تمام تر ان ہی کے ہاتھ میں آ گیا، نہ صرف تخت
 بلکہ خلیفہ کی زندگی بھی ان ہی کے رحم و کرم پر تھی، انہوں نے متعدد خلفاء کو ذلیل کر کے تخت
 سے اتارا اور بعضوں کو قتل بھی کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دولت عباسیہ کا زوال سلطنت کے ہر حصہ
 میں نمایاں ہونے لگا، مختلف صوبوں کے گورنروں نے پایہ تخت سے آزاد ہو کر اپنی اپنی خود
 مختار حکومتیں قائم کر لیں، مثلاً ایرانی گورنروں نے خراسان میں طاہریہ، فارس میں صفاریہ،
 ماوراء النہر میں سامانیہ، آذربایجان میں ساجیہ اور جرجان میں زیاریہ کی جداگانہ حکومتیں قائم
 کر لیں، اسی طرح ترکوں نے مصر میں طولویینہ، ترکستان میں ایلکیہ، پھر مصر میں اشیدیہ
 اور افغانستان و ہند میں دولت غزنویہ کی بنیاد ڈالی، یہ تمام حکومتیں تیسری صدی کے وسط سے
 چوتھی صدی ہجری کے وسط تک قائم ہو گئیں، پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی
 عیسوی) میں ترکوں کے ایک گروہ نے خراسان میں دولت سلجوقیہ کا بنیاد رکھا۔

آل سلجوق | آل سلجوق کا مورث اعلیٰ دقاق تھا جو کاشغر کے ترکی قبائل کا ایک رئیس تھا،
 سلجوق، جس کے نام سے یہ خاندان مشہور ہے اسی کا لڑکا تھا، سلجوق اپنے غیر مسلم ترک
 فرماں روا کو چھوڑ کر بخارا کی اسلامی مملکت میں چلا آیا اور یہاں وہ اور اس کا پورا قبیلہ مسلمان
 ہو کر بخارا کے قریب مقام چند میں قیام پذیر ہوا، اس کے بعد اس نے غیر مسلم ترکوں پر
 فتوحات حاصل کر کے اپنی قوت بہت بڑھالی۔

سلجوق نے اپنی وفات کے وقت تین لڑکے چھوڑے، ارسلان، میکائیل اور موسیٰ،
 دولت سلجوقیہ کے وارث میکائیل کے تین لڑکے ہوئے، پیغو، طغرل بیگ، جغرو بیگ لیکن
 سلطنت کی فرماں روائی طغرل بیگ کو ملی، جس نے اپنے زور و قوت کا سکہ گرد و پیش کے

ملکوں پر بٹھا دیا، محمود غزنوی نے سلجوقیوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہو کر ان سے جنگ شروع کر دی لیکن چند عارضی فتوحات کے بعد اس کو اور اس کے لڑکے مسعود کو شکستیں اٹھانی پڑیں اور آل سلجوق تمام خراسان پر قابض ہو گئے، اس کے بعد انہوں نے جرجان، طبرستان اور خوارزم پر بھی قبضہ کر لیا اور پھر طغرل بیگ نے اصغان، تبریز اور حلوان کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، یہ وہ زمانہ تھا جب بغداد میں ترکوں اور آل بویہ کی باہمی مخالفت نے سخت بد امنی پھیلانے لگی تھی، خلیفہ معتصم کے بعد دولت عباسیہ پر روز بروز ترکوں کا تسلط بڑھتا گیا لیکن چوتھی صدی ہجری سے آل بویہ نے اپنا اقتدار خلافت بغداد پر قائم کرنا شروع کیا، جس سے ترکوں کی قوت پر اثر پڑنے لگا، ان حریفوں کی کشمکش نے تمام سلطنت میں ہنگامہ برپا کر دیا اور بغداد کی حالت خصوصیت کے ساتھ بد سے بدتر ہونے لگی، مجبور ہو کر ترک سرداروں نیز خلیفہ قائم بامر اللہ نے طغرل بیگ کے اس فتنہ کے فرو کرنے کے لیے طلب کیا، چنانچہ طغرل بیگ رمضان ۴۴۷ھ (دسمبر ۱۰۵۵ء) میں بغداد میں داخل ہوا اور ملک رحیم کو گرفتار کر کے دولت آل بویہ کا خاتمہ کر دیا، اب بغداد میں آل سلجوق کا اثر قائم ہو گیا، خلیفہ نے ”سلطان شرق و غرب“ کے خطاب سے طغرل بیگ کی عزت افزائی کی، اس کے بعد طغرل بیگ نے عراق، موصل اور دیار بکر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، پھر الپ ارسلان کے دور حکومت میں ایشیائے کوچک اور شام بھی فتح ہو گیا اور ملک شاہ نے ۴۸۵ھ (۱۰۹۲ء) میں عدن اور یمن پر بھی قبضہ کر لیا، اس طرح سے پانچویں صدی سے ساتویں صدی ہجری تک خلیفہ بغداد کے ایشیائی مقبوضات کا بیش تر حصہ آل سلجوق کے زیر نگیں رہا۔

سلاجقہ روم | اس خاندان کا بانی سلیمان بن قطلمش تھا، قطلمش طغرل بیگ کے سرداروں میں تھا لیکن بعد میں اس نے الپ ارسلان کے خلاف بغاوت کر کے خود مختاری حاصل کر لی اور بالآخر ۴۵۶ھ (۱۰۶۴ء) میں رے کے قریب جنگ میں مارا گیا، اس کا بیٹا سلیمان قسمت آزمائی کے لیے ایشیائے کوچک میں چلا آیا اور ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) میں نائیکسار پر جو

بازنطینی سلطنت کا ایک مشہور شہر تھا، قبضہ کر کے اسے اپنا پایہ تخت بنایا اور ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی، ۴۷۶ء (۴۰۸ء) میں اس نے انطاکیہ کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا لیکن پہلی جنگ صلیبی میں سلاجھ روم کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا، ۴۹۰ء (۱۰۵۷ء) میں ناکسیا ان کے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا اور اسی کے ساتھ ایشیائے کوچک کے مغربی حصہ میں بھی ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس علاقہ پر بازنطینیوں کا قبضہ ہو گیا، اب صرف ایشیائے کوچک کا اندرونی حصہ ان کے پاس رہ گیا تھا لیکن وہاں بھی دانش مندیوں سے مقابلہ تھا، غرض چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں سلاجھ روم کی حالت بہت نازک نظر آتی تھی لیکن مسعود بن قلیج ارسلان نے اس گرتی ہوئی سلطنت کو سنبھالا اور قونیہ کو پایہ تخت بنا کر ایک مضبوط حکومت قائم کی، اس کے جانشین قلیج ارسلان ثانی نے اپنی فتوحات سے سلطنت میں اضافہ کیا اور دانش مندیوں کو مغلوب کر کے انہیں اپنا محکوم بنایا، ۵۷۸ء (۱۱۸۲ء) میں قلیج ارسلان ثانی کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا چھوٹا بیٹا غیاث الدین کینسر واول تخت نشین ہوا، اس نے بازنطینیوں سے جنگ کر کے انطاکیہ کے بندرگاہ پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد اس کے چانشین عز الدین کی کاؤس اول نے سنوپ کو بھی فتح کر لیا، عز الدین کی کاؤس اور اس کے بعد علاء الدین کی قباد کا دور حکومت شان و شکوہ کے لحاظ سے سلاجھ روم کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا لیکن غیاث الدین کینسر و ثانی ہی کے عہد (۶۳۶-۶۳۶ھ مطابق ۱۲۴۶-۱۲۴۸ء) سے سلطنت کا زوال شروع ہو گیا جو پھر نہ رکا، اس دوران میں تاتاری طوفان ایشیائے کوچک کی سرحد تک پہنچ چکا تھا اور ارض روم اور سرحدی قلعوں پر تاتاریوں کا قبضہ ہو گیا تھا، آخر کار ۶۴۱ھ مطابق ۱۲۴۳ء میں کوزاواخ کی جنگ نے دولت سلجوقیہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور آل سلجوق کی آزادی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی، صلح کے بعد تاتاری چلے گئے لیکن ۶۴۳ھ (۱۲۴۵ء) میں کینسر و ثانی کی وفات پر جب اس کے تینوں لڑکوں کی مشترکہ حکومت کی وجہ سے سلطنت میں بد نظمی پیدا ہوئی تو تاتاریوں نے پھر حملے شروع کر دیے، اس

درمیان میں ایک لڑکا مر گیا اور تخت کے دعوے دار بقیہ دولٹ کے عز الدین اور رکن الدین رہ گئے، ہلاکونے سلطنت کو ان دونوں کے درمیان تقسیم کر دیا، مغربی صوبے عز الدین (کیکاؤس ثانی) کو اور مشرقی رکن الدین (قلج ارسلان رابع) کو دیے لیکن حکومت دراصل تاتاریوں کی تھی اور سلاطین سلجوق کا عزل و نصب ان ہی کے ہاتھوں میں تھا، تاتاریوں کے تشدد سے عاجز آ کر امراء سلطنت نے اہل مصر سے مدد کی درخواست کی اور مصریوں نے ایشیائے کوچک میں تاتاریوں کو شکست دے کر بھگا دیا لیکن ان کی واپسی کے بعد تاتاریوں نے پوری طرح انتقام لیا اور دولت سلجوقیہ کے رہے سبے اقتدار کو بھی خاک میں ملادیا، سلطنت کی کم زوری سے فائدہ اٹھا کر متعدد امراء نے مختلف صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم کر لیں ان میں بنو کرمان اور بنو اشرف اپنی قوت و اثر کے اعتبار سے زیادہ ممتاز تھے، تاتاریوں نے بارہا ان خود سر امیروں کو زیر کرنے کی کوشش کی مگر عارضی شکستوں کے بعد یہ اپنا اقتدار پھر قائم کر لیتے تھے اور ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کے زوال پر انہوں نے مستقل حکومتیں قائم کر لیں، چنانچہ دولت سلجوقیہ کے خاتمہ کے قریب ایشیائے کوچک میں صار دخان، قروسی، ایڈین، ہنک، حمید، کرمانیہ، کرمان، قسطنطنیہ اور منشا کی خود سر حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔

ارطغرل

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کی ابتدا میں شاہان خوارزم کی قوت اور جوشاب پرتھی، وہ ایران و خراسان اور شام و عراق میں آل سلجوق کے پیش تر مقبوضات پر قابض ہو چکے تھے اور ایشیا کی تمام اسلامی سلطنتوں کو فتح کر لینا چاہتے تھے لیکن عین اس وقت جب وہ اس حوصلہ کی تکمیل کے لیے تیار ہو رہے تھے، چنگیز خانی طوفان اپنی تمام ہول ناکیوں کے ساتھ اٹھا اور سلطنت خوارزم کو پاش پاش کر ڈالا، اس سلطنت کی تباہی کے بعد ترکی قبائل جنوب کی طرف بھاگے، ان میں بعض ایران اور شام میں پہنچے اور وہاں ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں بہت کچھ اقتدار حاصل کیا اور ترکمانی مشہور ہوئے اور بعض جنوب کی طرف بڑھے اور مصر کے سلاطین مملوک سے معرکہ آرا ہوئے، جو خود ترکی النسل تھے لیکن مصر میں انہیں شکست ہوئی اور وہاں سے واپس ہو کر وہ ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں سے آملے، ان ہی ترکی قبائل میں جو چنگیز خاں کے حملہ کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر مارے مارے پھر رہے تھے، ارطغرل کا قبیلہ بھی تھا، یہ قبیلہ ترکان اوغوز کے قبیلہ کا ایک جزو تھا جو ارطغرل کے باپ سلیمان شاہ کی سرکردگی میں اپنے وطن خراسان کو چھوڑ کر مختلف ملکوں میں گھومتا ہوا شام کی طرف جا رہا تھا کہ اثنائے راہ میں دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے سلیمان شاہ ڈوب کر ہلاک ہو گیا، قبیلہ کا پیش تر حصہ اس وقت منتشر ہو گیا لیکن جو لوگ رہ گئے وہ ارطغرل اور اس کے بھائی دونوں کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوئے اور

سلطان علاء الدین سلجوقی کی سلطنت میں داخل ہو گئے۔

پہلا معرکہ | یہ جماعت جو صرف چار سو اسی گھرانوں پر مشتمل تھی، سلطان علاء الدین کے زیر سایہ پناہ لینے کے لیے پایہ تخت تونہ کی طرف جا رہی تھی کہ راستہ میں انگورا کے قریب ارطغرل کو دونو جیسے مصروف جنگ نظر آئیں، وہ کسی فریق سے واقف نہ تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ ان میں سے ایک تعداد کے لحاظ سے کم زور اور دوسری قوی ہے، اپنے سواروں کے مختصر دستہ کے ساتھ جن کی مجموعی تعداد صرف چار سو چالیس تھی، کم زور فریق کی حمایت کے لیے بڑھا اور اس جاں بازی سے حملہ آور ہوا کہ دشمن کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا، فتح حاصل کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ جس فریق کی اس نے یوں بروقت مدد کی تھی، وہ سلطان علاء الدین سلجوقی کی فوج تھی، جسے تاریخوں کی ایک بڑی فوج نے گھیر رکھا تھا۔

سنگ بنیاد | ارطغرل کے اس کارنامہ کے صلہ میں سلطان علاء الدین نے اسے سوغت کا زرخیز علاقہ جو دریائے سقاریہ کے بائیں جانب بازنطینی سرحد کے قریب واقع تھا، جاگیر میں عطا کیا اور سوغت کا شہر بھی اسے دیا، اس علاقہ میں ارطغرل اور اس کے ساتھیوں نے، جو خراسان اور آرمینیا سے آئے تھے، بودوباش اختیار کی، علاء الدین نے ارطغرل کو اس جاگیر کا سپہ دار بھی مقرر کیا، چونکہ ارطغرل کی جاگیر بازنطینی سرحد سے متصل واقع تھی، اس لیے بازنطینی قلعہ داروں سے اکثر جنگ کی نوبت آتی رہتی تھی، ارطغرل نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی شجاعت کا سکہ بٹھا دیا اور اس کی فتوحات کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے ترکی قبائل ایشیائے کوچک میں پہلے سے آباد تھے، اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے اور اس کی لڑائیوں میں شریک ہونے لگے، اس طرح اس کی قوت روز بروز بڑھتی گئی اور اس کا اقتدار گردو پیش کے علاقوں میں قائم ہونے لگا۔

سلطان علاء الدین کے لیے ایک جاگیر دار کا اس طرح قوت و اقتدار حاصل کر لینا

تشویش کا باعث ہوتا لیکن ایشیائے کوچک میں دولت سلجوقیہ اندرونی اختلال اور امراء کی بغاوتوں کے سبب زوال کی آخری منزل میں تھی، اگرچہ قونیہ میں سلاجقہ روم کی قدیم شان و شوکت اب بھی نمایاں تھی تاہم حکومت کا دائرہ بہت محدود رہ گیا تھا، ایک طرف تاتاریوں نے جنوبی اور مشرقی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا تو دوسری طرف عیسائیوں نے شمال اور مشرق کے قدیم بازنطینی صوبوں کے اکثر حصے واپس لے لیے تھے، اوسطی اور جنوبی حصہ میں متعدد سلجوقی سرداروں نے خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں، سرحدی علاقوں میں جنگ کا سلسلہ عموماً جاری رہتا تھا اور تاتاری حملوں کا خطرہ کبھی دور نہیں ہوتا تھا، ایسی حالت میں ارطغرل جیسے دلیر سردار اور نائب کی فتوحات سے علاء الدین کو بجائے تشویش کے ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا اور اس نے ارطغرل کو مزید انعامات عطا کیے، چنانچہ جب نبی شہر اور بروصہ کے درمیان ایک جنگ میں ارطغرل نے علاء الدین کے نائب کی حیثیت سے تاتاریوں اور بازنطینیوں کی ایک متحدہ فوج کو شکست دی تو سلطان نے اس کے صلہ میں اس کے شہر کو بھی اس کی جاگیر میں دے دیا اور پوری جاگیر کا نام سلطانونی (صدر سلطانی) رکھا، نیز ارطغرل کو اپنے مقدمہ الجیش کا سپہ سالار مقرر کیا، اس وسیع علاقہ میں بکثرت چراگاہوں اور زرخیز زمینوں کے علاوہ متعدد قلعے بھی تھے، مثلاً قریب حصار، بلے جیک، انینی وغیرہ لیکن سلطانونی کے اکثر حصوں پر خود سر امیروں کا قبضہ تھا اور اس جاگیر پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے ارطغرل اور اس کے بعد عثمان کو مدتوں جنگ کرنی پڑی، ہلال سلطان علاء الدین کے علم کا نشان تھا، ارطغرل نے بھی اس کے نائب کی حیثیت سے اسی نشان کو اختیار کیا جو آج تک ترکوں کی عظمت کا قومی نشان ہے۔^۱

۶۸۷ھ (۱۲۸۸ء) میں ارطغرل نے نوے سال کی عمر میں انتقال کیا اور سعوت

کے قریب دفن ہوا۔

۱ تاریخ ترکان عثمانی، از کریمی، جلد اول، ص ۷۵ By (History of The Othomani Turks

عثمان خان اول

۶۸۷ھ تا ۷۲۶ھ مطابق ۱۲۸۸ء تا ۱۳۲۶ء

ارطغرل کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا عثمان اس کا جانشین ہوا، یہ دولت عثمانیہ کا بانی اور سلطنت عثمانیہ کا پہلا تاج دار ہے، ارطغرل نے اپنے زور قوت اور دولت سلجوقیہ کے تفرق و انتشار کے باوجود کبھی خود مختاری کا دعویٰ نہیں کیا اور گوسلجوقی امراء نے سلطنت کی کم زوری سے فائدہ اٹھا کر متعدد خود سر حکومتیں قائم کر لی تھیں لیکن وہ خود آخردم تک سلطان قونیہ کا وفادار اور جاگیر دار ہی رہا، عثمان نے بھی یہی روش اختیار کی اور اپنی فتوحات سے سلطان کی شان و شوکت کو ایک حد تک محفوظ رکھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دولت سلجوقیہ دم توڑ رہی تھی اور ایشیائے کوچک میں طوائف الملو کی پھیلی ہوئی تھی، اس بنا پر اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع عثمان کو نہیں مل سکتا تھا لیکن اس نے اپنی توجہ زیادہ تر بازنطینی علاقوں کی طرف مبذول رکھی، جس کے مختلف اسباب تھے، پہلی وجہ تو یہ تھی کہ خود اس کی جاگیر بازنطینی سرحد سے متصل واقع تھی اور بازنطینی سلطنت کی کم زوری روز بروز نمایاں ہوتی جا رہی تھی، یہ اسی کم زوری اور شہنشاہ قسطنطنیہ کی ایک سیاسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ وہ اولمپس (Olympus) کے دروں کی حفاظت نہ ہو سکی اور ترک تھینیا (Bithynia) کے میدانوں میں داخل ہو گئے، شہنشاہ پالیوگس (Palaeblogus)

کے عہد تک ان دروں کی حفاظت اس علاقہ کے ردیف (میلیشیا) کے سپرد تھی اور وہ لوگ اس خدمت کے معاوضہ میں ٹیکسوں سے بری تھے لیکن اس کے بعد شہنشاہ نے اس رعایت کو منسوخ کر دیا اور دروں کی حفاظت اپنے ذمہ لے لی، نیز خراج کی رقم سختی سے وصول کرنی شروع کی، نتیجہ یہ ہوا کہ دروں کی حفاظت میں غفلت ہونے لگی اور وہ جفاکش پہاڑی لوگ محض کسان ہو کر رہ گئے، جن میں نہ کوئی جوش باقی رہا اور نہ فوجی نظم و تادیب۔^۱ بازنطینی سلطنت جو کسی زمانہ میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں شمار کی جاتی تھی، فرقہ وارانہ جنگوں اور انتہائی بد نظمیوں میں مبتلا تھی، جس کے باعث اس میں کسی طاقت ور حریف کے مقابلہ کی قوت باقی نہیں رہی تھی، ایشیائے کوچک میں اس کے سابق مقبوضات میں سے صرف چند شہر مثلاً بروصہ، ناسیا، ناکومیڈیا اور ان کے نواحی اضلاع باقی رہ گئے تھے، جو شمال مغرب میں واقع تھے، نیز باسفورس اور بحر مارمورا کے ساحلی خطے ابھی تک قسطنطنیہ کے زیر حکومت تھے، اناطولیہ کے بقیہ کے تمام علاقے جو پہلے بازنطینی سلطنت میں داخل تھے، اس کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے، عثمان کے لیے بازنطینی علاقوں کی طرف متوجہ ہونے کی دوسری وجہ اسلام کی تبلیغ تھی، تیسری وجہ بازنطینیوں سے برسہا برس پیکار ہونے کی یہ تھی کہ عثمان کے لیے دوسری جانب قدم بڑھانے کی گنجائش نہ تھی، سلجوقی امراء جنہوں نے خود سر حکومتیں قائم کر لی تھیں، طاقت میں اس سے بڑھے ہوئے تھے۔

قراجہ حصار | لیکن ان ترغیبات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ عثمان نے بااقتدار ہونے کے ساتھ ہی حملے شروع کر دیے، اس کی لڑائیاں ابتداءً مدافعتاً تھیں، بازنطینی قلعہ دار دولت سلجوقیہ کے سرحدی علاقوں پر وقتاً فوقتاً حملہ آور ہوتے رہتے تھے، سلطان قونیہ کے ایک نائب کی حیثیت سے عثمان کو ان حملہ آوروں سے مقابلہ کے لیے آگے بڑھنا پڑا، پہلے ہی سال قراجہ حصار کا معرکہ پیش آیا، عثمان نے اس قلعہ کو فتح کر کے بازنطینیوں کو آئندہ کے لیے متنبہ

کر دیا، سلطان علاء الدین نے قراجہ حصار اور اس کے گرد و پیش کی تمام آراضی جو عثمان نے بزور شمشیر حاصل کی تھی، اسے جاگیر میں دے دی، نیز بک کے خطاب سے سرفراز کر کے اسے اپنا سکھ جاری کرنے اور اپنا نام جمعہ کے خطبہ میں شامل کرنے کی بھی اجازت دی، اس طرح لقب کے علاوہ بادشاہی کے تمام امتیازات عثمان کو حاصل ہو گئے۔

استقلال | یہ کمی بھی چند سالوں کے بعد پوری ہو گئی، ۶۹۹ھ (۱۳۰۰ء) میں تاتاریوں نے ایشیائے کوچک پر حملہ کیا اور اسی جنگ میں سلطان علاء الدین مارا گیا، بعض روایتوں میں ہے کہ اس کا قاتل خود اس کا لڑکا غیاث الدین تھا، جس نے تخت سلطنت کی خاطر ایسا کیا، بہر حال تاتاریوں نے غیاث الدین کو بھی قتل کر دیا اور ایشیائے کوچک میں دولت سلجوقیہ کا خاتمہ ہو گیا، اب عثمان بالکل آزاد اور خود مختار تھا اور آئندہ اس نے تمام فتوحات ایک خود مختار فرماں روا کی حیثیت سے حاصل کیں۔

سلجوقی امراء میں عثمان کا سب سے بڑا حریف امیر کرمانیہ تھا، چنانچہ ایشیائے کوچک کے ترکوں کی سرداری اور پورے ملک کی حکومت کے لیے فریقین کے درمیان عثمان کی زندگی ہی میں جنگ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا، جو اس کے متعدد جانشینوں کے عہد تک جاری رہا، خود عثمان نے بھی امیر کرمانیہ کو کئی بار نیچا دکھایا لیکن سلطنت بازنطینی کے زرخیر مقبوضات زیادہ تر اس کی توجہ کا مرکز تھے اور اس کی زندگی کے آخری چھبیس سال کے کارناموں میں بازنطینی ہی شہروں اور قلعوں کی فتوحات نمایاں ہیں۔

عثمان کے کارنامے | تاہم عثمان کا مقصد زندگی صرف فتوحات کا حاصل کرنا اور گرد و پیش کی ریاستوں کو اپنا مطیع بنانا نہ تھا، ۶۹۰ھ (۱۲۹۱ء) سے ۶۹۶ھ (۱۲۹۸ء) تک اس نے اپنی توجہ تمام تر حکومت کے انتظام و استحکام کی جانب مبذول رکھی، حکومت کے مختلف شعبے قائم کر کے حکام کا تقرر کیا اور رعایا کے فلاح و بہبود کے انتظامات میں مصروف رہا لیکن

دوسرے ترک سرداروں نے، جو عثمان کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف تھے، اس کی خاموشی کو ضعف پر محمول کیا اور بازنطینی قلعہ داروں سے اتحاد کر کے اس کے مقبوضات پر حملہ آور ہوئے، اس طرح جنگ کا جو سلسلہ ۶۹ھ (۱۲۹۸ء) میں چھڑا وہ ابتداء عثمان کی طرف سے بالکل مدافعت نہ تھا لیکن ان حملہ آوروں کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، عثمان نے ان سب کو شکست دی، نواح کے چھوٹے چھوٹے سرداروں کو مطیع کیا، بازنطینی قلعے یکے بعد دیگرے فتح کیے اور بالآخر نینی شہر پر قبضہ کر کے اسے اپنی مملکت کا پایہ تخت بنایا، ۷۱ھ (۱۳۰۱ء) میں عثمان کو نائیکومیڈیا سے متصل قیون حصار کے مقام پر پہلی بار شہنشاہ قسطنطنیہ کی باقاعدہ افواج سے مقابلہ پیش آیا، جس میں اسے شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور چھ سال کے اندر اس کی فتوحات کا دائرہ بحر اسود کے ساحل تک پہنچ گیا، بازنطینی قلعے پے در پے مسخر ہوتے گئے اور بروصہ، نانسیا اور نائیکومیڈیا کے گرد فوجی چوکیوں کا ایک مضبوط حصار قائم ہو گیا، اس خطرہ کو دور کرنے کی غرض سے بازنطینیوں نے تاتاریوں کو عثمانی مقبوضات پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا، عثمان نے اپنے لڑکے اور خان کو حملہ آوروں کے مقابلہ میں بھیجا، تاتاریوں کو سخت شکست ہوئی اور بازنطینیوں کی امید کی یہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی۔

فتح بروصہ اور عثمان کی وفات | ۷۱ھ (۱۳۱۱ء) میں عثمان نے بروصہ کا محاصرہ کیا جو ایشیائے کوچک میں سلطنت بازنطینی کا ایک نہایت اہم شہر تھا، محاصرہ تقریباً دس سال تک جاری رہا، بالآخر ۶۶ھ (۱۳۶۶ء) میں عاجز آ کر محصورین نے ہتھیار ڈال دیے اور شہر کو خالی کر دیا اور ترکی فوج اور خان کی سرکردگی میں فاتحانہ طور پر بروصہ میں داخل ہوئی، عثمان اس وقت سعوت میں بستر مرگ پر تھا لیکن وفات سے قبل اور خان یہ خوش خبری لے کر اس کے پاس پہنچ گیا، عثمان نے اور خان کی ہمت و شجاعت کی داد دے کر اسے اپنا جانشین مقرر کیا اور بلا تفریق تمام رعایا کے ساتھ یکساں عدل و انصاف اور بھلائی کرنے کی وصیت کی، پھر یہ ہدایت کی کہ اسے بروصہ میں دفن کیا جائے اور اس شہر کو عثمانی مملکت کا پایہ تخت بنایا جائے، چنانچہ اس

وصیت کے مطابق اسے بروصہ میں دفن کیا گیا اور اس کی قبر پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

سلطنت | عثمان دولت عثمانیہ کا پہلا تاج دار ہے، اس بنا پر عموماً اس کے نام کے ساتھ سلطان کا لقب بھی شامل کر دیتے ہیں لیکن خود اس نے اور اس کے بعد اور خان اور مراد اول نے صرف ”امیر“ ہی کا لقب اختیار کیا، ارطغرل کی وفات پر اس کے مقبوضات کا دائرہ سعوت، اس کی شہر اور چند مواضع پر ختم ہو جاتا تھا، عثمان نے اپنی اڑتیس سال کی حکومت میں اس دائرہ کو جنوب میں کوتاہیہ اور شمال میں بحر مارمورا اور بحر اسود کے ساحلوں تک وسیع کر دیا، اس کی قلم رو کا طول تقریباً ۱۲۰۰ میل اور عرض تقریباً ۶۰۰ میل تھا، آبادی صرف ترکوں پر مشتمل نہ تھی، بلکہ بیش تر علاقے چوں کہ سلطنت بازنطینی کے ایشیائی مقبوضات سے حاصل کردہ تھے، اس لیے آبادی میں ایک بڑی تعداد یونانی اور سلاوی باشندوں کی بھی تھی، جو بخوشی مسلمان ہو کر ترکوں میں شامل ہو گئے تھے، اور سلعے لکھتا ہے کہ یہ عیسائی کسی جبر سے اسلام نہیں لائے کیوں کہ تاریخ میں نہ تو قیدیوں کے قتل عام کا کوئی ذکر ہے اور نہ بحیثیت غلام انہیں فروخت کرنے کا بلکہ ان کے اسلام لانے کی وجہ یہ ہوئی کہ قسطنطینہ کے یونانیوں نے جو فطری طور پر ان کے محافظ تھے، انہیں چھوڑ دیا تھا، اسلام میں داخل ہونے کے بعد فاتح اور مفتوح کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم ہو گئے اور دونوں کے میل سے ایک نئی نسل تیار ہونے لگی، جو دوسری ترکی ریاستوں کے باشندوں سے بہت کچھ مختلف تھی اور اپنے کو ”عثمانی“ کہتی تھی۔

عثمان کا اسلام | اس موقع پر خود عثمان اور اس کے قبیلے کے اسلام لانے کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے، اب سے بیس بائیس سال قبل تک یہ امر عموماً مورخین کے نزدیک مسلم تھا کہ ارطغرل اور اس کے ساتھی ایشیائے کوچک میں داخل ہونے سے پہلے ہی مسلمان تھے لیکن

۱۔ کریسی، جلد ۱ ص ۱۷۷ ۲۔ ترکی سلطنت، از لارڈ ایورسلے، ص ۱۵، مطبوعہ لندن، ۱۹۲۳ء (The Turkish

Empire By Lord Eversley ۳۔ ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے، ص ۱۶، مطبوعہ لندن، ۱۹۲۳ء۔

۱۹۱۶ء میں مسٹر ہربرٹ گینس نے اپنی مستند تالیف ”اساس سلطنت عثمانیہ“ کو شائع کر کے یہ تازہ تحقیق پیش کی کہ سغوت میں بودوباش اختیار کرنے کے وقت عثمان اور اس کے قبیلہ کے لوگ بت پرست تھے، مسٹر گینس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

تیرہویں صدی عیسوی کے ابتدا میں خراسان اور ماورالنہر کے دوسرے علاقوں کی جو قومیں ایشیائے کوچک کی سرحدوں پر نمودار ہوئیں ان کے اسلام لانے کا کوئی صحیح ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا، ان سے پہلے کے ترک حملہ آور جب اس ملک میں داخل ہوئے تو وہ کئی پشتوں سے عربی اسلام کے زیر اثر رہتے آئے تھے، چنانچہ آل سلجوق بھی مسلمان ہی تھے لیکن بعد کے آنے والے ترک جن میں عثمان پیدا ہوا، کچھ بہت زیادہ اسلام کے زیر اثر نہیں رہے، خود عثمانیوں کے مؤرخ نشری کے بیان سے بھی صاف اشارہ ملتا ہے کہ عثمان کا مورث اعلیٰ سلیمان شاہ اور اس کے ساتھی جو اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور پچاس ہزار گھرانوں پر مشتمل تھے، غیر مسلم تھے، وہ کہتا ہے کہ ان میں سے کچھ شامی ترکمانوں کے آباء و اجداد تھے اور بقیہ ان تمام خانہ بدوش قوموں کے جو روم میں ادھر ادھر پھرا کرتی تھیں اور خود نشری کے زمانہ میں بھی موجود تھیں، بارہویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے سیاحوں کی بکثرت شہادتوں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قومیں بت پرست تھیں، ان مختلف ترکی قبیلوں نے جو اسی زمانہ میں ایشیائے کوچک میں داخل ہوئے، جب عثمان کا قبیلہ وہاں آیا، ملک کے مغربی حصہ میں پہنچ کر اپنے آپ کو ایک اسلامی ماحول میں پایا، وہ تعداد میں تھوڑے تھے، ان کے لیے اس سے زیادہ قدرتی بات کوئی نہ تھی کہ اپنے سلجوقی اقرباء کا مذہب اختیار کر لیں، یہ اتنی قدرتی بات تھی کہ اس کے ذکر کی کوئی ضرورت سمجھی ہی نہیں گئی، عثمان اور اس کے قبیلہ کے اسلام لاپنے سے عثمانی قوم پیدا ہوئی کیوں کہ اسلام ہی نے ان مختلف قوموں کو جو ایشیائے کوچک کے شمالی مغربی گوشہ میں آباد تھیں، متحد کر کے ایک قوم بنا دیا، یہ سلاجقہ قونیہ کے خاتمہ کا نہیں بلکہ اس تبدیل

مذہب ہی کا نتیجہ تھا کہ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) کے بعد عثمان کی فاتحانہ سرگرمیاں شروع ہو گئیں، حالانکہ اس سے سعوت کی زندگی کے پچاس سال ان سرگرمیوں سے خالی تھی، ارطغرل اور عثمان ایک دیہاتی سردار کی حیثیت سے سعوت میں سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے تمام حوصلے اپنے چھوٹے سے گاؤں ہی تک محدود تھے، ان کی اس زمانہ کی کسی جنگ یا فتح کا ذکر تاریخ میں موجود نہیں، ارطغرل کے ساتھ چار سو سپاہی تھے اور عثمان کے ہم راہ اس سے زیادہ سپاہیوں کے ہونے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی، اس کے تعلقات اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بالکل صلح و دوستی کے تھے، نشری کا بیان ہے کہ اس ملک کے کافر و مسلم دونوں ارطغرل اور اس کے لڑکے کی عزت کرتے تھے، کافر و مسلم کا کوئی سوال ہی نہ تھا، پھر دفعۃً ہم عثمان کو اپنے پڑوسیوں پر حملہ آور ہوتے اور ان کے قلعوں کو فتح کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) سے ۶۹۹ھ (۱۳۰۰ء) تک وہ اپنے مقبوضات کو وسیع کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی سرحد بازنطینی علاقوں سے مل جاتی ہے، اس کے سپاہیوں کی تعداد چار سو سے بڑھ کر چار ہزار تک پہنچ جاتی ہے، ہم ایک قوم کا ذکر سننے لگتے ہیں، جو ترک نہیں بلکہ اپنے سرداروں کے نام پر ”عثمانی“ کہلاتی ہے، اس سردار کا نام خود بھی اس کی قوم ہی کے نام کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، یہ لوگ یونانیوں (بازنطینیوں) اور تاتاریوں دونوں کے یکساں دشمن ہیں اور متعین طور پر اسلام سے وابستہ ہیں، ان میں ایک ایسا تبلیغی جوش ہے جو صرف ان ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جنہوں نے حال ہی میں مذہب تبدیل کیا ہو، ان کی باہمی وحدت اور ایشیائے کوچک کے دوسرے ترکوں سے ان کا قطعی طور سے مختلف ہونا، چودہویں صدی کے ابتدائی ساٹھ سالوں میں اس قدر نمایاں ہو جاتا ہے کہ یورپ انہیں بحیثیت ایک قوم کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، ایشیائے کوچک کی دوسری جماعتوں کی بہ نسبت چوں کہ یہی لوگ یورپ کے سامنے زیادہ آئے، اس لیے اہل یورپ نے انہیں محض ”ترک“ کہنا شروع کیا اور ان کو اناطولیہ کے تمام ترکوں کا نمائندہ سمجھنے لگے۔

پروفیسر گرنالس نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے، لکھتے ہیں: ”اپنے پیش روؤں کی طرح جنہوں نے ایشیائے کوچک میں بودو باش اختیار کر لی تھی ”کے خان لی“ بھی ترک ہی تھے، البتہ ان کی بولی ذرا ان سے مختلف تھی، ایک اور فرق یہ تھا کہ سلاجقہ تو صدیوں سے اسلام لاپچکے تھے لیکن یہ نووارد ہنوز اپنے قدیم خانہ بدوشی کے مسلک پر قائم تھے، ان کے سردار طغرل کے بیٹے عثمان کی شادی کے متعلق جو روایت مشہور ہے، اس سے ہمارا یہ قیاس حق بہ جانب ہے کہ انہوں نے ایشیائے کوچک کی اسلامی فضا میں داخل ہونے کے بعد اسلام قبول کیا۔“

مال خاتون | وہ روایت یہ ہے کہ اس شہر کے قریب ابتر دنی نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک خدارسیدہ عالم اوہ بالی رہا کرتے تھے، عثمان اپنی نو عمری کے زمانہ میں ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا، ان کی ایک نہایت حسین لڑکی تھی جس کا نام مال خاتون تھا، ایک روز اتفاق سے عثمان کی نظر اس دوشیزہ پر پڑ گئی اور وہ دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا، اس نے نکاح کا پیغام دیا لیکن اوہ بالی چون کہ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، اس لیے فرق مراتب کا لحاظ کر کے انہوں نے اس پیغام کو قبول نہیں کیا، دو سال تک عشق و محبت کا یہ سلسلہ برابر قائم رہا اور عثمان نے اوہ بالی کے گھر کی آمد و رفت جاری رکھی، اس درمیان میں چند اور ترک سرداروں نے بھی، جو طاقت اور جاہت میں عثمان سے بڑھے ہوئے تھے، مال خاتون سے شادی کی خواہش کی لیکن اوہ بالی نے ان کو بھی صاف جواب دیا، بالآخر ایک رات جب عثمان اوہ بالی کے یہاں مقیم تھا، اس نے یہ عجیب و غریب خواب دیکھا کہ ایک چاند ہلال بن کر اوہ بالی کے سینہ سے نکلا اور رفتہ رفتہ بدر کامل بن کر اس کے سینہ میں اتر آیا، پھر اس کے پہلو سے ایک زبردست درخت نمودار ہوا، جو بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحر و بر پر چھا گئیں، درخت کی جڑ سے نکل کر دنیا کے چار بڑے دریا جلع، فرات، نیل اور ڈینیوب بہ رہے تھے اور چار بڑے

۱۔ ترکوں کی اسلامی خدمات از ڈاکٹر جو لیس گرنالس، ص ۱۰، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۲ء۔

بڑے پہاڑ کوہ قاف، کوہ بلقان، کوہ طور اور کوہ اٹلس اس کی شاخوں کو سمجھالے ہوئے تھے، دفعۃً ایک نہایت تیز ہوا چلی اور اس درخت کی پتیوں کا رخ جو شکل میں تلوار سے مشابہ تھیں، ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہو گیا، یہ شہر جو دو سمندروں اور دو براعظموں کے اتصال پر واقع تھا، مثل ایک انگوٹھی کے دکھائی دیتا تھا، جس میں دو نیم اور دو زمر درجے ہوئے تھے، عثمان اس انگوٹھی کو پہننا ہی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی، بیدار ہونے کے بعد اس نے یہ خواب اوہ بالی سے بیان کیا، اوہ بالی نے اس میں عثمان کے شان دار مستقبل کی تعبیر دیکھ کر نیز اسے ایک اشارہ غیبی سمجھ کر مال خاتون کو اس کے نکاح میں دے دیا، اوہ بالی ہی کی تلقین سے عثمان اور اس کے قبیلہ کے لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔

ذاتی اوصاف | عثمان میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے جو ایک بانی سلطنت کے لیے ضروری ہیں، اس کی ہمت اور شجاعت غیر معمولی تھی، اسے قیادت کا ملکہ خدا داد حاصل تھا، میدان جنگ میں اس کی بہادری سپاہیوں میں دلیری کی روح پھونک دیتی تھی اور انتظام حکومت میں اس کی دانش مندی رعایا کے دلوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی، اس کے عدل و انصاف کی شہرت تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی، اس کی عدالت میں ترک و تاتار، مسلم و عیسائی سب برابر تھے، رعایا کی بہبودی اس کا نصب العین اور ملک کی خوش حالی اس کا مطمح نظر تھا، قرون اولیٰ کے مجاہدوں کی طرح اس کا طرز زندگی نہایت سادہ اور نمائش سے یکسر پاک تھا، دولت اس نے کبھی جمع نہیں کی، تمام مال غنیمت غریبوں اور یتیموں کا حصہ نکالنے کے بعد سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا تھا، یعنی شہر میں اس کے رہنے کا جو مکان تھا، اس میں سونے، چاندی یا جواہرات کی قسم سے کوئی چیز بھی اس کے مرنے کے بعد نہیں ملی، صرف ایک کفتان، ایک سوتی عمامہ بکڑی کا ایک چمچ، ایک نمک دان، چند خالص عربی گھوڑے، زراعت کے لیے چند جوڑ بیل اور بھیڑوں کے کچھ گلے، علم اور اسلحہ کے علاوہ، بس یہی اس کی ساری کائنات تھی، وہ نہایت فیاض، نہایت رحم دل اور نہایت مہمان نواز تھا، ان خصوصیات کی وجہ سے اس کی ہر دل عزیز

عام تھی، چنانچہ تخت نشینی کے موقع پر جب اس کی تلوار جو ابھی تک محفوظ ہے، اس کے جانشینوں کی کمر سے باندھی جاتی تھی تو ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کی جاتی تھی کہ ”خدا اس میں بھی عثمان ہی جیسی خوبیاں پیدا کر دے۔“

لیکن ان خوبیوں کے ساتھ عثمان کے دامن پر ایک بے گناہ کے خون کی چھینٹیں بھی نظر آتی ہیں، ۶۹۸ھ (۱۲۹۹ء) میں جب اس نے یونانیوں کے قلعہ کوہ پری حصار پر حملہ کا عزم کیا تو پہلے اپنے فوجی سرداروں کو بلا کر مشورہ طلب کیا، اس مجلس میں اس کا بوڑھا چچا دوندار بھی تھا، اس نے یونانیوں کی قوت کا اندازہ کر کے حملہ کرنے کے خلاف رائے دی، عثمان نے اس خوف سے کہ مہادا دوندار کے مشورہ سے دوسرے سرداروں کی ہمتیں بھی پست نہ ہو جائیں، فوراً ایک تیر مار کر اسے ہلاک کر دیا، بوڑھے چچا کا یہ قتل آج خواہ کتنا ہی معیوب نظر آئے لیکن اس زمانہ کے لحاظ سے یہ ایک بالکل معمولی واقعہ تھا اور اگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی اہمیت اور بھی کم ہو جاتی ہے۔

پہلی مسجد | عثمان نے اپنے ابتدائی عہد حکومت میں ایک مسجد اس شہر میں تعمیر کرائی جو سلطنت عثمانیہ کی پہلی مسجد ہے۔

اورخان

۱۲۶۷ھ تا ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۳۲۶ء تا ۱۳۲۹ء

عثمان نے اپنی وفات کے وقت اپنے چھوٹے بیٹے اورخان کو اپنا چانشین مقرر کیا تھا، اورخان کی عمر اس وقت ۴۲ سال کی تھی اور وہ فن سپہ گری میں عثمان کے زیر نگرانی مہارت اور کمال حاصل کر چکا تھا، اس کے بڑے لڑکے علاء الدین نے اپنا وقت علوم دینیہ کی تحصیل میں صرف کیا تھا، فن حرب سے اس کو مناسبت نہ تھی، تاہم عثمان کی وفات کے بعد اورخان نے سلطنت کا باہم تقسیم کر لینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن علاء الدین نے باپ کی وصیت نیز اپنی سکون پسند طبیعت کی بنا پر اس کو نا منظور کیا اور اورخان کے اصرار پر صرف انتظام مملکت کی ذمہ داری قبول کی، یعنی تخت سلطنت سے کنارہ کش ہونے کے باوجود بار سلطنت کا اٹھانا قبول کیا اور دولت عثمانیہ کے پہلے وزیر کی حیثیت سے آئین ملک کی ترتیب و تنظیم میں مشغول ہوا۔

اصلاحات | علاء الدین نے تین چیزوں پر خاص طور سے توجہ کی، سکہ، لباس اور فوج، اگرچہ سلطان علاء الدین سلجوقی نے عثمان کو خطبہ کے علاوہ اپنے نام کا سکہ جاری کرنے کی بھی اجازت دے دی تھی، تاہم عثمان نے صرف خطبہ ہی پر قناعت کی تھی اور اپنا سکہ جاری نہیں کیا تھا، اورخان کی تخت نشینی کے وقت تمام ایشیائے کوچک میں صرف سلجوقی سکے رائج تھے، اب

علاء الدین نے بادشاہت کے اس امتیاز کو بھی اختیار کیا اور اسلامی مملکت میں اور خان کے نام کے سکے جاری کیے، اب تک لوگوں کے لباس میں بھی کوئی خاص فرق و امتیاز نہ تھا، علاء الدین نے رعایا کے مختلف طبقوں کے لیے مختلف قسم کے لباس تجویز کر کے ان کے متعلق قوانین نافذ کیے، شہری اور دیہاتی، مسلم اور غیر مسلم ہر طبقہ کا لباس الگ الگ مقرر کیا۔

فوج | لیکن علاء الدین کا سب سے بڑا کارنامہ وہ فوجی اصلاحات ہیں، جن سے دولت عثمانیہ کی طاقت دفعہ بڑھ گئی اور جو تین سو برس تک اس کی حیرت انگیز فتوحات کی ضامن رہیں، ارطغرل اور عثمان کے زمانہ میں کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی، بلکہ یہ دستور تھا کہ جب کوئی جنگ پیش آنے والی ہوتی تو پہلے سے اعلان کر دیا جاتا کہ جو شخص لڑائی میں شریک ہونا چاہے وہ فلاں روز فلاں مقام پر حاضر ہو جائے، چنانچہ یہ رضا کار سوار مقررہ وقت اور مقررہ مقام پر جمع ہو جاتے تھے اور لڑائی ختم ہونے کے بعد واپس چلے جاتے تھے، انہیں کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ جو مال غنیمت ہاتھ آتا تھا، وہی ان کی خدمت کا معاوضہ ہوتا تھا، ان کی کوئی مخصوص وردی بھی نہیں تھی، باایں ہمہ یہ سپاہی اعلیٰ درجہ کے شہسوار ہوتے تھے اور مضبوطی کے ساتھ صف قائم کر کے ایک دیوار کی طرح میدان جنگ میں آگے بڑھتے تھے، عثمان کے عہد تک تو اس طریقہ سے کام چلتا رہا لیکن اس کے بعد سلطنت کی توسیع اور استحکام کے لیے یہ نظام ناکافی ثابت ہوا اور ایک باقاعدہ اور مستقل فوج کی ضرورت محسوس ہونے لگی، چنانچہ علاء الدین نے تنخواہ دار پیادوں کی ایک فوج مرتب کی، جن کا نام ”پیادے“ تھا، یہ دس دس، سو سو اور ہزار ہزار کے دستوں میں تقسیم تھی، اس کی تنخواہیں اونچی اونچی تھیں لیکن اس کے قیام کو زیادہ روز نہ ہوئے تھے کہ اس میں اپنی قوت کا بے جا احساس پیدا ہو گیا اور اس کی سرکشی خود اور خان کے لیے تشویش کا باعث ہونے لگی، چنانچہ اور خان نے اس

۱۔ ترکی قدیم و جدید از سدلینڈ منزلیس، جلد ۱، ص ۵۷ (Turkey Old And New By Sutherland)

۲۔ Menzies, London, Vol I, P 57۔ گلین، جلد ۴، ص ۳۸۱۔ ۳۔ ہربرٹ گینس، ص ۸۱۔

امر میں علاء الدین اور قراخلیل سے (جو خاندان شاہی سے ازدواجی تعلق رکھتا تھا اور علاء الدین کے بعد وزیر سلطنت ہو کر خیر الدین پاشا کے نام سے مشہور ہوا) مشورہ کیا، قراخلیل نے جو تجویز پیش کی، اس نے نہ صرف پیادوں کی طرف سے مطمئن کر دیا بلکہ آئندہ تین صدیوں کے لیے عثمانی فتوحات کی رفتار میں ایک سیلاب کی قوت و سرعت بھی پیدا کر دی۔

ینی چری | وہ تجویز یہ تھی کہ عیسائی اسیران جنگ میں سے دس بارہ سال کے قوی اور ہونہار لڑکوں کی ایک تعداد منتخب کر کے اسلام میں داخل کی جائے اور پھر باقاعدہ فوجی تعلیم دے کر ان کی ایک مستقل فوج قائم کی جائے، اور خان کو یہ رائے پسند آئی اور اس نے ایک ہزار عیسائی لڑکوں کو منتخب کر کے انہیں فوجی تعلیم و تربیت دینی شروع کی، دوسرے سال ایک ہزار لڑکے اور چنے گئے اور یہ سلسلہ تین سو برس تک برابر جاری رہا، جب کبھی ہزار لڑکوں کی یہ سالانہ تعداد ان لڑکوں سے پوری نہ ہو سکتی جو اس سال کی جنگ میں قید ہوتے تو عیسائی رعایا کے لڑکوں سے کمی پوری کر لی جاتی لیکن سلطان محمد رابع کے عہد حکومت میں یہ نظام بدل گیا اور ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) سے خود ان ہی سپاہیوں اور ترکوں کے لڑکے اس فوج میں داخل کیے جانے لگے، اس فوج کا ترکی نام ینی چری (نی فوج) ہے، جو عربی میں انکشاری ہو گیا ہے، اور خان نے جب اسے مرتب کیا تو نوجو عمر سپاہیوں کے پہلے دستہ کو حاجی بکطاش کی خدمت میں جو ملک میں اپنے زہد و اتقا کی وجہ سے مشہور تھے، لے گیا اور ان سے دعا کی خواہش کی، حاجی موصوف نے اس فوج کے لیے فتح و نصرت کی دعا کی اور اس کا نام ینی چری رکھا، سلطنت عثمانیہ کی ابتدائی تین صدیوں میں جو اس کے عروج و ترقی کا زمانہ تھا، ینی چری کی قوت شباب پر تھی اور سلطنت کی تمام فتوحات زیادہ تر اسی فوج کے زور بازو کی رہیں منت تھیں، جو لڑکے اس فوج کے لیے منتخب کیے جاتے تھے، پہلے انہیں ایسے ماحول میں رکھا جاتا تھا کہ وہ خود بخود اسلام کی طرف مائل ہوتے جائیں، اسلام قبول کرنے کے بعد انہیں سلطان کی خاص نگرانی میں فن حرب کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی، ان کی فوجی تربیت میں حد

درجہ سختی برتی جاتی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہر قسم کے شدید کو آسانی سے برداشت کر لیتے تھے، اپنے والدین، وطن اور مذہب سے چھوٹنے کے بعد ان کی تمام امیدیں سلطان کی اطاعت، دولت عثمانیہ کی خدمت اور اسلام کی حمایت سے وابستہ ہو جاتی تھیں اور یہی ان کی زندگی کا نصب العین تھا، سلطان کو ان پر پورا اعتماد تھا اور وہ ہمیشہ ان کو انعام و اکرام سے سرفراز کرتا رہتا تھا، یہی چری کے متعلق مزید حالات آگے آئیں گے۔

جاگیردار اور بے ضابطہ پیادے | یہی چری کے بعد علاء الدین نے دوسری فوجوں کی تنظیم شروع کی، اب تک ”پیادوں“ کی مستقل فوج کو تنخواہیں دی جاتی تھیں لیکن اس خیال سے کہ ان کو مفتوحہ علاقوں کی حفاظت سے ایک خاص وابستگی پیدا ہو جائے، علاء الدین نے اب تنخواہ کے بجائے انہیں جاگیریں دے دیں اور فوجی خدمت کے علاوہ ان جاگیروں سے متصل سرلوگوں کی مرمت بھی ان کے فرائض میں داخل کر دی، پیدل سپاہیوں کی ایک بے ضابطہ فوج بھی مرتب کی گئی، اس کو نہ تو یہی چری کی طرح تنخواہیں ملتی تھیں اور نہ ”پیادوں“ کی طرح جاگیریں، میدان جنگ میں سب سے آگے ان ہی کا دستہ ہوتا تھا اور دشمن کے پہلے حملہ کی باڑھ آگے بڑھ کر یہی روکتے تھے، جب ان سے مقابلہ کرنے میں غنیمت کی قوت کم زور ہو جاتی یا ان کے میدان کے چھوڑ کر بھاگنے کی وجہ سے اسے اپنی فتح کا یقین ہونے لگتا، اس وقت دفعۃً یہی چری کی آہنی فوج اس کے سامنے نمودار ہوتی اور جنگ کا سارا نقشہ دیکھتے دیکھتے بدل جاتا، عموماً ان بے ضابطہ سپاہیوں ہی کی نعشوں پر سے گزر کر یہی چری آخری حملہ اور فتح کے لیے آگے بڑھتے تھے۔

تنخواہ دار اور جاگیردار سوار | پیادوں کی طرح سواروں کی بھی دو تقسیمیں تھیں، باضابطہ اور بے ضابطہ، مستقل تنخواہ دار سوار چار دستوں میں تقسیم کیے گئے تھے، ان کی تعداد ابتداء میں دو ہزار چار سو تھی لیکن سلیمان اعظم کے عہد میں چار ہزار تک پہنچ گئی تھی، وہ سلطان کے داہنے اور بائیں چلا کرتے تھے اور جنگ میں اس کے محافظ دستہ کا کام دیتے تھے، شاہی

سواروں کے دستوں میں ایک دستہ ”سپاہیوں“ کا تھا، ”سپاہی“ کا لفظ عموماً سوار فوج کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن شاہی سواروں کا ایک خاص دستہ بھی اس نام سے موسوم تھا، تنخواہ دار سواروں کے علاوہ علاء الدین نے جاگیر دار سواروں کی بھی ایک فوج مرتب کی، ان کی جاگیروں کو زعامت اور تیمار کہتے تھے۔

انگلی | تنخواہ دار اور جاگیر دار سواروں کے علاوہ بے ضابطہ سواروں کی بھی ایک فوج تھی جو انگلی کہلاتے تھے، ان کو نہ تنخواہیں ملتی تھیں نہ جاگیریں، جنگ میں لوٹ مار کر جو کچھ حاصل کر لیتے وہی ان کا معاوضہ تھا، قدیم دستور کے موافق عثمانی فوجوں کی روانگی کے وقت یہ ایک بڑی تعداد میں بلائے جاتے تھے، یہ گویا مقدمہ لکچس تھے اور باقاعدہ انواج کے لیے پہلے ہی سے راستہ صاف کر رکھتے تھے، دشمن کے دلوں میں ان کی دہشت بھی مینی چری اور سپاہیوں سے کم نہ تھی لیکن ان ہی کو سب سے زیادہ خطرات کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔

عثمانی فوج کے مخصوص امتیازات | علاء الدین نے اپنی فوجی اصلاحات سے ترکوں کی ایک باضابطہ اور مستقل فوج تیار کر دی، جس کی نظیر ایک صدی تک یورپ میں پیدا نہ ہو سکی، چارلس ہفتم شاہ فرانس کے پندرہ فوجی دستے جو عہد جدید کی پہلی مستقل فوج سمجھی جاتی ہے اور خان کی مستقل اور تنخواہ دار سپاہ سے پورے سو برس بعد وجود میں آئے، مسٹر ہربرٹ گہنس نے عثمانیوں کے اس امتیاز سے جسے عموماً تمام مورخین تسلیم کرتے آئے ہیں، انکار کیا ہے اور ایڈورڈ سوم شاہ انگلستان کی باقاعدہ بیڈل فوج کا ذکر کیا ہے، جس نے ۱۳۳۶ء میں جنگ کرہی میں حصہ لیا تھا لیکن جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، ایڈورڈ نے ایک ایسی فوج مرتب کی تھی، جو صرف ضرورت کے وقت جنگ کے لیے طلب کی جاسکتی تھی، برخلاف اس کے اور خان کی فوج ایک مستقل فوج تھی جسے باقاعدہ تنخواہیں دی جاتی تھیں اور جو ہمہ وقت جنگ کے لیے مستعد اور تیار رہتی تھی، چنانچہ یہ امر مسٹر گہنس کو بھی تسلیم ہے کہ فوج کی مکمل تنظیم اور

اسے ہمیشہ جنگ کے لیے تیار رکھنے کی اولیت عثمانیوں ہی کو حاصل ہے، علاء الدین کے فوجی نظام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ بادشاہ اور فوج کے درمیان براہ راست تعلق پیدا ہو گیا اور درمیانی اشخاص کی ضرورت باقی نہیں رہی، جن کی وساطت سے عثمان اور طغرل کے سپاہی فراہم ہوتے تھے، بے ضابطہ پیدل اور سوار فوجوں کے علاوہ جو صرف لڑائی کے موقعوں پر بلائی جاتی تھیں بقیہ تمام فوج تنخواہ دار یا جاگیر دار تھی اور سب کی کمان سلطان کے ہاتھ میں تھی، مسٹر گینس نے ایک قدیم اور واقف کار سیاح بروکئے (Broguiere) کا بیان نقل کیا ہے کہ عثمانیوں کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ عیسائی فوجیں کب آرہی ہیں اور کہاں ان سے مقابلہ کرنا مفید ہوگا، وجہ یہ تھی کہ عثمانی جنگ کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے اور ان کے چاؤش اور جاسوس صحیح رہنمائی کرتے تھے، سیاح مذکور لکھتا ہے: ”وہ (عثمانی) دفعہ روانہ ہو سکتے ہیں اور سو عیسائی سپاہی بہ نسبت دس ہزار عثمانیوں کے زیادہ شور کریں گے، طبل بجاتے ہی وہ فوراً کوچ کر دیتے ہیں اور جب تک حکم نہ ملے ہرگز اپنے قدم نہیں روکتے، بلکہ اسلحہ سے مسلح ہونے کی وجہ سے وہ ایک رات میں اتنی مسافت طے کر لیتے ہیں جتنی ان کے عیسائی حریف تین دن میں طے کرتے ہیں۔“

پاشا | علاء الدین پہلے عثمانی ترک ہے جسے پاشا کا خطاب ملا، اس کے بعد یہ خطاب اور خان کے سب سے بڑے لڑکے سلیمان کو دیا گیا، شروع میں پاشا کا خطاب عثمانی فرماں روا کے بڑے لڑکے کے لیے مخصوص تھا لیکن مراد اول کا بڑا لڑکا چون کہ باغی ہو گیا تھا اور بقیہ لڑکے اس وقت نابالغ تھے، اس لیے مراد نے یہ خطاب قر اخلیل کو دیا، اس کے بعد ولی عہد کی تخصیص جاتی رہی اور بڑے بڑے فوجی اور ملکی عہدے داروں کو بھی یہ خطاب دیا جانے لگا، اسی طرح وزارت کا عہدہ بھی علاء الدین کے بعد شاہی خاندان سے نکل گیا۔

نائیکومیڈیا اور نائسیا کی فتح | اور خان نے اپنی حکومت کے پہلے ہی سال (۷۲۶ھ

۱ ہربرٹ گینس، نوٹ، ص ۱۸۲ | ۲ ہربرٹ گینس، ص ۶۴ | ۳ ایضاً، ص ۷۲-۷۱۔

مطابق ۱۳۲۶ء) میں نائیکومیڈیا پر قبضہ کر لیا، بروصہ چند مہینے قبل فتح ہو چکا تھا، سلطنت بازنطینی کے ایشیائی مقبوضات میں اب صرف ایک ہی بڑا شہر نائیسارہ گیا تھا، جو اپنی عظمت اور اہمیت کے اعتبار سے قسطنطنیہ سے دوسرے درجہ پر تھا، اور خان نے اس کا بھی محاصرہ شروع کیا اور ۳۰ ۷۱ء (۱۳۳۰ء) میں اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اور خان نے نائسیا کے باشندوں کو اجازت دے دی تھی کہ اگر چاہیں تو اپنا تمام مال و اسباب لے کر کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں لیکن بروصہ کے باشندوں کی طرح یہ لوگ بھی بکثرت اسلام میں داخل ہو گئے اور اپنے وطن ہی میں مقیم رہے۔

قراسی پر قبضہ | ۷۱ ۷۲ء (۱۳۳۳ء) میں ترکی ریاست قراسی کے امیر نے انتقال کیا، اس کے بڑے لڑکے نے تخت پر قبضہ کر کے اپنے چھوٹے بھائی کو قتل کر دیا، اور خان چھوٹے لڑکے کا طرف دار تھا، اس کے خون کا بدلہ لینے کے لیے وہ قراسی پر حملہ آور ہوا، بڑا لڑکا شکست کھا کر بھاگا اور ۷۳ ۷۴ء (۱۳۳۶ء) میں پوری ریاست پر اور خان کا قبضہ ہو گیا، اس کے بعد اور خان نے اناطولیہ کے شمالی مغربی گوشہ کی چند اور چھوٹی چھوٹی ترکی ریاستیں بھی عثمانی مقبوضات میں شامل کر لیں، قراسی اور ان دوسری ترکی ریاستوں کی آبادی زیادہ تر ترکوں پر مشتمل تھی لیکن ساحلی علاقوں میں ایک خاصی تعداد یونانیوں کی بھی تھی، جنہوں نے بروصہ اور نائسیا کے اکثر باشندوں کی طرح اسلام قبول کر لیا۔

زمانہ امن کے کارنامے | ان فتوحات کے بعد تقریباً بیس سال تک کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی، اور خان پوری توجہ کے ساتھ ملکی اور فوجی آئین کی تنظیم اور تکمیل میں مصروف رہا، اس نے تمام ملک میں امن و امان قائم کیا، مسجدیں، مدرسے اور فراہ عام کی مختلف شان دار عمارتیں بنوائیں، بروصہ میں ایک نہایت عالی شان مسجد، ایک بڑا مدرسہ اور ایک شاہی اسپتال تعمیر کرایا، بڑے بڑے فضلا اور اہل کمال کو طلب کیا اور بروصہ کی شہرت اتنی پھیلی کہ ایرانی اور عربی طلبہ علوم مشرقیہ کے قدیم مدرسوں سے آکر وہاں تعلیم

حاصل کرنے لگے، ناسیا میں بھی ایک مسجد تعمیر کی اور اس کے متصل ایک مدرسہ قائم کیا، جو دولت عثمانیہ کا پہلا مدرسہ تھا اور بہت مشہور ہوا، اسی شہر میں اور خان نے غریبوں کے لیے پہلا لنگر خانہ بھی جاری کیا۔^۱

حکومت کی پالیسی | جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے، خاندان عثمانی کے ابتدائی تاج داروں کی ایک بڑی خصوصیت، جس کا اثر سلطنت کے استحکام پر نمایاں طور سے پڑا، یہ تھی کہ جب وہ کسی ملک کو فتح کرتے تھے تو قبضہ کے بعد ہی اس کے اندرونی نظم و نسق میں مصروف ہو جاتے تھے، ان کا مقصد محض فتوحات حاصل کرنا نہ تھا، بلکہ وہ مفتوحہ علاقوں کو اپنے آئین و ضوابط کے مطابق تنظیم دے کر مکمل طور پر سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس طرح بجائے اس کے کہ اپنی فتوحات سے مختلف صوبوں اور بے میل آبادیوں کو ایک غیر مرتب شکل میں اکٹھا کرتے، انہوں نے ایشیائے کوچک میں ایک مرتب اور پائیدار حکومت قائم کر لی، عہد قدیم و جدید کی دوسری مشرقی سلطنتوں کے مقابلہ میں دولت عثمانیہ کے زیادہ مدت تک قائم رہنے کی ایک بڑی وجہ اس کے ابتدائی فرماں رواؤں کی یہی پالیسی ہے اور چوں کہ اس پالیسی پر یورپ، شام اور مصر سے زیادہ ایشیائے کوچک کی فتوحات میں عمل کیا گیا، اس لیے وہیں عثمانیوں کی حکومت کو زیادہ استقلال بھی نصیب ہوا، اس میں شبہ نہیں کہ ایشیائے کوچک میں استقلال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں ترکوں کی آبادی کثرت سے پھیلی ہوئی تھی لیکن سلطنت کے استحکام میں فاتحین عثمانی کی اس دانش مندانہ پالیسی کو بھی کچھ کم دخل نہ تھا۔

سلطنت بازنطینی | سلطنت کے اندرونی انتظامات سے فارغ ہو کر اور خان یورپ کی جانب متوجہ ہوا اور اس کی زندگی کے آخری چند سال سلطنت بازنطینی کے پورے علاقوں میں قدم جمانے کی کوشش میں صرف ہوئے، یہ سلطنت آٹھویں صدی ہجری (چودھویں

۱۔ کتب، جلد ۲، ص ۳۸۱ ۲۔ ترکی قدیم و جدید، ارمنزس، ج ۱، ص ۵۹۔

صدی عیسوی) کے وسط میں نہایت کم زور ہو چکی تھی، اس کے مقبوضات جو صدیوں تک یورپ میں دریائے ڈینوب اور ایشیا میں اناطولیہ اور شام تک پھیلے ہوئے تھے، اب صرف تھریس، مقدونیا کے ایک جز جس میں سالونیکا شامل تھا اور یونان میں سوریہ کے ایک بڑے حصہ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے، ایشیائی مقبوضات تقریباً کل کے کل عثمانیوں کے قبضہ میں جا چکے تھے، یورپ میں بھی سربیا کا بااقتدار فرماں روا اسٹیفن ڈوشن (Stephen Dushen) جزیرہ نمائے بلقان کے نصف سے زیادہ علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر کے سالونیکا اور اس کے بعد قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا حوصلہ کر رہا تھا، خانہ جنگیوں نے سلطنت کو اور بھی کم زور کر دیا تھا، ۱۳۳۸ء میں شہنشاہ اینڈونیکس کے انتقال پر اس کا گرینڈ چانسلر کنفا کوزین اس کے نابالغ لڑکے جان پلیو لوگس کا ولی اور ملکہ اینا کے ساتھ اس کا مدارالہمام مقرر ہوا، کنفا کوزین نے اس پر قناعت نہ کر کے ۱۳۴۳ء میں نیکوٹیکا میں اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا، ملکہ کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی اور اس نے اس کی مخالفت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں لڑائی چھڑ گئی اور دونوں نے اورخان سے مدد کی درخواست کی، اس سے پہلے بھی بعض ترکی امیروں نے تخت قسطنطنیہ کے مختلف دعوے داروں میں سے کسی نہ کسی فریق کا ساتھ دیا تھا، کنفا کوزین نے اورخان سے چھ ہزار عثمانی سپاہی مانگے اور اس حمایت کے عوض اپنی لڑکی تھیوڈورا کو اس کی شریک زندگی بنانے کے لیے پیش کیا، اورخان نے یہ شرط منظور کی اور ۱۳۴۶ء میں چھ ہزار سپاہی کنفا کوزین کی مدد کے لیے یورپ میں بھیجے، کنفا کوزین نے ان سپاہیوں کی مدد سے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا، جو ملکہ کے قبضہ میں تھا، ایک سال کے محاصرہ کے بعد خود شہر کے بعض لوگوں کی غداری کی وجہ سے کنفا کوزین فوج کے ساتھ قسطنطنیہ میں داخل ہوا اور ملکہ کو مجبوراً صلح کے لیے راضی ہونا پڑا، صلح اس بات پر قرار پائی کہ کنفا کوزین اور اس کی بیوی نیز ملکہ اینا اور شہزادہ جان پلیو لوگس تخت نشین کر دیے جائیں، چنانچہ چاروں کی رسم تاج پوشی ادا کی گئی، اس اتحاد کو اور زیادہ مضبوط

کرنے کے لیے کنفا کوزین نے اپنی چھوٹی لڑکی کی شادی نوجوان شہنشاہ جان سے کردی اور خان کا نکاح بھی شہزادی تھیوڈورا سے ہو گیا، اور خان نے تھیوڈورا کو اس کے آبائی مذہب مسیحیت پر قائم رہنے کی اجازت دی۔

یورپ میں پہلا قدم | صلح کے بعد اور خان کے چھ ہزار سپاہی جو اس نے کنفا کوزین کی مدد کے لیے بھیجے تھے، واپس آگئے لیکن چند ہی سال کے بعد ان کی ضرورت پھر پیش آئی، ۱۷۵۰ء (۱۳۴۹ھ) میں اسٹیفن ڈوشن شاہ سرویا نے سالونیکا پر حملہ کیا اور یقین تھا کہ اسے فتح کرنے کے بعد وہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے گا، اس نازک موقع پر کنفا کوزین اور جان پاپیو لوگس دونوں نے اور خان سے مدد کی درخواست کی، اب کی بار اور خان نے بیس ہزار سپاہی روانہ کیے، ان کی مدد سے سالونیکا میں اسٹیفن کو شکست ہوئی اور قسطنطنیہ کی فتح کا حوصلہ جو اس کے دل میں بار بار پیدا ہوتا تھا، اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، جنگ کے خاتمہ پر عثمانی سپاہی پھر واپس بلا لیے گئے، مگر چار سال کے بعد اور خان کو اپنی فوجیں آبنائے باسفورس کے مغربی ساحل پر بھیجنے کا ایک اور موقع ہاتھ آیا جو یورپ میں عثمانیوں کے قدم جمنے کا سبب ثابت ہوا، کنفا کوزین تاج و تخت میں جان پاپیو لوگس اور ملکہ اینا کی شرکت کو زیادہ دنوں تک گوارا نہ کر سکا اور ۱۷۵۴ء (۱۳۵۳ھ) میں اس نے حکومت کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینے چاہے، جان نے اس کی شدید مخالفت کی اور خانہ جنگی شروع ہو گئی، کنفا کوزین نے حسب دستور سابق اور خان سے پھر مدد کی درخواست کی اور اس کے معاوضہ میں یورپین ساحل کا ایک قلعہ پیش کیا، اور خان نے اپنے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کی سرکردگی میں بیس ہزار سپاہی روانہ کیے، ان کی مدد سے کنفا کوزین نے جان پاپیو لوگس کو شکست دے کر قسطنطنیہ کے تخت پر قبضہ کر لیا، سلیمان پاشا نے حسب معاہدہ قلعہ زنپ (Tzympe) پر قبضہ کر کے اس میں عثمانی دستے متعین کر دیے، اس کے چند ہی دنوں بعد تھریس میں زلزلہ آیا جس سے بہتیرے شہروں کی شہر پناہیں منہدم ہو گئیں، ان ہی میں گیلی پولی بھی تھا، دودردانیال کے

مغربی ساحل پر سب سے زیادہ اہم قلعہ تھا اور زنپ سے تھوڑے فاصلہ پر واقع تھا، سلیمان پاشا نے اسے تائیدِ نمیبی خیال کیا اور گیلی پولی پر فوراً قبضہ کر لیا، قلعہ کے یونانی دستوں نے یہ سمجھا کہ خدا کی مرضی یوں ہی تھی، نیز وہ ترکوں کے دفعہ پہنچ جانے سے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ کوئی مزاحمت نہ کر سکے، اس درمیان میں کنفا کوزین نے سلیمان پاشا سے دس ہزار دوکات کے عوض زنپ سے قبضہ اٹھالینے کی خواہش کی اور سلیمان پاشا نے اسے منظور بھی کر لیا، مگر اس معاملہ کی تکمیل سے قبل ہی گیلی پولی کا واقعہ پیش آ گیا، جس کے بعد سلیمان پاشا نے زنپ کی واپسی سے بھی انکار کر دیا اور گیلی پولی کی شہر پناہ کو درست کر کے اس میں ترکی فوج کا ایک مضبوط دستہ متعین کر دیا، اس کے بعد اس نے تھریس کے چند اور مقامات بھی فتح کر لیے اور بہت سے ترکوں اور عربوں کو لاکران مقبوضات میں آباد کر دیا۔

گیلی پولی کی فتح سے ترکوں کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، ۱۵۵۷ء میں انہوں نے پہلی بار فاتح کی حیثیت سے یورپ میں قدم رکھا اور مسیحی یورپ میں ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو دو صدیوں کے اندر گیلی پولی سے ویانا کی دیواروں تک پھیل گئی، قرونِ اولیٰ کے مجاہدوں نے دینِ حق کے پیغام سے مغربی یورپ کو بہرہ اندوز کیا تھا اور اپنے علوم کی روشنی ان کے ظلمت کدہ میں پہنچائی تھی لیکن مشرقی یورپ پر ہنوز تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس کی سرزمین ایک مشعلِ ہدایت کی منتظر تھی، یہ سعادت عثمانیوں کے ہاتھوں کے لیے مقدر ہو چکی تھی، عرب مجاہدوں نے جس فرض کی تکمیل یورپ کے مغربی حصہ میں کی تھی، ترک مجاہدوں نے اسے مشرق میں پورا کیا۔

جان پلپو لوگس | ان واقعات سے کنفا کوزین کے خلاف قسطنطنیہ میں سخت برہمی پھیلی جس نے بغاوت اور انقلاب کی شکل اختیار کر لی، ہر شخص اس پر غداری وطن کا الزام عائد کرتا تھا اور اسی کو ترکوں کے یورپ میں لانے کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا، آخر رائے عامہ سے مجبور ہو کر اسے تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا، اس نے اپنی زندگی کے بقیہ تیس سال ایک

خانقاہ میں گزار دیے اور اس مدت میں اپنے عہد کی ایک تاریخ لکھ ڈالی، اس کی ملکہ راہبہ بن گئی، قسطنطنیہ کے لوگوں نے جان پلوی لوگس کو بلا کر تخت پر بٹھایا، اس نے پچاس سال تک حکومت کی لیکن اس طویل مدت میں سلطنت بازنطینی کی حالت روز بہ روز زیادہ خراب ہوتی گئی اور ترکوں کا تسلط بڑھتا ہی گیا، انہوں نے قلعہ شورلوار ڈیویوٹیکا کو فتح کرنے کے بعد پھر خالی کر دیا لیکن جنوبی تھریس پران کا مستقل قبضہ ہو گیا اور شہنشاہ جان کو مجبوراً اور خان سے صلح کر کے اس قبضہ کو تسلیم کرنا پڑا، اس کے بعد سلطنت بازنطینی گویا دولت عثمانیہ کی ایک باج گزار حکومت بن گئی۔

سلیمان شاہ اور اورخان کی وفات | ۱۵۹۷ء (۱۳۵۸ء) میں سلیمان پاشا شکار کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گرا اور اس کے صدمہ سے جاں بر نہ ہو سکا، یہ شہزادہ فن سپہ گری و سپہ سالاری میں ممتاز اور خاندان عثمانی کے تمام اعلیٰ اوصاف کا حامل تھا، اور خان کو اس کی وفات کا سخت صدمہ ہوا اور دوسرے ہی سال اس کا بھی انتقال ہو گیا۔

اورخان نے اپنے تینتیس سال کے دور حکومت میں عثمانی مقبوضات کو بہت زیادہ وسعت دی، اس نے نہ صرف ایشیائے کوچک کے بقیہ بازنطینی علاقوں پر قبضہ کر لیا اور بعض ترکی ریاستیں مملکت عثمانیہ میں کر لیں، بلکہ یورپ میں داخل ہو کر تھریس کا ایک حصہ بھی فتح کر لیا، جو اس براعظم میں عثمانی فتوحات کا ایک شان دار مقدمہ تھا، جن فوجی اور ملکی آئین پر سلطنت عثمانیہ کی عظمت قائم ہوئی ان کا بنیادی پتھر اسی نے اپنے ہاتھوں سے رکھا، عثمان کی حیثیت ایک امیر سے زیادہ نہ تھی لیکن اورخان کے کارناموں نے اسے بادشاہی کا حق دار ثابت کر دیا۔

تاہم اس پادشاہی میں بھی درویشی کی شان بدستور قائم رہی اور اس وصف میں وہ عثمان ہی کا مثیل تھا، مسٹر گینس لکھتے ہیں کہ نائیبیا میں وہ غریبوں کو روٹی اور شوربہ اپنے ہاتھوں سے تقسیم کرتا تھا، علوم و فنون کی سرپرستی آل عثمان کی ایک خاص خصوصیت تھی، اور خان کا یہ

امتیاز بھی بہت نمایاں تھا، بڑے بڑے مشہور علما اور مشائخ اس کی صحبت میں رہا کرتے تھے، ان ہی میں سے بعض کو وہ اپنے قائم کردہ مدرسوں میں مدرس مقرر کرتا مثلاً ملا داؤد قیصری اور تاج الدین کرد، جو یکے بعد دیگرے نائسیا کے مدرسہ میں مدرس اول مقرر ہوئے، بروصہ کے علم و فضل کی شہرت اس وقت بھی قائم رہی، جب یہ دولت عثمانیہ کا پایہ تخت نہ رہ گیا اور مدتوں یہ شہر اہل فضل و کمال کا مرکز بنا رہا، یہیں عثمانیوں کے اولین شعراء نے اپنے کلام سنائے اور یہیں ان کے بڑے بڑے شیوخ و ابدال کے مزارات پر آج بھی عقیدت کی پھول چڑھائے جاتے ہیں۔

مراد اول

۱۷۷۰ء تا ۱۷۹۱ء مطابق ۱۳۵۹ء تا ۱۳۸۹ء

اورخان کی وفات پر اس کا چھوٹا لڑکا مراد چالیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، اس میں ملک گیری اور حکم رانی کی وہ تمام خصوصیات بدرجہ غایت موجود تھیں جو آل عثمان کے ابتدائی فرماں رواؤں کا طرہ امتیاز تھیں، اس کی غیر معمولی فوجی قابلیت نے ایک قلیل مدت میں یورپ کی متعدد مملکتوں کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا اور انتظام حکومت کے خداداد ملکہ نے ان مفتوحات کو سلطنت کا ایک مستقل جزء بنا دیا۔

اورخان نے اپنے عہد میں سلطنت کو بہت کچھ وسعت دی تھی لیکن اناطولیہ کی بعض ترکی ریاستیں رقبہ میں اب بھی اس سے بڑھی ہوئی تھیں، مراد کی تخت نشینی کے وقت سلطنت عثمانیہ ایشیائے کوچک کے شمالی مغربی حصہ اور یورپ میں زنیپ، کیلی پولی اور تھریس کے بعض دیگر مقبوضات پر مشتمل تھیں، جہاں سلیمان پاشا نے ترکوں اور عربوں کی نوآبادیاں قائم کر دی تھیں، اس کا مجموعی رقبہ بیس ہزار مربع میل سے زیادہ نہ تھا اور آبادی بھی دس لاکھ سے کم ہی تھی، مراد نے صرف تیس سال کی مدت میں سلطنت کا پانچ گنا بڑھا دیا۔

ایشیائے کوچک میں بغاوت | عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد مراد نے سب سے پہلے یورپ کی طرف بڑھنے کا قصد کیا لیکن امیر کرمانیہ نے اس قدیم بغاوت کی بنا پر جو

اس کے خاندان اور آل عثمان کے درمیان چلی آتی تھی، ایشیائے کوچک میں مراد کے خلاف بغاوت کردی، جسے فرو کرنے کے لیے مراد کو یورپ کا قصد ملتوی کرنا پڑا، اس نے فوراً موقع پر پہنچ کر بغاوت کا استیصال کیا، ادھر سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد وہ یورپ کی طرف متوجہ ہوا اور ۱۷۷۶ء (۱۳۶۰ء) میں دردنیاں کو عبور کر کے فتوحات کا وہ حیرت انگیز سلسلہ شروع کیا جو ۱۷۹۱ء (۱۳۸۹ء) میں صرف اس کی شہادت پر جنگ کسوا میں ختم ہوا۔

فتوحات تھریس | مراد کی تخت نشینی کے وقت سلطنت بازنطینی کی حالت نہایت ابتر تھی، اس کے تمام ایشیائی مقبوضات پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور یورپ میں قسطنطنیہ کے علاوہ صرف شمالی تھریس اور مقدونیا اور موریا کے کچھ حصے باقی رہ گئے تھے، باہمی عداوتوں کے باعث ابتدا میں کوئی عیسائی حکومت ترکوں کے مقابلہ میں اس کی مدد کے لیے آمادہ نہ ہوئی، یہ سلطنت بلاشبہ ایک مسیحی سلطنت تھی اور ترکوں کا حملہ مذہبی نقطہ نظر سے نہایت خطرناک تھا، لیکن یورپ میں محاربات صلیبی کی قدیم روح تقریباً فنا ہو چکی تھی اور یونانی اور لاطینی کلیساؤں کی شدید مخالفت نے اتحاد عمل کے لیے بہت کم گنجائش باقی رکھی تھی۔

ان حالات میں مراد نے دردنیاں کو عبور کر کے ایک زبردست فوج کے ساتھ تھریس میں قدم رکھا اور سب سے پہلے قلعہ شورلو پر قبضہ کیا، جو قسطنطنیہ سے صرف پانچ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، اس کے بعد دوسرا قلعہ کرک کلیسے (Kirk Kilisse) فتح ہوا، پھر ۱۷۷۳ء (۱۳۶۳ء) میں اس کی بابا کے مقام پر بازنطینیوں کے ساتھ ایک سخت معرکہ پیش آیا جس میں مراد نے انہیں بری طرح شکست دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اورنہ نے فوراً ہتھیار ڈال دیے اور تقریباً تمام تھریس مراد کے قبضہ میں آ گیا، اس کے بعد عثمانی جنرل لالہ شاہین نے بلغاریا میں داخل ہو کر فلپو پولس کو فتح کر لیا جو کہ کوہ بلقان کے جنوب میں سلطنت بازنطینی کا مقبوضہ تھا اور شہنشاہ قسطنطنیہ کو مجبور ہو کر مراد سے صلح کرنی پڑی، اس معاہدہ کیا کہ تھریس کے جو علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں انہیں دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے گا،

عثمانیوں کے آئندہ حملوں میں سرویا اور بلغاریا کو مدد نہ دے گا اور اناطولیہ کے ترکی امراء کے مقابلہ میں مراد کی اعانت کرے گا، اس کے بعد مراد بروسہ کو واپس گیا۔

جنگ مارٹیز | یورپ میں مراد کا مقابلہ اس وقت تک صرف بازنطینیوں سے تھا اور دوسری مسیحی حکومتوں نے ترکوں کی مدافعت میں سلطنت بازنطینی کو مطلق مدد نہیں دی تھی، یہاں تک کہ یورپ میں بھی جس نے اس سے پیش تر محاربات صلیبی کی تحریک میں اس قدر نمایاں حصہ لیا تھا، مراد کی ان فتوحات پر کسی قسم کی تشویش کا اظہار نہیں کیا بلکہ یونانی کلیساؤں کے پیروؤں کی تباہی کو اطمینان کی نظر سے دیکھتا رہا، مگر اب فلپو پولس کی فتح نے معاملہ کی صورت بالکل بدل دی، یہ شہر اگرچہ سلطنت بازنطینی کا مقبوضہ تھا، تاہم بلغاریا میں واقع تھا، اس کی فتح نے عثمانی فوجوں کے لیے بلغاریا کا راستہ کھول دیا، ترکوں کا یہ اقدام بالآخر کلیسائے رومہ کے زیر سایہ حکومتوں کے لیے بھی تردد کا باعث ہوا اور پوپ ار بن پنجم (Pope Urban V) نے ہنگری، سرویا، بوسنیا اور ولاچیا کے فرماں رواؤں کو آمادہ کیا کہ ترکوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کے لیے اپنی فوجیں روانہ کریں، چنانچہ اتحادیوں نے ۱۳۶۳ء (۱۳۶۳ء) میں بیس ہزار فوج تھریس روانہ کی اور یہ اعلان کیا کہ وہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر چھوڑیں گے، مراد اس وقت اناطولیہ میں تھا، یہ خبر سن کر وہ فوراً یورپ کی طرف روانہ ہوا، مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی لالہ شاہین نے ایک مختصر فوج کے ساتھ، جو تعداد میں مسیحی لشکر کی نصف تھی، ان کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا اور روز رات کو جب کہ اتحادی فوجیں اور نہ سے قریب دریائے ماریٹرا کے ساحل پر اپنے خیموں کے اندر شراب و کباب کی سرمستیوں میں مبتلا تھیں، دفعۃً حملہ آور ہو کر تقریباً سب کو تہ تیغ کر دیا، جو لوگ لالہ شاہین کی تلوار سے بچ گئے انہوں نے دریا کو عبور کرنے کی کوشش میں ڈوب کر جان دی، یوں گویا پوری عیسائی فوج ہلاک ہو گئی، شاہ ہنگری جو موقع پر موجود تھا، بہ مشکل جان بچا کر بھاگ سکا۔

یہ پہلا معرکہ تھا جو عثمانیوں کو یورپ کی سلاوی قوموں کے ساتھ پیش آیا، اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوہ بلقان کے جنوب کا سارا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، اس سے عیسائیوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا اور مراد نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آئندہ اپنی سلطنت کو بجائے ایشیا کے یورپ میں وسعت دینے کی کوشش کرے گا، اسی غرض سے اس نے اب ڈیویوٹیکا کو جو تھریس میں واقع تھا، پایہ تخت بنایا اور پھر تین سال کے بعد اور نہ کو دار السلطنت قرار دیا، اس کی یہ حیثیت فتح قسطنطنیہ تک قائم رہی، اور نہ سے مراد نے بلقانی ریاستوں پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، جنگ مارٹیزا کے بعد مراد اور شہنشاہ قسطنطنیہ کے درمیان ایک اور معاہدہ ہوا جس کی رو سے شہنشاہ نے سلطان کا باج گزار ہونا منظور کیا اور آئندہ جنگوں میں عثمانی فوج کی حمایت میں اپنی فوج کا ایک دستہ بھیجنے کا وعدہ کیا۔

شہنشاہ کی ناکامی | کچھ دنوں تک تو شہنشاہ قسطنطنیہ خاموشی کے ساتھ خراج ادا کرتا رہا لیکن پھر اسے اپنی محکومی ناقابل برداشت محسوس ہونے لگی، چنانچہ اگست ۱۳۶۹ء میں اس نے رومہ کا سفر کیا اور پوپ کی خدمت میں حاضر ہو کر یورپ کی مسیحی حکومتوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارنے کی درخواست پیش کی، اس نے پوپ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی ذلت گوارا کی، یونانی کلیسا کے ان تمام عقائد سے بتری ظاہر کی جو کلیسائے رومہ سے مختلف تھی اور مذہبی معاملات میں کلیسائے رومہ کی برتری بھی تسلیم کر لی، مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کا مقصد حاصل نہ ہوا اور مسیحی حکومتیں ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کے لیے آمادہ نہ ہوئیں، شہنشاہ ناکام و نامراد قسطنطنیہ کو واپس ہوا اور واپسی میں جب وہ وینس سے گزر رہا تھا تو وہاں کے بعض ساہوکاروں نے جن سے رومہ کے سفر کے لیے اس نے روپیہ قرض لیا تھا، اسے گرفتار کر لیا، اس کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ قرض ادا کر سکے، اس کا بڑا لڑکا اینڈرونیکس جسے وہ قسطنطنیہ میں اپنا جانشین بنا گیا تھا، حکومت کی لذت سے آشنا ہو کر باپ کی رہائی کا خواہش مند نہ تھا، اس لیے اس نے بھی قرض ادا کرنے کی

کوشش نہ کی لیکن چھوٹے لڑکے مینوئل نے اپنی املاک فروخت کر کے قرض کی رقم فراہم کی اور شہنشاہ کو آزاد کرایا، قسطنطنیہ پہنچنے کے بعد شہنشاہ نے اینڈرونیکس کو حکومت کے تمام منصبوں سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ مینوئل کو مقرر کر کے اسے اپنے ساتھ تاج و تخت کا شریک بھی قرار دیا۔

صادوجی کی بغاوت | اینڈرونیکس کا لڑکا جس کا نام بھی اینڈرونیکس تھا، اپنے باپ کی اس حق تلفی پر سخت برا فروختہ ہوا اور اس نے مراد کے سب سے چھوٹے لڑکے شہزادہ صادوجی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ دونوں مل کر شہنشاہ اور مراد کو تخت سے اتار دیں اور ان کی جگہ خود فرماں روا بن جائیں، مراد اس وقت ایشیائے کوچک میں تھا اور صادوجی اس وقت یورپ میں ترکی سپاہ کا افسر اعلیٰ تھا، اس نے مراد کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر فوراً بغاوت کا اعلان کر دیا، ادھر اینڈرونیکس نے بھی نوعمر باز نسطی امراء کی ایک جماعت اپنے ساتھ لے کر شہنشاہ کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کی، ان شہزادوں کی متحدہ بغاوت نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی، مراد اس خبر کو سنتے ہی یورپ پہنچا، شہنشاہ اینڈرونیکس کے جرم سے اپنی برأت پیش کی اور اس فتنہ کو فرو کرنے کے لیے پوری آمادگی ظاہر کی، اس نے مراد کی یہ تجویز بھی منظور کر لی کہ گرفتاری کے بعد دونوں شہزادے اپنی بینائی سے محروم کر دیے جائیں، صادوجی کی فوج نے اپنے سلطان کی زبان سے معافی کا وعدہ سن کر باغی شہزادہ کا ساتھ چھوڑ دیا، صادوجی، اینڈرونیکس اور نوجوان باز نسطی امراء گرفتار کر کے مراد کے سامنے لائے گئے، مراد نے پہلے صادوجی کی آنکھوں میں گرم سیسہ پلا کر اسے اندھا کر دیا اور پھر اسے قتل بھی کر دیا، باز نسطی امراء دریائے مارٹیرا میں غرق کر دیے گئے، اینڈرونیکس شہنشاہ کے پاس بھیج دیا گیا، اس نے حسب وعدہ ان کی آنکھوں میں بھی سیسہ ڈلوادیا لیکن اس طرح کی خفیف سی بینائی باقی رہ گئی۔

ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کو ایک جدید معاہدہ کرنا پڑا، جس کی رو

سے اس نے دولت عثمانیہ کی باج گزاری از سر نو تسلیم کی، عثمانی لشکر میں فوجی خدمت انجام دینے کا وعدہ کیا اور ضمانت کے طور پر اپنے لڑکے میںٹول کو مراد کی خدمت میں بھیج دیا۔

فتوحات بلغاریا، مقدونیا و سرویا | اگرچہ بلغاریا نے جنگ مارٹیزا میں شرکت نہیں کی تھی تاہم تھریس کی فتح اور عیسائیوں کی شکست نے اس کو بھی نہایت اہم خطرات میں مبتلا کر دیا، خصوصاً اورنہ اور فلپو پولس پر قبضہ ہو جانے کے بعد بلغاریا اور مقدونیا کی راہ ترکوں کے لیے کھل گئی، رہا ستہائے بلقان کے باہمی بغض و عناد نے ان کی قوتوں کو کم زور کر دیا تھا، اس لیے مراد کو شروع میں ان کی متحدہ طاقت سے مقابلہ پیش نہیں آیا، ۱۷۸۷ء (۱۲۶۶ھ) اور ۱۷۹۹ء (۱۲۶۹ھ) کے درمیان وہ بلغاریا میں بڑھتا چلا گیا اور کوہ روڈوپ تک وادی مارٹیزا پر قابض ہو گیا، سرویا اب تک بلغاریا کا شریک نہ تھا لیکن مراد کی ان فتوحات کے بعد اس نے بلغاریا سے مل کر ترکوں کا سدباب کرنا چاہا، ۱۷۷۳ء (۱۲۵۳ھ) میں لالہ شاہین نے صوفیا کے قریب سماکوف کے میدان میں بلغاری اور سروی افواج کا مقابلہ کیا اور ان کو سخت شکست دی، اس جنگ کے بعد کوہ بلقان تک بلغاریا کا سارا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، دوسرے سال لالہ شاہین اور عثمانی فوج کے دوسرے مشہور جنرل افروینوس نے مقدونیا پر حملہ کیا جو اسٹیفن ڈوشن کے زمانہ سے سرویا کا ایک صوبہ تھا اور کوالا ڈروما اور سریز کے شہروں کو فتح کرتے ہوئے دریائے دروار کو عبور کر کے قدیم سرویا، البانیا اور بوسینا میں داخل ہوئے، لازار شاہ سرویا نے شکست کے بعد مراد کی اطاعت قبول کر لی، بلغاریا کے بادشاہ سیمان نے بھی اپنی لڑکی حرم سلطانی میں پیش کر کے صلح کی درخواست کی، چنانچہ بلغاریا کا وہ حصہ جو کوہ بلقان کے شمال میں واقع تھا اور اس وقت تک سلطنت عثمانیہ میں شامل نہیں کیا گیا تھا، اس کی حکومت میں رہنے دیا، اس کے بعد ۱۷۸۳ء (۱۲۸۱ھ) تک مراد اپنے ایشیائی مقبوضات کی توسیع و استحکام میں مصروف رہا، ۱۷۸۳ء میں اس نے پھر سرویا کا رخ کیا اور عثمانی فوج نے دریائے دروار کو عبور کر کے مونا ستر پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد ۱۷۸۷ء

(۱۳۸۵ء) میں صوفیا فتح ہوا، ہیسمان کو اپنی ملکہ اور خاندان کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر مراد سے رحم کی درخواست کرنی پڑی، مراد نے سالانہ خراج قبول کر کے اسے بلغاریا کے تخت پر قابض رہنے کی اجازت دے دی، ۷۸۷ھ (۱۳۸۶ء) میں پچیس روز کے شدید محاصرہ اور سخت جنگ کے بعد نیش پر بھی جو سردیا کے قلب میں ایک نہایت مضبوط قلعہ تھا، نیز قسطنطین اعظم کے مولد ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا تھا، مراد کا قبضہ ہو گیا، سردیا کو اب مقاومت کا یارا نہ رہا، اس نے ہزار پونڈ نقرئی سالانہ خراج اور عثمانی لشکر کے لیے ہزار سوار دینے کا وعدہ کر کے صلح کر لی۔

امن و اصلاحات کا زمانہ | ۷۸۷ھ (۱۳۷۶ء) سے ۷۸۳ھ (۱۳۸۱ء) تک کا زمانہ مراد کے دور حکومت میں امن کا زمانہ تھا، اس مدت میں اس نے کوئی جنگ نہیں چھیڑی اور اپنی توجہ زیادہ تر سلطنت کے انتظام و استحکام کی جانب مبذول رکھی، اس نے فوجی نظام میں اصلاحات جاری کیں اور جاگیری نظام کو مکمل کیا، مفتوحہ علاقوں میں جاگیریں قائم کر کے سپاہیوں کو دیں اور ہر جاگیردار کو جنگ کے موقعوں پر ایک یا ایک سے زیادہ مسلح سوار فراہم کرنے کا ذمہ دار بنایا، یہ فوجی جاگیریں چھوٹی اور بڑی دو قسموں کی تھیں، چھوٹی کو تیمار اور بڑی کو زعامت کہتے تھے، اس نے شاہی زمینیں الگ کیں اور مسجدوں نیز دوسرے مذہبی اداروں کے لیے بہت سی زمینیں وقف کر دیں، مراد نے عیسائی رعایا کی ایک جماعت بھی ادنیٰ فوجی خدمات کے لیے مرتب کی، اصطلیل وغیرہ کی صفائی، خیموں کو نصب کرنا اور اکھاڑنا، سامان کی گاڑیوں کی دیکھ بھال اور اسی قسم کے دوسرے کام ان لوگوں کے فرائض میں داخل تھے، مراد ہی کے عہد میں سپاہیوں کے علم کے لیے سرخ رنگ تجویز ہوا، جو عثمانی فوجوں کا قومی رنگ ہو گیا۔

۱۔ بلقان از ولیم ٹرسلے "اسٹوری آف دی پینینس" ص ۱۸۸ ۲۔ ان کے متعلق تفصیلات آئندہ آئیں گی۔

انا طولیہ میں سلطنت کی توسیع | لیکن امن کے زمانہ میں مراد توسیع سلطنت کی تدبیروں سے غافل نہ تھا، ۸۷۷ء (۱۳۷۶ء) میں اس نے شہزادہ بایزید کا نکاح امیر کرمان کی لڑکی سے کر دیا، عروس کو ریاست کرمان کا بڑا حصہ اور قلعہ کوتاہیہ جو اپنے مقام کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا تھا، جہیز میں ملا اور یہ علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، شادی کی تقریب بروصہ میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی، انا طولیہ کی تمام ترکی ریاستوں کے نمائندے اور سلطان مصر کے سفیر شریک ہوئے، یہ لوگ اپنے ساتھ عرب کے صبار فقار گھوڑے، یونان کی حسین کنیریں اور اسکندریہ کے حیرت انگیز ریشمی کپڑے نذر کے طور پر لائے تھے، من جملہ اور تحائف کے سونے اور چاندی کے ظروف بھی تھے، جن میں طلائی اور نقرئی سکے بھرے ہوئے تھے، نیز پیالے اور پشت تھے جن میں جواہرات جڑے ہوئے تھے، یہ تمام چیزیں مراد نے اپنے مہمانوں میں تقسیم کر دیں لیکن جب عروس نے کرمان کے قلعوں کی کنجیاں پیش کیں تو انہیں اپنے ہی پاس رکھا، ۹۷۷ء (۱۳۷۶ء) میں مراد نے ریاست حمید کے امیر کو آمادہ کیا کہ اپنی ریاست کا ایک بڑا حصہ اس کے ہاتھ فروخت کر ڈالے، جس میں آق شہر کا ضلع بھی شامل تھا، ریاست حمید کا یہ علاقہ شامل کر لینے سے سلطنت عثمانیہ کی سرحد ریاست کرمانیہ سے بالکل متصل ہو گئی، کرمانیہ اور آل عثمان کی آویزش ابتدا سے چلی آتی تھی، اسے دور کرنے کے خیال سے مراد نے اپنی لڑکی نفیسہ کا عقد علاء الدین امیر کرمانیہ سے کر دیا، چنانچہ تقریباً دس سال یہ صلح قائم رہی لیکن ان میں سے ہر فریق انا طولیہ کے ترکوں کی سرداری کا دعوے دار تھا اور باوجود اس کے کہ ایشیائے کوچک کی متعدد ترکی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکی تھیں، امیر کرمانیہ کی خود سری اور شورش انگیزی مراد کو اس کے ایشیائی مقبوضات کی طرف سے مطمئن نہیں ہونے دیتی تھی، چنانچہ ۹۷۷ء (۱۳۷۶ء) میں دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور قونیہ میں علاء الدین کو بری طرح شکست ہوئی، مراد اگر

چاہتا تو علاء الدین کو قتل کر کے اس کی ریاست پر قابض ہو جاتا لیکن نصیحت کی التجاؤں سے متاثر ہو کر اس نے علاء الدین کا قصور معاف کر دیا اور اس کی ریاست اسے پھر بخش دی، علاء الدین نے مراد کو اپنا آقا تسلیم کیا، اسی جنگ میں شہزادہ بایزید نے اپنے حملوں کی حیرت انگیز سرعت اور شدت کی بنا پر یلدروم (بجلی) کا لقب حاصل کیا تھا، اس کے بعد مراد بروصہ کو واپس گیا اور اب اس کی خواہش تھی کہ بقیہ عمر آرام اور یادِ الہی میں گزار دے، چنانچہ اسی وجہ سے اس نے ریاست تکہ پر حملہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرنے سے انکار کر دیا اور جس فوجی افسر نے یہ تجویز پیش کی تھی اسے یہ جواب دیا کہ ”امیر تکہ بہت غریب اور کم زور ہے، مجھے اس سے جنگ کرنے میں شرم آنی چاہیے، شیر مکھیوں کا شکار نہیں کرتا، لیکن بہت جلد اس بوڑھے شیر کو دوسرے شیروں کے مقابلہ کے لیے اپنی آرام گاہ سے نکلنا پڑا۔“

مسیحی حکومتوں کا اتحاد | یورپ میں اس وقت ۱۲۹۰ء (۱۳۸۸ء) تک تقریباً تمام قدیم تھریس اور جدید رومیلیا سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکا تھا، اس کے علاوہ بعض دوسری اہم فتوحات بھی حاصل ہو چکی تھیں، ان علاقوں میں ترک اور عرب نوآبادیاں قائم کر دی گئی تھیں اور وہاں کے اکثر باشندے دوسرے مقامات کو منتقل کر دیے گئے تھے، ان نوآبادیوں نے عیسائیوں میں ایک عام بے چینی پیدا کر دی، نئی چری کے لیے ہر سال ایک ہزار عیسائی لڑکوں کے مطالبہ سے اس بے چینی میں برہمی بھی شامل ہو گئی، ترکوں کے خلاف غصہ کا جذبہ پورے جوش کے ساتھ موجود تھا، اسے مشتعل کرنے کے لیے جس چنگاری کی ضرورت تھی وہ بھی جنگ تونیہ کے بعد ہاتھ آ گئی، اس جنگ میں عثمانی فوج کے ساتھ سرویا کے دو ہزار سپاہی بھی شریک تھے، جو سابق معاہدہ کی رو سے طلب کیے گئے تھے، کوچ سے پہلے ہی مراد نے فوج میں اعلان کر دیا تھا کہ کرمانیہ کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد بھی ریاست کے عام باشندوں کی جان و مال کو ہرگز کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے اور جو شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا وہ سخت سزا کا مستوجب ہوگا لیکن سروی سپاہیوں نے جو یورپ کے دستور کے

مطابق دشمن کے ملک میں پہنچ کر ہر قسم کی عارت گری کو بالکل جائز خیال کرتے تھے، اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور راستہ میں نہایت وحشیانہ طریقہ پر لوٹ مار شروع کر دی، مراد نے ان میں سے بہتوں کو سخت سزائیں دیں اور بعضوں کو قتل بھی کر دیا، اس کا یہ فعل فوجی قانون کی رو سے بالکل جائز تھا لیکن اہل سرویا کے لیے یہ سخت اشتعال کا باعث ہوا اور شاہ سرویا نے جس کی سلطنت اسٹیفن ڈوشن کے عہد میں بلغراد سے دریائے یارنزا تک اور بحر اسود سے بحر ایڈریا تک تک پھیلی ہوئی تھی، عیسائی حکومتوں کا ایک عظیم الشان اتحاد قائم کر کے ترکوں کے استیصال کا بیڑا اٹھایا، اس اتحاد میں سرویا، بوسنیا اور بلغاریا کی حکومتیں آگے ہوئیں، البانیا، ولاچیا اور ہنگری نے پوری قوت کے ساتھ شرکت کی، پولینڈ نے بھی اپنی فوج بھیجی، سلاوی قوموں کا اتنا زبردست اتحاد اس سے پہلے کبھی قائم نہیں ہوا تھا، سرویا نے مغربی یورپ کی حکومتوں کو بھی شرکت کی دعوت دی لیکن وہ مختلف وجوہ سے ادھر متوجہ نہ ہو سکیں، محاربات صلیبی کا قدیم جوش فرو ہو چکا تھا اور ہنوز ارض مقدس کو ترکوں سے آزاد کرانے کا سوال پیدا نہ ہوا تھا، علاوہ بریں چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپ کی مغربی سلطنتوں کی اندرونی حالت اور ان کے حکمرانوں کی ذاتی کم زوریاں اس اتحاد کی شرکت سے مانع تھیں لیکن اس وقت تمام یورپ کے متحد نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب لاطینی کلیسا کا وہ شدید افتراق تھا جس نے کل مغربی سلطنتوں کو دو متخاصم جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک جماعت پاپائے رومہ کے زیر فرمان تھی اور دوسری اس کے حریف پوپ کی حلقہ بگوش تھی، جس نے اونیاں (واقعہ فرانس) کو اپنے جدید کلیسا کا مرکز قرار دیا تھا۔

جنگ کسوا | بہر حال سرویا نے مشرقی حکومتوں کے اتحاد سے جو قوت فراہم کر لی تھی، وہ بہ ظاہر ترکوں کو یورپ سے نکال دینے کے لیے کافی تھی، مراد نے اس اجتماع کی خبر بروصہ میں سنی اور گواس کی عمر ستر سال کی ہو چکی تھی، تاہم عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے فوراً روانہ ہو گیا، اتحادیوں نے مراد کے پہنچنے سے پہلے ہی بوسنیا میں ایک عثمانی فوج پر حملہ کیا اور من جملہ بیس

ہزار ترک سپاہیوں کے پندرہ ہزار کو تہ تیغ کر ڈالا، اس کے بعد فوراً ہی علی پاشا مراد کے حکم کے مطابق درہ در بند کی راہ سے کوہ بلقان کو عبور کر کے بلغاریا میں داخل ہوا اور شوملہ اور ترانو پر قبضہ کر کے دریائے ڈینوب کی طرف بڑھا، سلیمان شاہ نے بلغاریا سے بھاگ کر نائیکو پولس میں پناہ لی لیکن بہت جلد اسے مراد سے معافی مانگ کر صلح کر لینے پڑی، شرائط صلح یہ تھے کہ سلسٹریا کا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا جائے گا اور بلغاریا سالانہ خراج ادا کرتا رہے گا، سیمان کی علاحدگی کے باوجود شاہ سرویا نے استقلال کے ساتھ جنگ جاری رکھی اور سلیمان بھی چند ہی دنوں میں معاہدہ کو توڑ کر پھر سرویا سے مل گیا، اس نے سلسٹریا سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا اور ایک فوج سرویا کی مدد کے لیے روانہ کی، مراد نے علی پاشا کو اس کے مقابلہ میں بھیجا، سیمان پھر نائیکو پولس میں پناہ گزین ہوا اور یہ اہم قلعہ دوبارہ فتح ہوا، مراد نے اس مرتبہ بھی سیمان کی جان بخشی کی لیکن اس کی بار بار کی غداری کی سزا میں بلغاریا کا جنوبی حصہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا، لازار شاہ سرویا نے اپنے دوسرے حلیفوں کے ساتھ برابر ترکوں کا مقابلہ کرتا رہا، بالآخر اس نے تمام اتحادی افواج کو جمع کر کے ایک فیصلہ کن معرکہ کا تہیہ کیا اور اپنے لشکر کی کثرت و قوت پر اعتماد کر کے مراد کے پاس آخری جنگ کا پیغام بھیجا، چنانچہ ۱۵ جون ۱۳۸۹ء (۹۱ھ) کو کسودا کے میدان میں وہ آخری مقابلہ پیش آیا جس نے اتحادیوں کا شیرازہ پراگندہ کر کے سرویا کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، جنگ اختتام کے قریب تھی کہ میلوش کوبیلوویچ (Miloshe Kobilovich) نامی ایک سروی امیر عثمانی لشکر کی طرف گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور وہاں شاہ لازار کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے اس نے یہ بیان کیا کہ مجھے کچھ نہایت اہم باتیں سلطان سے کہنی ہیں، چنانچہ وہ مراد کی خدمت میں لایا گیا لیکن قدم بوسی کے وقت اٹھ کر دفعۃً اس نے مراد پر خنجر سے حملہ کیا اور اپنے مقصد میں کام یاب ہو کر بھاگ جانے کی کوشش کی، سپاہیوں نے چشم زدن میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، مگر مراد کو زخم کاری پہنچ چکا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ تھوڑی دیر کا مہمان اور ہے، اسی

حالت میں اس نے آخری حملہ کا حکم دیا، جس نے جنگ کا فیصلہ کر دیا، وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات پورے کر رہا تھا کہ لازار گرفتار کر کے اس کے سامنے لایا گیا، اس نے اس کے قتل کا حکم دیا اور کچھ دیر بعد خود بھی جاں بحق تسلیم ہوا، میلوش کے واقعہ کے بعد سے یہ قاعدہ ہو گیا کہ جب کوئی اجنبی شخص سلطان کے حضور میں لایا جاتا تو دو آدمی اس کے بازو پکڑے رہتے تاکہ وہ فریب نہ کر سکے، انیسویں صدی سے اس قاعدہ کی پابندی جاتی رہی، تاہم گذشتہ صدی میں بھی غیر ملکوں کے سفیروں کو سلطان کے بہت قریب جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

جنگ کسوا کے بعد پانچ سو برس تک اہل سرویانے پھر کبھی متحد ہو کر ترکوں سے مقابلہ کرنے کی جرات نہیں کی، بہتیرے بھاگ کر جبل اسود (مونٹی نیگرو) میں پناہ گزیں ہوئے اور وہاں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے برابر جنگ کرتے رہے، بہت سے بوسنیا اور ہنگری میں جا کر آباد ہو گئے لیکن یہ حیثیت ایک خود مختار حکومت کے سرویا کا خاتمہ ہو گیا، اگرچہ اس کے بعد بھی ستر سال تک سرویا کی عنان حکومت ملکی فرماں رواؤں کے ہاتھ میں رہی تاہم اس کی حیثیت محض ایک باج گزار مملکت کی تھی۔

مراد کے کارنامے | مراد کا عہد حکومت تاریخ آل عثمان کے اہم ترین عہدوں میں ہے، اس نے تیس سال تک حکومت کی، ان میں سے چوبیس سال میدان جنگ میں صرف کیے اور ہر جنگ میں کامیاب رہا، مراد سے پہلے ترکوں کا مقابلہ پورپ کی قوموں میں سے صرف بازنطینیوں سے ہوا تھا، جن کی سلطنت اپنے زوال کے آخری منزلیں طے کر رہی تھی لیکن مراد کی ظفریاب فوجیں ان ملکوں میں بھی پھیل گئیں جو پورپ کی نہایت طاقت ور سلطانی قوموں کے زیر نگیں تھے اور بلغاریا، سرویا اور بوسنیا پر دولت عثمانیہ کا تسلط قائم ہو گیا، مراد ہی کے عہد میں اول بار آل عثمان اور اہل ہنگری کا مقابلہ پیش آیا، جس میں موخر الذکر کو سخت شکست اٹھانی پڑی، مراد کی فتوحات نے سلطنت عثمانیہ کے دائرہ اقتدار کو دریائے ڈینیوب تک پہنچا دیا اور گو

بعض ریاستوں مثلاً سرویا اور بوسنیا سے محض خراج قبول کرنے پر قناعت کی گئی، تاہم تھریس، مقدونیا اور جنوبی بلغاریا کی ریاستیں مکمل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئیں۔
مسٹر گینس لکھتے ہیں:

”تیس سال تک مراد نے عثمانیوں کی سیادت ایسے سیاسی تدبیر کے ساتھ کی کہ اس عہد کا کوئی مدبر اس پر فوقیت نہ حاصل کر سکا، محض اس لیے کہ مراد کی بہ نسبت محمد فاتح اور سلیمان اعظم سے متعلق ہماری معلومات بہت زیادہ ہیں، مراد کا صحیح مقام کہ وہ خاندان عثمانی کا سب سے زیادہ ممتاز و کامیاب ماہر سیاست اور محارب تھا، کبھی پہچانا نہ جا سکا، جب ہم ان دشواریوں کا جن کا اس نے مقابلہ کیا، ان مسائل کا جنہیں اس نے حل کیا اور اس کے عہد حکومت کے نتائج کا موازنہ اس کے زیادہ پر شکوہ جانشینوں کے کارناموں سے کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اگر وہ ان سے بڑھ کر نہیں تو ان کے برابر ضرور ہے، جو تغیر اس نے اپنی مدت حیات کے اندر کر دیا، وہ تاریخ کے نہایت حیرت انگیز واقعات میں سے ہے، اس کی فتوحات کو پانچ صدیوں تک قائم رہنا تھا، ۱۸۷۸ء کے معاہدہ برلن تک، ان میں سے بعض حال کی جنگ بلقان کے طوفان کے بعد بھی باقی رہ گئی ہیں۔“

مراد نے مسیحی علاقے فتح کر کے ان میں اسلامی حکومت قائم کی لیکن عیسائیوں کو بہ جبر اسلام میں داخل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، برخلاف اس کے اس نے انہیں پوری مذہبی آزادی دے رکھی تھی، جس کی واضح شہادت اس خط میں محفوظ ہے جو ۱۷۷۷ء (۱۳۸۵ھ) میں یونانی کلیسا کے بطریق اعظم نے پوپ اربن ششم کو لکھا تھا، بطریق مذکور نے اقرار کیا ہے کہ مراد نے کلیسا کو کامل آزادی بخش دی تھی، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۷۷۷ء (۱۳۶۰ھ) اور ۱۷۹۱ء (۱۳۸۹ھ) کے درمیان بطریق اعظم کے دفتر میں کوئی ایک شکایت بھی عثمانیوں کے ہاتھوں ارباب کلیسا کی بدسلوکی کی درج نہیں ملتی۔^۱

۱۔ ہربرٹ گینس، ص ۱۷۸ ج ۲ ایضاً۔

بایزید اول یلدرم

۷۹۱ھ تا ۸۰۵ھ مطابق ۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء

مراد کی شہادت کے بعد ہی جنگ کسوا کا بھی خاتمہ ہو گیا، شہزادہ بایزید جب اتحادیوں کو پوری طرح شکست دینے کے بعد اپنے لشکر میں واپس آیا تو فوج کے تمام سرداروں نے اس کا خیر مقدم وارث تاج و تخت کی حیثیت سے کیا لیکن تخت نشین ہونے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ یعقوب کو جس نے اس جنگ میں شجاعت اور فوجی قابلیت کے اعلیٰ جوہر دکھائے تھے، فوراً قتل کر دیا، باپ کی لاش ابھی سرد بھی نہیں ہوئی تھی کہ الفتنۃ اشد من القتل کی آڑ پکڑ کر یعقوب کے وجود کو سلطنت کے لیے فتنہ قرار دیا گیا اور صادو جی کی بغاوت نظیر میں پیش کی گئی، تخت سلطنت کی خاطر آل عثمان میں یہ پہلا قتل تھا، جس نے آئندہ کے لیے مثال قائم کر دی۔

سرویا سے صلح | اتحادیوں کی شکست کے بعد بھی سرویا نے کچھ دنوں تک جنگ جاری رکھی لیکن بالآخر اسے صلح کر لینی پڑی، بایزید نے سرویا کی خود مختاری قائم رکھی اور صرف اس کے باج گزار ہونے پر اکتفا کی، لازار کے جانشین شاہ اسٹیفن نے سالانہ خراج کے علاوہ پانچ ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ سلطان کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رکھنے کا معاہدہ کیا، نیز اپنی بہن شہزادی ڈیپینا کو بایزید کے نکاح میں دے دیا، اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ سلطان کی تمام لڑائیوں میں وہ اپنی فوج لے کر خود شریک ہوا کرے گا، چنانچہ آخر وقت تک وہ اس

معاهدہ پر قائم رہا اور نائیکو پولس اور انگورہ کی معرکہ الآرا جنگوں میں اسٹیفن بایزید کے دوش بہ دوش لڑتا رہا اور سروی افواج کی خدمات حد درجہ وسیع اور موثر ثابت ہوئیں۔

شہنشاہ سے جدید صلح نامہ | سرویا سے صلح کرنے کے بعد بایزید قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوا اور اینڈرونیکس کو تخت پر بٹھانے کی دھمکی دے کر شہنشاہ پیلو لوگس کو ایک جدید صلح نامہ پر مجبور کیا، جس نے بازنطینی سلطنت کی رہی سہی حیثیت بھی خاک میں ملا دی، جان اور اس کے لڑکے مینوئل نے جو تخت سلطنت میں اپنے باپ کا شریک تھا، معاہدہ کیا کہ تیس ہزار طلائی سکے بطور خراج ہر سال ادا کرتے رہیں گے اور بارہ ہزار کا ایک فوجی دستہ بایزید کی خدمت میں ہمیشہ حاضر رکھیں گے، ایشیائے کوچک میں بازنطینی سلطنت کے مقبوضات میں سے اب صرف ایک قلعہ فلاڈلفیا باقی رہ گیا تھا، اس صلح نامہ میں وہ بھی بایزید کے نام لکھ دیا گیا لیکن اس قلعہ کے یونانی افسر نے شہنشاہ کے حکم کے باوجود قلعہ خالی کرنے سے انکار کر دیا، بایزید نے شہنشاہ کو مجبور کیا کہ وہ خود اپنی فوج کے ذریعہ سے قلعہ خالی کرادے، چنانچہ دولت بازنطینیہ کے انتہائی زوال کا یہ عبرت ناک واقعہ بھی ظہور میں آیا کہ یونانی سپاہیوں نے فلاڈلفیا پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے بایزید کے حوالے کر دیا۔

اناطولیہ کی فتوحات | ایشیائے کوچک کی اکثر ترکی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکی تھیں، بایزید نے باقی ماندہ پر بھی قبضہ کر لینا چاہا اور سب سے پہلے ایدین کی طرف بڑھا، ایدین کو فتح کرنے کے بعد اس نے امنشا اور صادر خاں کا رخ کیا، ان ریاستوں کے امیروں نے بھاگ کر امیر قسطنطنیہ کے پاس پناہ لی اور امنشا اور صادر خاں سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئیں، ایدین، امنشا اور صادر خاں کی فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ عثمانی ترک بحر اخبین کے ساحل تک پہنچ گئے، یہیں سے عثمانی بحری طاقت کی ابتدا ہوئی ہے، گو بایزید کے عہد میں اس کو ترقی نہ ہو سکی، ساٹھ جہازوں کا پہلا عثمانی بیڑا ۹۲۱ھ (۱۳۹۰ء) میں روانہ ہو کر جزیرہ کیوس (Chios) پر حملہ آور ہوا،

اس کے بعد بایزید نے سمرنا پر حملہ کیا، یہ شہر یروشلم کے مبارزین سینٹ جان کا مقبوضہ تھا، بحرئ قوت کے ناکافی ہونے کی وجہ سے بایزید کوچھ ہفتوں کے بعد سمرنا کا محاصرہ اٹھا لینا پڑا، ریاست تکہ کے ایک حصہ پر مراد کے زمانہ میں قبضہ ہو چکا تھا، بایزید نے بقیہ علاقہ کو بھی اپنی حدود سلطنت میں لے لیا، اب صرف دوریا تیس کرمانیہ اور قسطنونی سلطنت عثمانیہ میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، بایزید نے کرمانیہ پر بھی حملہ کیا، حالانکہ کرمانیہ کے امیر علاء الدین سے اس کی بہن بیاہی ہوئی تھی اور پایہ تخت قونیا کا محاصرہ کر لیا، علاء الدین نے کرمانیہ کا ایک ٹکڑا جس میں آق شہر بھی شامل تھا، بایزید کی نذر کر کے صلح کر لی۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ | ان فتوحات کے بعد جن کا اکثر حصہ بغیر کسی جنگ کے ہاتھ آیا تھا، بایزید پھر دردنیا ل کو عبور کر کے اور نہ چلا گیا، اس درمیان میں جان پلو لوگس نے قسطنطنیہ کے تین گرجے مسمار کر دیے تھے اور وہ ان کے سامان سے نئے قلعے تعمیر کرنا چاہتا تھا، بایزید نے اس ارادہ سے شہنشاہ کو بہ جبر باز رکھا، چند ہی دنوں کے بعد جان کا انتقال ہو گیا، اس کا لڑکا مینوئل جو کچھ عرصہ سے بایزید کے دربار میں مامور تھا، شہنشاہ کے انتقال کی خبر سن کر چپکے سے بھاگ کر قسطنطنیہ پہنچا اور اپنے باپ کا جانشین ہوا، بایزید کو یہ بات ناگوار ہوئی اور اس نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا، سات مہینہ تک محاصرہ جاری رہا، پھر چوں کہ بایزید کو بلغاریا میں جھنڈ شاہ ہنگری کے جارحانہ اقدام کو روکنے کے لیے فوجیں درکار تھیں، اس لیے اس نے دس سال کے لیے صلح کر کے محاصرہ اٹھا لیا، شرائط صلح بہت سخت تھے، سالانہ خراج کی رقم تیس ہزار طلائی کراون مقرر ہوئی، مسلمانوں کے لیے قسطنطنیہ میں ایک شرعی عدالت قائم کی گئی، جس میں بایزید نے ایک ترکی قاضی مقرر کیا اور کلیسائے مشرق کے اس مرکز میں ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کی گئی، جس کے میناروں سے توحید اسلامی کا اعلان ہونے لگا، مسٹرگ نیس نے لکھا ہے کہ مینوئل نے شہر کے سات سو مکانات بھی مسلمانوں کو دے دیے اور غلطہ کا نصف

حصہ بایزید کے حوالہ کر دیا، جس میں اس نے چھ ہزار عثمانی فوج متعین کر دی، شہر کے باہر جو انگور کے باغ اور ترکاریوں کے کھیت تھے، ان کی پیداوار کا عشر بھی صلح نامہ کی رو سے عثمانی خزانہ کو دے دیا گیا، اسی وقت سے عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو استنبول کہنا شروع کیا۔

ولاچیا | اس کے بعد بایزید نے ولاچیا کا رخ کیا اور اسے دولت عثمانیہ کا باج گزار بنا کر بوسنیا اور ہنگری کی طرف بڑھا، ابتدا میں ترکوں کو بوسنیا اور ہنگری کی متحدہ افواج سے شکست ہوئی اور نائیکو پولس کا مضبوط قلعہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا لیکن جمنڈ کی یہ کامیابی بالکل عارضی تھی اور چند ہی دنوں کے بعد اسے شکست کھا کر بھاگنا پڑا، نائیکو پولس پر پھر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔

بلغاریا کی فتح | ۱۳۹۳ء میں بایزید نے اپنے سب سے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کو بلغاریا کی طرف روانہ کیا، بلغاریا کا جنوبی حصہ مراد ہی کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکا تھا، بایزید نے شمالی حصہ پر بھی قبضہ کر لینا چاہا، شاہ سلیمان نے جم کر مقابلہ کیا لیکن تین ہفتے کے محاصرہ کے بعد پایہ تخت ترنوا فتح ہو گیا اور پورے ملک پر ترکوں کا تسلط ہو گیا، اب شمالی بلغاریا بھی عثمانی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا، بلغاریا کا شاہی خاندان ختم ہو گیا، بلغاریا کا اسقف اعظم جلاوطن کر دیا گیا اور بلغاریا کلیسا قسطنطنیہ کے یونانی کلیسا کا ماتحت بنا دیا گیا اور اس کی یہ محکومی ٹھیک پانچ سو برس تک قائم رہی، بلغاریا کے جن باشندوں نے اسلام قبول کر لیا، ان کی زمینیں ان ہی کے قبضہ میں چھوڑ دی گئیں، باقی سارا علاقہ فوجی جاگیروں کی شکل میں ترکوں کو دے دیا گیا۔

ویدین اور سلسٹریا | نائیکو پولس پہلے ہی فتح ہو چکا تھا، بایزید نے ویدین اور سلسٹریا پر بھی قبضہ کر لیا، یہ تینوں قلعہ ہنگری کی سرحد پر واقع تھے، ان کی فتح کے بعد ترکوں کے ہنگری کے سرحدی علاقہ میں چھوٹے چھوٹے حملے شروع کر دیے، بایزید اب ہنگری پر حملہ کرنے

کی تیاری کر رہا تھا کہ دفعۃً اسے ایشیائے کوچک کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔

کرمانیہ | کرمانیہ اور آل عثمان کی عداوت بدستور چلی آتی تھی، مراد نے اپنی ایک لڑکی کا نکاح علاء الدین سے کر کے تعلقات کو خوش گوار بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اناطولیہ کے ترکوں کی سرداری اور آل سلجوق کی قائم مقامی کا حوصلہ امیر کرمانیہ کو چین نہیں لینے دیتا تھا، وہ ہر موقع پر دولت عثمانیہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا، مراد کے عہد میں بھی وہ ایک سے زائد بار اپنی دشمنی کا ثبوت دے چکا تھا اور اب بایزید کے مقابلہ میں بھی اس نے اپنی وہی قدیم روش قائم رکھی، چنانچہ بایزید جب ہنگری کی فتح کی تیاری کر رہا تھا، علاء الدین نے اناطولیہ کے عثمانی علاقوں پر حملہ کر دیا، انگورہ اور بروصہ کے درمیان سخت معرکہ ہوا، جس میں عثمانی فوج کو بری طرح شکست ہوئی اور تیمورتاش پاشا جو سالارِ عسکر اور ایشیائے کوچک میں بایزید کا نائب سلطنت تھا، علاء الدین کے ہاتھ میں گرفتار ہوا، یہ خبر سن کر بایزید سرعت کے ساتھ اناطولیہ پہنچا اور آق چاقی کے مقام پر کرمانی لشکر کو شکست دے کر علاء الدین اور اس کے دو لڑکوں محمد اور علی کو قید کر لیا، علاء الدین اور اس کے دونوں لڑکے تیمورتاش پاشا کی حراست میں رکھے گئے اور اس نے بایزید کی اجازت کے بغیر تینوں کو پھانسی دے دی، بایزید یہ معلوم کر کے بہت برہم اور رنجیدہ ہوا لیکن پھر اس مقولہ کو یاد کر کے خاموش ہو گیا کہ ”ایک امیر کی موت اتنی بری نہیں جتنا ایک صوبہ کا نقصان“ لارڈ ایورسلے نے اس ترکی مقولہ کو قرآن کریم کی ایک آیت قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس آیت کے بموجب بایزید نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ کرمانیہ کی پوری ریاست پر قبضہ کر کے اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا جائے، اسلام کی دشمنی میں اتنا سفید جھوٹ جو بیسویں صدی کے ایک انگریز مورخ کے قلم سے نکلا ہے، قرون وسطیٰ کے مسیحی مفتریوں کو بھی نہ سوجھا ہوگا، بہر حال کرمانیہ پر بایزید کا قبضہ ہو گیا اور ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کی قائم مقامی کے لیے اب آل عثمان کا کوئی حریف باقی نہ رہا۔

بقیہ ترکی ریاستیں | اس کے بعد ۹۶-۹۵ھ (۹۴-۱۳۹۳ء) میں بایزید نے سیواس، سمون اور ارماسیا میں اپنی فوجیں روانہ کیں اور ان علاقوں کو بھی فتح کر لیا، اب صرف ریاست قسطنطنیہ سلطنت عثمانیہ میں شامل ہونے سے رہ گئی تھی، دوسری مفتوحہ ریاستوں کے امراء قسطنطنیہ میں جا کر پناہ لیتے تھے، بایزید نے اسی امر کو بنائے مخالفت قرار دے کر قسطنطنیہ پر بھی حملہ کیا اور اناطولیہ کی اس آخری ترکی ریاست کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

سلطان بایزید | ان فتوحات کے بعد امیر کا لقب جسے اب تک عثمانی فرماں روا اختیار کرتے آئے تھے، بایزید کو اپنی عظمت و شان کے مقابلہ میں فروتر معلوم ہونے لگا، چنانچہ اس نے مصر کے عباسی خلیفہ کی اجازت سے سلطان کا لقب اختیار کر لیا، خلیفہ کو عملاً اگرچہ کوئی اقتدار حاصل نہ تھا، تاہم اسلامی دنیا میں اس کی مذہبی حکم رانی اب بھی تسلیم کی جاتی تھی اور بایزید جیسے بادشاہ کو بھی جو اپنی سطوت میں یورپ اور ایشیا کے بڑے سے بڑے فرماں رواؤں کا حریف تھا، سلطان کے لقب کو جائز قرار دینے کے لیے خلیفہ ہی کا فرمان حاصل کرنا پڑا۔

اس موقع پر لین پول عام مورخوں سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ آل عثمان میں بایزید پہلا شخص نہیں ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا، بلکہ برٹش میوزیم اور دوسرے مقامات پر عثمانیوں کے جو سکے محفوظ ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اورخان اور مراد اول بھی اپنے سکوں پر سلطان کا لقب کندہ کراتے تھے، عثمان کے نام کا کوئی سکہ موجود نہیں، (کیوں کہ اگرچہ سلطان علاء الدین سلجوقی نے اسے اپنا سکہ جاری کرنے کی بھی اجازت دے دی تھی، تاہم اس نے اس حق کو استعمال نہیں کیا) اور غالباً پہلا عثمانی سکہ اورخان کے عہد میں جاری ہوا، پس بایزید کے لیے سلطان کا لقب صرف اس بنا پر ایک نئی چیز ہو سکتا ہے کہ اس نے اس کے لیے خلیفہ اسلام کی اجازت بھی حاصل کر لی۔

دقغہ عیش | یورپ اور ایشیا، ان عظیم الشان فتوحات کے بعد بایزید نے کچھ دنوں آرام

کرنے کا قصد کیا اور ہمہ تن محل سرا کے عیش و نشاط میں محو ہو گیا، شہزادی ڈی سپینا کی ترغیب سے اس نے شراب بھی شروع کر دی تھی، جسے اس وقت تک کسی عثمانی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا، شراب کا سرور عیش کے دیگر لوازم کا بھی متقاضی ہوا اور پھر تو اس سلسلہ کی کوئی برائی ایسی نہ تھی جو باقی رہی ہو لیکن جام و سبویٰ کی یہ تمام سرمستیاں بایزید کے قوائے عمل کو مضحمل نہ کر سکیں اور جب اس نے سنا کہ یورپ نے ایک زبردست صلیبی اتحاد قائم کر کے سلطنت عثمانیہ کے استیصال کا بیڑا اٹھایا ہے، تو عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے کوئی خواب شیریں سے آسودہ ہو کر تازہ قوت کے ساتھ بیدار ہوتا ہے۔

صلیبی اتحاد | جنگ کسودا کے بعد سرویا کی تسخیر نے ہنگری کی آزادی کو تخت خطرہ میں ڈال دیا تھا، خصوصاً نائیکو پولس، ویدین اور سلسٹر یا کے فتح ہو جانے کے بعد ترکوں کے لیے ہنگری کا راستہ کھل گیا تھا، ان کے متواتر حملوں سے عاجز آ کر جمنڈ شاہ ہنگری نے یورپ کی عیسائی سلطنتوں سے مدد کی درخواست کی، چوں کہ ہنگری کلیسائے روم سے وابستہ تھا، اس لیے پوپ نے بھی اس کی سرپرستی کی اور ترکوں کے خلاف ایک صلیبی جنگ کی تبلیغ شروع کر دی، اب تک ترکوں کے خلاف عیسائیوں کا جو اتحاد قائم ہوا تھا، اس میں مغربی یورپ کی حکومتوں نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا، اس مرتبہ جمنڈ کی خاص کوشش یہ تھی کہ فرانس بھی اس کی مدد کے لیے اپنی فوجیں روانہ کرے، اتفاق سے اس زمانہ میں فرانس اور انگلستان کے درمیان جنگ موقوف تھی، جس کی وجہ سے فرانس کو اس اتحاد کی شرکت میں تامل نہ ہوا، فرانس اور برگنڈی کے پر جوش نوجوان بھی مشرقی یورپ کے میدانوں میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھانے کے لیے بے چین تھے، طے یہ پایا کہ ڈیوک آف برگنڈی کالز کا کونٹ ڈی نیورس (Count De Neuers) ایک فوج لے کر شاہ ہنگری کی مدد کے لیے روانہ ہو اور وہی فرانسیسی اور دوسرے سوار دستوں کا سالارِ عسکر مقرر کیا جائے، ان بہادروں کے پیش نظر صرف ہنگری

کی مدد نہ تھی، بلکہ منصوبے یہ تھے کہ ہنگری میں بایزید کی قوت کو توڑنے کے بعد قسطنطنیہ کی طرف بڑھیں اور پھر دردنیاں کو عبور کر کے شام میں داخل ہوں، ارض مقدسہ پر قبضہ کریں اور یروشلم اور درگاہ شریف کو مسلمانوں کے ہاتھ سے آزاد کرائیں، غرض شہرت اور نام وری کے شوق میں مبارزین جوق در جوق اکٹھا ہونے لگے، شاہی خاندان اور فرانسیسی امراء کے ممتاز اشخاص جو فن سپہ گری میں خاص شہرت رکھتے تھے، اس مقدس مہم میں شریک ہوئے، یہ منتخب فوج ۹۸ھ (مارچ ۱۳۹۶ء) میں فرانس سے روانہ ہوئی، راستہ میں جرمنی سے گزرتے ہوئے جرمنی کے شاہی خاندان کے بعض افراد مثلاً فریڈریک، کانٹ آف ہونزولرن (Count of Hohenzollern) اور روڈس کے مبارزین سینٹ جان کا افسر اعلیٰ بھی ایک مضبوط دستہ لے کر شامل ہو گیا، ان کے علاوہ جمنڈ نے بویریا اور اٹسٹریا کے سوار دستے بھی فراہم کر لیے تھے، مغربی یورپ کے مسیحی مجاہدوں کی مجموعی تعداد دس بارہ ہزار تھی اور وہ سب کے سب اپنی شجاعت کے نشہ میں اس قدر سرشار تھے کہ ان کا دعویٰ تھا کہ اگر آسمان بھی گرنے لگے تو وہ اپنے نیزوں کی نوک پر اس کو روک لیں گے، جمنڈ نے اپنی مملکت سے جس قدر فوج ممکن تھی، فراہم کی اور امیر ولاچیا کو بھی اس صلیبی اتحاد میں شریک ہونے پر آمادہ کیا، حالاں کہ تھوڑے ہی دنوں پہلے ولاچیا اور دولت عثمانیہ میں صلح ہو چکی تھی اور امیر ولاچیا سالانہ خراج ادا کرنے کا معاہدہ کر کے اپنی خود مختاری برقرار رکھ سکا تھا، مسیحی فوجوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ تھی۔

ابتدائی فتوحات | اتحادی فوجیں بودا واقع ہنگری میں اکٹھا اور وہاں سے کچھ ٹرانسلوینیا اور ولاچیا کی راہ سے اور کچھ سرویا کے راستہ سے عثمانی مقبوضات کی طرف روانہ ہوئیں، چونکہ سرویا کا بادشاہ بایزید کا حلیف تھا اور کامل وفاداری کے ساتھ اپنے معاہدہ پر قائم تھا، اس لیے ان مسیحی مجاہدوں نے سرویا کے باشندوں کے ساتھ بھی جو تمام تر عیسائی ہی تھے،

وحشیانہ قتل و غارت گری کا وہی سلوک کیا جو وہ ترکوں کے ساتھ کرتے، سب سے پہلے محمد نے ویدین پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے سسٹو دا اور ارسودا پر قبضہ کرتا ہوا نائیکو پولس کی طرف بڑھا، نائیکو پولس پہنچ کر فوراً اس کا محاصرہ کر لیا، نائیکو پولس کے کمانڈر یونغان بے نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور محاصرہ کی انتہائی شدت کے باوجود حیرت انگیز شجاعت کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا، اسے یقین تھا کہ بائیزید اس کی مدد کو ضرور پہنچے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بائیزید جو اس درمیان میں اپنی بہترین فوج کے ساتھ روانہ ہو چکا تھا، برقی سرعت کے ساتھ محاصرہ کے سولہویں دن نائیکو پولس پہنچ گیا۔

مسیحی لشکر میں قمار بازی اور سے خواری کا ایک ہنگامہ برپا تھا، اس نشہ کو ابتدائی فتح کے جرات نے اور بھی تیز کر دیا تھا، عیسائیوں خصوصاً فرانسیسیوں کو گمان بھی نہ تھا کہ بائیزید اس قدر جلد آ پہنچے گا، وہ علانیہ کہتے تھے کہ اسے ان کے مقابلہ میں آبنائے باسفورس کے عبور کرنے کی بھی جرات نہ ہوگی، وہ ترکی فوجوں کا ذکر حقارت کے ساتھ کرتے تھے اور انہیں اپنا حریف مقابل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کو اپنی کامیابی کا اس درجہ یقین تھا کہ انہوں نے یہ دریافت کرنے کی بھی مطلق فکر نہ کی کہ ترک آ تو نہیں رہے ہیں، ان مجاہدین صلیب کے ساتھ ان کی طوائفیں بھی آئی تھیں، جن کی عشوہ طرازیوں نے فوجی کیمپ کو نشاط محل بنا رکھا تھا۔

معرکہ نائیکو پولس | ۲۳ رزی قعدہ ۹۸ھ مطابق ۲۴ ستمبر ۱۳۹۶ء کو کانٹ ڈی نیورس اپنے فرانسیسی ساتھیوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا کہ دفعۃً اسے یہ اطلاع ملی کہ ترکی فوج قریب آگئی، سب کے سب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑائی کے لیے ہتھیار باندھنے لگے، وہ چاہتے تھے کہ بلاتاخیر ترکوں پر حملہ کر دیں، محمد عثمانیوں کے اصول جنگ سے واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ سب سے آگے بے قاعدہ اور غیر مرتب دستے ہوتے ہیں جو

دشمن کے پہلے حملے کا زور توڑنے کے لیے آگے رکھے جاتے ہیں، اصلی اور باقاعدہ فوج ان کے پیچھے ہوتی ہے، اسی بناء پر اس نے فرانسیسی فوج کو مشورہ دیا کہ ان بے قاعدہ سواروں پر حملہ کر کے اپنی قوت کو ضائع نہ کریں، بعض فرانسیسی کمانڈروں نے اس رائے سے اتفاق کیا لیکن دوسروں نے اس بدگمانی کی بنا پر کہ سمجھڑ پہلے خود حملہ کرنا چاہتا ہے، یہ گوارا نہیں کیا کہ فرانسیسی دستے ہنگری کی فوج سے پیچھے رہیں اور اس مشورہ کی مخالفت کی، فرانس کے نو عمر بہادروں نے بھی اس رائے کی پر جوش مخالفت کی اور اسی جوش میں ان ترک قیدیوں کو جوان کے قبضہ میں تھے اور جنہوں نے امن کے وعدے پر ہتھیار ڈالے تھے، قتل کر ڈالا۔

بایزید نے عیسائی لشکر سے تھوڑے فاصلہ پر اپنی خاص فوج کو روک کر پہلے بے قاعدہ فوج دشمن کے مقابلہ میں روانہ کی اور ان کی مدد کے لیے یینی چری اور سواروں کا ایک دستہ آگے بڑھایا، فرانس کے نو عمر نائٹ ترکوں کے اصول جنگ سے بالکل ناواقف تھے، وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ عثمانیوں کی اصلی فوج بے قاعدہ فوج کے پیچھے ہوتی ہے، سمجھڑ نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی، مگر انہوں نے اس کی ایک نہ سنی اور پوری قوت کے ساتھ ترکوں کے مقدمہ الجھش پر ٹوٹ پڑے، آسانی کے ساتھ اسے شکست دیتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور پھر یینی چری اور سواروں کی صفوں کو چیرتے ہوئے جنہیں بایزید نے پہلے روانہ کر دیا تھا، اسی جوش میں اتنی دور نکل گئے کہ باقی ماندہ اتحادی فوجوں سے ان کا تعلق تقریباً منقطع ہو گیا، دفعۃً انہیں بایزید کی چالیس ہزار بہترین فوج نظر آئی، جسے دیکھتے ہی ان کو اپنی شدید غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے فوراً واپس ہونے کی کوشش کی، مگر واپسی اب ان کے اختیار سے باہر تھی، آگے سلطان کی تازہ دم فوج تھی اور پیچھے سے وہ ترکی دستے جنہیں وہ منتشر کر چکے تھے، دوبارہ جمع ہو کر ان کی طرف بڑھ رہے تھے، یہ دیکھ کر کہ اب جان بچانا کسی طرح ممکن نہیں، وہ مایوسانہ طور پر نہایت بے جگری سے لڑے اور ان چھ ہزار بہادروں میں سے تقریباً سب کے سب مارے گئے، جو بچ رہے وہ قید کر لیے گئے، صرف چند ایسے تھے جو بھاگ کر عیسائی لشکر میں پہنچ سکے، اس کے بعد

بایزید بجمنڈ کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا، اسے دیکھتے ہی اتحادی فوجوں کے دونوں بازو فوراً بھاگ کھڑے ہوئے، البتہ قلب لشکر نے جو ہنگری، بویریا اور ایشائریا کے دستوں پر مشتمل تھا اور جس کی کمان خود بجمنڈ کے ہاتھ میں تھی، جم کر مقابلہ کیا لیکن یہ جنگ تین گھنٹہ سے زیادہ قائم نہ رہ سکی، اتحادیوں کو بری طرح شکست ہوئی، ان کے ہزاروں سپاہی کام آئے اور دس ہزار گرفتار کر لیے گئے، بجمنڈ چند سرداروں کے ساتھ بمشکل جان بچا کر بھاگا، اس جنگ میں اسٹیفن کی سروی فوج سے جو بایزید کی حمایت میں لڑ رہی تھی، عثمانی فوج کو بڑی مدد پہنچی۔

فتح کے بعد بایزید نے میدان جنگ کا معائنہ کیا، اس وقت اسے مقتول ترکوں کی تعداد کا اندازہ ہوا، نیز یہ معلوم کر کے کہ ابتدائے جنگ میں جن ترکوں نے مغلوب ہو کر جان بخشی کے وعدہ پر ہتھیار ڈال دیے تھے، انہیں بھی عیسائیوں نے نقص عہد کر کے قتل کر ڈالا، اس کا رنج و غصہ اور بھی زیادہ ہوا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ ان کے خون کا بدلہ عیسائی قیدیوں سے لے کر رہے گا، چنانچہ دوسرے روز صبح کو اس نے تمام عیسائی قیدیوں کو جن کی تعداد دس ہزار تھی، اپنے سامنے کھڑا کر کے ان کے قتل کا حکم دیا، قیدیوں میں کانٹ ڈی نیورس بھی تھا، بایزید نے اسے قتل سے مستثنیٰ کر دیا اور اسے اجازت دی کہ قیدیوں میں سے چوبیس عیسائی شرفاء کو منتخب کر لے اور ان سب کی بھی جان بخشی کر دی، اس کے بعد قتل شروع ہوا جو چار بجے شام تک جاری رہا، جب ہزاروں قتل ہو چکے تو امراء سلطنت کی درخواست پر بایزید نے جلادوں کو ہاتھ روکنے کا حکم دیا اور جو قیدی بچ رہے تھے ان میں سے ایک شخص سلطان کا حصہ علاحدہ کرنے کے بعد بقیہ ان مسلمان سپاہیوں کو تقسیم کر دیے، جنہوں نے ان کو جنگ میں گرفتار کیا تھا، کانٹ ڈی نیورس اور اس کے چوبیس ساتھی ایک سال تک زیر حراست رہے لیکن بایزید نے ان کی حیثیت کے مطابق انہیں عزت و احترام کے ساتھ رکھا، اور جب ان کا زرفدیہ فرانس سے آ گیا تو انہیں وطن جانے کی اجازت دے دی، رخصت کے وقت جب یہ لوگ بایزید کے لطف و عنایت اور حسن سلوک کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے اس

کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس نے جان کانٹ ڈی نیورس کو مخاطب کر کے یہ تقریر کی:

”جان! مجھے خوب معلوم ہے کہ تو اپنے ملک میں ایک بڑا سردار اور ایک طاقت ور رئیس کا لڑکا ہے، تو نوجوان ہے اور ابھی تیرے لیے امید کے بہت سے سال باقی ہیں، ممکن ہے کہ میدان جنگ میں تیری اس پہلی کوشش کی ناکامی پر لوگ تجھے قابل الزام ٹھہرائیں اور تو اس اتہام کو فرج کرنے اور اپنی شہرت و نیک نامی کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے ایک طاقت ور فوج اکٹھا کر کے میرے مقابلہ میں جنگ کے لیے آئے، اگر میں تجھ سے ڈرتا تو تجھ سے اور تیرے ساتھیوں سے تیرے ایمان اور عزت پر حلف لے لیتا کہ نہ تو اور نہ وہ کبھی میرے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائیں گے لیکن نہیں، میں ایسی حلف کا مطالبہ نہ کروں گا، برخلاف اس کے میں خوش ہوں گا، اگر تو اپنے ملک میں واپس پہنچ کر ایک فوج جمع کرے اور اسے لے کر یہاں آئے، تو مجھے ہمیشہ میدان جنگ میں اپنے مقابلہ کے لیے تیار پائے گا، جو بات میں اس وقت کہہ رہا ہوں، اسے تو جس شخص سے بھی چاہے نقل کر دینا کیوں کہ میں ہمیشہ جنگی کارناموں نیز اپنی فتوحات کی توسیع کے لیے تیار اور خواہش مند رہتا ہوں۔“

کانٹ ڈی نیورس اور اس کے ساتھیوں میں سے صرف ایک نائٹ مارشل بوسیلکا (Boucical) نے بائزید کی یہ دعوت قبول کی، وہ ۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء) میں چند جہاز اور بارہ سونائٹ اور پیدل فوج لے کر قسطنطنیہ پہنچا اور شہنشاہ کو شہر کی مدافعت میں مدد دی، اس کے علاوہ کسی اور کو بائزید کے مقابلہ میں آنے کی پھر کبھی ہمت نہ ہوئی۔

مزید فتوحات | جنگ نائیکوپولس کے بعد عثمانی فوجوں نے دلاچیا، اشاریا اور ہنگری پر حملے شروع کیے اور پیٹر وارڈین کے شہر پر قبضہ کر لیا، ایک ترکی دستہ نے سرمایہ پر یورش کی اور ساحل ڈینوب کے جو قلعے عیسائیوں نے لے لیے تھے ان کو دوبارہ حاصل کیا، بائزید خود بودا پر چڑھائی کی تیاری کر رہا تھا لیکن دفعۃً بیمار پڑ گیا اور ہنگری کی یہ مہم ملتوی کر دی گئی۔

یونان کی فتح | اس کے بعد بایزید اور نہ کو واپس ہو اور وہاں پہنچ کر مینوکل، شہنشاہ قسطنطنیہ کو مجبور کیا کہ جان کے حق میں تخت سے دست بردار ہو جائے، ۸۰۰ھ (۱۳۹۶ء) میں وہ دفعہ یونان پر حملہ آور ہوا اور آسانی کے ساتھ تھسلی، فوسیس، ڈوریس اور لوکریس پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد اس کے دو جزلوں یعقوب اور افرینیوس نے خاکنائے کو رنٹھ کو طے کر کے جنوب کا رخ کیا اور تمام موریا کو فتح کر لیا، موریا کے تیس ہزار یونانی باشندے بایزید کے حکم سے ایشیائے کوچک میں منتقل کر دیے گئے اور ان کی جگہ ترکوں کی نوآبادیاں قائم کر دی گئیں، موریا پر تھوڈور پلویو لوگس شہنشاہ قسطنطنیہ کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا، اس نے بایزید کی سیادت قبول کر لی اور دولت عثمانیہ کا باج گزار بن گیا۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ | یونان کی فتح کے بعد بایزید پھر اور نہ لوٹ آیا اور اب اس نے قسطنطنیہ پر فوراً قبضہ کرنے کا تہیہ کر لیا، اس سے قبل بھی وہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کر چکا تھا اور شہنشاہ کو اپنا پایہ تخت محفوظ رکھنے کے لیے بہت سخت شرائط پر دس سال کے لیے صلح کر لینی پڑی تھی لیکن اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے ہی یونان کی فتح سے فارغ ہو کر بایزید پھر قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے ایک خاص ایچی کی ذریعہ سے شہنشاہ کے پاس یہ پیام بھیجا کہ وہ تاج و تخت سے دست بردار ہو جائے ورنہ شہر بہ زور شمشیر فتح کر لیا جائے گا اور اس وقت وہاں کے باشندے رحم و کرم کے مستحق نہ سمجھے جائیں گے، اس نے یہ بھی کہلایا کہ قسطنطنیہ کے معاوضہ میں شہنشاہ اپنے لیے کوئی دوسری حکومت پسند کر لے جو اسے دے دی جائے گی، قسطنطنیہ کے باشندے بایزید کی قوت سے واقف ہونے کی وجہ سے چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو جنگ کی نوبت نہ آنے دیں لیکن جان کو امید تھی کہ عیسائی حکومتیں قسطنطنیہ کی مخالفت میں اس کی مدد سے دریغ نہ کریں گی، اس لیے اس نے ایچی کو یہ جواب دے کر رخصت کر دیا ”اپنے آقا سے کہہ دو کہ باوجود اس کے کہ ہم ضعیف و ناتواں ہیں، ہم خدا کے سوا کسی دوسری طاقت سے نہیں ڈرتے، وہی کم زور کی حفاظت کرتا ہے اور طاقت ور کا

غور توڑتا ہے، سلطان کو اختیار ہے، جو چاہے کرے، اس جواب کے بعد بائزید نے فوراً قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا، اسی محاصرہ کے دوران میں مارشل بوسیلکا شہنشاہ کی مدد کے لیے فرانس سے آیا تھا۔

حالات کا انقلاب | لیکن عین اس وقت جب بائزید قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا، اس کے ایشیائی مقبوضات میں نہایت انقلاب انگیز حالات رونما ہو رہے تھے، جن سے مجبور ہو کر اسے محاصرہ اٹھالینا پڑا، اب تک بارہ سال کی مدت حکومت میں جو مسلسل جنگوں پر مشتمل تھی، بائزید کو ہمیشہ کامیابی ہوتی گئی، اس نے ایشیائے کوچک کے بڑے حصہ مقدونیا، شمالی بلغاریا اور تھسالی کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا اور سلطنت بازنطینی سرویا، ولاچیا، بوسنیا اور یونان کے بیش تر حصہ کو دولت عثمانیہ کا باج گزار بنا لیا تھا، نائیکوپولس کے میدان میں اس نے یورپ کی متحدہ اور بہترین فوجوں کو نہایت سخت شکست دے کر صلیبی اتحاد کی قوت کو پاش پاش کر ڈالا تھا، اس وقت تک کسی جنگ میں اسے ناکامی نہیں ہوئی تھی لیکن آئندہ دو سالوں میں جو اس کی حکومت کے آخری سال تھے، اسے اتنی زبردست شکست اٹھانی پڑی کہ اس کی تمام فتوحات پر پانی پھر گیا اور کچھ دنوں کے لیے سلطنت عثمانیہ کی عظمت خاک میں مل گئی، خود بائزید کا خاتمہ بھی قید کی حالت اور بے کسی کے عالم میں ہوا، اس تباہی اور بربادی کا سبب وہ آویزش ہوئی جو بائزید اور تیمور کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔

تیمور | تیمور کی سلطنت دیوار چین سے لے کر ایشیائے کوچک کی سرحد تک اور بحر ارجل سے دریائے گنگا اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی، اس کی زندگی کے ابتدائی سال اپنے ہم سایہ تاتاری امراء سے جنگ کرنے میں گزرے، پینتیس سال کی عمر میں اس نے سب کو زیر کر کے سمرقند کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اس کے بعد فتوحات کا وہ سلسلہ شروع کیا جس کی وسعت کے سامنے سکندر، سیزر، اٹیلا، چنگیز خاں، شارلیمن اور نیپولین کی سلطنتیں حقیر معلوم ہوتی تھیں، اس نے پینتیس سال سے کم مدت میں ستائیس مملکتیں فتح کر لی تھیں اور نو شاہی

خاندانوں کو فنانا کر دیا تھا، اس کی یہ حیرت انگیز جہاں گیری صرف ذاتی شجاعت اور اعلیٰ فوجی قابلیت کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ اس کے تدبیر اور ملکہ حکم رانی کو بھی اس میں بہت کچھ دخل تھا، اس کا مجموعہ قوانین جسے اس نے فوج، عدالت اور مالیہ کے انتظام کے لیے مرتب کر لیا تھا، اس کے تدبیر اور صحیح غور و فکر کا ثبوت پیش کرتا ہے، اس کے جاسوس مختلف بھیسوں میں خصوصاً زائرین اور درویشوں کے لباس میں ہر طرف گھومتے رہتے تھے اور ان کی مکمل رپورٹیں احتیاط کے ساتھ دفتر میں درج کی جاتی تھیں، اس طرح تیمور کو اپنے دشمنوں کی قوت اور کم زوری کی صحیح اطلاع بہم پہنچتی رہتی تھی، اسے اپنے سپاہیوں پر اس قدر اقتدار حاصل تھا کہ وہ اس کے حکم پر نہ صرف بڑی سے بڑی سختی برداشت کرنے اور اپنی جانیں نثار کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے بلکہ عین فتح کے موقع پر اگر وہ حکم دیتا تو لوٹ مار سے بھی ہاتھ کھینچ لیتے اور مال غنیمت سے دست بردار ہو جانے میں مطلق پس و پیش نہ کرتے، اپنے ماتحتوں کے ساتھ اس کا سلوک شریفانہ اور فیاضانہ تھا لیکن جو لوگ اس کی مخالفت کرتے انہیں سخت سزائیں دیتا، جیسا کہ کرلیسی نے لکھا ہے:

”تیمور نے دہشت انگیزی کو بھی فتح کا ایک خاص ذریعہ بنا رکھا تھا اور جو سزائیں

وہ پوری پوری آبادیوں کو دیتا ان سے اکثر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی فوری اشتعال کا نتیجہ نہ

تھیں، بلکہ پہلے سے سمجھ بوجھ کر طے کر لی گئی تھیں۔“

جنگ نائیکو پولس کے بعد بائزید کے بعض فوجی افسروں نے ایشیائے کوچک کے

مشرق میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تھا، جس کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ کی سرحد جار جیا تک

پہنچ گئی تھی، ادھر تیمور کی حکومت اس سے پہلے ہی جار جیا اور بحر کا سپین کے دوسرے مغربی

ممالک میں قائم ہو چکی تھی، دونوں سلطنتوں کے ہم سرحد ہو جانے کی وجہ سے ان کے

درمیان جلد یا بہ دیر تصادم کا واقع ہونا ناگزیر تھا، تیمور کی سلطنت کے بعد بائزید ہی کی

سلطنت اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت تھی، بائزید اپنی سابق فتوحات

کے نشہ میں اتنا سرشار تھا کہ اس نے تیمور کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کیا اور ایک ایسے فاتح کو برا بیچنے کر دیا جس کے نام کی دہشت سے بڑے بڑے بادشاہوں کے تحت متزلزل ہو جاتے تھے، سرحدی جھگڑوں کے علاوہ آویزش کے اور بھی اسباب تھے، مثلاً ایک دوسرے کے باج گزار رییسوں کو حملہ کی دھمکی دینا اور ایک دوسرے کے باغیوں کو پناہ دینا، باغیوں سے مراد وہ امراء تھے جن کی ریاستوں پر بایزید نے قبضہ کر لیا تھا اور وہ بھاگ کر تیمور کے پاس پناہ گزیں ہوئے تھے، اسی طرح وہ امراء بھی باغی سمجھے جاتے تھے جن کی ریاستیں تیمور نے فتح کر لی تھیں اور جنہیں بایزید نے اپنے دربار میں پناہ دی تھی، یہ لوگ اپنی ریاستوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے تیمور اور بایزید کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارتے رہتے تھے، اسی سلسلہ میں دونوں کے درمیان نہایت تلخ خط و کتابت شروع ہوئی اور بالآخر نوبت جنگ کی آگئی۔

سیواس | ۸۰۳ھ (۱۴۰۰ء) میں تیمور نے آرمینیا کی طرف سے عثمانی سرحد میں داخل ہو کر سیواس کا محاصرہ کر لیا جو چند سال پہلے بایزید کے قبضہ میں آیا تھا، اس شہر کی دیواریں نہایت مضبوط تھیں اور ترکی دستہ نے بایزید کے سب سے بڑے لڑکے ارطغرل کی سرکردگی میں اس کی محافظت بھی ایسی جاں بازی کے ساتھ کی کہ تیمور کی سات آٹھ لاکھ فوج شروع میں کام یاب نہ ہو سکی لیکن آخر میں تیمور نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جس کا جواب محصورین کے پاس نہ تھا، اس نے چھ ہزار مزدور لگا کر دیواروں کی بنیادیں کھدوانا شروع کر دیں اور اس درمیان میں شہتیروں کی تھوئی لگا کر دیواروں کو گرنے سے روک رکھا، جب کھدائی کا کام پورا ہو گیا اور بنیادوں کے اندر بڑی بڑی سرنگیں تیار ہو گئیں تو شہتیروں میں آگ لگوا دی اور تمام دیواریں دیکھتے دیکھتے ان ہی سرنگوں میں بیٹھ گئیں، حملہ آوروں کے لیے اب کوئی روک نہ تھی اور شہر پر فوراً قبضہ ہو گیا، تیمور نے سیواس کے اس محافظ دستہ سے دل کھول کر انتقام لیا، ان میں سے چار ہزار آرمینیوں کو اس نے زندہ دفن کر دیا اور ارطغرل اور بقیہ ترک سپاہیوں کو قتل کر دیا۔

بایزید اس وقت قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، سیواس کے مفتوح ہونے اور ارطغرل کے قتل کی خبر سن کر وہ فوراً وہاں سے روانہ ہوا اور تیمور کے مقابلہ کے لیے ایشیائے کوچک پہنچا لیکن تیمور اس درمیان میں شام اور مصر کی طرف روانہ ہو چکا تھا، دو سال کے بعد وہ پھر لوٹا اور سیواس پہنچنے کے بعد بایزید اور اس کے درمیان خط و کتابت دوبارہ شروع ہوئی جو پہلے سے بھی زیادہ تند اور تیز تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ فریقین نے ایک فیصلہ کن جنگ کا عزم کر لیا۔

جنگ انگورہ | بایزید ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ تیمور کے مقابلہ کے لیے سیواس کی طرف بڑھا لیکن تیمور کی کثیر فوج کے لیے جس کی تعداد سات آٹھ لاکھ کے درمیان بتائی جاتی ہے، سیواس کا میدان تنگ تھا، اس لیے وہ بایزید کے پہنچنے سے پہلے ہی انگورہ کی طرف روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچ کر فوراً انگورہ کا محاصرہ کر لیا، اسے یقین تھا کہ بایزید انگورہ کو بچانے کی ضرور کوشش کرے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور محاصرہ کی اطلاع پا کر بایزید نے بجائے سیواس جانے کے فی الفور انگورہ کی طرف کوچ کر دیا، وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ تیمور شہر کے شمال مغرب کی جانب جو فوجی نقطہ نظر سے میدان کا بہترین حصہ ہے، اس کا انتظار کر رہا ہے، تیمور نے صرف یہی نہیں کیا کہ میدان کے اس حصہ پر قبضہ کر لیا بلکہ اس نے بایزید کے مقابلہ کے لیے اور تمام ضروری اور احتیاطی تدبیریں بھی کر لی تھیں، وہ بایزید کی قوت سے پوری طرح واقف تھا، اس لیے ہر ممکن طریقہ سے اسے کم زور کرنے کے ذرائع اختیار کر چکا تھا، بایزید کی فوج میں ایک بڑی تعداد تاتاریوں کی بھی تھی، تیمور کے خفیہ ایجنٹ بھیس بدل کر عثمانی لشکر میں جاتے تھے اور ان تاتاریوں کو اندر اندر بایزید کے خلاف ابھارتے رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کی عصبيت برا بیچتے ہو گئی اور وہ عین جنگ کی حالت میں ٹوٹ کر تیمور کی فوج سے جا ملے، بایزید کی جزسی اور بخل کی وجہ سے فوج میں پہلے ہی سے بددلی پھیلی ہوئی تھی، جسے تیمور کے جاسوسوں کی ریشہ دوانیوں نے اور بھی تیز کر دیا تھا، عثمانی فوج کے افسروں نے یہ حالت دیکھ کر بایزید کو جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر اس نے مطلق

التفات نہ کیا اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں تیمور کی فوجی طاقت کا صحیح اندازہ بھی نہ کر سکا، اس نے یہ بھی نہ کیا کہ اس موقع پر فراخ دلی سے کام لے کر سپاہیوں کو انعام و اکرام سے خوش کرتا، برخلاف اس کے تیمور کے مقابلہ میں محض اپنی شانِ استغنا کا مظاہرہ کی غرض سے وہ انگورہ پہنچنے کے بعد ایک روز پوری فوج کو ساتھ لے کر شکار کے لیے روانہ ہو گیا، جس مقام پر یہ شکار طے پایا تھا وہاں پانی بہت کم تھا اور پانچ ہزار عثمانی سپاہی پیاس کی شدت سے مر گئے، جو باقی رہ گئے وہ بھی گرمی اور پیاس کی تکلیف سے بہت خستہ ہو رہے تھے۔

بایزید جب شکار سے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی لشکر گاہ پر تیمور کا قبضہ ہے اور جس چشمہ سے عثمانی فوج پانی لے سکتی تھی، اس کا رخ بھی تاتاریوں نے پھیر دیا ہے، جس کی وجہ سے پانی بہت کم دست یاب ہو سکتا ہے، حالات کی نامساعدت میں اس واقعہ نے اور بھی اضافہ کیا، بایزید کے لیے اب بلاتاخیر جنگ شروع کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ چہار شنبہ ۷ ارزی الحج ۸۰۴ھ (۲۰ جولائی ۱۴۰۲ء) کو وہ فیصلہ کن معرکہ پیش آیا جس نے بقول گبن تیمور کی شہرت و عظمت کو حیات ابدی بخش دی اور بایزید کی ذلت و رسوائی کو ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا، لڑائی طلوع فجر سے قبل شروع ہو گئی تھی اور غروب آفتاب کے بعد تک جاری رہی، اس روز بایزید نے سپہ گرمی اور سپہ سالاری کے جوہر خوب خوب دکھائے، اس کی خاص فوج نے بھی غیر معمولی شجاعت سے کام لیا اور نہایت جان بازی کے ساتھ تاتاریوں کا مقابلہ کرتی رہی لیکن تیمور کی فوجی قابلیت اور اس کی فوج کی کثرت کے سامنے بایزید کی ساری کوششیں بے سود نظر آنے لگیں، علاوہ بریں سب سے زیادہ نقصان اسے خود اپنے سپاہیوں سے پہنچا، اس کی فوج کے تاتاری دستے پہلے ہی سے غداری کے لیے آمادہ تھے، وہ لڑائی شروع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد تیمور کی فوج سے جا ملے، اناطولیہ کی ترکی ریاستوں مثلاً ایدین، منتشا، صاردخاں اور کرمان کے دستے بھی جن کو بایزید نے بہ جبر اپنی فوج میں بھرتی کیا تھا، عین موقع پر غدار ثابت ہوئے اور سب

کے سب بھاگ کر اپنے اپنے امیروں کے علم کے نیچے پہنچ گئے، جو تیمور کی فوج میں بائزید کے فوج کے خلاف لڑ رہے تھے، البتہ اسٹیفن اپنے سروی دستوں کے ساتھ وفاداری اور جاں بازی کا حق ادا کرتا رہا لیکن لڑائی ختم ہونے سے پہلے ہی اسے بھی راہ فرار اختیار کرنی پڑی، اب صرف بائزید دس ہزار بیٹی چری کے ساتھ میدان میں باقی رہ گیا تھا، اس مختصر فوج نے سات آٹھ لاکھ تاتاریوں کے مقابلہ میں چھبیس حیرت انگیز شجاعت کا ثبوت دیا، اس کی مثال خود بینی چری کی تاریخ میں کم نظر آتی ہے لیکن آخر کار گرمی اور پیاس کی شدت نے ان کے بازو کم زور کر دیے اور تاتاریوں کی کثرت غالب ہو کر رہی، بائزید کے بعض افسروں نے لڑائی کی حالت دیکھ کر چند گھنٹے پیش تر ہی اسے میدان جنگ چھوڑنے کی رائے دی تھی لیکن اس نے اس مشورہ کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا، اب جب کہ وقت نکل چکا تھا، بائزید نے بھاگنے کی کوشش کی مگر محمود خان چغتائی نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا، اس کے پانچ لڑکوں میں سے جو لڑائی میں شریک تھے، تین دشمن کی زد سے بچ کر نکل گئے، شہزادہ سلیمان نے یورپ کا رخ کیا، شہزادہ محمد نے اسیا پہنچ کر دم لیا اور شہزادہ عیسیٰ کرمانیہ کی طرف بھاگا، شہزادہ موسیٰ گرفتار ہوا، پانچویں لڑکے شہزادہ مصطفیٰ کا حشر معلوم نہ ہو سکا، ممکن ہے لڑائی میں مارا گیا ہو، بہر حال وہ ایسا غائب ہوا کہ کسی کو اس کا سراغ نہ ملا۔

قیدی سلطان | آل تیمور کا مورخ شرف الدین علی بیان کرتا ہے کہ جب بائزید قیدی کی حیثیت سے دست بستہ تیمور کے سامنے لایا گیا تو تیمور نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اس کے ہاتھ کھلوا کر عزت و احترام کے ساتھ اپنے قریب بٹھایا، پھر اس کی حالت پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا کہ:

”اگرچہ احوال عالم تمام تر خداوند تعالیٰ کے ارادہ و قدرت کے مطابق پیش آتے

ہیں اور کسی دوسرے کو حقیقتاً کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہے، تاہم انصاف اور حق یہ ہے

کہ تم پر جو مصیبت آئی ہے، وہ خود تمہاری لائی ہوئی ہے، تم نے بارہا اپنے حد سے باہر قدم

رکھا اور بالآخر مجھے انتقام پر مجبور کر دیا، پھر بھی چون کہ تم اس دیار میں کفار سے جہاد کر رہے تھے، میں نے بہت کچھ تحمل کیا اور ان حالات میں جو فرض ایک خیر اندیش مسلمان کا تھا، اسے بجالایا، میری خواہش تھی کہ اگر تم فرماں برداری کی راہ اختیار کرو تو مال و لشکر کی جس قدر ضرورت تمہیں ہو اس سے تمہاری مدد کروں تاکہ تم اطمینان و قوت کے ساتھ جہاد میں مشغول رہ سکو اور دیار اسلام کے اطراف و اکناف سے بے دینوں کے شرک کی شوکت کو فنا کر دو..... لیکن تم نے سرکشی اور عناد اختیار کیا، حتیٰ کی معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، سب جانتے ہیں کہ اگر صورت حال اس کے برعکس ہوتی اور یہ قوت و غلبہ جو خداوند تعالیٰ نے مجھ کو بخشا ہے تم کو حاصل ہوتا تو اس وقت مجھ پر اور میرے لشکر پر کیا گزرتی لیکن اس فتح کے شکرانے میں جو خدا کے فضل و عنایت سے مجھے حاصل ہوئی ہے، میں تمہارے اور تمہارے آدمیوں کے ساتھ بھلائی کے سوا کچھ نہ کروں گا، دل کو مطمئن رکھو،

بایزید نے انفعال کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور آئندہ کے لیے اطاعت کا وعدہ کیا، تیمور نے اسے خلعت شاہانہ پہنا کر مزید لطف و عنایت کی توقع دلائی، اس کی خواہش پر شہزادہ موسیٰ بھی جو قید میں تھا، آزاد کر کے اس کے پاس بھیج دیا گیا اور تیمور نے ان کے رہنے کے لیے اپنے خیمہ کے قریب ایک عالی شان خیمہ نصب کرایا اور بعض عالی مرتبت امراء کو ان کی خدمت میں مامور کیا، بروصہ سے جب حرم سلطانی لایا گیا تو تیمور نے شہزادی ڈیپسینا اور اس کی لڑکی کو بھی بایزید کے پاس بھجوادیا۔

بایزید کی موت | لیکن یہ مراحم خسروانہ بایزید کے زخم دل کے لیے نمک کا کام دے رہے تھے اور شاہی خیمہ بھی اس کے لیے قید خانہ سے کم نہ تھا، اپنی سابق عظمت و سطوت کی یاد اسے کسی لمحہ چین نہیں لینے دیتی تھی، اضطراب یہاں تک بڑھا کہ اس نے آخر کار بھاگنے کا عزم کر لیا لیکن اس کی اس کوشش کی اطلاع تیمور کو ہو گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ اب اس کی نگرانی سختی

کے ساتھ کی جانے لگی، تاتاری لشکر جب ایک مقام سے دوسرے مقام کو کوچ کرتا تو تیمور بایزید کو بھی ساتھ لیتا جاتا لیکن تشہیر سے بچنے کے لیے بایزید ایک پالکی میں سفر کرتا تھا، جس پر پردہ پڑا رہتا تھا، اس پالکی میں لوہے کی جالی کا کام تھا، جس کی بنا پر مشہور ہو گیا کہ تیمور قیدی سلطان کو لوہے کے پنجرے میں بند رکھتا ہے اور جہاں جاتا ہے اپنے ساتھ اس پنجرے کو بھی لے جاتا ہے، بہر حال بایزید کے قلب و دماغ پر اپنی قید و رسوائی کا اس قدر جاں کاہ اثر پہلے ہی پڑ چکا تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک اسے برداشت نہ کر سکا اور صرف آٹھ مہینے بعد اس کی روح نفسِ عنصری اور نفسِ فولادی دونوں سے بیک وقت آزاد ہو گئی، تیمور کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اس فاتحِ کشور کشاکش کے لیے بھی جس نے لاکھوں انسانوں کو قتل کر دیا اور دل میں تاثر کی خفیف سی لرزش بھی محسوس نہ کی، آلِ عثمان کے اتنے جلیل القدر سلطان کی یہ عبرت انگیز موت ایک دردناک واقعہ تھی، تیمور نے موسیٰ کو آزاد کر کے بایزید کی نعش شاہانہ احترام کے ساتھ بروصہ کو روانہ کی جہاں وہ سابق تاج دارانِ عثمانی کے پہلو میں سپردِ خاک کر دی گئی، خود تیمور بھی اس کے بعد دو ہی سال زندہ رہا۔

سلطنتِ عثمانیہ کا ظاہری خاتمہ | جنگِ انگورہ نے صرف بایزید کی زندگی کا خاتمہ نہیں کیا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ بھی نیست و نابود ہو گئی، تیمور نے ان تمام ترکی امیروں کو جن کی ریاستیں سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر لی گئی تھیں، پھر ان کی حکومتوں پر برقرار کر دیا اور ایشیائے کوچک کا کوئی علاقہ آلِ عثمان کے ہاتھ میں باقی نہ رہا۔

محمد اول

۸۱۶ھ تا ۸۲۴ھ مطابق ۱۴۱۳ء تا ۱۴۲۱ء

سلطنت کی حالت | بایزید کے انتقال کے وقت سلطنت عثمانیہ بظاہر فنا ہو چکی تھی، ایشیائے کوچک عثمانیوں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا، اس کے کچھ حصے ترکی امیروں کے قبضہ میں واپس جا چکے تھے اور کچھ ابھی تک تاتاریوں کی قتل و غارتگری کی آماج گاہ بنے ہوئے تھے، یورپ میں بھی سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کی حالت امید افزا نہ تھی، بلغاریا، بوسنیا اور ولاچیا کی رعایا بغاوت کے لیے آمادہ تھی اور سلطنت بازنطینی اپنے مقبوضات کو واپس لینے کا حوصلہ کر رہی تھی لیکن پریشانی اور ناامیدی کے ان حالات میں بھی سلطنت عثمانیہ نے اپنی غیر معمولی قوت بھاکا ثبوت دیا اور دس بارہ سال کی قلیل مدت میں اس نے نہ صرف اپنے تمام قدیم مقبوضات واپس لیے بلکہ پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ رونما ہوئی۔

تیوری فوجوں نے ایشیائے کوچک کی غارتگری کے بعد دوسری سمت کا رخ کیا، ان کے واپس جانے کے بعد ایشیائے کوچک میں ان کا کوئی نشان باقی نہ رہا، میدان پھر عثمانیوں اور قدیم ترکی امیروں کی قوت آزمائی کے لیے خالی ہو گیا۔

شہزادوں کی باہمی جنگ | بایزید کے چھ لڑکوں میں سے پانچ اس کے ساتھ جنگ انگورہ میں شریک تھے، ان میں ایک مصطفیٰ نامی غالباً لڑائی میں مارا گیا تھا، دوسرا موسیٰ بایزید کے ساتھ گرفتار ہو گیا تھا، باقی تین جان بچا کر بھاگ گئے، ان میں سب سے بڑا لڑکا سلیمان

وزیر اعظم علی پاشا کو ساتھ لے کر اور نہ پہنچا اور بایزید کے انتقال کے بعد سلطنت عثمانیہ کے یورپی حصہ کا مالک بن بیٹھا اور اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، دوسرا لڑکا عیسیٰ بروصہ آیا اور اس نے وہاں بایزید کی جانشینی کا اعلان کر دیا، محمد سب سے چھوٹا لیکن سب سے لائق تھا، وہ ایشیائے کوچک کے شمال مشرق میں ارماسیا کے چھوٹے سے علاقہ پر قابض ہو گیا، بایزید کے انتقال کے بعد ان تینوں میں سلطنت کے لیے کشمکش ہونے لگی، کچھ دنوں کے بعد چوتھا بھائی موسیٰ بھی جسے تیور نے بایزید کی وفات پر رہا کر دیا تھا، تاج و تخت کے لیے قسمت آزمائی کرنے لگا۔

شروع میں محمد اور عیسیٰ کے درمیان جنگ چھڑی، محمد ایشیائی مقبوضات کو برابر برابر تقسیم کر لینا چاہتا تھا لیکن عیسیٰ پوری سلطنت کا دعوے دار تھا، جنگ میں عیسیٰ کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر سلیمان سے مدد طلب کرنے کے لیے یورپ پہنچا، سلیمان عیسیٰ کی حمایت میں فوج لے کر ایشیائے کوچک میں داخل ہوا، ابتدا میں محمد کو دشواری پیش آئی لیکن بالآخر اس نے موسیٰ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ یورپ میں داخل ہو کر سلیمان کے مقبوضات پر حملہ کر دے، یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور سلیمان عیسیٰ کو چھوڑ کر اپنے مقبوضات کی حفاظت کے لیے فوراً یورپ کی طرف روانہ ہوا، عیسیٰ کو شکست ہوئی اور وہ خدا جانے کہاں غائب ہو گیا اور پھر کہیں اس کا پتہ نہ چلا۔

یورپ میں سلیمان اور موسیٰ کے درمیان جنگ شروع ہو گئی، سلیمان کا برتاؤ اپنی فوج کے ساتھ بہت سخت تھا اور سپاہیوں میں اس کی طرف سے عام بے زاری پھیلی ہوئی تھی، اس کی سختی سے عاجز آ کر فوج باغی ہو گئی اور اسے قتل کر دیا، سلیمان کے قتل کے بعد موسیٰ اور نہ کے تخت کا مالک بن بیٹھا اور اس نے اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد موسیٰ نے قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاری شروع کی، شہنشاہ نے محمد سے مدد کی درخواست کی اور محمد اپنی ترکی فوج اور سرویا کے ایک دستہ کے ساتھ شہنشاہ کی مدد کے لیے یورپ میں داخل ہوا، یہ بھی عجیب منظر تھا، ایک ترکی فوج موسیٰ کی سرکردگی میں قسطنطنیہ کا

محاصرہ کیے ہوئے تھی اور دوسری محمد کی قیادت میں قسطنطنیہ کی محافظت کر رہی تھی۔

آخر کار موسیٰ کو محاصرہ اٹھا کر پسا ہونا پڑا، محمد نے اس کا تعاقب کیا، سرویا کی سرحد پر دونوں فوجیں ایک دوسرے سے بہت قریب پہنچ گئیں اور جنگ کی نوبت آنے والی ہی تھی کہ موسیٰ کے فوجی سرداروں نے جو اس سے بہت نالاں تھے، بغاوت کا اعلان کر دیا اور پوری فوج محمد سے جا ملی، موسیٰ زخمی ہو کر بھاگا اور تلاش کے بعد اس کی نعش ایک دلدل میں پائی گئی۔

محمد کی تخت نشینی | تخت سلطنت کے لیے محمد کا کوئی حریف اب باقی نہیں رہا، اس کے سلطان ہونے کا اعلان کیا گیا اور ایشیا اور یورپ کی تمام رعایا نے اس کا خیر مقدم کیا، یہ حیثیت سلطان کے اس نے صرف آٹھ سال حکومت کی لیکن اس مختصر مدت میں بھی اس نے غیر معمولی اہلیت کا ثبوت دیا، اس نے نہ صرف اپنی سلطنت کے انتشار کا خاتمہ کیا بلکہ اپنی خداداد فوجی اور آئینی قابلیت سے دولت عثمانیہ کو ویسا ہی طاقت ور اور مستحکم بنا دیا جیسا کہ تیمور کے حملہ سے قبل وہ تھی، سلطنت کے استحکام کے لیے اس نے امن و صلح کو ضروری سمجھا اور اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر گرد و پیش کی تمام مملکتوں سے صلح کے معاہدے کیے، اس نے بازنطینی سلطنت کے چند مقبوضات شہنشاہ کو واپس کر دیے اور اس سے آخر وقت تک صلح قائم رکھی۔

لیکن کبھی کبھی اسے میدان جنگ میں آنے کے لیے بھی مجبور ہونا پڑا اور اس وقت اس نے ثابت کر دکھایا کہ تدبیر اور نظم و نسق کی اہلیت کے علاوہ فوجی قابلیت میں بھی وہ اپنے کسی پیش رو سے کم نہیں ہے، کرمانیہ، کرمان اور دوسری ترکی ریاستیں تیمور کے حملہ کے بعد سلطنت عثمانیہ سے آزاد ہو گئی تھیں، محمد نے ان سب کو تاتاریوں کی حمایت سے الگ کر کے دولت عثمانیہ کی فرماں روائی قبول کرنے اور خراج ادا کرنے پر مجبور کیا، امیر کرمانیہ نے کئی بار بغاوت کی لیکن محمد نے ہر بار اسے شکست دے کر معاف کر دیا اور صرف اظہارِ اطاعت پر قناعت کر کے اس کی جان بخشی کی، اس نے درویشوں کے گروہ کو جس نے بہت زیادہ طاقت حاصل کر لی تھی اور آخر میں بغاوت کا اعلان کر دیا تھا، شکست دے کر اس فرقہ کا

استیصال کر دیا۔

ذاتی اوصاف | محمد کے بلند اخلاق اور اعلیٰ اوصاف کی شہادت دینے میں تمام مورخین متفق اللفظ ہیں، وہ بے حد کشادہ دل اور منصف مزاج تھا، اپنے وعدوں کو سخت پابندی سے پورا کرتا، اس کی عدالت میں ہر مذہب، ہر قوم اور ہر فرقہ برابر تھا، اس کی رعایا ہر جگہ خوش حال تھی، عیسائی رعایا کی بہبودی کا اسے خاص طور پر خیال رہتا تھا اور ان کے ساتھ وہ کسی قسم کی زیادتی کو روا نہ رکھتا، اس نے ادب کی سرپرستی بڑی فیاضی سے کی اور اسی کے مختصر عہد حکومت میں شعر و شاعری کا مذاق عثمانیوں میں اول اول شروع ہوا۔

محمد نے اکتالیس سال کی عمر میں ۸۲۳ھ (۱۴۲۱ء) میں وفات پائی اور بروصہ میں مسجد خضرا سے متصل جسے اس نے خود تعمیر کرایا تھا، دفن ہوا، یہ مسجد اسلامی طرز تعمیر اور سنگ تراشی کا بہترین نمونہ خیال کی جاتی ہے، محمد نے اس عظیم الشان مسجد کی تعمیر بھی مکمل کرائی جسے مراد اول نے بنوانا شروع کیا تھا لیکن بائزید کی بے توجہی کی وجہ سے نامکمل رہ گئی تھی، اس نے اپنی مسجد کے قریب ہی دو عمارتیں اور بنوائیں، ایک میں مدرسہ قائم کیا اور دوسری میں غریبوں کے لیے طعام خانہ۔

معیارِ عظمت | اگرچہ دولت عثمانیہ کے اول دس فرماں رواؤں میں صرف محمد ہی ایسا تھا جس کے عہد میں سلطنت کی توسیع نہیں ہوئی تاہم جنگ انگورہ کے بعد سلطنت عثمانیہ تباہی کی جس منزل پر پہنچ گئی تھی اور پھر گیارہ سال کی مسلسل خانہ جنگیوں سے جو مزید خطرات پیدا ہو گئے تھے، ان پر نظر رکھتے ہوئے محمد کا یہ کارنامہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں دکھائی دیتا کہ اس نے سلطنت کے کسی صوبے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور گواس کے مختصر عہد حکومت میں ایشیائے کوچک کی ترکی ریاستوں پر پوری طرح قبضہ نہ ہو سکا پھر بھی اس نے ان سب کو زیر کر کے دولت عثمانیہ کے دامن سے وابستہ رکھا، اس کو بجا طور پر سلطنت کے بانیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔

مراد ثانی

۸۲۳ھ تا ۸۵۵ھ مطابق ۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء

مراد اور مصطفیٰ کی جنگ | سلطان محمد اول کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا مراد جو ایشیائے کوچک میں سلطان کا قائم مقام تھا، اٹھارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، محمد اول نے اپنے مختصر زمانہ حکومت میں تیموری حملہ کے تمام اثرات مٹا دیے تھے اور سلطنت کو گویا از سر نو قائم کر کے مستقل و مستحکم بنا دیا تھا لیکن مراد کی نوعمری سے ان فرماں رواؤں کی ہمتیں بڑھ گئیں جن کو سلطان مرحوم نے اپنی قوت اور حکمت عملی سے سلطنت عثمانیہ کا حلیف و مطیع بنا لیا تھا، سب سے پہلے شہنشاہ قسطنطنیہ نے ان تمام احسانات کو فراموش کر کے جو محمد اول نے اس کے ساتھ کیے تھے، آل عثمان کے ساتھ اپنے قدیم بغض و عناد کی بنا پر مراد کی کم سنی سے فائدہ اٹھانا چاہا اور مصطفیٰ نامی ایک شخص کو جو اپنے کو سلطان بایزید یلدرم کا لڑکا کہتا تھا اور تخت سلطنت کا دعوے دار تھا، مراد کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا، یہ وہی مصطفیٰ تھا جو سلطان محمد اول کے مقابلہ میں بھی آیا تھا اور بالآخر شکست کھا کر قسطنطنیہ میں پناہ گزین ہوا تھا اور جس کی نظر بندی کے معاوضہ میں شہنشاہ قسطنطنیہ سلطان سے ایک کثیر رقم ہر سال پاتا تھا، شہنشاہ نے اس معاہدہ کے ساتھ کہ بہ شرط کامیابی وہ گیلی پولی نیز بحر اسود کے ساحل کے تمام بارز نظینی شہر جو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے تھے، شہنشاہ کو واپس کر دے گا، مصطفیٰ کو رہا کر دیا اور اپنی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے روانہ کیا، مراد اس وقت ایشیائے کوچک میں تھا، اس نے مصطفیٰ

کے مقابلہ میں ایک فوج بازید پاشا کی سرکردگی میں بھیجی لیکن یورپ میں ترکی افواج کا پیش تر حصہ مصطفیٰ کا طرف دار ہو گیا تھا، بازید پاشا کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا، اس کے بعد مصطفیٰ شہنشاہ قسطنطنیہ کے فراہم کیے ہوئے جہازوں میں دردنیاں کو عبور کر کے ایشیائے کوچک میں پہنچا، مراد نے بڑی لیاقت اور شجاعت سے اس کا مقابلہ کیا اور شکست دی، مصطفیٰ بھاگ کر گیلی پولی میں محصور ہو گیا، مراد نے گیلی پولی کو فتح کر کے مصطفیٰ کو گرفتار کر لیا اور اس کو سولی دے دی، اس طرح اس آخری فتنہ کا بھی خاتمہ ہو گیا جس کا سلسلہ بازید یلدرم کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں کی باہمی آویزش اور قوت آزمائی سے شروع ہوا تھا۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ | مراد نے شہنشاہ کی اس غداری کے جواب میں قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں اس شہر کے محاصرہ کے لیے بیس ہزار فوج کے ساتھ پہنچ گیا، بازنطینیوں نے نہایت بہادری اور مذہبی جوش کے ساتھ ترکوں کا حملہ روکا مراد نے اس محاصرہ میں جس غیر معمولی فوجی لیاقت کا ثبوت دیا، اس کی مثال اس عہد کی فوجی تاریخ میں شاذ و نادر ملتی ہے، قوی امید تھی کہ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر رہے گا لیکن شہنشاہ نے ایسی تدبیر اختیار کی، جس سے مراد کو مجبوراً محاصرہ اٹھا کر اپنی سلطنت کی حفاظت کے لیے ایشیائے کوچک کا رخ کرنا پڑا، مراد کا ایک چھوٹا بھائی مصطفیٰ نامی تھا، قسطنطنیہ کے محاصرہ کے وقت وہ ایشیائے کوچک میں تھا، شہنشاہ نے کوشش کر کے اس کو مراد کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا، امیر کرمانیہ اور امیر کرمان نے اس کی مدد کی اور مصطفیٰ نے ان کی مدد سے ایشیائے کوچک میں مراد کی ایک فوج کو شکست دے کر اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، یہ خبر سن کر مراد قسطنطنیہ کا محاصرہ چھوڑ کر فوراً ایشیائے کوچک پہنچا، مصطفیٰ کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ خود گرفتار کر لیا گیا، اس کے گرفتار کرنے والوں نے مراد کے علم و اجازت کے بغیر اسی وقت اس کو سولی پر چڑھا دیا۔

ترکی ریاستوں کی اطاعت | اس فتنہ کو فرو کرنے کے بعد مراد ایشیائے کوچک کی ان
 ترکی ریاستوں کی طرف متوجہ ہوا، جو تیموری حملہ کے بعد سلطنت عثمانیہ سے بالکل آزاد ہو گئی
 تھیں اور اس کی بیخ کنی کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی تھیں، امیر کرمانیہ ان سب میں پیش پیش
 تھا، مراد کے خلاف مصطفیٰ کو کھڑا کرنے میں بھی زیادہ تر اسی کا ہاتھ تھا، اس کا یہ طرز عمل اس
 قدیم عناد پر مبنی تھا جو آل عثمان اور کرمانیہ کے درمیان ابتدا سے چلا آتا تھا، چنانچہ مراد نے اس
 کی سرکوبی کے لیے کرمانیہ پر حملہ کیا اور محمد بک کو قتل کر کے اس کے لڑکے ابراہیم کو وہاں کا
 امیر بنایا، اس نے کرمانیہ کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا، بلکہ صرف اس کے باج گزار
 ہونے پر قناعت کی، یہی معاملہ اس نے دوسری ریاستوں مثلاً کرمان، قسطنطنیہ، منشا، صادو
 خاں اور حمید وغیرہ کے ساتھ بھی کیا اور ان سب کو سلطنت عثمانیہ کا مطیع اور باج گزار بنا لیا، اس
 طرح ایشیائے کوچک میں آل عثمان کا وہی اقتدار پھر قائم ہو گیا، جو جنگ انگورہ سے پہلے تھا،
 امیر قسطنطنیہ باج گزار ہونے کے علاوہ اپنی نصف ریاست سے بھی سلطان کے حق میں دست
 بردار ہو گیا اور اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دی، ۸۳۱ھ (۱۴۲۸ء) میں امیر کرمان لاؤلد
 مرگیا، اس کی وصیت کے مطابق ریاست کرمان سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئی۔

شہنشاہ سے صلح اور چند جدید مقبوضات | ایشیائے کوچک میں امن و امان قائم
 کرنے کے بعد مراد ۸۲۴ھ (۱۴۲۳ء) میں یورپ کو واپس ہوا، اس درمیان میں شہنشاہ
 مینویل کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا جان پلیو لوگس قسطنطنیہ کا فرماں روا تھا،
 مراد نے دوبارہ قسطنطنیہ کا محاصرہ نہیں کیا، بلکہ جان سے صلح کر لی، جان نے تیس ہزار
 وکات سالانہ خراج دینے کا معاہدہ کیا اور ستمبر یا اوردورکوس کے سوازیون اور تمام دوسرے
 یونانی شہر جو دریائے اسٹرانیا اور بحر احمر کے ساحل پر باقی رہ گئے تھے، سلطان کے حوالے
 کر دیے، یوں بازنطینی سلطنت کا خاتمہ چند دنوں کے لیے اور ملتوی ہو گیا۔

سالونیکا کی فتح | سالونیکا بازنطینی سلطنت کا ایک مشہور اور نہایت اہم شہر تھا، گذشتہ

سوسال کے اندر یہ تین بار ترکوں کے قبضہ میں آیا لیکن کچھ دنوں کے بعد ہر بار یونانیوں نے اسے واپس لے لیا، شہنشاہ جان کے دور حکومت میں اس کا حاکم شہنشاہ کا بھائی اینڈروئیکس تھا، اینڈروئیکس نے غداری کر کے اس شہر کو وینس کے ہاتھوں فروخت کر دیا، چون کہ یہ مقدونیا کا ایک اہم شہر تھا اور اس سے قبل تین بار ترکوں کے قبضہ میں رہ چکا تھا، اس لیے مراد نے اس معاملہ بیچ کی مخالفت کی اور ۸۳۳ھ (۱۴۳۰ء) میں سالونیکا کو بہ زور شمشیر فتح کر کے مع اس کے ملحق علاقہ کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔

سرویہ کی فتح | سالونیکا کی فتح کے بعد مراد اپنی سلطنت کی شمالی مغربی سرحد کی جانب متوجہ ہوا، ۸۳۰ھ (۱۴۲۰ء) میں اسٹیفن لازار یو بیچ شاہ سرویہ کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ جارج برنیکو بیچ تخت نشین ہوا، اسٹیفن اس معاہدہ کے مطابق جو اس نے جنگ کسوا کے بعد بائزید یلدرم سے کیا تھا، ہمیشہ سلطنت عثمانیہ کا ایک وفادار حلیف رہا، اس نے اپنی بہن شہزادی ڈسپنا کو بائزید کے نکاح میں دے کر اس تعلق کو اور زیادہ مضبوط کر دیا تھا لیکن جارج کو مراد کے ساتھ کوئی ذاتی تعلق نہ تھا، اس نے تخت نشینی کے بعد سرویہ میں ترکوں کے اقتدار کی مخالفت شروع کر دی، اس نے ترکوں کے خلاف ہنگری سے باہمی امداد کا معاہدہ کیا اور دریائے ڈینوب کے ساحل پر سمندریہ میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا، مراد نے جارج کے معاندانہ ارادوں سے واقف ہو کر اس قلعہ کا مطالبہ کیا اور انکار پر جارج کے مقابلہ کے لیے بڑھا، سرویہ کو شکست ہوئی اور پورے ملک پر ترکی افواج کا قبضہ ہو گیا، ۸۴۴ھ (۱۴۴۰ء) میں سرویہ تمام ترکوں کے تسلط میں آ گیا۔

عیسائی حکومتوں میں ایک نئی تحریک | ہنگری کو جنگ انگورہ کے بعد سلطنت عثمانیہ سے آزادی کا موقع مل گیا تھا اور وہ رفتہ رفتہ استحکام حاصل کرتا جاتا تھا، مراد کے ابتدائی دور حکومت میں وہ اتنی قوت حاصل کر چکا تھا کہ ترکی حملہ کی مدافعت کر سکے، سرویہ پر ترکوں کا

قبضہ ہو جانے کے بعد ہنگری کے سرحدی علاقوں میں دونوں سلطنتوں کے درمیان اکثر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، اہل بوسنیا بھی ترکوں کی قربت سے خائف تھے، البانیا کو اپنی آزادی کی طرف سے خطرہ تھا اور ولاچیا جو سلطنت عثمانیہ کا باج گزار تھا، اپنی خود مختاری کے لیے بے تاب تھا، تاہم مراد کی تخت نشینی سے تقریباً بیس سال بعد تک ان مختلف عیسائی حکومتوں کے درمیان کوئی اتحاد قائم نہ ہو سکا اور ان میں سے ہر حکومت علاحدہ علاحدہ مراد سے جنگ اور صلح کرتی رہی لیکن جب ۸۲۴ھ (۱۴۲۰ء) میں لارسلاس شاہ پولینڈ ہنگری کے تخت پر بیٹھا تو سلطنت عثمانیہ کے دشمنوں کی قوت بہت کچھ بڑھ گئی اور ایک متحدہ مقابلہ کا حوصلہ ان میں پیدا ہوا، اس حوصلہ کا محرک حقیقتاً ایک فوجی سردار ہونیا ڈے نامی تھا، جو حال ہی میں مغربی یورپ سے واپس آیا تھا اور جس کی غیر معمولی شجاعت کا شہرہ تمام ملک میں پھیلا ہوا تھا، ہونیا ڈے نے ہنگری پہنچ کر ترکوں کے مقابلہ کا بیڑا اٹھایا اور بیس سال تک برابر سلطنت عثمانیہ سے جنگ کرتا رہا۔

بلغراد | ۸۲۶ھ (۱۴۲۲ء) میں مراد کو بلغراد کے حملہ سے ناکام واپس ہونا پڑا، یہ دریائے ڈینوب کے ساحل پر سرویا کا ایک نہایت اہم شہر تھا لیکن ۸۳۰ھ (۱۴۲۷ء) سے ہنگری کا مقبوضہ تھا، ہنگری میں داخل ہونے کے لیے اس شہر کی فتح ناگزیر تھی، مراد نے اسی خیال سے اس کا محاصرہ کیا لیکن ہنگری کے عزم و استقلال کے مقابلہ میں آخر کار اسے شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا۔

ہونیا ڈے کی کامیابی | اسی زمانہ میں عثمانی جنرل مزید پاشا ٹرانسلوانیا میں ہرمان اسٹاٹ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، ہونیا ڈے اس قلعہ کی مدد کے لیے بڑھا اور ایک مختصر فوج کے ساتھ ترکوں کے عظیم الشان لشکر کو شکست دی، اس معرکہ میں بیس ہزار ترک مارے گئے، ہونیا ڈے نے مزید پاشا اور اس کے لڑکے کو اپنے سامنے لکڑے لکڑے کرادیا، اس کی لہو کی پیاس کسی طرح بجھتی ہی نہ تھی، مقتولوں کی چیخ اور تڑپ میں اسے خاص لذت محسوس ہوتی تھی،

چنانچہ اس فتح کے بعد جب وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر دسترخوان پر بیٹھا تو اسی وقت ترک قیدیوں کو سامنے بلا کر سب کو نہایت بے دردی سے قتل کر دیا، ہر فتح کے بعد جو دعوت ہوتی تھی اس میں مہمانوں کو یہ خونیں تماشا بھی ضرور دکھایا جاتا تھا، یہ ہونی اڑے اور ترکوں کا پہلا مقابلہ تھا، مراد نے اس شکست کی خبر سن کر اسی ہزار کی ایک دوسری فوج شہاب الدین باشا کی سرکردگی میں روانہ کی، وازاگ سے مقابلہ ہوا اور ہونی اڑے نے عثمانی لشکر کو پھر شکست دی۔

صلیبی اتحاد | ہونی اڑے کی شان دار کامیابی اور ترکوں کی بے درپے شکستوں سے یورپ کی تمام حکومتوں میں امید کی ایک لہر دوڑ گئی اور یورپ سے ترکوں کو نکال دینے کے لیے ایک زبردست عیسائی اتحاد قائم کر لیا گیا، شاہ لاڈ سلاس جو اس وقت ہنگری اور پولینڈ دونوں مملکتوں کا فرماں روا تھا، اس تحریک کا روح رواں تھا، اس اتحاد میں ہنگری، پولینڈ، ولاچیا اور بوسنیا کی حکومتیں اپنی پوری قوت کے ساتھ شریک ہوئیں، سرویا بھی جو اسٹیفن کے عہد میں عثمانیوں کا نہایت وفادار حلیف تھا، اب اس کے جانشین جارج برنیکوویچ کی سرکردگی میں اتحادیوں کی صف میں شامل ہو گیا، فرانس اور جرمنی نے مبارزین کی ایک کثیر فوج بھیجی، اس کے علاوہ یورپ کے ہر ملک سے ایک بڑی تعداد سپاہیوں کی خود آ کر شریک ہوئی لیکن سب سے زیادہ جوش یورپ نے دکھایا، اس نے اپنے نمائندہ کارڈینل جولین سیزرائینی (Julian Cesurini) کو ایک مسلح فوج کے ساتھ روانہ کیا اور یورپ کے ہر حصہ سے اس جنگ کے لیے ایک کثیر رقم فراہم کر کے بھیجی، حقیقتاً یہ ایک صلیبی جنگ تھی، جو عیسائیت کے مذہبی جوش نے اسلام کے خلاف چھیڑی تھی، جمہوریہ وینس اور جمہوریہ جنوائے بھی اپنے بحری بیڑوں سے مدد کی اور چونکہ عثمانیوں کے پاس اس وقت تک کوئی بحری فوج نہ تھی، اس لیے خیال تھا کہ مراد کی خاص فوجیں ایشیائے کوچک سے جہاں وہ امیر کرمانیہ سے جنگ میں مصروف تھیں، یورپ میں منتقل نہ کی جاسکیں گی، اتحادی افواج بہ ظاہر شاہ لاڈ سلاس کے زیرِ کمان تھیں لیکن دراصل ان کا سردار ہونی اڑے تھا، جو اس وقت مسیحی دنیا کا سب سے بڑا جنرل خیال کیا جاتا تھا۔

ترکوں کی شکست | مراد اس وقت کرمانیہ کی بغاوت کے سلسلہ میں ایشیائے کوچک میں تھا، اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر عیسائی لشکر نے ۸۲۷ھ (۱۴۲۳ء) میں دریائے ڈینیوب کو عبور کیا اور نیش کے مقام پر عثمانی فوج کو شکست دی، اس کے بعد ہونیڈے نے صوفیا پر قبضہ کر لیا اور پھر کوہ بلقان کو عبور کر کے فلیو پولس پر حملہ کی تیاری شروع کی، کوہ بلقان کے دامن میں ترکوں نے ایک بار اور مقابلہ کیا لیکن اس مرتبہ بھی ان کو شکست ہوئی، عیسائیوں کے لیے میدان اب خالی تھا، مسلسل فتوحات سے ان کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں، مراد ایشیائے کوچک میں تھا اور پہم شکستوں نے ترکی فوج کو بہت کچھ کم زور کر دیا تھا، بااں ہمہ ہونیڈے نے اس مقصد کے خلاف جسے پیش نظر رکھ کر عیسائی حکومتوں کا یہ اتحاد قائم کیا گیا تھا، واپسی کا عزم کیا اور اپنی کامیابیوں کی داد لینے کے لیے پوری فوج کے ساتھ بودا کو واپس چلا گیا۔

صلح نامہ ز بیجڈین | مراد نے ہونیڈے کا تعاقب کرنے کے بجائے اتحادیوں سے صلح کر لینا زیادہ مناسب خیال کیا، کارڈینل جو لین صلح کا مخالف تھا لیکن طویل گفت و شنید کے بعد بالآخر ۲۶ ربیع الاول ۸۳۸ھ (۱۲ جولائی ۱۴۳۳ء) کو ز بیجڈین (Szeged) کے مقام پر ایک صلح نامہ مرتب ہوا، جس کی رو سے سر ویا سلطنت عثمانیہ سے آزاد کر دیا گیا اور ولاچیا ہنگری کو دے دیا گیا، اس کے علاوہ مراد نے ساٹھ ہزار روکات عثمانی جنرل محمد چلبی کا زرفدیہ ادا کیا، جو گذشتہ جنگ میں عیسائیوں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تھا، یہ صلح دس سال کے لیے کی گئی، اس پر پابند رہنے کے لیے لاڈ سلاس نے انجیل اور مراد نے قرآن کو ہاتھ میں لے کر قسم کھائی۔

مراد کی تخت سے کنارہ کشی | ایشیائے کوچک میں امن پہلے ہی قائم ہو چکا تھا، اس صلح نامہ سے یورپ کی جنگ کا بھی بہ ظاہر خاتمہ ہو گیا اور مراد کو ایک گونہ اطمینان حاصل ہوا، بیس بائیس سال کی مسلسل لڑائیوں نے اس کو اب امور سلطنت کی طرف سے دل برداشتہ کر دیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ بقیہ زندگی سکون کے ساتھ گزار دے، صلح نامہ ز بیجڈین کے تکملہ کے بعد

جب وہ ایشیائے کوچک میں واپس گیا تو اسے اپنے بڑے لڑکے شہزادہ علاء الدین کی وفات کی خبر معلوم ہوئی، یہ شہزادہ نہایت لائق اور بہادر تھا، مراد کو اس کی وفات کا بے حد رنج ہوا اور اس نے سلطنت سے مستقل طور پر کنارہ کش ہو جانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ اپنے دوسرے لڑکے محمد کو جس کی عمر صرف چودہ سال تھی، تخت پر بٹھا کر وہ ریاست ایدین میں چلا گیا۔

عیسائیوں کی معاہدہ شکنی | لیکن جس زندگی کی تلاش میں مراد نے تخت چھوڑ کر ایدین کی سکونت اختیار کی تھی وہ حاصل نہ ہو سکی، جوں ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ مراد سلطنت سے کنارہ کش ہو گیا ہے اور اس کی جگہ نو عمر اور ناتجربہ کار محمد تخت نشین ہے، عیسائیوں کے دلوں میں ترکوں کو یورپ سے خارج کر دینے کا حوصلہ ایک بار پھر پیدا ہوا، صلح نامہ زنجیڈین کی تحریر کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ہنگری کی مجلس قومی نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کا فیصلہ کر لیا، اس غداری کا اصل محرک کارڈینل جو لین تھا جو پوپ کی پوری تائید کے ساتھ معاہدہ شکنی پر زور دے رہا تھا، شہنشاہ قسطنطنیہ بھی اس تحریک میں پیش پیش تھا، حالات تمام تر عیسائیوں کے لیے امید افزا تھے، سلطنت عثمانیہ کی زمام حکومت ایک نو عمر لڑکے کے ہاتھ میں تھی، ایشیائے کوچک میں امیر کرمانیہ نے پھر بغاوت شروع کر دی تھی اور عثمانی فوجیں اس کے فرو کرنے میں مصروف تھیں، دردیانیال پر جنوا، وینس اور برگنڈی کے بحری بیڑوں کا قبضہ تھا، جن کی موجودگی میں ترکی افواج کا ایشیائے کوچک سے یورپ میں آنا محال تھا، پھر بھی لاڈ سلاش شاہ ہنگری کو صلح نامہ کی خلاف ورزی کرنے میں تامل تھا لیکن کارڈینل جو لین نے اپنے مذہبی اثر سے کام لے کر اس کو مجبور کر دیا اور بادشاہ کے ضمیر کو اس فتویٰ سے مطمئن کر دیا کہ غیر عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی نہیں کرنی چاہیے، ہنگری کی مجلس قومی کے بعض ارکان کی مخالفت بھی اس فتویٰ سے دبا دی گئی اور جو لین نے مجلس میں اعلان کیا کہ اس فتویٰ میں خود پوپ کی تائید بھی شامل ہے، اس نے مجلس کو مخاطب کر کے کہا:

”کیا تم اس موقع پر ان امیدوں کو توڑ دو گے جو لوگوں نے تمہارے ساتھ قائم کر رکھی ہیں اور اس خوش بختی سے فائدہ نہ اٹھاؤ گے جو تمہیں نصیب ہوئی ہے، تمہارا عہد و پیمانہ تمہارے خدا اور تمہارے مسیحی بھائیوں کے ساتھ ہے اور وہ سابق معاہدہ اس ناعاقبت اندیشانہ اور مخالف مذہب عہد کو ساقط کر دیتا ہے، جو مسیح کے دشمنوں سے باندھا گیا ہو، دنیا میں اس کا نائب پاپائے روم ہے، جس کی اجازت کے بغیر تم نہ کوئی وعدہ کر سکتے ہو اور نہ اسے پورا کر سکتے، اس کی طرف سے میں تم کو دروغ حلفی سے بری الذمہ کرتا ہوں اور تمہاری فوج کو برکت دیتا ہوں، شہرت اور نجات کی راہ پر میرے پیچھے پیچھے چلو اور اگر اب بھی تمہیں کچھ پس و پیش ہے تو میں اس گناہ کا وبال اپنے سر لیتا ہوں۔“

ابتدا میں ہونی اڑے نے بھی معاہدہ زنجیڈین کی خلاف ورزی سے اختلاف کیا لیکن جب یہ وعدہ کیا گیا کہ بلغاریا کو ترکوں سے فتح کرنے کے بعد اسے وہاں کا بادشاہ بنا دیا جائے گا تو وہ راضی ہو گیا، البتہ اس نے یہ شرط کی کہ معاہدہ شکنی کا اعلان یکم ستمبر تک ملتوی کر دیا جائے، یہ شرط اس وجہ سے نہ تھی کہ اسے اب بھی کچھ تامل باقی تھا بلکہ اس خیال سے پیش کی گئی تھی کہ اس وقت تک اتحادی صلح نامہ سے پورا فائدہ اٹھالیں اور ان تمام قلعوں اور علاقوں پر قابض ہو جائیں جنہیں ترک معاہدہ کے مطابق دیانت داری کے ساتھ خالی کر رہے تھے، شاہ سرویکو اس کی سلطنت میں اضافہ کا لالچ دیا گیا اور وہ بھی معاہدہ شکن اتحادیوں کے ساتھ ہو گیا۔

لین پول لکھتا ہے کہ جس طریقہ سے یہ غداری عمل میں لائی گئی اس سے زیادہ معیوب بات یورپ کے سو رماؤں اور ایک بڑے سپہ سالار کی شہرت کے لیے تصور میں بھی نہیں آسکتی، جس وقت عثمانی دستے مذکورہ بالا قلعوں اور علاقوں سے نکل آئے اور اتحادیوں نے صلح نامہ سے پوری طرح فائدہ اٹھالیا، شاہ لاڈ سلاس، کارڈنیل جو لین اور ہونی اڑے یکم ستمبر کو بیس ہزار فوج کے ساتھ سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے، ترک اس فریب سے

بالکل بے خبر تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد قلعے ان کے ہاتھ سے نکل گئے، قلعوں کے ترکی دستے یا قتل کر دیے گئے یا چٹانوں سے گرا کر ہلاک کر دیے گئے، بحر اسود کے ساحل پر پہنچ کر حملہ آوروں نے جنوب کا رخ کیا اور کئی اہم مقامات کو فتح کرتے ہوئے دارنا پہنچے اور اس مشہور شہر کا محاصرہ کر لیا، یہاں بھی ترک اس اچانک حملہ کے لیے بالکل تیار نہ تھے، مجبوراً انہیں ہتھیار ڈال دینے پڑے اور وارنا پر بھی عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔

جنگ وارنا | اس درمیان میں دولت عثمانیہ کے یہی خواہوں نے ان واقعات کی خبر سن کر مراد سے گزارش کی کہ یہ وقت گوشہ عزلت سے نکل کر میدان جنگ میں آنے کا ہے، ورنہ شہزادہ محمد کی نوعمری اور نا تجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر دشمن بڑھتے آئیں گے، چنانچہ مراد بہ عجلت تمام چالیس ہزار جنگ آزمودہ سپاہیوں کو لے کر اتحادیوں کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوا، در دانیال پر عیسائی بیڑوں کا قبضہ تھا لیکن اس نے جنوا کے جہازوں کو فنی سپاہی ایک ودکات کی شرح سے محصول ادا کر کے اپنی پوری فوج کو یورپ میں منتقل کر دیا، اتحادیوں کو مراد کی آمد کا گمان بھی نہ تھا کہ اچانک انہیں اس کے قریب پہنچنے کی اطلاع ملی، مراد نے وارنا سے چار میل کے فاصلہ پر اپنے خیمے نصب کر دیے اور جنگ کی تیاری کرنے لگا۔

ہو نیا ڈے کو سابق کام یا بیوں کی بنا پر اپنی فتح کا پورا یقین تھا، چنانچہ اس نے مجلس حربی کے بعض اراکین کا یہ مشورہ بھی قبول نہ کیا کہ لشکر گاہ کے گردنا کہ بندی کر کے مراد کے حملہ کا انتظار کرنا چاہیے بلکہ خود ہی مراد پر حملہ کرنے کے لیے پوری فوج کے ساتھ چل کھڑا ہوا، ۲۶، ۲۷ جب ۸۴۸ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۴۴۳ء کو دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں، عیسائی فوج کے ہمین دیسار میں ہنگری اور ولاچیا کے بہترین دستے تھے، ہنگری کے دستوں کے ساتھ کارڈینل جولین کی سرکردگی میں صلیبی مجاہدوں کی ایک خاص جماعت بھی تھی، لاڈ سلاش شاہی دستہ اور ہنگری اور پولینڈ کے نوجوان امراء کو لے کر قلب لشکر کو قوت پہنچا رہا تھا، ہو نیا ڈے پوری فوج کا سپہ سالار اعظم تھا، ترکوں کی طرف پہلی

دو صفیں بے ضابطہ سوار اور پیدل فوجوں کی تھیں، داہنے بازو کی کمان رومیلیا کے بیلر بے کے ہاتھ میں اور بائیں بازو کی اناطولیہ کے بیلر بے کے ہاتھ میں تھی، ان صفوں کے پیچھے مرکز میں خود سلطان مراد کے زیر کمان بی چری اور شاہی سوار دستے تھے، ایک اونچے نیزہ کے سرے پر صلح نامہ زنجیڈین کی نقل فوجی نشان کی طرح ہوا میں لہرا رہی تھی اور بقول کریمی اس منتقم حقیقی کو پکار رہی تھی جو لوگوں کو نقص عہد کی سزا دیتا ہے، لڑائی شروع ہونے کے قریب ہی تھی کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے عیسائیوں کے دلوں میں بدشگونی کا خطرہ پیدا ہو گیا، دفعۃً ہوا کا ایک سخت جھونکا آیا اور ان کے تمام علم سوائے بادشاہ کے علم کے زمین پر گر گئے۔

ابتدا میں عیسائیوں کا حملہ بہت کامیاب رہا، ترکوں کی پہلی دو صفوں کے قدم اکٹھے گئے اور فوج میں اتنا انتشار پیدا ہوا کہ مراد کو اپنی شکست کا یقین ہونے لگا، زندگی میں پہلی اور آخری بار صبر و استقلال کا سررشتہ ایک لمحہ کے لیے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے گھوڑا موڑ کر بھاگنے کا قصد کیا لیکن اناطولیہ کے بیلر بے نے جو قریب ہی تھا، بڑھ کر گام پکڑی اور عرض کی کہ ابھی مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، مراد کو بھی تہمتہ ہوا اور اس نے فوراً گھوڑا روک کر بی چری کو ہمت دلانا شروع کی، دیکھتے دیکھتے جنگ کا نقشہ بدل گیا، بی چری نے پے در پے اتنے سخت حملے کیے کہ عیسائی پسپا ہونے لگے، لاڈسلاں نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا لیکن اس کا گھوڑا زخمی ہو کر گر اور بعض بی چری سپاہیوں نے اسے گھیر کر گرفتار کر لیا، لاڈسلاں نے خواہش کی کہ اسے قید کر لیا جائے، مگر ترکوں میں عیسائیوں کی معاہدہ شکنی سے اس درجہ برہمی پھیلی ہوئی تھی کہ انہوں نے اس کی خواہش پر مطلق توجہ نہ کی، ایک پرانے بی چری خواجہ خیری نے فوراً اس کا سر کاٹ کر ایک نیزے پر رکھا اور نیزے کو بلند کر کے عیسائیوں کی طرف بڑھا، امرائے ہنگری کے دل اس منظر کو دیکھتے ہی بیٹھ گئے اور وہ نہایت بدحواسی کے عالم میں میدان چھوڑ کر بھاگے، ہونیا ڈے نے تھوڑی دیر تک جم کر مقابلہ کیا اور اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ کم سے کم لاڈسلاں کا سر ترکوں سے چھین کر اپنے قبضہ میں کر لے، مگر اسے

کام یابی نہ ہوئی اور آخر کار وہ بھی بقیہ عیسائی دستوں کے ساتھ بمشکل جان لے کر بھاگا لیکن اس سے قبل اتحادی فوجوں کا دو ٹکٹ حصہ قتل ہو چکا تھا، شاہ لاڈ سلاس کے علاوہ مقبولین میں دو مشہور بشارت اور بعض نہایت ممتاز فوجی افسر بھی تھے لیکن سب سے زیادہ عبرت انگیز لغزش کارڈیٹل جولین کی تھی، جو معاہدہ زنجیڈین کی شکست کا خاص محرک اور عیسائیوں کی ہلاکت کا اصلی سبب تھا، جس گناہ کو اپنے سر لے کر اس نے ہنگری کی قومی مجلس کو عثمانی مقبوضات پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا، اس کی لغزش اس کے وبال کا ایک ایسا موقع تھی جو مکافات عمل کے خدائی قانون کو فاتح و مفتوح دونوں کے سامنے مجسم شکل میں پیش کر رہا تھا۔

اس جنگ کے نتائج | جنگ وارنا کے بعد ہنگری پر ترکوں کا قبضہ تو فوراً نہ ہو سکا لیکن سرویا اور بوسنیا کی ملکیتیں مکمل طور پر فتح کر لی گئیں، یہ دونوں جو یونانی کلیسا سے وابستہ تھیں دولت عثمانیہ کے زیر تسلط آنا بھی چاہتی تھیں کیوں کہ ہونیاڈے کی کام یابی کی صورت میں انہیں بہ جبر لاطینی کلیسا میں داخل کرنے کی دھمکی دی گئی تھی، سرویا کا مورخ رانکی (Ranke) نقل کرتا ہے کہ ایک بار جارج برینکوویچ نے ہونیاڈے سے دریافت کیا کہ اسے کام یابی حاصل ہوئی تو مذہب کے متعلق اس کا رویہ کیا رہے گا، ہونیاڈے نے جواب دیا کہ میں سرویا کو رومن کیتھولک مذہب قبول کرنے پر مجبور کروں گا، اس کے بعد برینکوویچ نے یہی سوال مراد سے کیا، اس نے جواب دیا کہ میں ہر مسجد کے پاس ایک گرجا بنوادوں گا اور لوگوں کو پوری آزادی حاصل ہوگی کہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق خواہ مسجد میں جا کر عبادت کریں خواہ گرجا میں، اسی طرح کلیسائے رومہ کی مذہبی تعدیوں نے بوسنیا کی تسخیر میں بھی ترکوں کی مدد کی اور آٹھ روز کے اندر بوسنیا کے ستر قلعوں نے عثمانی فوجوں کے لیے اپنے پھانک کھول دیے، بوسنیا کا شاہی خاندان مٹ گیا اور اس کے بہت سے ممتاز امراء اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

ینی چری کی بغاوت | اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد مراد نے تاج و تخت پھر شہزادہ محمد

کے حوالہ کیا اور ایدین کی پرفیک فضا میں علما و مشائخ کی صحبتیں دوبارہ شروع ہوئیں لیکن اب کی بار بھی یہ عزت پسندی راس نہ آئی، ورنہ اس کی شکست نے عیسائیوں کی قوت کو بالکل توڑ دیا تھا اور سلطنت عثمانیہ کو اب کسی خارجی خطرہ کا خوف نہ تھا لیکن محمد کی کم سنی سے خود بینی چری نے فائدہ اٹھانا چاہا اور تنخواہ کے اضافہ کا مطالبہ پیش کیا، محمد کے انکار پر انہوں نے بغاوت کر دی اور اورنہ میں قتل و غارت کا بازار ایسا گرم کیا کہ وزرائے سلطنت نے مجبور ہو کر مراد سے بمنست استدعا کی کہ زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر اس فتنہ کو فرو کرے، چنانچہ مراد کو بادل نا خواستہ ایدین کا سکون پرور ماحول پھر چھوڑنا پڑا، اس کے اور نہ پہنچتے ہی باغیوں نے سرطاعت خم کر دیا اور شہر میں امن قائم ہو گیا، دوبار کے تجربہ سے مراد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ محمد میں ابھی سلطنت کے سنبھالنے کی کافی قابلیت پیدا نہیں ہوئی، چنانچہ اس نے پھر تخت چھوڑنے کا قصد نہیں کیا، بلکہ بقیہ زندگی امور سلطنت کے سرانجام دینے میں گزار دی، بادشاہوں کے تخت سے دست بردار ہو جانے کی متعدد مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں، ان میں سے بعض حالات سے مجبور ہو کر دوبارہ عنان سلطنت کو ہاتھ میں لینا بھی ثابت ہے لیکن دوسری بار تخت چھوڑ کر پھر سلطنت کی ذمہ داریوں کو اپنے سر لینا ایک ایسا استثنائی واقعہ ہے جو صرف مراد ثانی کے ساتھ مخصوص ہے اور جس کی کوئی نظیر تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی، لکن کے نزدیک مراد کی زندگی اور سیرت کا سب سے زیادہ مؤثر واقعہ یہی ہے کہ یہ فلسفی سلطان دنیاوی عظمت کی بے حقیقتی سے آگاہ ہو کر چالیس سال کی عمر میں دوبارہ تخت سے علاحدہ ہو گیا۔

موریا | لیکن اب تخت پر آنے کے بعد مراد کی زندگی کے بقیہ چھ سال تقریباً تمام تر میدان جنگ ہی میں گزرے، سب سے پہلے اسے موریا کی طرف توجہ کرنی پڑی، جہاں شہنشاہ قسطنطنیہ کے دو بھائی قسطنطنین اور طامس علاحدہ علاحدہ حصوں پر حکم ران تھے، قسطنطنین نے اپنے مقبوضات کے تحفظ کے لیے خاکنائے کورنتھ کی قلعہ بندی کی اور ادھر سے اطمینان کر لینے کے بعد تھیبیز (Thebes) کے شہر پر جو اس سرحد سے قریب سلطنت عثمانیہ کا مقبوضہ

تھا، دفعتاً حملہ کر کے قبضہ کر لیا، اس واقعہ کی اطلاع پا کر مراد فوراً موریا کی طرف روانہ ہوا، کورنتھ کا مضبوط قلعہ اس کی راہ میں کسی قدر حائل ہوا، مگر عثمانی توپوں کی گولہ باری کے سامنے وہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا، عثمانی فوج میں توپوں کے استعمال کا یہ پہلا موقع تھا، کورنتھ کی فتح کے بعد موریا کا راستہ بالکل صاف ہو گیا اور قسطنطین اور طامس کے لیے اظہار اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا، انہوں نے خراج دینا منظور کیا اور موریا بھی دولت عثمانیہ کی باج گزار ریاستوں میں شامل کر لیا گیا۔

کسوا کی دوسری جنگ | وارنا کی شکست کے بعد ہونیا ڈے ترکوں سے انتقام لینے کی تیاریوں میں مصروف رہا، اس کے دامن شہرت پر وارنا کا داغ بہت ہی بد نما تھا، چنانچہ اس نے چار سال کے اندر اسی ہزار کی ایک زبردست فوج پھر جمع کر لی اور دریائے ڈینیوب کو عبور کر کے سرویا میں داخل ہوا، یہاں ہنگری، سرویا اور بوسنیا کی فوجیں متحد ہو کر مراد کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئیں، سرویا اور بوسنیا نے جنگ وارنا کے بعد دولت عثمانیہ کی سیادت قبول کر لی تھی، مگر ہونیا ڈے کی کوششوں سے یہ دونوں حکومتیں اپنے معاہدہ سے منحرف ہو گئیں اور مکمل آزادی کی خواہش انہیں مراد کے بالمقابل میدان جنگ میں پھر کھینچ لائی، یہ قوت آزما کی کسوا کے اسی میدان میں ہوئی جہاں تقریباً ساٹھ سال پیش تر مراد اول نے سرویا کی طاقت و سلطنت کو شکست دے کر اسے اپنا مطیع بنا لیا تھا، تین روز کی شدید جنگ کے بعد ۱۸ شعبان ۸۵۲ھ (۱۷ اکتوبر ۱۴۴۸ء) میں مراد نے ہونیا ڈے کی متحدہ افواج کو بری طرح شکست دی، کسوا کی اس دوسری عظیم الشان جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرویا کی آزادی سلب کر لی گئی اور وہ چند سال بعد سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، مراد نے بوسنیا سے سالانہ خراج قبول کرنے پر اکتفا کیا۔

اسکندر بک | اس درمیان میں البانیا میں ایک نیا قتنہ پیدا ہو گیا تھا، مراد کے ابتدائی عہد حکومت میں البانیا کی ایک ریاست کا امیر جان کستریو (John Castriot) دولت علیہ کا مطیع ہو

گیا تھا، بطور ضمانت اس نے اپنے چار لڑکے مراد کی خدمت میں بھیج دیے تھے، ان میں سے تین تو بچپن ہی میں انتقال کر گئے، چوتھا لڑکا جارج کسٹریو زندہ رہا اور اس کی ہونہاری اور فراست نے بہت جلد سلطان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، مراد نے اپنی ذاتی نگرانی میں جارج کو اسلامی اور فوجی تعلیم دلوائی اور اس کی لیاقت اور شجاعت سے خوش ہو کر محض اٹھارہ سال کی عمر میں اسے ایک سختی کا حاکم بنا دیا اور اسکندر ربک کے لقب سے سرفراز فرمایا، جان کسٹریو کا جب انتقال ہوا تو مراد نے اس کی ریاست سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی، یہ بات اسکندر ربک کو بہت ناگوار گزری لیکن اس نے ایک عرصہ تک اپنے اندرونی جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا، جب ۸۲۳ھ (۱۴۲۳ء) میں ہونیواڈے کے مقابلہ میں عثمانی فوج کو شکست ہوئی تو اسکندر ربک نے موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنے باپ کی ریاست پر قبضہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا، چنانچہ ایک روز وہ رئیس آفندی یعنی سلطان کے چیف سکریٹری کے خیمہ میں تھا دفعتاً داخل ہوا اور اس کے گلے پر خنجر رکھ کر البانیا کے مضبوط شہر آق حصار (جس کا قدیم نام کروئیا (Croia)) تھا، کے ترک افسر کے نام ایک حکم نامہ لکھوا لیا کہ شہر اور اس کے ملحق علاقے بہ حیثیت گورنر کے اسکندر ربک کو دے دیے جائیں، یہ تحریر حاصل کر لینے کے بعد اس نے رئیس آفندی کو فوراً قتل کر دیا اور اسی وقت البانیا کی طرف روانہ ہو گیا، آق حصار پہنچ کر اس فرمان کے ذریعہ سے وہ شہر پر قابض ہو گیا، اس کے بعد اس نے اپنے ارتداد کا اعلان کیا اور دین عیسوی کی حمایت اور البانیا کی آزادی کے لیے اپنی خدمات پیش کیں، البانیا کے مختلف جڑگوں کے سردار اس کے علم کے نیچے جمع ہونے لگے، ان کی مدد سے اس نے متعدد قلعوں پر قبضہ کر لیا اور پھر ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے آبائی علاقوں میں داخل ہوا، اس کے بعد تمام قومی امراء نے اسے اپنا سردار تسلیم کر لیا، تقریباً پچیس سال تک وہ ترکوں کا مقابلہ کرتا رہا، البانیا کے بیچ در بیچ پہاڑی دروں کی وجہ سے عثمانی فوجوں کو کھل کر لڑنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور متعدد کوششوں کے باوجود البانیا

مراد کی حیات میں پوری طرح مستحضر نہ ہو سکا۔ www.KitaboSunnat.com

مراد کی وفات | ۵ محرم ۸۵۵ھ (۹ فروری ۱۴۵۱ء) کو مراد نے اور نہ میں وفات پائی،
تجہیز و تکفین قدیم پایہ تخت بروصہ میں ہوئی۔

اخلاق و اوصاف | مراد کے عدل و انصاف اور شریفانہ اوصاف کا اعتراف اس کے
دشمنوں نے بھی کیا ہے، یونانی مؤرخین بھی اس کی فوجی قابلیت کے علاوہ اس کی اخلاقی
عظمت کی شہادت دیتے ہیں اور اس بات میں ترک مؤرخین کے ہم نوا ہیں، لارڈ ایورسلے
جس کے قلم سے آل عثمان کے محاسن کا اعتراف بہت شاذ ہوتا ہے، مراد کے عہد حکومت پر
تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”اس کی حکومت پر نظر ڈالنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے توسیع سلطنت
کے مقصد سے لڑائیاں لڑیں، تقریباً ہر جنگ کے لیے وہ مجبور کیا گیا، تین بار امیر کرمانیہ نے
اس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، ہر بار مراد نے اس کو شکست دی اور کرمانیہ کو صرف ایک
باج گزار ریاست بنا لینے پر قناعت کی اور اس کی آزادی کو فنا کر کے اسے سلطنت میں ضم
کر لینے پر اصرار نہیں کیا، یہ دکھایا جا چکا ہے کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کا طرز عمل کس قدر غدارانہ تھا
اور مراد اس کے مقبوضات کے دائرہ کو تنگ سے تنگ کر دینے میں کس درجہ حق بجانب تھا، اسی
طرح سالونیکا پر بھی مراد کا حملہ، جب کہ وہ شہر جمہوریہ وینس کے ہاتھ میں تھا، بالکل حق
بجانب تھا کیوں کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کو اسے فروخت کرنے اور یوں اور ایک غیر حکومت کو وہاں
قدم جمانے کی جگہ دینے کا کوئی حق نہ تھا، شمالی سرحد پر جو لڑائیاں ہوئیں ان میں مراد کو اہل
ہنگری اور ان کی حلیف مسیحی طاقتوں کے جارحانہ اقدام سے مجبور ہو کر میدان میں آنا پڑا،
اتحادیوں نے تلوار سے فیصلہ چاہا اور فیصلدان کے خلاف ہوا۔“

گلیں ایک ترک مؤرخ کا بیان نقل کرتا ہے:

”سلطان مراد نے انچاس سال کی عمر پائی اور تیس سال چھ مہینے اور آٹھ روز حکومت

کی، وہ ایک عادل اور شجاع فرماں روا تھا، نہایت کشادہ دل، مستقل مزاج، عالم، رحم دل، پابند مذہب اور فیاض، وہ اہل علم اور ان تمام لوگوں سے جو کسی علم یا فن میں کمال رکھتے، محبت کرتا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا، وہ ایک نیک شہنشاہ اور ایک جلیل القدر سپہ سالار تھا، کسی شخص نے مراد سے زیادہ اس سے بڑی فتوحات نہیں حاصل کیں، اس کے عہد حکومت میں سپاہی ہمیشہ فتح یاب تھا اور شہری خوش حال اور مامون، جب وہ کسی ملک کو فتح کرتا تو سب سے پہلے وہاں مسجدیں اور کارواں سرائیں، ہسپتال اور مدرسے تعمیر کراتا، ہر سال وہ ایک ہزار طلائی سکے سادات کی نذر کرتا اور ڈھائی ہزار مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کے دین دار لوگوں کے لیے بھیجتا۔

اس کے بعد گنن خود اپنی تحقیق لکھتا ہے:

”مراد کے عدل و انصاف اور بردباری کی تصدیق اس کے طرز عمل نیز خود عیسائیوں کی شہادت سے ہوتی ہے، جن کا خیال ہے کہ اس کے عہد کی خوش حالی اور اس کی پرسکون موت اس کے غیر معمولی اوصاف کا صلہ تھی، اپنی عمر اور فوجی قوت کے دور شباب میں بھی اس نے شاذ ہی کسی میدان جنگ میں قدم رکھا، جب تک پہلے دشمن کی طرف سے اس کو جنگ کے لیے کافی طور پر براہیچینہ نہ کیا گیا، دشمن کے مطیع ہو جانے کے بعد فاتح سلطان اپنے ہتھیار کو کھول کر رکھ دیتا تھا اور صلح ناموں کی پابندی میں اس کا عہد نامہ قابل شکست اور مستحکم تھا، جملہ کی ابتدا عموماً اہل ہنگری کی طرف سے ہوا کرتی تھی، اسکندر ربک کے خلاف اس کو اشتعال خود اسکندر ربک کی بغاوت کی وجہ سے پیدا ہوا اور کرمانیہ کے غدار امیر کو سلطان نے دوبار زیر کیا اور دونوں مرتبہ معاف کر دیا، قبل اس کے کہ وہ موریا پر چڑھائی کرے، تھیبیز پر موریا کا فرماں روا اچانک حملہ کر چکا تھا، جہاں تک سالونیکا کی فتح کا تعلق ہے، بائزید کا پوتا اہل وینس کی تازہ خریداری کو زیر بحث لاسکتا تھا اور قسطنطنیہ کے پہلے محاصرہ کے بعد سلطان کو پھر کبھی پلویو لوگس کی مصیبت، غیر موجودگی یا اذیتوں کی بنا پر سلطنت بازنطینی کے بچھتے ہوئے چراغ کو گل کر دینے کی ترغیب نہیں ہوئی۔“

محمد فاتح

۸۵۵ھ تا ۸۸۶ھ مطابق ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء

شہزادہ محمد ریاست ایدین میں تھا جب اسے مراد کی وفات کی اطلاع ملی، وہ فوراً ایک عربی گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ کہتا ہوا کہ ”جو لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں، میرے ساتھ آئیں“ دردنیا کی طرف روانہ ہو گیا اور اسے عبور کر کے اور نہ پہنچا، تخت نشینی کے وقت یعنی چری کی خوش نودی حاصل کرنے کی غرض سے اسے انعامات تقسیم کرنے پڑے، جس سے آئندہ کے لیے ایک مثال قائم ہو گئی اور نئی چری میں اپنی اہمیت کا مزید احساس پیدا ہو گیا۔

معصوم بھائی کا قتل | زمام سلطنت کو ہاتھ میں لینے کے بعد محمد نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے شیر خوار بھائی کو جو سردیا کی شہزادی کے بطن سے تھا، آئندہ فتنہ کے خوف سے حوض میں غرق کر دیا، معصوم بچہ کا یہ قتل عین اس وقت عمل میں آیا جب غریب و بے کس ماں سلطان کے حکم سے بالکل بے خبر اس کی تخت نشینی پر دربار میں تہنیت پیش کر رہی تھی۔

شہنشاہ قسطنطنیہ سے آویزش | محمد کی تخت نشینی سے تین سال قبل بازنطینی سلطنت کا آخری فرماں روا قسطنطین یازدہم قسطنطنیہ کے تخت پر بیٹھ چکا تھا، قسطنطین ایک بہادر شہزادہ تھا لیکن محمد کو برا فروختہ کرنے میں اس نے اسی شدید غلطی کا اعادہ کیا جس کا خمیازہ اس کے پیش رو مینوئل کو مراد ثانی کے ہاتھوں بھگتنا پڑا تھا، سلطان بایزید یلدرم کا ایک پوتا اور خان نامی جو شہزادہ سلیمان کی اولاد سے تھا، قسطنطنیہ میں نظر بند تھا، اس کے مصارف سلطان کی

طرف سے ادا ہوتے تھے، قسطنطین نے اس رقم میں اضافہ کا مطالبہ کیا اور عدم منظوری کی صورت میں اورخان کو محمد کے مقابل کھڑا کر دینے کی دھمکی دی، اس نے اپنی غلط فہمی سے یہ خیال کیا کہ محمد ابھی ویسا ہی نا تجربہ کار ہے جیسا کہ چھ سال قبل تھا، اسے معلوم نہ تھا کہ اس قلیل مدت میں نو عمر سلطان کی قوتیں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی پا چکی ہیں اور اکیس ہی سال کی عمر میں وہ ارادہ کی پختگی، فوجی قابلیت اور ملکی تنظیم و تدبیر میں اپنے پیش روؤں کا حریف بن چکا ہے، محمد اس وقت ایشیائے کوچک کی بعض شورشوں کے فرو کرنے میں مصروف تھا، اس نے بازنطینی سفراء کو نرمی سے جواب دے کر ٹال دیا لیکن وزیر اعظم خلیل پاشا نے قسطنطین کو اس احتمالہ مطالبہ کے خطرات سے متنبہ کیا اور سفراء سے کہا کہ ”تمہارا جنون قسطنطنیہ کو سلطان کے ہاتھوں میں دے کر رہے گا، یورپ میں اورخان کے سلطان ہونے کا اعلان کرو، اہل ہنگری کو اپنی مدد کے لیے بلاؤ، جو صوبے تم واپس لے سکتے ہو واپس لے لو لیکن بہت جلد تم کو بازنطینی سلطنت کا خاتمہ بھی نظر آ جائے گا۔“

قسطنطنیہ کی اہمیت | اصل یہ ہے کہ ابتدا ہی سے محمد نے قسطنطنیہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کا تہیہ کر لیا تھا، سینوپ اور طرابزون کے علاوہ قدیم بازنطینی سلطنت کے تمام ایشیائی علاقوں پر عثمانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا، یورپ میں بھی صرف قسطنطنیہ اور اس کے مضافات اس سلطنت میں باقی رہ گئے تھے، قیصرہ کی وہ عظیم الشان سلطنت جو اپنی وسعت اور قوت کے لحاظ سے کبھی دنیا کی تمام سلطنتوں پر فوقیت رکھتی تھی، اب تباہی اور بربادی کی آخری حد تک پہنچ گئی تھی اور جہاں تک وسعت اور قوت کا تعلق تھا، گویا فنا ہو چکی تھی، تاہم اس حالت میں بھی قسطنطنیہ کا وجود بجائے خود نہایت اہم تھا اور قصر سلطنت کی یہ پہلی اور آخری اینٹ ہنوز اپنی جگہ قائم تھی، ترکوں نے جس وقت یورپ کی سرزمین پر قدم رکھا، اسی وقت سے اس شہر کو فتح کر لینے کا حوصلہ ان کے دلوں میں راسخ ہوتا گیا، جوں جوں فتوحات کا دائرہ بڑھتا جاتا تھا، ان کے ارادہ میں قوت آتی جاتی تھی اور بالآخر اس کا پہلا عملی اظہار بایزید یلدرم

کے عہد میں ہوا، جب کہ اس نے آبنائے باسفورس کے مشرقی ساحل پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرانے کے بعد قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع کیا لیکن محاصرہ کو چند ہی روز گزرے تھے کہ تیموری حملہ نے بائزید کو اسے اٹھالینے پر مجبور کیا اور جنگ انگورہ کے بعد کچھ دنوں کے لیے قسطنطنیہ محفوظ و مامون ہو گیا، مراد ثانی اگرچہ شہنشاہ قسطنطنیہ سے آویزش پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن خود شہنشاہ کی غداری نے اسے مجبور کیا کہ سلطنت عثمانیہ کی حفاظت کے خیال سے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے اس قتنہ کا استیصال کر دے، مگر سلطنت بازنطینی کے ایام حیات ابھی کچھ اور باقی تھے اور مراد کو بھی ایشیائے کوچک کی ایک بغاوت کے باعث محاصرہ اٹھا کر شہنشاہ کی اطاعت اور خراج قبول کرنے پر اکتفا کرنا پڑا، تاہم ترکوں کی نظریں اب بھی قسطنطنیہ پر جمی ہوئی تھیں، یہ شہر اپنے موقع کے لحاظ سے سلطنت عثمانیہ کا قدرتی پایہ تخت تھا، بحر مامورا کے دونوں ساحلوں پر عثمانیوں کی حکومت تھی لیکن جب تک قسطنطنیہ عیسائیوں کے قبضہ میں رہتا، سلطان کے ایشیائی اور یورپی صوبوں کا درمیانی تعلق کبھی محفوظ نہیں ہو سکتا تھا، لہذا علاوہ اس عظمت و شان کے جو اس تباہی اور بربادی کی حالت میں بھی بازنطینی سلطنت کے پایہ تخت سے وابستہ تھی، خود اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے بھی قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینا ناگزیر تھا، یہ مصالح بجائے خود محمد ثانی جیسے سلطان کو اس مہم پر آمادہ کرنے کے لیے کافی تھے، قسطنطین کی دھمکی نے اسے اور زیادہ برا بیچتہ کر دیا اور اس نے اپنے دور حکومت کے سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔

قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں | اس غرض سے کہ قسطنطنیہ کے محاصرہ کے دوران میں اسے کسی دوسری جانب متوجہ نہ ہونا پڑے، اس نے پہلے ایشیائے کوچک کی شورشوں کو فرو کیا اور امیر کرمانیہ سے صلح کر کے اس کی لڑکی سے عقد کر لیا، اس کے بعد تین سال کے لیے ہونیا ڈے سے بھی صلح کر لی، جس کی وجہ سے شمالی یورپ کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا، پھر اس نے ایک فوج موریا میں بھیج دی تاکہ شہنشاہ کے بھائی جو وہاں حکومت کرتے

تھے، قسطنطنیہ کی مدد کرنے سے روک دیے جائیں، ان تدبیروں سے فارغ ہو کر اس نے آبنائے باسفورس کے یورپی ساحل اور قسطنطنیہ سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر ایک زبردست قلعہ تعمیر کرانا شروع کیا، یہ قلعہ بائزید بیلدرم کے بنوائے ہوئے قلعہ کے جو آبنائے باسفورس کے ایشیائی ساحل پر واقع تھا، بالکل مقابل تھا، قسطنطین نے اس قلعہ کی تعمیر کے خلاف احتجاج کیا لیکن بے سود، دورانِ تعمیر میں بعض ترکوں نے چند یونانی کاشت کاروں سے کچھ چھپر کی جس نے ایک چھوٹی سی لڑائی کی شکل اختیار کر لی اور اس میں فریقین کے چند سپاہی مارے گئے، قسطنطین سمجھ چکا تھا کہ یہ ساری تیاریاں دراصل قسطنطنیہ پر حملہ کے لیے ہو رہی ہیں، اس نے خوف زدہ ہو کر شہر کا پھانگ بند کر لیا اور ایک وفد کے ذریعہ سے محمد ثانی کی خدمت میں ترک سپاہیوں کے طرزِ عمل کی شکایت کی، محمد نے اس شکایت کا جواب اعلانِ جنگ سے دیا، اب سلطنتِ بازنطینی کی موت و زبست کا مسئلہ آخری فیصلہ کا منتظر تھا۔

جدید قلعہ ۸۵۶ھ (۱۴۵۲ء) کے موسمِ سرما سے قبل تیار ہو گیا، آبنائے باسفورس اب تمام ترکوں کے قبضہ میں تھی، کوئی جہاز بغیر ان کی اجازت کے اسے عبور نہیں کر سکتا تھا، اس قلعہ کی تعمیر کے بعد محمد جنگ کی دوسری تیاریوں میں مصروف ہوا، اس نے اور نہ میں ڈیڑھ لاکھ فوج جمع کی لیکن قسطنطنیہ کی فتح کے لیے محض سپاہیوں کی تعداد کافی نہ تھی خواہ وہ کتنی ہی زیادہ رہی ہو، یہ شہر مثلث نما تھا جس کے دو حصے پانی سے گھرے ہوئے تھے، شمال میں شاخِ زریں اور جنوب میں بحرِ مامورا تھا، بری فوجیں صرف تیسرے حصہ سے حملہ کر سکتی تھیں، جو مغرب کی جانب واقع تھا لیکن اس کی حفاظت یکے بعد دیگرے تین زبردست دیواریں کر رہی تھیں، جو توپوں کی ایجاد سے قبل ہر طرح کے حملہ سے محفوظ خیال کی جاتی تھیں، اندر کی دونوں دیواریں بہت موٹی تھیں اور ان پر ایک سوسٹر فٹ کے فاصلہ سے مضبوط برج بنے ہوئے تھے، ان دیواروں کے درمیان ساٹھ فٹ کا فاصلہ تھا، باہر کی جانب دوسری اور تیسری دیوار کے بیچ میں ساٹھ فٹ چوڑی ایک خندق تھی، جو سو فٹ گہری تھی، یہ

دیواریں پانچویں صدی عیسوی میں شہنشاہ تھیوڈوسیوس ثانی (Theodosius II) نے تعمیر کرائی تھیں اور اب تک ایکس محاصروں میں قسطنطنیہ کو دشمنوں کے قدم سے محفوظ رکھ چکی تھیں، قسطنطنیہ کی فتح کے لیے ضروری تھا کہ ان دیواروں پر کام یابی کے ساتھ گولہ باری کی جائے، کچھ عرصہ سے ترکوں اور عیسائیوں نے جنگ میں توپوں کا استعمال شروع کر دیا تھا لیکن محمد نے مروجہ توپوں کو نا کافی خیال کر کے نہایت عظیم الشان توپیں بنوائیں، جو اپنی جسامت اور طاقت کے لحاظ سے بے نظیر تھیں، اربان (Urban) نامی ایک عیسائی انجینیر نے، جو ہنگری کا رہنے والا تھا اور بازنطینیوں کی ملازمت سے علاحدہ ہو کر سلطان کی خدمت میں چلا آیا تھا، ایک نہایت زبردست توپ ڈھالی، جس کے سنگی گولوں کا قطر ڈھائی فٹ تھا، اس کے علاوہ اس نے اور بھی توپیں بنائیں جو نسبتاً چھوٹی تھیں لیکن زیادہ تیزی کے ساتھ گولے برس سکتی تھیں، محمد نے قسطنطنیہ کے محاصرہ کے لیے ایک سو اسی جہازوں کا ایک بیڑا بھی تیار کرایا، وہ محاصرہ کی تیاریوں میں حد درجہ منہمک تھا اور اس کے لیے تمام سامان اپنی ذاتی نگرانی میں فراہم کر رہا تھا۔

مدافعت کی تیاریاں | ادھر قسطنطنین بھی مدافعت کی تیاریوں میں اسی قدر مصروف تھا، اس نے شہر کی دیواروں کی مرمت کرائی اور جو کچھ رسد ممکن تھی، بہم پہنچائی، اس کے بعد اس نے مغربی یورپ کے فرماں رواؤں سے مدد کی درخواست اور پوپ کی پوری اعانت اور ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کلیسائے روم کے تمام مطالبات کو منظور کر کے یونانی کلیسا کو اس سے ملحق کر دیا، سینٹ صوفیا میں پوپ کے نمائندہ کارڈینل اسیدور (Cardinal Isidore) کے زیر صدارت ایک مجلس منعقد ہوئی، جس میں شہنشاہ، اس کے درباری اور قسطنطنیہ کے تمام ملکی اور مذہبی عہدے دار شریک ہوئے اور کلیسائے قسطنطنیہ کو کلیسائے روم سے متحد کرنے کی تجویز کثرت رائے سے منظور کر لی گئی، اس فیصلہ نے یونانی پادریوں کو بہت برا فروختہ کیا اور شہر کی آبادی کے بڑے حصہ نے اس سے اپنی بے زاری کا علانیہ اظہار کیا، دونوں

کلیساؤں کے درمیان جو قدیم عناد چلا آتا تھا، وہ اس نازک موقع پر بھی قائم رہا اور شہنشاہ کے اس فعل نے خود اس کی رعایا کی ایک کثیر تعداد کو اس سے برگشتہ کر دیا، گرانڈ ڈپوک نوٹاراس (Notaras) جو تمام افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالار اور قسطنطنین کے بعد سلطنت کی سب سے بڑی شخصیت تھا، اس قدر برہم تھا کہ اس نے صاف لفظوں میں یہ کہا کہ کارڈینل کی ٹوپی کے مقابلہ میں قسطنطنیہ میں ترکوں کے عمائے دیکھنا مجھے زیادہ گوارا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ خود یونانیوں میں دو جماعتیں ہو گئیں، ایک جو کلیسائے رومہ کی طرف دار اور اس نازک وقت میں اس کی مدد کی خواست گارتھی، دوسری وہ جو اس حالت میں بھی کلیسائے رومہ سے اتحاد کرنے پر کسی طرح راضی نہ تھی، دوسری جماعت پہلی سے بڑی تھی، چنانچہ اس جماعت کے گرجاؤں نے شہنشاہ کو مالی مدد دینے سے انکار کر دیا اور اس میں سے جو لوگ جنگ میں شریک ہو سکتے تھے، ان کی ایک بہت قلیل تعداد نے شہر کی محافظت کے لیے آمادگی ظاہر کی، قسطنطنیہ کی آبادی باوجود بہت کچھ کم ہونے کے ایک لاکھ کے قریب تھی لیکن ترکوں کے مقابلہ میں قسطنطنین کی حمایت کے لیے صرف چھ ہزار یونانیوں نے اپنی خدمات پیش کیں۔

مغربی یورپ کی سردمہری | قسطنطنین نے مغربی یورپ سے مدد کی جو درخواست کی تھی، وہ بھی بہت ناکافی حد تک پوری ہوئی، پوپ میں آزمودہ کار سپاہیوں کی ایک تعداد اور کچھ مالی مدد کارڈینل اسیدور کے ساتھ روانہ کی، اٹلی اور اسپین کے بعض شہروں نے جو قسطنطنیہ سے تجارتی کاروبار رکھتے تھے، چند فوجی دستے بھیجے، دینس اور اسپین کے صوبہ کٹالونیا اور اراگن نے کچھ مدد کی لیکن ان سب سے زیادہ قیمتی مدد اہل جنوا کی طرف سے آئی، مشہور جنوی کمانڈر جان چسٹینانی (John Giustinani) دو جنگی جہازوں اور سات سو منتخب بہادروں کے ساتھ محاصرہ شروع ہونے سے تھوڑی ہی مدت آپہنچا، یہ شخص اپنی شجاعت اور اعلیٰ فوجی قابلیت کے لحاظ سے تنہا ایک فوج کے برابر تھا، دوران محاصرہ میں اور خاص کر آخری حملہ کے

روز اس نے ایسی جاں بازی کا ثبوت دیا کہ خود محمد ثانی کی زبان سے بے اختیار اس کی تحسین نکل گئی اور اس نے کہا ”کاش یہ شخص میرے فوجی سرداروں میں ہوتا“ بہر حال مغربی یورپ سے مختلف حکومتوں نے جو فوج بھیجی تھی اس کی مجموعی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی اور ان کو شامل کرنے کے بعد قسطنطین کی تمام فوج صرف نو ہزار تک پہنچی تھی، تعجب یہ ہے کہ قسطنطین کی درخواست کا کوئی اثر فرانس، جرمنی، ہنگری اور پولینڈ پر نہ ہوا اور سلطنتیں جو بار بار ایک عظیم الشان مسیحی اتحاد قائم کر کے ترکوں کو یورپ سے نکالنے کے لیے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھتی تھیں، قسطنطینہ کے اس آخری لمحہ حیات میں جب کہ ان ہی ترکوں کے ہاتھوں سلطنت بازنطینی کا خاتمہ ہو رہا تھا، کامل بے حسی اور بے پروائی کے ساتھ اپنے اپنے مقام سے اس منظر کو دیکھتی رہیں، بعض مورخین کا خیال ہے کہ قسطنطین کے معاملہ سے یورپ کو زیادہ دل چسپی نہ تھی، مگر ہمارے نزدیک عیسائی سلطنتوں کے اس طرز عمل کا باعث کچھ اور ہی تھا، گذشتہ ۶۵ سال کے اندر ترکوں کو یورپ سے خارج کر دینے کی غرض سے انہوں نے چار مرتبہ مذہبی اتحاد کے ذریعہ اپنی تمام قوتوں کو یک جا کیا لیکن ہر بار انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی اور مسیحی اتحاد کا شیرازہ بندھ بندھ کر منتشر ہوتا گیا، کسوا (۱۳۸۹ء)، نائیکو پولس (۱۳۹۶ء) وارنا (۱۴۴۳ء) اور کسوا (۱۴۴۸ء) کی تباہ کن شکستیں اتنی تازہ تھیں کہ یورپ اس قسم کے کسی مزید تجربہ کے لیے تیار نہ تھا اور باوجود اس کے کہ قسطنطین نے اپنا اور اپنی سلطنت کا مذہب تبدیل کر کے کلیسائے رومہ کی اطاعت قبول کر لی اور وہ کڑا لاجو صدیوں کی کوشش کے بعد بھی مغربی یورپ کی تمام قوتیں انجام نہ دے سکی تھیں، یورپ کے جمود میں کوئی محسوس حرکت پیدا نہ ہوئی اور قسطنطینہ کی دیواروں کو آخر کار محمد فاتح کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔

محاصرہ | ۲۶ ربیع الاول ۸۵۷ھ (۶ اپریل ۱۴۵۳ء) کو محاصرہ شروع ہوا، دوران محاصرہ میں یونانیوں نے غیر متوقع شجاعت اور استقلال کا ثبوت دیا، جھینانی کی فوجی مہارت خاص طور پر نمایاں تھی اور وہ اپنی قابلیت کے جوہر دکھا کر بار بار سلطان سے خراج

تحسین وصول کر رہا تھا، بری فوج کے حملہ کا ابھی کوئی معمولی اثر بھی ظاہر نہ ہونے پایا تھا کہ وسط اپریل میں ایک مختصر سی بحری جنگ پیش آگئی، ایک یونانی اور چار جنوی جہاز اہل قسطنطنیہ کے لیے سامانِ رسد لارہے تھے، بحرِ مامورا کو عبور کرنے کے بعد جب وہ آبنائے باسفورس میں بمشکل داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ ۱۴۰ عثمانی کشتیاں ان کی راہ میں حائل ہیں، جس وقت یہ جہاز بندرگاہ کے قریب پہنچے ترکی بیڑے نے حملہ کر دیا لیکن جنوی جہاز عثمانی کشتیوں کے مقابلہ میں بہت اونچے اور طاقت ور تھے، انہوں نے عثمانی کشتیوں پر پتھر اور آگ برسانا شروع کر دیا جس سے ان میں انتشار پیدا ہو گیا اور یہ انتشار ان کی کثرت تعداد کی وجہ سے اور بھی بڑھ گیا، سلطان ساحل پر کھڑا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے بے اختیار اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا لیکن ترکی بیڑا اس وقت تک اس قدر منتشر ہو چکا تھا کہ عیسائی جہازوں کو نکل جانے کا راستہ مل گیا اور وہ اہل قسطنطنیہ کے نعرہ ہائے مسرت کے ساتھ بہ حفاظت بندرگاہ میں پہنچ گئے۔

جنوی جہازوں کی اس شان و ارفع کا اخلاقی اثر محصورین پر بہت اچھا پڑا، ان میں جرأت و استقلال کی ایک نئی روح پیدا ہو گئی، تاہم صرف اس روح کا پیدا ہو جانا ہی مدافعت کے لیے کافی نہ تھا، جنوی رسد کے بعد پھر کوئی رسد انہیں باہر سے نہ مل سکی، دوسری طرف محمد نے بھی اپنی پہلی بحری شکست کے بعد محاصرہ کی سختی کے لیے ایک زیادہ مؤثر تدبیر سوچی، اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ آبنائے باسفورس کے اس حصہ میں جہاں پانی زیادہ گہرا تھا، ترکی بیڑا عیسائیوں کے طاقت ور جہازوں کے مقابلہ میں مشکل سے کام یاب ہو سکتا تھا، لہذا اس نے اپنی کشتیوں کی ایک بڑی تعداد بندرگاہ کے بالائی حصہ میں منتقل کر دینا چاہی، جہاں پانی تنگ اور چھپلا تھا اور جس میں یونانی اور جنوی جہاز اپنے قدم و قامت کی وجہ سے کام یاب نہیں ہو سکتے تھے، ہمسدر کے راستہ سے بندرگاہ کے اس حصہ تک پہنچنا ممکن نہ تھا، اس لیے محمد نے ایک ایسی صورت اختیار کی جو اس کی ذہانت اور آہنی عزم و استقلال کی ایک غیر فانی مثال ہے، باسفورس اور بندرگاہ

قسطنطنیہ کے درمیان پانچ میل کا فاصلہ ہے، اس نے اس درمیانی پہاڑی زمین پر لکڑی کے تختوں کی ایک سڑک بنوائی اور ان تختوں کو چرپی سے خوب چکنا کروا دیا اور ایک رات کے اندر اسی کشتیاں بیلوں سے کھنچوا کر بندرگاہ کے اس حصہ میں پہنچا دیں، قسطنطنیہ کا یہ حصہ اب تک بالکل محفوظ تھا، ترکی کشتیوں کے پہنچ جانے سے اب یہ بھی حملہ کی زد میں آ گیا اور قسطنطنین کو مجبوراً سپاہیوں کا ایک دستہ شہر کے دوسرے حصہ سے ہٹا کر اس حصہ میں متعین کرنا پڑا۔

اس درمیان میں شہر کی دوسری سمتوں میں برابر حملے ہو رہے تھے، لیکن ان زبردست دیواروں پر جو ایک ہزار سال سے دشمنوں کا مقابلہ کر رہی تھیں، ہنوز ان حملوں کا کوئی اثر ظاہر نہ تھا، بالآخر سات ہفتوں کی متواتر گولہ باری کے بعد دیواروں میں تین مقامات پر شگاف نمودار ہوئے اور محمد کو آخری حملہ کی کامیابی کا یقین ہو گیا، ۱۵ جمادی الاول ۸۵۷ھ (۲۳ مئی ۱۴۵۳ء) کو اس نے قسطنطنین کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ شہر کو سپرد کر دے تو رعایا کی جان و مال سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا اور موریا کی حکومت اسے دے دی جائے گی لیکن قسطنطنین نے اسے منظور نہ کیا، اس کے بعد محمد نے فوج میں اعلان کر دیا کہ ۱۰ جمادی الاول (۲۹ مئی) کو آخری حملہ ہوگا۔

سقوطِ قسطنطنیہ | ۲۰ جمادی الاول ۸۵۷ھ (۲۹ مئی ۱۴۵۳ء) کی رات ترکوں نے تسبیح و تہلیل میں گزاری اور فریضہ فخر ادا کرنے کے بعد حملہ شروع ہوا، حملہ مختلف سمتوں میں ہو رہا تھا لیکن سب سے زیادہ زور اس حصہ پر تھا جو دروازہ سینٹ رومانس کے قریب تھا، وہاں کی دیوار ترکی توپوں کی گولہ باری سے بہت کچھ مجروح ہو چکی تھی، عثمانی اور یونانی سپاہیوں کی تعداد میں کوئی مناسبت نہ تھی لیکن دوپہر سے پہلے تک انتہائی کوشش اور فتح کی پوری امید کے باوجود عثمانی فوج کا ایک سپاہی بھی شہر میں داخل نہ ہو سکا، قسطنطنین اور اس کے ساتھیوں نے اس روز حیرت انگیز شجاعت کا ثبوت دیا اور ترکوں کی باڑھ کو بے حد پامردی سے روکتے رہے لیکن محمد بھی عزم و استقلال کا مجسمہ تھا، وہ ابتدائی ناکامیوں سے متاثر نہ ہوا اور اب خود اپنے بی

چری دستوں کو لے کر آگے بڑھا، یونانی اس وقت تک بالکل خستہ ہو چکے تھے، ان میں اس تازہ حملہ کی تاب نہ تھی، اسی درمیان میں جھینائی کو جو گویا مدافعت کی روح تھا، ایک کاری زخم لگا، جس سے وہ کچھ ایسا خائف ہوا کہ جنگ سے بالکل کنارہ کش ہو گیا، ایسے نازک وقت میں جب محمد اپنی پوری قوت کے ساتھ حملہ کر رہا تھا، جھینائی کا اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر چلا جانا گویا شہر کو دشمن کے سپرد کر دینا تھا لیکن قسطنطین کے شدید اصرار کے باوجود وہ کچھ دیر بھی نہ ٹھہرا اور فوراً بندرگاہ میں چلا گیا، اس کے بٹنے ہی عیسائیوں میں کم زوری کے آثار نمایاں ہونے لگے، قسطنطین نے خود موقع پر پہنچ کر کمان اپنے ہاتھ میں لی مگر یہی چری کا حملہ اتنا سخت تھا کہ شہنشاہ اور اس کے بہادر سپاہیوں کی جاں بازی زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکی، یہی چری کا سردار آغا حسن اپنے تئیں ہم راہیوں کے ساتھ دیوار پر چڑھ گیا اور اگرچہ حسن اور اس کے اٹھارہ ساتھی فوراً مار کر گرا دیے گئے تاہم باقی کام یاب رہے اور اس کے بعد ہی ترکی دستانے بھی یکے بعد دیگرے پہنچتے گئے، یونانیوں کے لیے اب کوئی امید باقی نہ رہی، قسطنطین نے اپنی سرخ عبا جو قیصرہ کی امتیازی پوشاک تھی، اتار کر پھینک دی اور ترکی فوج کے بڑھتے ہوئے طوفان میں گھس کر ایک جاں باز اور سرفروش سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مارا گیا۔

فاتح کا داخلہ | چند لمحوں کے اندر قسطنطنیہ فاتحوں کے پے در پے دستوں سے بھر گیا، پہلے تو انہوں نے فتح کے ابتدائی جوش میں قتل عام شروع کر دیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب یہ جوش کسی قدر ٹھنڈا ہوا اور نیز یہ دیکھ کر کہ شہر والوں کی طرف سے مزاحمت نہیں ہوتی، انہوں نے اپنی تلواریں نیام میں کر لیں اور مال غنیمت کے حاصل کرنے میں مصروف ہو گئے، ظہر کے قریب سلطان محمد فاتح اپنے وزرا اور امرائے سلطنت کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، سینٹ صوفیا کے گرجے کے پاس پہنچ کر وہ گھوڑے سے اتر اور اس عالی شان معبد میں داخل ہو کر، جس میں گیارہ سو برس سے تین خداؤں کی پرستش ہوتی آئی تھی، خدائے واحد کی تسبیح و تقدیس کے لیے سربجذہ ہوا اور مؤذن کو حکم دیا کہ اللہ کے بندوں کو اس کی عبادت کے لیے آواز

دے، فتح کے دوسرے روز محمد نے شہر کا جائزہ لیا، جب قیصرہ کے شاہی محل میں پہنچا اور اس کے ویران اور اجڑے ہوئے ایوانوں پر نظر پڑی تو بے اختیار اس کی زبان پر یہ شعر آگیا:

پردہ داری می کند بر قصر کسری عنکبوت چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

قسطنطنیہ میں داخل ہونے کے بعد ترکوں نے جو کچھ کیا وہ تاریخ کا کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا، قرون وسطیٰ کے دستور جنگ میں مفتوحین کی جان و مال تمام تر فاتح کی ملک ہوتی تھی، جس پر اسے ہر طرح کا اختیار حاصل ہوتا تھا، یورپ کی سلطنتوں نے اس اختیار کے استعمال میں کبھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور ظلم و تعدی کی ایسی ہولناک مثالیں پیش کیں جو تخیل میں بھی بمشکل آسکتی ہیں، جب کبھی انہوں نے مسلمانوں پر فتح پائی وہ سب کچھ کر ڈالا جو تاریخ مظالم کے روشن ترین کارناموں میں شمار کیا جاسکتا ہے، اس کے مقابلہ میں ترکوں نے قسطنطنیہ میں داخل ہو کر جو کچھ کیا وہ حقیقتہً کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا، بلاشبہ شروع شروع میں جو بھی سامنے آیا اس کو قتل کر دیا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ عیسائیوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور مدافعت کی قوت ان میں باقی نہیں رہی تو فوراً ہی اپنی تلواریں نیام میں کر لیں اور مال غنیمت کے جمع کرنے میں مصروف ہو گئے، یہ سلسلہ تین روز تک جاری رہا، چوتھے روز سلطان نے امن عام کا اعلان کیا اور سپاہیوں کے ہاتھ دفعہً رک گئے، اس موقع پر ایورسلے لکھتا ہے:

”اگرچہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کیے اور یونانیوں کی

پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فتح قسطنطنیہ کے

موقع پر ویسی نفرت انگیز بد مستیوں کا مظاہرہ ہوا جیسی ۱۲۰۴ء میں دیکھی گئی تھیں جب کہ

مخارجین صلیبی نے اس پر قبضہ کیا تھا، داخلہ کے ابتدائی چند گھنٹوں کے بعد اس موقع پر کوئی قتل

عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہوئی، سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ

رکھنے میں پوری کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب رہا۔“

عیسائیوں کی مذہبی اور ملی آزادی | یکم جون ۱۴۵۳ء کو سلطان نے امن عام کا اعلان کیا اور ان تمام عیسائیوں کو جو قسطنطنیہ سے بھاگ گئے تھے، واپس آنے کی دعوت دی، اس نے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا اور انہیں آمادہ کیا کہ آکر اپنے پیشوں اور کاروبار میں پھر بدستور مشغول ہو جائیں، اس کے بعد اس نے یونانی کلیسا کے بطریق کو از سر نو اس کے عہدہ پر مامور کیا اور کلیسا کی سرپرستی خود قبول کی، ایک خاص فرمان کے ذریعہ یونانی بطریق کی ذات محترم قرار دی گئی، وہ اور نیز اس کے کلیسا کے دوسرے عہدہ دار تمام ٹیکسوں سے بری کر دیے گئے، اسی فرمان کے ذریعہ یونانیوں کے نصف گرجے انہیں واپس کر دیے گئے اور ان کو اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی دے دی گئی، اس فرمان میں سلطان نے انہیں اس امر کی بھی اجازت دی کہ وہ اپنے قومی معاملات اپنی ملی عدالتوں میں طے کر لیا کریں، ان عدالتوں کا صدر کلیسا کے بطریق جارج گنادیس (George Gennadius) کو مقرر کیا جو خود یونانیوں کا منتخب کردہ تھا، سلطان نے یونانیوں کے قانون نکاح اور قانون وراثت کو بدستور قائم رکھا اور ان کا نفاذ بطریق اور مذہبی عدالتوں کے سپرد کیا، پروفیسر آرنلڈ اپنی مشہور کتاب ”دعوت اسلام“ میں سلطان محمد فاتح کی اس رواداری کے متعلق لکھتے ہیں:

”سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے اور شہر میں امن ہونے کے بعد پہلا

ان نظام یہ کیا کہ وہ یونانی کلیسا کا حامی اور سرپرست بنا تا کہ عیسائی اس کی اطاعت قبول کریں، عیسائیوں پر سختی ہونے کی ممانعت کر دی اور ایک فرمان جاری کیا جس کے بموجب قسطنطنیہ کے نئے بطریق اور اس کے جانشینوں اور ماتحت استقفون کو قدیم اختیارات جو حکومت سابقہ میں ان کو حاصل تھے، دیے گئے اور جو ذریعے ان کی آمدنی کے تھے وہ بحال ہوئے اور جن قواعد سے وہ مستثنیٰ تھے ان سے بدستور مستثنیٰ کیے گئے، گنادیس کو جو ترکوں کی فتح کے بعد قسطنطنیہ کا پہلا بطریق ہوا، سلطان نے اپنے ہاتھ سے وہ عصا عنایت فرمایا جو اس کے منصب کا نشان تھا اور ایک خریطہ میں جس میں ایک ہزار اشرفیاں تھیں اور ایک گھوڑا جس پر بہت تکلف کا سامان تھا،

اس کو دیا اور اجازت دی کہ وہ اپنے قدیم سامانِ جلوس کے ساتھ شہر میں سوار ہو کر دورہ کرے، ترکوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ کلیسا کے سب سے بڑے افسر کی وہی عزت اور وقعت قائم رکھی جو اس کو عیسائی شہنشاہانِ روم کے وقت میں حاصل تھی بلکہ عدالت کے وسیع اختیارات بھی اس کو دیے، بطریق قسطنطنیہ کی ایسے کل مقدمات کا جن میں فریقین مسیحی المذہب ہوں، فیصلہ کرتی تھی، جرمانہ کرنے اور مجرموں کو قید کی سزا دینے کے اختیارات جس کے لیے علاحدہ قید خانے بنے ہوئے تھے اور خاص صورتوں میں سزائے موت کے حکم دینے کا بھی اختیار اس کو حاصل تھا، وزراء نے سلطنت اور ترکی حکام کو ہدایت تھی کہ اس عدالت کے فیصلوں کی تعمیل کریں، سابق کی عیسوی سلطنت نے رعایا کے مذہبی امور میں طرح طرح کی دست اندازیاں کی تھی لیکن ترکوں نے ان میں کچھ دخل نہیں دیا، بطریق اور اس کی مذہبی مجلس کو پورے اختیارات مذہب اور مذہبی انتظام کے بارہ میں حاصل ہوئے، بطریق مجاز تھا کہ مذہب مشوروں کی مجلس کو جب چاہے جمع کرے اور اس کے ذریعہ سے عیسوی فقہ اور اصول کے تمام مسائل کو بغیر سلطنت کی مداخلت کے طے کرے اور چوں کہ ایک حیثیت سے وہ سلطانی عہدہ دار بھی تھا، اس لیے اس کے اختیار میں تھا کہ مصیبت زدہ عیسائیوں کی حالت کی اصلاح اس طرح کرے کہ ناانصاف ترکی گورنروں کے کاموں سے سلطان کو اطلاع کر دے، یونانی اسقف جو اضلاع میں تھے، ان کی بھی بہت عزت تھی اور عدالت کے اختیارات ان کو اس قدر دیے گئے تھے کہ موجودہ زمانہ تک انہوں نے اپنے علاقوں میں عیسائیوں پر ترکی حاکموں کی طرح حکومت رکھی۔“

لارڈ ایورسلے کو بھی تسلیم ہے کہ ”محمد کی یہ عظیم الشان رواداری اس عہد کی مسیحی یورپین حکومت کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی، اہل اسپین نے ان مسلمان مورس کو جنہوں نے اپنے کو گرفتار کرنے والوں (عیسائیوں) کا مذہب اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، ان کے ملک سے نکالتے وقت اس کے نمونہ پر عمل نہیں کیا..... یونانیوں یا قسطنطنیہ کے

دوسرے باشندوں کو ترغیب یا جبر سے مسلمان بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔“

قسطنطنیہ کی جدید آبادی | عیسائیوں کو مذہبی آزادی کا پروانہ عطا کرنے کے بعد محمد قسطنطنیہ کو از سر نو آباد کرنے کی طرف متوجہ ہوا، عرصہ سے قسطنطنیہ کی آبادی برابر کم ہوتی جا رہی تھی، سلطان کی ترغیب اور حوصلہ افزائی سے شہر کے اکثر باشندے جو بھاگ گئے تھے، واپس آ گئے، سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں سے بھی بہت سے یونانی اور یہودی اور ترک خاندان کو منتقل کر کے قسطنطنیہ میں آباد کیا گیا، اس کے علاوہ ہر نئی فتح کے بعد محمد نے مفتوحہ ممالک کے ہزاروں باشندوں کو وہاں لاکر بسایا، اس کے عہد حکومت کے خاتمہ پر قسطنطنیہ اپنے آخری یونانی فرماں روا کے زمانہ سے بہت آباد اور خوش حال تھا لیکن اب اس شہر کی خالص یونانی حیثیت فنا ہو چکی تھی اور یونانیوں کے ساتھ ترکی، البانی، بلغاری اور سروی عنصر بھی بکثرت اس کی آبادی میں شامل ہو گیا تھا۔

دار السلطنت | قسطنطنیہ کی فتح عثمان کے خواب کی تعبیر تھی، یہی شہر اس انگشتری کا گنبد تھا، جسے عثمان اپنی انگلی میں پہننا چاہتا تھا لیکن جو ازل سے محمد فاتح کے لیے مقدر ہو چکی تھی، محمد نے قسطنطنیہ کو سلطنت عثمانیہ کا پایہ تخت بنا لیا، کسی نے اس فتح میں کی تاریخ ”بلدہ طیبہ“ (۸۵۷ھ) سے نکالی جو قرآن پاک کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔

قسطنطنیہ کے سابق محاصرے | قسطنطنیہ کی بنیاد بازنطیم (Byzantium) کے نام سے ۶۵۸ قبل مسیح میں پڑی تھی، اس وقت سے لے کر اس کی فتح تک انتیس بار اس شہر کا محاصرہ ہو چکا تھا لیکن صرف آٹھ مرتبہ دشمن کی فوج اس کے اندر داخل ہو سکی، وان ہیمر (Von Hammer) نے اپنی مستند اور ضخیم تاریخ دولت عثمانیہ میں ان تمام محاصروں کا ذکر کیا ہے، مسلمانوں نے بھی اس سے پہلے آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی کے یقین پر گیارہ بار قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تھا، مسند امام جنبل کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ”تم ضرور قسطنطنیہ فتح کر لو گے اور

فوج بھی خوب ہے اور اس کا امیر بھی خوب ہے،“ نیز بخاری، مسلم اور مسند ابن حنبل میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”میری امت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگی اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا ہے“ چنانچہ اس سعادت اور مغفرت کے حصول کے لیے سب سے پہلے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۴۸ھ (۶۶۸ء) میں ایک لشکر قسطنطنیہ کی فتح کے لیے روانہ کیا، اس مہم میں بہت سے صحابہ کرامؓ نے بھی شرکت فرمائی، مثلاً حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ، بن صامت، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ وغیرہ، بعض روایتوں میں ہے کہ اس لشکر کے سپہ سالار حضرت سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ تھے، بعض کے نزدیک اس کی قیادت یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی، محمد فرید بک نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے سب سے پہلے ۳۴ھ (۶۵۴ء) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا، وان ہمیر نے بھی تصریح کی ہے کہ عربوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ پہلی مرتبہ ۳۴ھ (۶۵۴ء) میں کیا اور اس فوج کے سپہ سالار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے لیکن اور تاریخوں سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی، بظاہر فرید بک کی روایت وان ہمیر ہی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے، وان ہمیر نے مسلمانوں کے دوسرے محاصرہ کی تاریخ ۴۷ھ (۶۶۱ء) درج کی ہے اور یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کو سالار عسکر لکھا ہے، فرید بک نے بھی یہی نقل کیا ہے لیکن وہ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ بتاتے ہیں، حالاں کہ آپ اس محاصرہ سے سات سال قبل ۴۰ھ میں شہید ہو چکے تھے، بہر حال تیسرا محاصرہ وان ہمیر اور فرید بک کی روایت کی رو سے ۵۲ھ (۶۷۲ء) میں ہوا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کو اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا، اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں مسلمہ نے ۹۷ھ (۷۱۵ء) میں قسطنطنیہ کا

محاصرہ کیا، پھر پانچواں حملہ خلیفہ ہشام کے عہد میں ۱۲۱ھ (۳۹ء) میں ہوا، چھٹا مہدی عباسی کے زمانہ میں ۱۶۴ھ (۸۰ء) میں ہارون الرشید کے زیر قیادت ہوا اور ساتواں ہارون الرشید کے سپہ سالار عبدالملک نے ۱۸۲ھ (۹۸ء) میں کیا، عربوں کے بعد عثمانی ترکوں کی باری آئی اور سلطان بایزید یلدرم نے دوبار محاصرہ کیا اور اگر تیمور اور بایزید کے درمیان تصادم نہ ہو گیا ہوتا تو ۸۰۵ھ (۱۴۰۲ء) میں قسطنطنیہ کا ترکوں کے ہاتھ میں آجانا بظاہر یقینی تھا، بایزید کی وفات کے بعد اس کے لڑکے شہزادہ موسیٰ نے یہ حوصلہ پورا کرنا چاہا لیکن شہزادہ محمد کی مصلحت بینی اور بھائیوں کی باہمی جنگ نے قسطنطنیہ کے لیے سپر کا کام دیا، آخری بار سلطان مراد ثانی نے ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں اس شہر کی فتح کا عزم کیا مگر وہ شہنشاہ کی مذمت اور اظہارِ اطاعت سے متاثر ہو گیا اور محاصرہ اٹھالیا گیا۔

غرض سلطان محمد ثانی سے پہلے مجاہدین اسلام گیارہ بار قسطنطنیہ کا محاصرہ کر چکے تھے لیکن کام یابی کا سہرا اسی فاتح کا منتظر تھا اور صحابہ کرامؓ کے مقدس خون نے جس چمن زار امید کی آب یاری کی تھی، اس کے پھولوں کا تاج اسی فیروز بخت کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

جامع ایوب رضی اللہ عنہ فتح کے تیسرے روز حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار کا انکشاف ہوا، آپ نے ۲۸ھ کے محاصرہ کے دوران میں وفات پائی تھی اور قسطنطنیہ کی فصیل سے متصل دفن ہوئے تھے، سلطان نے وہاں ایک مسجد تعمیر کرائی، جس کا نام جامع ایوب ہے اور اس وقت سے یہ دستور ہو گیا تھا کہ تخت نشینی کے موقع پر ہر سلطان اسی مسجد میں جا کر عثمان اول کی تلوار جامل کرتا تھا اور یہ تقریب رسم تاج پوشی کے قائم مقام سمجھی جاتی تھی۔

دیگر فتوحات | اگرچہ قسطنطنیہ کی فتح محمد کا سب سے زیادہ شان دار کارنامہ ہے اور اسی بنا پر وہ فاتح کے لقب سے مشہور ہوا، تاہم یہ اس کے سلسلہ فتوحات کی محض پہلی کڑی تھی، اس کا تین سالہ عہد حکومت تمام تر ملک گیری اور توسیع سلطنت ہی میں گزرا، یہ طویل مدت اس نے تقریباً مسلسل میدان جنگ میں صرف کی اور شاذ ہی کوئی مہم ایسی پیش آئی جس کے بعد

اس کے یورپی یا ایشیائی مقبوضات میں کوئی نیا علاقہ شامل نہ ہوا۔

یونان ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء) میں محمد نے یونان کا رخ کیا، وہاں قسطنطین کے دو بھائی دمتریس اور طامس دولت عثمانیہ کے باج گزار کی حیثیت سے علاحدہ علاحدہ حصوں پر حکم راں تھے، انہوں نے سلطان کے پہنچنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ اس کی خدمت میں اپنے سفیر بھیج کر فرماں برداری کا عہد کیا اور بارہ ہزار دوکات سالانہ خراج دینا منظور کیا۔

سرویہ اس کے بعد ۸۵۸ھ ہی میں محمد سرویہ کی طرف متوجہ ہوا اور سب سے پہلے سمندریہ پر حملہ کیا جو شاہ سرویہ جارج برنیکوویچ کی قیام گاہ تھا، چند ہی دنوں میں عثمانی توپوں کی گولہ باری نے اس شہر کو کھنڈر بنا دیا اور جارج برنیکوویچ کو بھاگنا پڑا، ہونیا ڈے یہ خبر سن کر فوراً سرویہ کی مدد کے لیے روانہ ہوا اور اس نے ترکوں کے مقدمہ الجیش کو، جو فیروز بے کی سرکردگی میں تھا، شکست دی لیکن اہل سرویہ اپنے ملک میں ہنگری کے اقتدار کو ناپسند کرتے تھے، کلیسارومہ کی مذہبی تقدیوں نے سرویہ کے باشندوں کو اس قدر برگشتہ کر دیا تھا کہ وہ علانیہ مسلمان ترکوں کو کیتھولک عیسائیوں پر ترجیح دیتے تھے اور عثمانی تسلط کو ہنگری کے اقتدار سے بدرجہا بہتر خیال کرتے تھے، چنانچہ اسی وجہ سے برنیکوویچ نے تیس ہزار دوکات سالانہ خراج کے وعدہ پر سلطان سے صلح کر لی۔

محاصرہ بلغراد دوسرے سال محمد پھر سرویہ میں داخل ہوا اور جنوب کی طرف سے بڑھتا ہوا بغیر کسی مزاحمت کے بلغراد تک پہنچ گیا، اس کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ کالشکر اور تین سو توپیں تھیں، یہ مہم دراصل بلغراد کی فتح کے لیے تھی جو اگرچہ سرویہ کی شمالی سرحد پر واقع تھا لیکن اس وقت ہنگری کے قبضہ میں تھا اور گویا ہنگری کا دروازہ تھا، اس کی فتح سے ہنگری کی فتح کا راستہ کھل جاتا اور پھر آسٹریا تک عثمانیوں کو روکنا مشکل ہو جاتا، محمد نے بلغراد پہنچ کر فوراً اس کا محاصرہ کر لیا، بری فوج کے علاوہ شہر کی شمالی سمت میں عثمانی بیڑا دریائے ڈینیوب پر قابض تھا، قسطنطنیہ کی فتح نے سارے یورپ کو خوف زدہ کر دیا تھا، جب محمد نے بلغراد کا محاصرہ کیا تو یورپ کے

تمام ملکوں میں ایک ہل چل مچ گئی اور پوپ نے صلیبی جنگ کا اعلان کر کے اپنے نمائندہ جان کاپسٹران (John Capistran) کو ساٹھ ہزار پر جوش مسیحی مجاہدوں کے ساتھ ہنگری کی مدد کے لیے روانہ کیا، ہونیازے نے مدافعت میں اپنی پوری قوت صرف کر دی، آٹھ روز کی گولہ باری کے بعد ۲۱ جولائی ۱۴۵۶ء کو سلطان نے ایک عام حملہ کا حکم دیا اور ترک شہر کے ایک حصہ میں داخل ہو گئے لیکن ابھی وہ پوری طرح قابض نہ ہو سکے تھے کہ عیسائیوں کے ایک زبردست حملہ نے ان کو پیچھے ہٹا دیا اور پھر دوسرے حملہ میں عثمانی دستے بالکل منتشر ہو گئے، یہ حال دیکھ کر محمد خود دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا لیکن اس کی حیرت انگیز شجاعت اس روز ترکوں کے قدم کو نہ روک سکی اور اسے بھی زخمی ہو کر میدان جنگ چھوڑنا پڑا، اس معرکہ میں پچیس ہزار ترک کام آئے اور ان کے پورے توپ خانہ پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا، محاصرہ اٹھالیا گیا اور بلغراد کی فتح جو ہنگری اور ویانا کے حملوں کا مقدمہ تھی، پچاس سال کے لیے ملتوی ہو گئی، ہونیازے اس جنگ میں اس قدر زخمی ہو گیا تھا کہ بیس ہی روز کے بعد مر گیا، سلطان کو جب اس کی وفات کی اطلاع ہوئی تو اس نے افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ یورپ کا سب سے بڑا سپہ سالار جاتا رہا، دو مہینے بعد جان کاپسٹران کا بھی، جس کی عمر ستر سال ہو چکی تھی، انتقال ہو گیا۔

سرویہ پر مکمل قبضہ بلغراد کا محاصرہ اٹھالینے کے بعد محمد اور نہ کو واپس گیا اور جارج برنیکوویچ پھر سرویا پر قابض ہوا لیکن اس کی عمر نوے سے متجاوز ہو چکی تھی اور تھوڑے ہی دنوں بعد ۸۶۱ھ (۱۴۵۷ء) میں اس کا انتقال ہو گیا، سرویا کی آزادی بھی اس کے بعد ڈیڑھ ہی دو سال قائم رہی، ۸۶۳ھ (۱۴۵۹ء) میں یہ ایک باقاعدہ طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، ہونیازے کی وفات کے بعد صدر اعظم محمود پاشا نے سرویا میں داخل ہو کر دو سال کے اندر پورے ملک کو فتح کر لیا، تاہم یہ ممکن تھا کہ سلطان پھر خراج قبول کر کے سرویا کی خود مختاری بدستور قائم رہنے دیتا لیکن جارج برنیکوویچ کے مرنے کے بعد جو خانہ جنگیاں شروع ہوئیں ان سے ملک کی آزادی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا، جارج نے حکومت کا انتظام مشترکہ طور پر اپنی بیوہ اور تین لڑکوں

کے سپرد کیا تھا، ان میں بہت جلد جھگڑے شروع ہو گئے، سب سے چھوٹے لڑکے لازار نے اپنی ماں کو زہر دے دیا اور بھائیوں کو حکومت سے نکال دیا، اب وہ سرویا کا تنہا فرمان روا تھا، اس نے بیس ہزار طلائی سکے سالانہ کے خراج کا وعدہ کر کے سلطان کی سرپرستی بھی حاصل کر لی لیکن دوسرے ہی سال اس کا انتقال ہو گیا، اب محمد نے یہ طے کر لیا کہ سرویا کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بنا لے، ہونیازے مرچکا تھا، اہل سرویا میں مزاحمت کی ہمت نہ تھی، پچھلے ستر سال کی لڑائیوں کے بعد وہ ہر دام پر امن و صلح کے لیے تیار تھے، لازار کی بیوہ ہیلینا نے اپنے ملک کی سیاسی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اسے کلیسائے روم سے وابستہ کر دینا چاہا لیکن سرویا والوں نے سخت مخالفت کی اور علانیہ کہہ دیا کہ وہ ترکوں کو رومن کیتھولک عیسائیوں پر ترجیح دیتے ہیں، چنانچہ امراء سرویا نے صدر اعظم محمود پاشا کے بھائی کو بلا کر اپنا سردار مقرر کیا اور جب ہیلینا نے اسے قید میں ڈال دیا تو انہوں نے سلطان سے مدد کی درخواست کی، سمندریا نے اپنے پھانک عثمانی فوجوں کے لیے کھول دیے، جس کی تقلید اور شہروں نے بھی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ۸۶۳ھ (۱۴۵۹ء) میں سرویا کا وجود بحیثیت ایک مستقل مملکت کے فنا ہو گیا۔

بوسنیا کی فتح | کلیسائے روم کے مظالم سے بوسنیا کے باشندے اہل سرویا سے بھی زیادہ عاجز تھے، انہوں نے بھی ترکوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھا، صدیوں سے وہاں لاطینی اور یونانی کلیساؤں کے معرکے گرم تھے، جن سے پریشان ہو کر بہت سے لوگ ان دونوں مسلکوں سے علاحدہ ہو گئے تھے اور اپنی عافیت کے لیے ایک نیا مذہب اختیار کر لیا تھا، جو بدعت بوگومیل (Bogumil Heresy) کے نام سے مشہور ہے لیکن اب اس جدید فرقہ کے لوگوں پر دوہرے مظالم ہونے لگے، وہ کبھی یونانی کلیسا کی شدید تعدیوں کا شکار ہوتے اور کبھی لاطینی کلیسا کی، یہ مظالم دیکھ کر اکثر اہل بوسنیا کو اسلام ہی کے دامن رحمت میں پناہ نظر آئی، محمود پاشا کی فوج شاہ بوسینا کی تنبیہ کے لیے، جس نے خراج دینا روک دیا تھا، فاتحانہ بڑھتی آرہی

۱۔ بلقان از ملر، ص ۲۹۶ ۲۔ جزیرہ نمائے بلقان اور شرق اولی، از شیول ملی، مطبوعہ لندن، ۱۹۲۱ء، ص ۴۰۴۔

تھی، بہت سے قلعوں نے ترکوں کا خیر مقدم کیا، بادشاہ میں جب مقابلہ کی طاقت نہ رہی تو اس نے جان بخشی کے وعدہ پر ہتھیار ڈال دیے، مگر محمد نے خلاف معاہدہ اس کو اور اس کے لڑکے کو قتل کر دیا، یوں بوسنیا بھی ۸۶ھ (۱۴۶۲ء) میں سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بن گیا، اس نے نوجوانوں میں سے تیس ہزارینی چری فوج کے لیے چن لیے گئے اور اس کے اکثر امراء مشرف باسلام ہوئے۔

موریا پر قبضہ | موریا میں خاندان پلوگوس کی حکومت کا بھی بتدریج خاتمہ ہو رہا تھا، طامس اور دمتریس نے خراج کے وعدہ پر اپنی خود مختاری قائم کر رکھی تھی لیکن جب بلغراد کی مہم میں سلطان کونا کامی ہوئی اور یورپ کے مذہبی جوش نے ترکوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو ایک لمحہ کے لیے روک دیا تو موریا کے فرماں رواؤں کو بھی دولت عثمانیہ کی سیادت کا بار محسوس ہونے لگا، پوپ نے بھی ان کے جذبات کو براہیختہ کیا، چنانچہ جب پوپ کا جنگی بیڑا بحر اسیجین میں نمودار ہوا تو طامس نے ہمت کر کے خراج کی رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا، اس سے قبل بھی تین سال سے باوجود متعدد تقاضوں کے سلطان کو موریا سے خراج کی کوئی رقم وصول نہیں ہوئی تھی لیکن ابھی تک علانیہ انکار کی نوبت نہیں آئی تھی، اسی لیے محمد نے کسی قسم کی سختی بھی نہیں کی تھی، اب یہ انکار گویا بغاوت کا اعلان تھا، چنانچہ وہ ۸۶۳ھ (۱۴۵۸ء) میں ایک بڑی فوج لے کر خود موریا آیا اور متعدد قلعوں کو فتح کرتا ہوا پتراس پہنچا جو طامس کا مستقر تھا، تیرا اس کے باشندے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے، قلعہ کے فوجی دستے نے بھی مزاحمت کی جرأت نہ کی، محمد نے پتراس کے باشندوں کے ساتھ بڑی فیاضی اور کشادہ دلی کا برتاؤ کیا، اس کے بعد کورنتھ فتح ہوا، کورنتھ کے باشندوں کے ساتھ بھی اس نے ویسی ہی مراعات کی اور انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا لیکن وہاں کے بہت سے لوگوں کو اس نے قسطنطنیہ اور اس کے مضافات میں لے جا کر آباد کیا، یہ لوگ کاریگر اور کاشت کار تھے، طامس اور دمتریس کو اب صلح کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، محمد نے ان کی درخواست قبول کی اور صلح نامہ کے

تکلمہ کے بعد وہ موریا سے چلا گیا لیکن اس کے جاتے ہی ان بھائیوں نے پھر شورش برپا کرنی شروع کی، محمد کو مجبوراً لوٹنا پڑا، اب کی بار اس نے تہیہ کر لیا کہ موریا کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بنا کر رہے گا، دمتریس نے اپنے کو مسٹرا (Mystra) کے قلعہ میں بند کر لیا اور مدافعت کی کوشش کی، مگر بہت جلد اسے ہتھیار ڈال کر قلعہ ترکوں کے سپرد کر دینا پڑا، محمد نے اس کے اخراجات کے لیے تھریس کا ایک شہر اور اس کے قریب امبروس (Imbros) لمنوس (Lemnos) اور سامو تھریس (Samothrace) کے جزیرے دے کر اسے اور نہ بھیج دیا، کچھ دنوں کے بعد یہ جاگیریں بھی ضبط کر لی گئیں اور محمد نے ان کے بجائے پچاس ہزار ایسپر (Asper) بطور پنشن کے مقرر کر دیئے لیکن دمتریس نے آخر میں رہبانیت اختیار کر لی اور ۸۷۵ھ (۱۴۷۰ء) میں اس کا انتقال ہوا، دمتریس کے بعد محمد طامس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے علاقہ کے شہروں کو یکے بعد دیگرے فتح کرنا شروع کیا، طامس نے اپنے مقبوضات کو بچانے کی ذرا بھی کوشش نہ کی اور اپنے خاندان کے ساتھ جہاز پر سوار ہو کر کارفو چلا گیا لیکن تین ہی مہینہ کے بعد اس نے کارفو کو بھی خیر باد کہا اور رومہ پہنچ کر پوپ کے دامن میں پناہ لی، وہیں ۸۷۰ھ (۱۴۶۵ء) میں اس کا انتقال ہو گیا، محمد نے موریا کے تمام علاقوں کو فتح کر کے ان پر قبضہ کر لیا، ۸۶۴ھ (۱۴۶۰ء) میں موریا بھی سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ ہو گیا۔

کرمانیہ | اسی زمانہ میں ایشیائے کوچک کے بعض حصوں پر بھی جو ابھی تک سلطنت عثمانیہ میں شامل نہ تھے، قبضہ کیا جا رہا تھا، کرمانیہ اور دولت عثمانیہ کی عداوت قدیم سے چلی آرہی تھی، محمد کی تخت نشینی کے چند دنوں بعد کرمانیہ کے امیر ابراہیم بیغ خراج ادا کرنے کا معاہدہ کر کے سلطان سے صلح کر لی تھی اور وہ آخر دم تک اس معاہدہ پر قائم رہا، اس کے انتقال کے بعد اس کے لڑکوں میں ریاست کے لیے جنگ چھڑ گئی، محمد نے ان سب کو برطرف کر کے خود کرمانیہ پر قبضہ کر لیا اور اسے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔

طرابزون اور سینوپ | ایشیائے کوچک میں سینوپ اور طرابزون پر اب تک دولت عثمانیہ کا قبضہ نہ ہوا تھا، محمد نے پہلے سینوپ کے مضبوط شہر پر حملہ کیا، اسماعیل بیگ امیر سینوپ کی چار سو توپیں اور دس بارہ ہزار سپاہی کچھ دیر بھی مقابلہ نہ کر سکے اور اس نے شہر سلطان کے حوالہ کر دیا، اس کے بعد محمد طرابزون کی طرف متوجہ ہوا، طرابزون کا شہر اور ملحق علاقے قدیم بازنطینی سلطنت کا جزو تھے، ۶۰۱ھ (۱۲۰۳ء) کے بعد سے جب کہ قسطنطنیہ پر محاربین صلیبی کا قبضہ ہو گیا تھا، طرابزون نے ایک جداگانہ مملکت کی شکل اختیار کر لی تھی، ۸۳۵ھ (۱۴۲۶ء) میں محمد نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اب ایشیائے کوچک کے تمام علاقے سلطنت عثمانیہ کے دائرے میں آ گئے، بحر اسود کے ساحل پر جنوا کے جو مقبوضات تھے وہ بھی فتح کر لیے گئے۔

یونانی مجمع الجزائر | محمد نے یونانی مجمع الجزائر کے بہت سے جزیروں پر بھی جو ونیس اور جنوا کے زیر حکومت تھے، حملہ کر کے انہیں فتح کر لیا، ان میں سے لسبوس (Lesbos) لمنوس (Lemnos) اور سیفالونیا (Cephalonia) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جزیرہ یوبیا (Uboea) کا بھی یہی حشر ہوا، یہ جمہوریہ ونیس کا مقبوضہ تھا، جس کے اور مقبوضات بھی جو موریا کے ساحل پر واقع تھے، سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے۔

کریمیا | قسطنطنیہ کے بعد محمد کا سب سے اہم کارنامہ کریمیا کی فتح تھی، جس کا سہرا دولت عثمانیہ کے مشہور سپہ سالار صدر اعظم احمد کدک پاشا کے سر ہے، کریمیا پر حملہ کے دو خاص اسباب تھے، ایک سبب تو یہ تھا کہ اس زمانہ میں جنوا سے دولت علیہ کے تعلقات بہت خراب ہو گئے تھے اور کریمیا میں کافہ کا مضبوط شہر جنوا کے قبضہ میں تھا، دوسرا سبب یہ ہوا کہ خود خان کریمیا نے، جسے اس کے باغی بھائیوں نے تخت سے اتار دیا تھا، محمد سے مدد کی درخواست کی لیکن ان اسباب کے علاوہ کریمیا کا محل وقوع بھی قسطنطنیہ کے تخت نشینوں کے لیے حد درجہ اہم تھا اور محمد جیسے بیدار مغز سلطان کی نظر سے یہ امر پوشیدہ نہ تھا کہ عثمانی

مقبوضات کے تحفظ کے لیے کریمیا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینا کس حد تک ضروری ہے، چنانچہ ۱۸۸۰ھ (۱۸۷۵ء) میں احمد کدک نے جنگی بیڑے اور چالیس ہزار فوج کے ساتھ پہلے کافہ پر حملہ کیا، اس شہر نے جو اپنی دولت اور مضبوطی کے لحاظ سے قسطنطنیہ کو چک کہلاتا تھا، چار روز میں ہتھیار ڈال دیے، بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ آیا، چالیس ہزار باشندے قسطنطنیہ کو منتقل کر دیے گئے اور ڈیڑھ ہزار نوجوان جنوی امراء بنی چری فوج میں داخل کیے گئے، پھر سرعت کے ساتھ پورے ملک پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا اور کریمیا کی آزادی ختم ہو گئی، اس کے بعد تین سو برس تک کریمیا کے خان دولت عثمانیہ کے محکوم رہے۔

ولاچیا | اسی زمانہ میں ولاچیا کے مظلوموں کی دردناک چیخیں قسطنطنیہ پہنچیں، جنگ کسوا (۱۳۸۹ء) کے بعد ولاچیا نے دولت عثمانیہ کی سیادت قبول کر لی تھی، سلطان محمد ثانی کے وقت میں اس ریاست کا امیر ولاد چہارم (Vlad IV) تھا، اس نے سلطان کے خلاف بغاوت کردی اور عثمانی تاجروں کو جو ولاچیا میں قیام پذیر تھے، سخت اذیتوں کے ساتھ قتل کرادیا، اس کا دست عقوبت خود اپنے ملک والوں پر بھی دراز تھا، اس کے مظالم اس قدر بڑھ گئے تھے کہ وہ ”ڈراکول“ (Drakul) یعنی شیطان کے لقب سے مشہور تھا، اسے لوگوں کو قتل کرنے میں خاص لطف آتا تھا اور قتل کے عجیب و غریب طریقے ایجاد کرتا رہتا تھا لیکن سب سے زیادہ لطف اسے جسم میں میخیں ٹھونک کر قتل کرانے میں آتا تھا، اکثر کئی کئی سو آدمیوں کو ایک ساتھ اس طریقہ سے قتل کراتا اور ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں سے اس کی شیطانی روح کو ایک خاص لذت حاصل ہوتی تھی، شیویل لکھتا ہے کہ اس کے ہم عصر بھی، جن میں سے کسی کا دامن مظالم کے دھبوں سے پاک نہ تھا، اس کی تعذیب کے انوکھے طریقوں سے ہیبت زدہ تھے اور اس کو ولاددی امپیلر (Vlad The Impaler) (یعنی میخیں ٹھنکوا کر قتل کرنے والا) کہتے تھے، غرض جب اس کے مظالم کی فریاد قسطنطنیہ پہنچی تو سلطان ایک زبردست فوج لے کر اس کی تنبیہ کے لیے روانہ ہوا لیکن قبل اس کے کہ وہ حملہ آور ہو، ولاد نے اس کی خدمت

میں ایک وفد بھیجا اور اس کی سیادت قبول کر کے دس ہزار روکات سالانہ خراج ادا کرنے کا عہد کیا اور یہ درخواست کی کہ سلطان کی جانب سے اس معاہدہ کی از سر نو تصدیق کر دی جائے جو ۹۵ھ (۱۳۹۳ء) میں بایزید یلدرم اور امیر ولاچیا کے درمیان ہوا تھا، محمد نے اسے منظور کیا اور واپس چلا آیا لیکن یہ معاہدہ ولاد کا محض ایک وقتی حیلہ تھا، وہ اس بہانہ سے سلطان کو نال کر ہنگری کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا، چنانچہ عثمانی فوجوں کے واپس ہوتے ہی اس نے ہنگری سے اتحاد کر کے پھر اپنی سابق معاندانہ روش اختیار کر لی، محمد کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے حالات کی تحقیق کے لیے اپنے نمائندے ولاچیا میں بھیجے، ولاد نے ان نمائندوں کو قتل کر دیا، اس کے بعد اس نے بلغاریا کے علاقوں میں جو دولت علیہ کے ماتحت تھے، لوٹ مار شروع کر دی اور بے حد مظالم کیے، وہ بلغاریا کے پچیس ہزار باشندوں کو بھی پکڑ لایا، یہ سن کر محمد نے پھر اس کے پاس پیغام بھیجا کہ اپنے حدود سے متجاوز نہ ہو اور ان قیدیوں کو رہا کر دے، ولاد نے اس کے جواب میں سلطانی ایلچیوں کے سروں میں میخیں ٹھنکوا کر انہیں فوراً ہلاک کر دیا، اب محمد کے لیے حملہ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، وہ ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ اس ظالم کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا، ولاچیا کے شہر کیے بعد دیگرے فتح ہوتے گئے، یہاں تک کہ پایہ تخت بخارسٹ پر بھی عثمانیوں کا قبضہ ہو گیا لیکن ولاد ہاتھ نہ آیا، اس نے بھاگ کر شاہ ہنگری کے یہاں پناہ لی، محمد جب بخارسٹ پہنچا تو اس نے وہاں ان قیدیوں کی لاشیں دیکھیں جن کو ولاد بلغاریا سے پکڑ لایا تھا، ان لاشوں کی تعداد بیس ہزار تھی، ان میں بچے اور عورتیں بھی تھیں، بہر حال محمد نے ولاد کو معزول کر کے اس کے بھائی رادول (Radul) کو جو اس کا معتمد علیہ تھا، اور جس کی تربیت بھی سلطان ہی کے زیر نگرانی ہوئی تھی، ولاچیا کا امیر مقرر کیا اور ولاد نے خون کی جو نہر جاری کر رکھی تھی وہ کسی طرح خشک ہوئی، ولاچیا پھر سلطنت عثمانیہ کی ایک اطاعت گزار ریاست ہو گئی، محمد نے اسے مکمل طور پر اپنی سلطنت میں ضم کر لینے پر اصرار نہیں کیا بلکہ صرف اطاعت اور خراج پر قناعت کی۔

البانیا اور ہرزگیو وینا | البانیا ابھی تک زیر نہ ہو سکا تھا، اسکندر بک محمد فاتح کا مقابلہ بھی اسی طرح کرتا رہا جس طرح اس نے مراد ثانی کا کیا تھا، محمد چاہتا تھا کہ اگر اسکندر بک خراج دینا منظور کر لے تو لڑائی ختم کر دی جائے مگر اس نے یہ شرط قبول کرنے سے انکار کر دیا، عثمانی فوجیں البانیا پر مکمل قبضہ نہ پاسکیں اور آخر کار ۸۶۵ھ (۱۴۶۱ء) میں سلطان نے اسکندر بک کو البانیا اور اپائرس کا فرماں روا تسلیم کر لیا، چھ سال کے بعد اسکندر بک کا انتقال ہو گیا، اب البانیا کی فتح میں کوئی دشواری باقی نہ رہ گئی تھی، محمد نے آسانی کے ساتھ اسے مستخر کر لیا اور البانیا اور اپائرس کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا، اس کے بعد ہرزگیو وینا کا علاقہ بھی عثمانی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔

وینس | البانیا کی فتح کے بعد اٹلی ترکوں کی زد میں آیا، جس طرح ہونیا ڈے نے شمال میں عثمانی فوجوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو چند دنوں تک روک رکھا تھا، اسی طرح اسکندر بک بھی مغرب میں ان کی راہ روکے ہوئے کھڑا تھا، اس کے مرنے کے بعد ہی اٹلی کا راستہ کھل گیا اور وینس پر حملہ کا مسئلہ زیر غور آ گیا، جمہوریہ وینس نے فتح قسطنطنیہ کے دوسرے ہی سال سلطان سے ہمت صلح کی درخواست کی تھی اور اس صلح نامہ کے ذریعہ محمد نے تقریباً وہ تمام تجارتی مراعات جو وینس کو بازنطینی شہنشاہوں کے عہد میں حاصل تھیں، اسے عطا کر دی تھیں لیکن اسکندر بک کی کامیابیوں نے وینس کے اندر بھی دولت عثمانیہ کے مقابلہ کا حوصلہ پیدا کیا اور اس کی نیاز مندی جاتی رہی، وینس کو اپنی بحری طاقت کا غرور تھا، دوسری طرف سلطنت عثمانیہ کو بھی بلقانی ریاستوں پر کامل اقتدار رکھنے کے لیے بحر ایڈریاٹک اور بحر الچین میں اپنے جنگی جہازوں کی تعداد بڑھانی ضروری تھی، البانیا کی تسخیر کے بعد بحر ایڈریاٹک کے تمام ساحلی علاقے اس کے قبضہ میں آ گئے تھے اور اب وینس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ ناگزیر ہو گئی تھی، لڑائی ۸۶۸ھ (۱۴۶۳ء) میں شروع ہوئی اور سولہ سال تک جاری رہی، یکے بعد دیگرے وینس کے ساحلی مقبوضات ترکوں کے قبضہ میں آتے گئے، یہاں تک کہ

جزیرہ یوبیا (نگر پونٹ) بھی جمہوریہ کے ہاتھ سے نکل گیا، ۸۸۲ھ (۷۷۷ء) میں ایک زبردست ترکی فوج فریولی (Friuli) کے علاقہ میں داخل ہوئی جو جرائڈ ریٹک کی شمالی حد پر واقع تھا اور اس پر تسلط قائم کرنے کے بعد وینس کی طرف بڑھی، وینس نے مزاحمت کے لیے فوج روانہ کی لیکن عمر پاشا سے شکست دیتا ہوا آگے بڑھ گیا اور دریائے پیاوے (Piave) کے ساحل تک کے تمام زرخیر علاقوں پر قابض ہو گیا، جمہوریہ کے لیے اب صلح کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، اگر اب بھی اسے کچھ تامل ہوتا تو اس کے بقیہ مقبوضات بھی نکل جاتے اور خود وینس کے شہر پر عثمانی علم نصب ہو جاتا، ۸۸۴ھ (۷۷۹ء) میں صلح نامہ پر دستخط ہو گئے، وینس نے سالانہ خراج ادا کرنے کا معاہدہ کیا اور سلطان نے اسے دوبارہ مشرق میں تجارت کرنے کی اجازت دی۔

روڈس کی ناکام مہم | وینس کی بحری قوت ٹوٹ چکی تھی لیکن بحرا تھین میں روڈس کا جزیرہ عثمانی جہازوں کی راہ کا کاٹنا تھا، اس جزیرہ پر ڈیڑھ سو برس سے یروٹلم کے مبارزین سنیٹ جان کی حکومت تھی جو آسانی کے ساتھ عثمانی جہازوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، محمد نے روڈس کی فتح کو ضروری خیال کر کے ۸۸۵ھ (۷۸۰ء) میں مسیح پاشا کو اس مہم پر روانہ کیا، مسیح پاشا نے جزیرہ پر اتر کر متعدد مقامات فتح کئے اور پھر خود شہر روڈس کا محاصرہ کر لیا، عیسائی مدافعت کے لیے پوری طرح تیار تھے اور محاصرہ طول کھینچ گیا، بالآخر ۱۸ ربیع الاول ۸۸۵ھ (۲۸ جولائی ۷۸۰ء) کو ترکوں نے ایک عام حملہ کیا، یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ عیسائی اپنی انتہائی شجاعت کے باوجود اسے روک نہ سکے اور بعض ترکوں نے دیواروں پر چڑھ کر ہلائی جھنڈا گاڑ دیا لیکن عین اس وقت جب وہ شہر میں داخل ہوا چاہتے تھے، مسیح پاشا کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ تمام مال غنیمت سلطان کے حق میں محفوظ سمجھ جائے گا، اس اعلان سے سپاہیوں میں سخت برہمی اور بے زاری پیدا ہو گئی اور جو ابھی تک باہر تھے، انہوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے، جو پہلے پہنچ چکے تھے، اندر جانے سے انکار کر دیا، عیسائیوں نے

عثمانی فوج کی یہ حالت دیکھ کر اپنی پوری قوت کے ساتھ جان توڑ حملہ کیا اور ان ترکوں کو جو شہر میں داخل ہو گئے تھے، شکست دے کر باہر نکال دیا، مسیح پاشا کو اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب کہ اس کی تلافی ناممکن تھی، اسے محاصرہ اٹھالینا پڑا اور روڈس کی تسخیر نصف صدی کے لیے ملتوی ہو گئی۔

اوٹرانٹو کی فتح | لیکن جس روز مسیح پاشا کو روڈس میں ہزیمت اٹھانی پڑی اسی روز احمد کدک پاشا فاتح کریمیا نے سرزمین اٹلی میں قدم رکھا جہاں اس وقت تک کوئی عثمانی سپاہی نہ پہنچا تھا، اٹلی کی فتح کے لیے اوٹرانٹو پر قبضہ کرنا ضروری تھا کیوں کہ یہ شہر اپنے موقع کے لحاظ سے گویا اٹلی کا دروازہ تھا، احمد پاشا نے فوراً خشکی اور سمندر دونوں جانب سے اس پر حملہ کیا، اہل شہر نے مدافعت میں بڑی سرگرمی دکھائی لیکن وہ صرف چند روز مقابلہ کر سکے اور ۲۴ جمادی الثانی ۸۸۵ھ (۱۱ اگست ۱۴۸۰ء) کو عثمانی فوج فاتحانہ اوٹرانٹو میں داخل ہو گئی۔

فاتح کی وفات | اوٹرانٹو جیسے مضبوط شہر اور بندرگاہ پر قابض ہونے کے بعد محمد کے لیے اٹلی کی فتح کا راستہ کھل گیا، دوسرے سال وہ کسی جدید مہم کے لیے فوجیں اکٹھا کر رہا تھا اور خیال تھا کہ اوٹرانٹو کے بعد غالباً رومہ پر حملہ ہونے والا ہے لیکن دفعہ ۳ ربیع الاول ۸۸۶ھ مطابق ۲ مئی ۱۴۸۱ء کو کیا دن سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا فاتح کی موت سے یورپ کی جان میں جان آئی، تجہیز و تکفین اس مشہور مسجد میں ہوئی جسے اس نے قسطنطنیہ میں تعمیر کرایا تھا، وہ پہلا سلطان تھا جو اس نئے دارالسلطنت میں دفن ہوا۔

فوجی قابلیت | سلطان محمد ثانی کا عہد حکومت شروع سے آخر تک میدان جنگ میں گزرا، کریمیا، روڈس اور اوٹرانٹو کی مہموں علاوہ ہر جنگ میں فوج کی کمان اسی کے ہاتھ میں تھی اور بلغراد کے علاوہ کسی معرکہ میں اسے شکست نہیں ہوئی، فاتح کا لقب اسے قسطنطنیہ کی فتح پر حاصل ہو گیا تھا لیکن اس کی ہر جنگ اس لقب کی تصدیق کرتی ہے، ایک سپہ سالار کی حیثیت سے وہ مراد ثانی پر بھی فوقیت لے گیا تھا، فوجی قابلیت میں اس کا کوئی افسر اس کا ہم

پلہ نہ تھا، حالاں کہ احمد کدک پاشا، محمود پاشا اور بعض دوسرے عثمانی سپہ سالاروں کا شمار اس وقت دنیا کے بہترین جنزلوں میں ہوتا تھا، وہ اپنے ارادوں کو بالکل راز میں رکھتا اور اس کے کسی کمانڈر کو بھی پہلے سے معلوم نہ ہوتا کہ حملہ کس سمت میں ہونے والا ہے، ایک بار جب کسی مہم کے لیے فوجیں جمع ہونے لگیں اور اس کے خاص افسروں میں سے ایک نے محمد سے پوچھا کہ دراصل کون سا شہر یا ملک پیش نظر ہے تو اس نے سختی سے جواب دیا کہ ”اگر میری داڑھی کے ایک بال کو بھی اس کی اطلاع ہو جائے تو میں اسے توڑ کر آگ میں ڈال دوں“ وہ جنگ کی کامیابی کے لیے رازداری اور سرعت عمل کو ضروری شرطیں خیال کرتا تھا اور اس نے ہمیشہ اسی اصول کی پابندی کی، جب وہ کسی حملہ کا عزم کر لیتا تو اسے پوری تیاری اور انتہائی شدت کے ساتھ انجام تک پہنچاتا، اسی وجہ سے عموماً اس کی مہمیں تھوڑے عرصہ میں سر ہو جاتی تھیں، البتہ وینس کے ساتھ لڑائیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ سولہ برس تک قائم رہا، اسی طرح البانیا کی فتح میں بھی کئی برس لگ گئے لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں۔

علوم و فنون کی سرپرستی | محمد کی عظمت فتوحات کی وسیع دائرہ میں محدود نہ تھی، اس کی خداداد قابلیت کے جو ہر رزم و بزم دونوں جگہ یکساں طور پر نمایاں تھے، بہترین اساتذہ کے زیر نگرانی اس نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ علوم و فنون کی تحصیل کی تھی، اپنی مادری زبان کے علاوہ عربی، فارسی، عبرانی، لاطینی اور یونانی زبان پر بھی قدرت رکھتا تھا، دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ سے اسے پوری واقفیت تھی، وہ ایک بلند پایہ شاعر اور شعر و سخن کا بہت بڑا سرپرست بھی تھا، اس کے دربار سے تیس عثمانی شعرا کو وظیفے ملتے تھے اور وہ ہر سال گراں قدر تحائف خواجہ جہاں (ہندوستان) اور مولانا جامی (ایران) کی خدمت میں بھی بھیجا کرتا تھا، اس کی محفلیں علماء اور اہل کمال سے معمور رہا کرتی تھیں، اس نے قسطنطنیہ اور سلطنت کے دوسرے شہروں میں نہایت کثرت سے مسجدیں، اسپتال، مکاتب اور مدارس قائم کیے اور ان کے

اخراجات کے لیے بڑی بڑی جائدادیں وقف کیں، اس کے تعلیمی نظام کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ آگے آتا ہے، اس کی علم دوستی کا اثر اس کے اعلیٰ عہدہ داروں پر بھی پڑا، چنانچہ محمود پاشا نے، جو شاعر بھی تھا، کئی مدرسے قائم کیے، مشرق و مغرب کے نام وروں کے کارنامے اس کے مطالعہ میں رہا کرتے تھے، مگن آخری بازنطینی مؤرخ فرانزا (Phranza) کے حوالہ سے، جو محمد فاتح کا ہم عصر تھا اور فتح قسطنطنیہ میں گرفتار بھی ہو گیا تھا، لکھتا ہے کہ سلطان سکندرا غسٹس، قسطنطین اور تھیوڈوسیوس کے سوانح حیات اور کارنامے بڑے انہماک سے پڑھا کرتا تھا، اس کے حکم سے یونانی سوانح نگار پلوٹارک (Plutarch) کی مشہور و معروف تالیف، جو مشاہیر یونان و رومہ کے تذکروں پر مشتمل ہے، ترکی زبان میں ترجمہ کی گئی۔

اخلاق و سیرت | لیکن علم و مذہب کا جو اثر تہذیب نفس پر پڑنا چاہیے تھا، وہ کما حقہ ظاہر نہ ہوا اور محمد کی بے باک فطرت بعض اخلاقی پابندیوں سے عموماً آزاد رہی، وہی مغربی مؤرخین جو مراد ثانی کے مکارم اخلاق اور شریفانہ اوصاف کے مداح ہیں اور اس کے سی سالہ عہد حکومت کے ایک واقعہ کو بھی قابل الزام نہیں ٹھہراتے، محمد ثانی کی سنگ دلی، بے اعتمادی اور عیاشی کی داستان بے تکلف بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ خفیف سے اشتعال پر وہ قتل کا حکم دے دیتا تھا، یہاں تک کہ بڑے بڑے پاشاؤں اور وزیروں کو بھی اپنی جان کی طرف سے کبھی اطمینان نہیں رہتا تھا، چنانچہ اس کے عہد میں دو صدراعظم بغیر کسی سابقہ تشبیہ یا اطلاع کے اس کے حکم سے دفعتاً قتل کر دیے گئے، لیکن پول کا بیان ہے کہ معاہدوں کے توڑنے میں وہ اہل ہنگری کا حریف تھا، شیویل کہتا ہے کہ اپنے عیسائی ہم عصروں کی طرح محمد اس مفید اصول کا قائل تھا کہ جو عہد کفار کے ساتھ باندھا جائے اس کی پابندی ضروری نہیں، دوسرے مغربی مؤرخین نے بھی ایسے ہی خیالات ظاہر کیے ہیں اور ان کی تائید واقعات سے کی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جن معاصرین سے محمد کا سابقہ تھا، ان کا طرز عمل اس

باب میں کیا تھا، لارڈ ایورسلے محمد کی سنگ دلی اور نقض عہد کے متعدد واقعات بیان کرنے کے بعد آخر میں لکھتا ہے:

”محمد کے مظالم اور غداریوں پر ایک بلند معیار کے لحاظ سے رائے قائم کرنا شاید قرین انصاف نہیں ہے، اس کے دشمن یعنی ان ملکوں کے فرماں روا جن پر اس نے چڑھائی کی اور جنہیں اس نے فتح کیا، ان باتوں میں اکثر اس سے کم نہ تھے، اسکندر بک جس کو البانیا کی وطن پرستانہ مدافعت کے صلہ میں اپنے ملک کے اندر ایک دلی کی شہرت اور تاریخ میں ایک بلند مقام حاصل ہوا، جب کبھی اسے موقع ملتا، حد درجہ سفاک اور انتقام جو ثابت ہوتا، وہ جنگ کے قیدیوں کو عادتاً قتل کر دیتا تھا، اس معاملہ میں موریا کے دونوں حکمراں بھی پیچھے نہ تھے، ولاچیا کا فرمان روا جس کا نام ولاد تھا تاریخ کے شدید ترین ظالم اور خون خوار بد معاشوں میں تھا، وہ ایمپلر (Impaler) یعنی جسم میں میخیں ٹھونک کر ہلاک کرنے والا مشہور تھا، اسے ان قیدیوں اور دوسرے مظلوموں کی، جنہیں وہ اس ظالمانہ طریقہ سے قتل کرتا، مرتے وقت کی اذیت اور تڑپ دیکھنے میں خاص لطف آتا تھا، وہ اس غرض سے اس کی ضیافتوں کی رونق کے لیے محفوظ رکھے جاتے تھے، ایک بار جب کسی مہمان نے اس بات پر تعجب ظاہر کیا کہ وہ ایسی موت سے مرنے والے کے جسم کی بو کیسے برداشت کرتا ہے تو اس نے اس مہمان کو فوراً سولی پر چڑھوایا اور حکم دیا کہ سولی کا کھبادوسروں سے زیادہ بلند رکھا جائے تاکہ جس بو کی مہمان نے شکایت کی ہے، اس کی تکلیف اسے نہ پہنچے۔“

اشتعال یا انتقام کے موقع پر محمد ثانی نے جو کچھ بھی کیا ہوتا، ہم اس کی فطرت نرم اور لطیف جذبات سے محروم نہ تھی، قسطنطنیہ کی فتح کے روز اس نے جس رحم دلی اور رقیق القلسی کا ثبوت دیا، اس کی مثال اس کے کسی ہم عصر نے کبھی پیش نہ کی، ڈیوک نوٹار اس جو افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالار اعظم تھا، جب گرفتار کر کے اس کے سامنے لایا گیا تو محمد نے اسے نہ

صرف معاف کر دیا بلکہ اپنی سرپرستی کا بھی یقین دلایا، اس نے ڈیوک کے ساتھ یہاں تک نوازش کی کہ اس کی بیوی کی عیادت کے لیے گیا، جو علالت اور تازہ مصیبت کے غم سے پریشان تھی اور نہایت نرمی اور احترام کے ساتھ جس طرح کوئی لڑکا اپنی ماں کو سمجھائے، اسے تسلی و تسفی دی، ایسی ہی نرمی کا برتاؤ اس نے حکومت کے بڑے بڑے افسروں کے ساتھ بھی کیا اور ان میں سے کئی ایک کا زرفدیہ اس نے خود ادا کیا، چند ہی دنوں میں اس کے عفو و کرم کا دامن تمام باشندگانِ شہر تک دراز ہو گیا۔

مگر جلد ہی یہ دامن خون کے دھبوں سے داغ دار نظر آنے لگا، نوٹار اس اور اس کے لڑکوں کے قتل کا واقعہ عیسائی مؤرخوں نے محمد کے نقص عہد، سنگ دلی اور نفس پرستی کی ایک بین مثال کے طور پر لکھا ہے اور دل کھول کر اسے برا بھلا کہا ہے لیکن گہن کی تحقیق نے حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے اور ایک بازنطینی مؤرخ کی حق گوئی سے بہتان کی یہ پوری عمارت جو بغض و عناد کی بنیاد پر قائم تھی، مسمار ہو گئی، عیسائی مؤرخین ڈیوک اور اس کے لڑکوں کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں اور قتل کا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ اس نے اپنے لڑکوں کو سلطان کے خلوت عیش میں بھیجنے سے انکار کر دیا تھا لیکن واقعہ یہ تھا کہ یہ قتل ایک سازش کا نتیجہ تھا جو نوٹار اس قسطنطنیہ کی رہائی کے لیے اٹلی سے کر رہا تھا، گہن لکھتا ہے کہ:

”ایسی باغیانہ سازش قابل ستائش ہو سکتی ہے لیکن جو باغی دلیرانہ جرأت کرتا ہے،

وہ اس کی پاداش میں اپنی جان کے حق سے بجا طور پر محروم ہو جاتا ہے اور اگر کوئی فاتح اپنے

دشمنوں کو قتل کر دے، جن پر آئندہ وہ اعتبار نہیں کر سکتا تو ہمیں اس کو قابل الزام نہ قرار

دینا چاہیے۔“

محمد ثانی ایک مطلق العنان فرماں روا کی طرح حکومت کرنا چاہتا تھا اور کسی وزیر کی

مداخلت کو گوارا نہ کرتا، عثمان سے لے کر مراد ثانی تک تمام سلاطین اپنے وزیروں اور سپہ سالاروں

سے مشورہ لیا کرتے تھے اور انہیں شریک دسترخوان بھی کرتے تھے لیکن محمد نے اس دستور کو اٹھا دیا، وہ صرف احکام نافذ کرتا اور کسی کو محرم راز نہ بناتا، کھانا بھی وہ تنہا کھایا کرتا۔

آئین سلطنت | ایک واضح قانون کی حیثیت سے سلطان محمد ثانی اپنے تمام پیش روؤں سے ممتاز نظر آتا ہے، اور خان کے عہد میں دولت عثمانیہ کے پہلے وزیر علاء الدین نے چند فوجی اصلاحات جاری کی تھیں.....، جن کی تکمیل مراد اول کے زمانہ میں ہوئی لیکن نظام حکومت کے لیے کوئی دستور اس وقت تک مرتب نہ ہوا تھا، محمد ثانی پہلا سلطان ہے جس نے آئین سلطنت کو باضابطہ طور پر ترتیب دیا، اس کا ”قانون نامہ“ سلطنت عثمانیہ کا بنیادی دستور ہے۔

ارکان حکومت | قانون نامہ میں سلطان کو ایک خیمہ سے تشبیہ دی گئی ہے، جو چار ستونوں پر قائم ہے، یعنی (۱) وزراء سلطنت، (۲) قضاة عسکر، (۳) دفتر دار (خازن) اور (۴) نشاخی (معمد سلطنت)، اس شاہی خیمہ کا بلند دروازہ باب عالی کے نام سے موسوم ہے، جس سے مراد حکومت عثمانیہ ہے۔

وزرا حکومت کے سب سے بڑے عہدہ دار تھے، محمد ثانی کے عہد میں ان کی مقررہ تعداد چار تھی، ان کو صدر وزیر اعظم، سلطنت کے تمام عہدے داروں کا افسر اعلیٰ تھا، اسی کے پاس حکومت کی مہر ہا کرتی تھی، جو بلند ترین منصب کا نشان تھا، تفصیلات پر غور و بحث کرنے کے لیے اسے اپنے مکان پر بھی مجلس وزراء کے منعقد کرنے کا اختیار حاصل تھا، قضاة عسکر کا تقرر علماء کی جماعت سے ہوتا تھا، محمد کے زمانہ میں قاضی عسکر دو تھے، ایک یورپ کی تمام عثمانی عدالتوں کا صدر تھا، دوسرا ایشیا کی، علماء ہی کی جماعت سے تین بڑے عہدہ دار مقرر کیے جاتے تھے، جن کا مرتبہ اس وقت قضاة عسکر کے بعد تھا۔

(۱) خواجہ جو سلطان اور شہزادوں کا اتالیق ہوتا تھا، (۲) مفتی اور (۳) قاضی

قططنیہ نشاخی کے سپرد سرکاری دستاویزوں کے تیار کرنے اور ان پر سلطان کا طغرا خت

کرنے کی خدمت تھی، یہ منصب بعد کو صرف تعظیمی رہ گیا، اس کے تمام متعلقہ فرائض بتدریج رئیس آفندی (چیف سکرٹری) کی طرف منتقل ہو گئے۔

دیوان | حکومت کی مجلس حل و عقد کا نام دیوان تھا، سلطان کی غیر موجودگی میں وزیر اعظم اس کا صدر ہوتا تھا، دوسرے وزراء اور قضاة عسکر اس کے داہنے بازو پر بیٹھتے تھے، دفتر دار اور نشانچی کی جگہیں بائیں جانب تھیں، ضرورت کے وقت دیوان کا خاص اجلاس وزیر اعظم کے مکان پر بھی ہوتا تھا۔

آغا | ان عمائدین سلطنت کے علاوہ بڑے بڑے آغا بھی تھے، جو سلطنت کے دست و بازو سمجھے جاتے تھے، ان کی دو تقسیمیں تھیں، خارجی آغا اور داخلی آغا، خارجی آغا کی جماعت سے وہ فوجی حکام منتخب ہوتے تھے جن کے سپرد صوبوں کی حکومت ہوتی تھی، داخلی آغا دربار کے عہدوں پر مامور ہوتے تھے، فوجی آغاؤں میں بنی چری کے آغا اور سپاہی اور دوسرے سوار دستوں کے آغا خاص طور پر ممتاز تھے، بنی چری کا آغا قسطنطنیہ کی پولیس کا افسر اعلیٰ بھی ہوتا تھا اور داخلی آغا قصر سلطانی کے اعلیٰ عہدہ دار ہوتے تھے، مثلاً قاپو آغا (گورے خواجہ سراؤں کا افسر)، قیزلر آغا (جیشی خواجہ سراؤں کا افسر)، بوستانچی ماشی (باغبانوں کا افسر)، چاؤش باشی (حکومت کے قاصدوں کا افسر) وغیرہ، محکمہ دیوانی کے بہت سے عہدوں پر بھی یہ داخلی آغا مقرر کیے جاتے۔

سخت بے | محمد فاتح کے عہد میں صوبوں کی حکومت بے اور بیلر بے کے سپرد ہوتی تھی، بے وہ پاشا کہے جاتے تھے، جن کے نیزوں کے سرے پر ایک گھوڑے کی دم باندھی جاتی تھی، یہ عثمانیوں کا فوجی نشان تھا، بیلر بے وہ پاشا تھے جن کے علم میں دو گھوڑوں کی دمیں ہوتی تھیں، یہ ان جاگیرداروں کے سردار تھے جن کو فوجی خدمات کے صلہ میں زمینیں دی گئی تھیں اور جن کے فرائض میں داخل تھا کہ جنگ کے موقعوں پر مسلح ہو کر حاضر ہو جایا کریں، یہ لوگ ایسے وقتوں میں اپنے اپنے سرداروں کے علم کے نیچے جمع ہو جاتے تھے، علم کو ترکی زبان میں

سنجق کہتے ہیں اور چون کہ ہر علاقہ کا سنجق الگ تھا، اس لیے ان علاقوں کا نام ہی سنجق پڑ گیا اور ان کے سرداروں کو سنجق بے کہنے لگے، پاشا کا لقب جو عموماً صوبوں کے والیوں کو دیا جاتا تھا، حقیقتہً کسی حاکمانہ اختیار یا فوجی منصب کا نشان نہ تھا، بلکہ محض ایک اعزازی لقب تھا، ابتداءً عثمانیوں میں پاشا کے لقب کا استعمال صرف ان افسروں کے لیے نہیں ہوتا تھا جو فوج کی قیادت کرتے تھے یا جن کے ہاتھ میں صوبوں یا شہروں کی حکومت تھی، جن اول پانچ پاشاؤں کا ذکر عثمانی مصنفین نے کیا ہے، ان میں سے تین ادیب تھے، رفتہ رفتہ یہ اعزازی لقب ان لوگوں کے لیے مخصوص ہو گیا جو سلطان کی طرف سے فوج کے کمانڈر اور علاقوں اور اہم شہروں کے حاکم مقرر کیے جاتے تھے، یہاں تک کہ لفظ پاشا لفظ گورنر کے تقریباً مترادف ہو گیا۔

محمد ثانی کے زمانہ میں چھتیس سنجق سلطنت عثمانیہ کے صرف یورپی علاقوں میں تھے، جن میں سے ہر ایک کے نیچے چار چار سو سوار جمع ہوتے تھے، یورپ اور ایشیا میں سلطنت کے باضابطہ سواروں اور پیادوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی، اس میں وہ سوار اور پیادے شامل نہ تھے، جو ہر جنگ کے موقع پر بطور خود اپنی خدمات پیش کرتے تھے اور جن کا معاوضہ صرف مال غنیمت تھا، سلطنت کی سالانہ آمدنی بیس لاکھ روکات سے زیادہ تھی، آمدنی کی مدوں میں مال گزاری کے علاوہ محصول درآمد، معدنیات، جرمانے اور خراج کی رقمیں بھی شامل تھیں۔

علماء | قانون نامہ کا نہایت اہم حصہ وہ ہے جس میں مذہب اور عدالت کے عہدہ داروں کا نظام قائم کیا گیا ہے، چون کہ قضاۃ عسکر کا تقرر علما کی جماعت سے ہوتا تھا اور وہ خیمہ سلطنت کے چار ستونوں میں سے ایک ستون تھے، اس لیے محمد ثانی نے اس جماعت کی تعلیم و تنظیم پر خاص توجہ کی، کرہی لکھتا ہے:

”محمد ثانی کے پیش روؤں خصوصاً اور خان کو اسکولوں اور کالجوں کے قائم کرنے

کا بہت شوق تھا لیکن محمد ان سب سے بڑھ گیا تھا، اسی نے ”سلسلہ علما“ کو قائم کیا اور سلطنت کے مفتیوں اور قاضیوں کی تعلیم و ترقی کا ضابطہ مرتب کیا، فاتح قسطنطنیہ خوب جانتا تھا کہ ایک بڑی سلطنت کے پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے جواں مردی اور فوجی مہارت کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ضروری ہیں، محمد نے جو خود بھی علوم میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا، اپنی رعایا میں تعلیم پھیلانے کے لیے بڑی عالی حوصلگی سے کام لیا، وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ عدالت کا نظم و نسق جیسا کہ چاہیے درست رکھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ قاضیوں کا احترام قائم کیا جائے اور ان کا احترام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف علم و دیانت سے آراستہ ہوں بلکہ سلطنت کے اونچے اور باعزت عہدوں پر بھی مامور کیے جائیں، نیز افلاس کے وسوسوں اور پریشانیوں سے محفوظ کر دیے جائیں۔“

اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر محمد ثانی نے تعلیم کا جو نظام مرتب کیا وہ مذہبی اور علمی حیثیت کے علاوہ سیاسی حیثیت بھی رکھتا تھا، جیسا کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے:

”پچھلے عہد میں تمام مدرسے محض مذہبی مدرسے ہوتے تھے، اگرچہ ان میں اور علوم بھی پڑھائے جاتے تھے لیکن ترکوں کا سررشتہ تعلیم پولیٹیکل حیثیت رکھتا تھا، وہ سلطنت کے لیے لائق لائق عہدہ دار پیدا کرتا تھا۔“

علاوہ مکاتب کے جو ہر قبضہ کے ہر محلہ اور تقریباً تمام بڑے بڑے دیہاتوں میں کھول دیے گئے تھے، محمد نے کثرت سے اونچے درجہ کے مدرسے بھی قائم کیے اور ان پر جاندادیں وقف کیں، یہ مدرسے موجودہ زمانہ کے کالجوں کے برابر تھے، ان میں دس مضامین کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی، یعنی صرف، نحو، منطق، مابعد الطبیعیات، لسانیات، بلاغت، طرز تحریر، فن خطابت، تقلیدس اور ہیئت، جو طلبہ ان تمام مضامین میں پوری دست گاہ حاصل کر لیتے تھے ان کو دانش مند کی سند ملتی تھی، جو موجودہ یونیورسٹیوں کے ایم، اے کی سند کے

۱۔ کریمی، جلد ۱، ص ۱۷۰-۱۶۹ ۲۔ ”مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم“ از مولانا شبلی نعمانی۔

برابرتھی، یہ سند کسی ابتدائی مدرسہ کی اعلیٰ مدرسے کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی لیکن علما کی جماعت کارکن بننے کے لیے دانش مند کی سند حاصل کرنے کے بعد فقہ اور اصول فقہ کا ایک طویل نصاب مکمل کرنا پڑتا تھا اور مختلف امتحانات پاس کرنے پڑتے تھے، اس جماعت میں وہی لوگ داخل کئے جاتے تھے، جو علوم کے بلند ترین مراتب پر فائز ہوتے اور ایسے لوگوں کو حکومت کی طرف سے بڑے بڑے عہدے اور منصب ملتے تھے اور انہیں خاص رعایتیں اور حقوق حاصل تھے، مدرسوں (کالجوں) کے اساتذہ جو مدرس کہے جاتے تھے، علما ہی کی جماعت سے مقرر ہوتے تھے اور اسی جماعت سے تمام حکام عدالت کا انتخاب بھی ہوتا تھا، مثلاً قصبوں اور دیہاتی علاقوں کے قاضی، ملا یعنی بڑے بڑے شہروں کے قاضی، استنبول آفندی یعنی قسطنطنیہ کا قاضی اور ناظر اعلیٰ، قضاة عسکر یعنی روسلیا اور اناطولیہ کے قاضی القضاة اور مفتی، یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ علما کی جماعت کوئی مخصوص مذہبی جماعت نہ تھی، بلکہ ایک علمی جماعت تھی جس سے بڑے بڑے ملکی عہدہ دار، حکام فوج داری اور مدرسوں کے اساتذہ مقرر کیے جاتے تھے، خالص مذہبی جماعت جس میں مسجدوں کے امام، خطیب اور مبلغین شامل تھے، طبقہ علما کا محض ایک جز تھی، عام خیال یہ ہے کہ اس مذہبی گروہ کا اثر عثمانی ترکوں پر بہت زیادہ تھا اور اکثر مغربی مورخین نے بھی دولت عثمانیہ کے زوال کا ایک بڑا سبب علما نے مذہب ہی کو قرار دیا ہے جن کا جمود ترقی کی ہر راہ کا پتھر تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جماعت کا اثر بہت کم تھا، فان ہیمیر لکھتا ہے:

”نام نہاد مذہبی گروہ یعنی مسجدوں کے اماموں، مؤذنین اور خطیبوں کا اثر سلطنت

عثمانیہ میں شاید ہر مملکت سے کم ہے، برخلاف اس کے معلمین کی جماعت کا اقتدار اور اہمیت

اس قدر ہے کہ اس کی مثال چین کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔“

کر لیں جس کی تحقیق فان ہیمیر کے علاوہ دوسرے قدیم ماخذوں پر بھی مبنی ہے،

اس کی تائید کے ذیل میں لکھتا ہے:

”عثمانیوں کے شرف و افتخار کا یہ واقعہ بھی ضبط تحریر میں لانا چاہیے کہ ان میں مدرسین اور ان تمام اشخاص کا احترام جو خود علمی فضیلت میں ممتاز ہوں، یا اس کے حاصل کرنے میں دوسروں کی رہنمائی کا خاص ملکہ رکھتے ہوں، ہر عیسائی قوم سے زیادہ کیا جاتا ہے۔“

خونیں قانون | سلطان محمد ثانی نے حکومت کی ابتدا اپنے شیرخوار بھائی کے قتل سے کی تھی، جب اس نے اس قانون نامہ کو مرتب کرنا شروع کیا تو برادر کشتی کو بھی سلطنت کے تخت نشین کے لیے ایک قانون بنا دیا اور یہ دفعہ دستور حکومت میں درج کر دی:

”میرے فقہا کی اکثریت نے یہ فتویٰ صادر کیا ہے کہ میرے جانشینوں میں سے

جو تخت پر بیٹھیں وہ دنیا کے امن و امان کی غرض سے اپنے بھائیوں کو قتل کر سکتے ہیں، ان کا فرض ہوگا کہ اس پر کار بند ہوں۔“

بایزید ثانی

۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ مطابق ۱۳۸۱ء تا ۱۵۱۲ء

سلطان محمد ثانی نے اپنی وفات پر دوڑ کے چھوڑے، بڑا لڑکا شہزادہ بایزید اماسیا کا حاکم تھا اور چھوٹا شہزادہ جم (جمشید) کرمانیہ کا، بایزید کا میلان طبع زیادہ تر مذہب اور فلسفہ کی جانب تھا جس کی وجہ سے لوگ اسے صوفی کہتے تھے، وہ نہایت سادہ مزاج، حلیم، نرم خواہ اور پابند شرع تھا، شاعری سے بھی خاص ذوق رکھتا تھا لیکن ان خصوصیات کے باوجود سپاہیانہ شجاعت میں بھی کم نہ تھا اور میدان جنگ میں پہنچ کر یہ صوفی مجاہد بن جاتا تھا، شہزادہ جم میں زیادہ تر سلطان محمد کے اوصاف پائے جاتے تھے، وہ فنون حرب کا ماہر اور شجاعت میں اپنے باپ کا مماثل تھا، حکم رانی کا ملکہ اور ملک گیری کی اہلیت اسے خداداد حاصل تھی، اس کے ساتھ شاعری میں بھی اس کا پایہ بلند تھا۔

جس وقت سلطان محمد کے انتقال کی خبر قسطنطنیہ میں مشتہر ہوئی، بینی چری نے تمام شہر میں لوٹ مار شروع کر دی اور وزیر اعظم کو جس نے سلطان کی وفات کو مخفی رکھنے کی کوشش کی تھی، قتل کر دیا، چونکہ وزیر اعظم کے متعلق معلوم تھا کہ وہ شہزادہ جم کا طرف دار ہے، اس لیے شہزادہ بایزید کے حامیوں نے بہ آسانی بینی چری کی حمایت حاصل کر لی، اس کے بعد باقی افواج نے بھی بینی چری کے تتبع میں بایزید کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، شہزادہ جم کو سلطان کی

وفات کی اطلاع دیر میں ہوئی، اس درمیان میں شہزادہ بایزید نے قسطنطنیہ پہنچ کر تخت پر قبضہ کر لیا، بی چری نے اس کی حمایت کی لیکن تخت نشینی کے موقع پر اپنی تنخواہوں میں اضافہ اور بخشش کا مطالبہ بھی پیش کیا، اس رسم کی بنا سلطان محمد کی تقریب تاج پوشی میں پڑچکی تھی، بایزید کو مجبوراً یہ مطالبہ پورا کرنا پڑا، اس کے بعد تین سو برس تک یہ دستور قائم رہا کہ ہر نئے سلطان کی تخت نشینی کے وقت بی چری کو بڑی بڑی رقمیں بطور انعام کے دی جاتی تھیں، بقول کریمی یہ رسم جس قدر خزانہ شاہی کے لیے ہارتھی اسی قدر سلاطین کے لیے باعث شرم تھی۔

شہزادہ جم | خاندان عثمانی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس کا کوئی شہزادہ تاج و تخت سے کم پر کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا، اسی لیے کسی سلطان کے مرنے پر اس کے لڑکوں میں تخت سلطنت کے لیے جنگ کا شروع ہو جانا لازمی تھا، چنانچہ اس موقع پر بھی اگرچہ بایزید تخت پر قابض ہو چکا تھا اور تمام فوج اور امرائے دولت نے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا، تاہم شہزادہ جم نے علم بغاوت بلند کر دیا اور جنگ چھڑ گئی، وہ جانتا تھا کہ اس کے والد نے جو خونی قانون دستور سلطنت میں داخل کر دیا ہے، اس کی وجہ سے اس کی جان ہر وقت خطرہ میں ہے، لہذا اطاعت قبول کرنے کے بعد بھی اسے بایزید کی طرف سے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا، اعلان جنگ سے قبل اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ سلطنت و حصوں میں تقسیم کر دی جائے، یورپ کے صوبے بایزید کی حکومت میں رہیں اور ایشیا کے صوبوں پر جم کی حکومت تسلیم کر لی جائے لیکن بایزید نے اس تجویز کو مسترد کر دیا، اب لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، ۲۰ جون ۱۴۸۱ء کو احمد کدک پاشا نے جم کو شکست دی اور وہ بھاگ کر سلطان مصر کے دربار میں پناہ گزین ہوا، دوسرے سال مصر کی فوجی مدد کے ساتھ وہ پھر واپس ہوا اور ایشیائے کوچک کے بعض ترک سردار اس کی حمایت میں کھڑے ہوئے لیکن اس مرتبہ بھی اسے شکست کھا کر وطن چھوڑنا پڑا، اب کی بار وہ بجائے مصر کے روڈس پہنچا تا کہ وہاں سے مدد لے کر سلطنت عثمانیہ کے یورپین مقبوضات میں داخل ہو اور از سر نو قسمت آزمائی کرے، روڈس مبارزین یروشلیم

کے قبضہ میں تھا، ان کا سردار ڈی، آبوسن (De Aubusson) ایک نہایت چالاک اور خدار شخص تھا، اس نے ایک طرف تو شہزادہ جم کو مدد دینے کا وعدہ کیا اور اس سے یہ معاہدہ کرایا کہ یہ صورت کام یابی وہ مبارزین روڈس کو بعض مخصوص اور اہم مراعات عطا کرے گا اور دوسری طرف سلطان بایزید سے یہ طے کیا کہ پینتالیس ہزار روکات سالانہ کے عوض وہ جم کو نظر بند رکھے گا، چنانچہ سات برس تک یہ بد نصیب شہزادہ روڈس اور پھر فرانس کے مختلف مقامات میں جو مبارزین روڈس کے قبضہ میں تھے، ظاہری احترام کے باوجود دراصل ایک قیدی کی طرح زندگی بسر کرتا رہا، تمام یورپ کو جم کے معاملہ سے دل چسپی پیدا ہو گئی تھی اور متعدد بادشاہوں نے شہزادہ کو حاصل کرنے کے لیے ڈی آبوسن سے مراسلت شروع کر دی تھی، وہ چاہتے تھے کہ اسے بایزید کے مقابلہ میں کھڑا کر کے سلطنت عثمانیہ کو نقصان پہنچائیں لیکن ڈی آبوسن پینتالیس ہزار روکات سات سالانہ کی رقم سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھا، وہ معاملہ کو عداً طول دیتا رہا، اس درمیان میں اس نے شہزادہ جم کی ماں اور بیوی سے بھی جو اس وقت قاہرہ میں مقیم تھیں، خط و کتابت شروع کر دی تھی اور انہیں یقین دلایا تھا کہ اگر بیس ہزار روکات ادا کر دیے جائیں تو شہزادہ فوراً قاہرہ پہنچا دیا جائے گا، ڈی آبوسن کے وعدہ پر اعتماد کر کے ان خواتین نے یہ رقم اس کے پاس بھیج دی تھی، مگر مبارزین یروشلم کا یہ مقدس پیشوا ایفائے عہد کی پابندی سے بالاتر تھا، عیسائی مورخین بھی اس شرمناک فریب پر اظہارِ نفرت کرتے ہیں، بالآخر شاہ فرانس چارلس ہشتم نے جم کو ڈی آبوسن کے بچے سے رہا کر کے پوپ اینوسنٹ ہشتم (Pope Innocent VII) کے پاس رومہ بھیج دیا، یہاں بھی اس کی حیثیت حقیقتاً ایک قیدی ہی کی تھی، اگرچہ اینوسنٹ نے اس کے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کو اپنے محل میں عزت و احترام کے ساتھ رکھا، اب پوپ نے چالیس ہزار روکات سالانہ کی رقم شہزادہ کی نگرانی کے صلہ میں بایزید سے وصول کرنا شروع کی، چند سال کے بعد اینوسنٹ مر گیا اور اس کا جانشین پوپ اسکندر بورجیا

(Pope Alexander Borgia) ہوا جو اپنے ہلاکت پاش جرائم کی وجہ سے عالم گیر شہرت کا مالک ہے، اسکندر بورجیانے اپنا ایک سفیر سلطان بایزید کی خدمت میں بھیج کر شہزادہ جم کی نظر بندی سے متعلق سابق معاہدہ کی تجدید کی اور اس میں ایک اہم دفعہ کا اضافہ یہ کیا کہ اگر وہ سلطان کو شہزادہ کی طرف سے ہمیشہ کے لیے مطمئن کر دے تو بجائے چالیس ہزار ووکات سالانہ وصول کرنے کے تین لاکھ ووکات یک مشت کا مستحق ہوگا لیکن ابھی سلطان اور سفیر پوپ کے درمیان اس معاملہ پر گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ چارلس، ششم نے اٹلی پر حملہ کر دیا اور ۳۱ دسمبر ۱۴۹۵ء کو رومہ میں فاتحانہ داخل ہوا، چند روز کے بعد شاہ چارلس اور پوپ اسکندر کے درمیان صلح کی گفتگو شروع ہوئی، جس کی ایک اہم شرط تھی کہ شہزادہ جم چارلس کے ساتھ فرانس جائے گا، اسکندر کو صلح کی خاطر یہ شرط منظور کرنی پڑی اور شہزادہ فرانسیمس فوج کے سپہ سالار کے ساتھ رومہ سے روانہ ہو گیا، اسکندر بورجیا کو اگرچہ چالیس ہزار ووکات سالانہ سے محروم ہو جانا پڑا تاہم شہزادہ کے قتل سے تین لاکھ ووکات کی خطرہ رقم کا حاصل کرنا اب بھی ممکن تھا اور وہ اس خونیں تدبیر میں کام یاب ہوا، قتل کے طریقہ میں ترک اور اطالوی مورخین کے بیانات باہم مختلف ہیں، اطالوی مورخین کی روایت ہے کہ اسکندر بورجیانے شہزادہ کے ایک خدمت گار سے سازش کر کے ایک خاص قسم کا سفید زہر شکر میں ملا کر کھلادیا، ترک مورخین کا بیان ہے کہ مصطفیٰ نامی ایک نائی نے بورجیا کی تحریک سے شہزادہ کا خط بناتے وقت زہر کے بچھے ہوئے استرہ سے ایک خفیف سازخم لگا دیا، بہر حال تمام مورخین کو اس امر پر اتفاق ہے کہ شہزادہ جم کا قتل پوپ اسکندر بورجیا ہی کی تحریک سے عمل میں آیا، زہر کا اثر فوراً ہی ظاہر نہ ہوا، بلکہ رفتہ رفتہ نمایاں ہوا، یہاں تک کہ چند دنوں کے بعد فاتح قسطنطنیہ کا وہ جواں سال و جواں ہمت فرزند جس نے اپنی عمر کے ۳۶ سال بھی ہنوز پورے نہ کیے تھے اور جو تیرہ سال تک اسیری کی صعوبتیں برداشت کر چکا تھا، بیک وقت قید فرنگ و قید حیات دونوں سے آزاد

ہو گیا، آخر وقت تک اسے بیوی اور بچوں کے دیکھنے کی حسرت تھی، اس کی آخری دعائیہ تھی:

”اے میرے رب! اگر دین حق کے دشمن یہ چاہتے ہیں کہ میری ذات کو آلہ کار

بنا کر ان تجویزوں کو تقویت پہنچائیں جو انہوں نے مسلمانوں کی بربادی کے لیے سوچ رکھی

ہیں تو آج کے بعد مجھے زندہ نہ رکھ، بلکہ فوراً میری روح کو اپنی طرف اٹھالے۔“

سلطان بائزید نے اس کی لعش یورپ سے منگوالی اور اسے شاہی تزک و احتشام

کے ساتھ بروصہ میں سپرد خاک کر دیا۔

شہزادہ جم کے ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لین پول لکھتا ہے:

”اس تمام غم ناک سرگذشت سے یہ حیرت انگیز نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیائے مسیحیت

میں ایک بھی ایمان دار بادشاہ نہ تھا، جو قیدی پر ترس کھاتا اور نہ کوئی ایسا تھا جو گرینڈ ماسٹر (ڈی

آیون) پوپ اور چارلس ہشتم کی غیر شریفانہ اور ضمیر فروشانہ سازشوں پر نفیر کرتا، ان میں

سے ہر ایک غداری اور فضیحت کے انعام کے لیے دوسرے سے مسابقت کی کوشش کر رہا تھا،

اپنے بھائی کو محفوظ نگرانی میں رکھنے کی خواہش کرنا بائزید کے لیے قابل معافی ہو سکتا ہے لیکن

مسیحی کلیسا کے پیشوائے اعظم اور رہبانوں کی جماعت کے سردار کی مدافعت میں کیا کہا

جاسکتا ہے جنہوں نے کافر کی اشرافیوں کے لیے ایک بے کس و مجبور پناہ لینے والے کو دعا دی۔“

اوٹرانٹو | بائزید ثانی کا عہد حکومت فتوحات اور توسیع سلطنت کے لحاظ سے کوئی اہمیت

نہیں رکھتا، تخت نشینی کے بعد اس نے احمد کدک پاشا کو شہزادہ جم کی بغاوت فرو کرنے کے

لیے اوٹرانٹو سے واپس بلا لیا اور اس کی جگہ خیر الدین پاشا کو مقرر کیا، خیر الدین پاشا کو حسب

ضرورت مدد نہ پہنچ سکی، وہ بہت دنوں تک نہایت بہادری کے ساتھ دشمن کے حملوں کا مقابلہ

کرتا رہا، مگر بالآخر شہر ڈیوک آف کلبریا (Calabria) کو سپرد کردی بنا پڑا، اوٹرانٹو کے ہاتھ سے

نکل جانے کے بعد پھر کبھی ترکوں کا قدم اٹلی کے کسی حصہ میں نہ جم سکا۔

ہرزیکو وینا | ہرزیکو وینا اب تک ایک باج گزار حکومت تھی، بائزید نے اسے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔

ہنگری | ہنگری سے کئی سال تک چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس سے کوئی خاص نتیجہ حاصل نہ ہوا اور آخر میں دونوں سلطنتوں میں صلح ہو گئی۔

بحری فتوحات | البتہ جمہوریہ وینس سے جولائی ۱۴۹۸ء میں چھڑی وہ بہ اعتبار اپنے نتیجہ کے بہت زیادہ اہم تھی، ترکوں نے موریا میں وینس کے تین باقی ماندہ قلعوں یعنی مورانس (Mavarrins) موڈن (Moden) اور کورن (Coran) کو بھی فتح کر لیا اور اس طرح یونان میں وینس کے اثر کا خاتمہ ہو گیا، ترکی بیڑا محمد فاتح کے عہد ہی میں بحر روم کی تمام بحری طاقتوں پر فوقیت حاصل کر چکا تھا، بائزید ثانی نے اس کو اور زیادہ فروغ دیا، چنانچہ ۱۴۹۹ء میں مشہور ترکی امیر البحر کمال رئیس نے وینس کے بیڑے کو زبردست شکست دے کر لیپانٹو (Lepanto) کے بندرگاہ پر قبضہ کر لیا، دوسرے سال وینس، آسٹریا، اسپین اور پوپ کے بیڑوں نے متحدہ طور پر ترکی بیڑے پر حملہ کیا، باوجود اس کے کہ عثمانی جہازوں کی مجموعی تعداد اتحادی بیڑوں سے بہت کم تھی، کمال رئیس نے کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور پھر آگے بڑھ کر مسلمانانِ غرناطہ کی درخواست پر، جو عیسائیوں کے ظلم و ستم سے عاجز آچکے تھے، سواہل اسپین پر حملے کے لیکن مظلومینِ غرناطہ کو ان حملوں سے کوئی فائدہ نہ پہنچا اور ان کو آخر کار اپنا وطن چھوڑ کر اسپین سے نکل جانا پڑا۔

مصر سے صلح | ایشیا میں اب تک سلاطین عثمانی کو جن مخالفین سے سابقہ پڑا تھا وہ صرف ایشیائے کوچک کے امراء تھے، جنہوں نے دولت سلجوقیہ کی تباہی کے بعد خود مختار ریاستیں قائم کر لی تھیں، یہ تمام ریاستیں محمد فاتح کے عہد تک مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئی تھیں اور سلطان کو اپنے ایشیائی مقبوضات کی طرف سے اطمینان حاصل ہو چکا تھا لیکن بائزید ثانی کے تخت پر آتے ہی عثمانیوں کو ایک نئے دشمن سے معاملہ کرنا پڑا، حکومت مصر یہ اب تک سلطنت

عثمانیہ کے معاملات سے بالکل بے تعلق تھی، شہزادہ جم نے پہلی بار اس کو عثمانی مقبوضات میں قدم رکھنے کی دعوت دی، اگرچہ اس مہم میں مصری فوج کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا تاہم سلطنت عثمانیہ سے قوت آزمائی کی جرأت پیدا ہوگئی اور مصریوں نے ایشیائے کوچک کے جنوبی مشرقی علاقوں پر دست درازیاں شروع کر دیں، دولت عثمانیہ اور مصر کے مملوک سلطانوں کے درمیان پہلی جنگ ۸۹۰ھ (۱۴۸۵ء) میں شروع ہوئی، جس میں ترکوں کو سخت شکست ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرمانیہ نے بغاوت کر دی، عثمانی فوجیں اس بغاوت کے فرو کرنے میں تو کامیاب ہوئیں لیکن مصریوں کے مقابلہ میں انہیں پیچھے ہٹنا پڑا، بالآخر پانچ سال کے بعد اس جنگ کا سلسلہ ختم ہوا اور بایزید ثانی نے اپنے تین قلعے سلطان مصر وشام کی نذر کر کے صلح کر لی۔

سلیم کی بغاوت اور تخت نشینی | بایزید کا عہد حکومت جس طرح خانہ جنگی سے شروع ہوا تھا، اسی طرح خانہ جنگی پر ختم بھی ہوا، اس کے تینوں لڑکے کرکود، احمد اور سلیم ایشیائے کوچک کے مختلف صوبوں کے حکم راں تھے، کرکود بڑا لڑکا تھا لیکن اس کا ذوق تمام تر علمی تھا، اس لیے بایزید احمد کو جسے وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا لیکن سلیم باوجود سب سے چھوٹا ہونے کے اپنی شجاعت اور فوجی قابلیت کی وجہ سے تمام فوج خصوصاً آبی چری میں نہایت محبوب تھا، یہ دیکھ کر بایزید اپنی عمر اور خرابی صحت کے باعث امور سلطنت پر کافی توجہ مبذول کرنے سے معذور ہے، سلیم کو خطرہ لاحق ہوا کہ ممکن ہے احمد بایزید کی حیات ہی میں تخت پر قابض ہو جائے، لہذا اس نے سلطان کی اجازت کے بغیر طرابزون سے قسطنطنیہ کی طرف کوچ کر دیا اور ایک منتخب فوج کے ساتھ اور نہ پہنچ گیا، بایزید نے اس کو طرابزون واپس جانے کا حکم دیا لیکن سلیم جنگ پر آمادہ ہو گیا اور بایزید کو مجبوراً اس سے مقابلہ کرنا پڑا، اس جنگ میں سلیم کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر کریمیا پہنچا، کریمیا کافرماں رواسلیم کا خسر تھا، اس نے سلیم کی مدد کی، کچھ دنوں کے بعد وہ پھر قسطنطنیہ لوٹا اور اب کی بار تمام فوج نے اس کا ساتھ دیا، بایزید نے بینی چری کے ایک وفد کو باریاب کیا اور ان سے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں، انہوں نے

جواب دیا کہ ہمارا بادشاہ ضعیف العمر اور کم زور ہے، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ سلیم تخت نشین ہو، یہ دیکھ کر کہ فوج قابو سے باہر ہو چکی ہے، یازید نے اعلان کیا کہ میں اپنے لڑکے سلیم کے حق میں تخت سلطنت سے دست بردار ہوتا ہوں، خدا اس کو ایک خوش حال عہد حکومت عطا فرمائے، اس کے بعد وہ تخت سے اتر آیا، وہ چاہتا تھا کہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام ایشیائے کوچک کے شہر ڈیویوٹیکا میں گزار دے جو اس کی جائے پیدائش تھا لیکن موت نے اس کی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا اور قسطنطنیہ سے روانہ ہونے کے تین ہی روز بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

پہلا روسی سفیر | سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان اب تک سفارتی تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے، ۹۰۰ھ (۱۴۹۵ء) میں پہلا روسی سفیر مائیکل پلےشیف (Micheal Plestshiev) قسطنطنیہ آیا اور روسی تاجروں کے لیے تجارتی مراعات کا خواست گار ہوا، زار ایوان سوم (Ivan III) نے اسے سختی کے ساتھ ہدایت کر دی تھی کہ وہ نہ تو سلطان کے سامنے گھنٹوں کے بل کھڑا ہو، نہ سلطان کے علاوہ کسی وزیر سے سفارتی معاملات پر کوئی گفتگو کرے اور نہ یورپ یا ایشیا کی کسی مملکت کے سفیر کو اپنے آگے جگہ دے، اے ڈی لامارٹین (A. De Lamartine) تاریخ ترکی میں لکھتا ہے کہ پلےشیف کی گستاخی اور بدتمیزی اس کے دربار کے تکبر سے بھی بڑھ گئی، جو قوم اس کی مہمان نوازی اور تواضع کر رہی تھی، اسی کے رسم و رواج کی اس نے تحقیر کی، وزیر اعظم نے اس کے استقبال کے لیے جو دعوت کی تھی، اس میں شریک ہونے سے اس نے انکار کر دیا اور دیوان کی طرف سے جو خلعت اور دوسرے تحائف اسے پیش کیے گئے تھے، انہیں واپس کر دیا، عثمانی رسم و رواج کی اس توہین پر مغربی حکومتوں کے سفیروں کو بھی غصہ آیا، اگر یہ روسی سفیر محمد ثانی یا سلیم اول کے عہد میں آیا ہوتا تو اسے اپنی گستاخیوں کا نتیجہ معلوم ہو جاتا، یازید نے اپنے غیر معمولی تحمل اور بردباری کی وجہ سے صرف اسی پر اکتفا کیا کہ پلےشیف کو رخصت کر دیا اور اپنا کوئی سفیر دربار روس میں نہیں بھیجا۔

سلیم اول

۹۱۸ھ تا ۹۲۶ھ مطابق ۱۵۱۲ء تا ۱۵۲۰ء

جس وقت سلیم نے بایزید کو تخت سے اتار کر زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی وہ سیتالیس سال کی پختہ عمر کو پہنچ چکا تھا اور اس کی فوجی اور انتظامی قابلیت پوری طرح مسلم ہو چکی تھی، اس نے صرف آٹھ سال حکومت کی لیکن اس قلیل مدت میں سلطنت عثمانیہ کی وسعت کو دو چند کر دیا، اس نے یورپین مقبوضات میں کوئی اضافہ نہیں کیا مگر ایشیا میں دیار بکر، کردستان، شام، مصر اور عرب کا ایک بڑا حصہ جس میں حریم شریفین بھی داخل تھے، فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اس کی فتوحات کی وسعت، اعلیٰ فوجی قابلیت اور انتظام سلطنت کی غیر معمولی اہلیت نے اس کو سلاطین آل عثمان کی صف اول میں ایک ممتاز جگہ دی ہے، ان خصوصیات کے علاوہ علم و فضل میں بھی اس کا پایہ نہایت بلند تھا، وہ رات کو بہت کم سوتا اور زیادہ تر وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتا، اس کو تاریخ اور فارسی شاعری سے خاص دل چسپی تھی، فارسی زبان میں اس نے کچھ نظمیں خود بھی لکھیں، حمد فاتح کی طرح وہ بھی سیزر اور اسکندر کے کارنامے نہایت شوق سے پڑھا کرتا تھا، اس کو حرم کی زندگی سے بہت کم دل چسپی تھی، دن میں سلطنت کے کاموں سے جو وقت بچتا، اس کا بیش تر حصہ وہ علما کی صحبت میں گزارتا، وہ اہل علم کو بڑے بڑے عہدوں پر بھی مامور کرتا، مثلاً جب کردستان کا

صوبہ فتح ہوا تو اس نے مورخ ادریس کو وہاں کا والی مقرر کیا لیکن علم کا شوق اور علما کی ہم نشینی اس کے مزاج میں نرمی پیدا نہ کر سکی، اس کی طبیعت حد درجہ اشتعال پذیر تھی، وہ کسی امر میں خفیف سی مخالفت بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور جو لوگ اس کی رائے سے ذرا بھی اختلاف کرنے کی جرأت کرتے، ان کو فوراً قتل کر دیتا تھا، اس کے مختصر عہد حکومت میں سات وزیر اعظم اس کے حکم سے قتل ہوئے، ان کے علاوہ متعدد فوجی اور ملکی عہدہ داروں کو بھی اس کی ناخوشی کی پاداش میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا، جو لوگ وزیر اعظم کے عہدہ پر مقرر کیے جاتے تھے، ان کو اپنے انجام کا اتنا یقین ہوتا تھا کہ وہ اس ہلاکت آفریں ذمہ داری کو قبول کرنے سے پہلے ایک وصیت نامہ لکھ کر چھوڑ جاتے تھے اور اکثر ان کی پیش بینی صحیح ثابت ہوتی تھی، چنانچہ ایک روز وزیر اعظم پیری پاشا نے سلیم سے عرض کیا کہ اے میرے بادشاہ! میں جانتا ہوں کہ جلد یا بدیر تجھے اس وفادار غلام کو قتل کرنے کا کوئی نہ کوئی حیلہ مل جائے گا، لہذا التجا ہے کہ قتل سے پہلے مجھے تھوڑی مہلت عطا فرماتا کہ میں اس دنیا سے متعلق اپنے کاروبار کا انتظام کر لوں اور تیرے حکم سے دوسری دنیا میں جانے کے لیے تیار ہو جاؤں، سلیم اس درخواست پر ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ میں کچھ دنوں سے تیرے قتل کی نسبت غور کر رہا ہوں لیکن فی الحال تیرا کوئی جانشین مجھے نظر نہیں آتا، ورنہ تیری یہ درخواست میں بہ خوشی منظور کر لیتا، لیکن سلیم کی یہ سختی جو عموماً ظلم سے تعبیر کی جاتی ہے، ایک خاص اصول کے ماتحت تھی، وہ جو کچھ کرتا تھا، سلطنت کے لیے کرتا تھا، وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے باپ کے حلم ولایت نے حکومت کے تمام شعبوں میں بد نظمی پیدا کر دی تھی، فوج میں خود سری آگئی تھی، وزراء اپنے فرائض کو بھولے ہوئے تھے، قاضیوں کے فیصلوں میں جانب داری کی جھلک نمایاں تھی، اس حالت کو سدھارنے کے لیے سختی ناگزیر تھی اور گویا بعض اوقات سزا کی شدت جرم کی شدت سے بڑھ جاتی تھی، تاہم اس سخت گیری کا عام اثر نہایت مفید ثابت ہوا اور وہ تمام خرابیاں دور ہو گئیں جو حکومت کی بنیاد کو متزلزل کر دینے کے لیے کافی ہیں، مورخین

نے سلیم کو ظالم لکھا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان مظالم کے باوجود وہ رعایا میں نہایت مقبول تھا، جو طرز عمل افراد کے لیے ظلم کا حکم رکھتا تھا، وہی رعایا کے حق میں رحمت بن گیا تھا۔

بھائیوں کی بغاوت | سلیم نے جس وقت بائزید کو تخت سے اتار کر سلطنت پر قبضہ کیا تھا، اس کے دونوں بڑے بھائی کرکود اور احمد ایشیائے کوچک کے دو صوبوں کے حاکم تھے، ابتدا میں ان دونوں نے اطاعت کا اظہار کیا، سلیم ان کی طرف سے مطمئن نہ ہوا، اس کو تخت پر بیٹھے چند ہی روز گزرے تھے کہ شہزادہ احمد نے، جو اماسیا کا حاکم تھا، علم بغاوت بلند کر کے بروصہ پر قبضہ کر لیا، سلیم فوراً ایشیائے کوچک پہنچا، احمد بروصہ چھوڑ کر بھاگا اور اپنے دولوں کو کوشاہ اسماعیل کے پاس مدد حاصل کرنے کے لیے ایران روانہ کیا، سلیم نے گوروصہ پر قبضہ کر لیا لیکن اس کی فوج کے بعض افسر شہزادہ احمد سے جا ملے اور لڑائی پھر چمڑ گئی، ابتدا میں احمد کو چند معمولی فتوحات حاصل ہوئیں لیکن بالآخر اسے اپنی جان لے کر بھاگنا پڑا، سلیم نے وزیر اعظم مصطفیٰ پاشا کو، جو احمد سے مل گیا تھا، پھانسی دے دی اور اس کے بعد اپنے پانچ بھتیجوں کو، جو بروصہ کے بعض امراء کے گھروں میں چھپے ہوئے تھے، گرفتار کر کے مروا ڈالا، یہ شہزادے اس کے مرحوم بھائیوں شہنشاہ شاہ عالم اور محمود (جو بائزید کی حیات ہی میں وفات پا چکے تھے) کی اولاد تھے۔

شہزادہ کرکود اس وقت تک اپنے علاقہ صاروخان میں خاموش بیٹھا تھا لیکن ان شہزادوں کے قتل کی خبر سن کر اس نے سمجھ لیا کہ اس کی باری بھی اب آیا چاہتی ہے، اس لیے وہ بھی اب اپنی جان کی حفاظت کا سامان کرنے لگا اور اپنی چری کو اپنا طرف دار بنانے کی کوشش شروع کی، سلیم کو اس کی تیاریوں کی اطلاع ہو گئی، وہ نہایت خاموشی سے شکار کا بہانہ کر کے دس ہزار سواروں کے ساتھ کرکود کی حکومت میں داخل ہوا اور اسے گرفتار کر لینا چاہا، کرکود بھاگا لیکن جلد پکڑ لیا گیا، سلیم نے سان نامی ایک افسر کو اس کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ مرنے کے لیے فوراً تیار ہو جاؤ، اس وقت تھا اور کرکود سو رہا تھا، سان نے اس کو

بیدار کر کے سلیم کا حکم سنایا، کرکود نے صرف ایک گھنٹہ کی مہلت مانگی، اس فرصت میں اس نے اپنی بے کسی کی موت پر ایک منظوم خط سلیم کے نام لکھا، جس میں اس کی بے دردی کی شکایت کی، اس کے بعد اس نے اپنی گردن جلاد کے حوالے کر دی، سلیم یہ خط پڑھ کر، جو حقیقت ایک نہایت دردناک مرثیہ تھا، بہت رو دیا، اسے اس قدر صدمہ ہوا کہ تین روز تک خود بھی ماتم کرتا رہا اور تمام سلطنت میں بھی ماتم کا حکم دیا، جن ترکمانوں نے کرکود کے چھپنے کی جگہ کا پتہ بتایا تھا اور اب انعام کے لیے حاضر ہوئے تھے، سلیم نے ان سب کو قتل کر دیا، اس درمیان میں احمد نے پھر ایک فوج اکٹھا کر کے سلیم کا مقابلہ کیا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوا لیکن ۷ ارفرفر ۹۱۹ھ (۲۴ اپریل ۱۵۱۳ء) کی جنگ میں اسے شکست ہوئی اور وہ قید کر لیا گیا، اسے بھی گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا۔

ایران سے جنگ | سلیم اب تحت سلطنت کی طرف سے مطمئن ہو گیا، وہ ایشیائے کوچک سے یورپ کو واپس ہوا اور یورپ کی مختلف حکومتوں سے صلح ناموں کی تجدید کر کے اپنی سلطنت کے مغربی حصہ کو ہر طرح کے بیرونی خطرات سے محفوظ کر لیا اور پھر مشرق کی جانب متوجہ ہوا، ایران کے تحت پر اس وقت شاہ اسماعیل صفوی متمکن تھا، جس نے چند سال قبل عراق، عرب، خراسان اور دیار بکر پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کا ایک فوجی افسر بغداد میں بھی داخل ہو گیا تھا، ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں فارستان اور آذربائیجان بھی سلطنت ایران میں شامل کر لیے گئے تھے، جو خلیج فارس سے بحر کاہلین اور فرات سے دریائے آمو تک پھیلی ہوئی تھی، اس طرح ایران کی سرحد سلطنت عثمانیہ کی سرحد سے مل گئی تھی، اتفاق یہ کہ دونوں سلطنتوں کے فرماں روا بھی شجاعت، عظمت اور ملک گیری کی ہوس میں ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے، ایسی صورت میں دونوں کا تصادم ناگزیر تھا، تصادم کے متعدد اسباب موجود تھے، سب سے بڑا سبب مذہب کا اختلاف تھا، شاہ اسماعیل ایک غالی شیعہ اور سلیم ایک متشدد سنی تھا، سلطنت عثمانیہ کے ایشیائی مقبوضات میں شیعوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، شاہ اسماعیل کے گماشتے اناطولیہ میں شیعیت

کی تلقین کرتے پھرتے تھے اور اندر اندر لوگوں کو سلیم کے خلاف ابھارتے رہتے تھے، سلیم شیعیت کا سخت دشمن تھا اور اسے سلطنت کے لیے ایک بڑا فتنہ خیال کیا کرتا تھا، وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کی تخت نشینی سے ایک ہی سال قبل اسماعیل کے اعوان میں سے شاہ قلی نامی ایک شخص نے کس طرح تشیع کی تبلیغ کر کے اناطولیہ کے باشندوں کو بغاوت پر آمادہ کرنا چاہا تھا اور اس فتنہ کے فرو کرنے میں کس قدر دشواری پیش آئی تھی، چنانچہ جب اسے اس قسم کا خطرہ پھر محسوس ہوا تو اس نے اپنی سلطنت سے شیعیت کا استیصال کر دینا چاہا اور جاسوسوں کے ذریعہ سے سلطنت کے تمام شیعوں کو شمار کرایا، ان کی تعداد ستر ہزار نکلی، پھر ایک روز دفعۃً ان میں سے چالیس ہزار کو قتل کر دیا اور باقی تیس ہزار کو جن میں عورتیں اور بچے شامل تھے، قید میں ڈال دیا، اس واقعہ سے تمام ایران میں ایک آگ سی لگ گئی لیکن سلیم کی قوت و سطوت کے مقابلہ میں اس وقت شاہ اسماعیل کو اقدام کی جرأت نہ ہوئی، بہر حال ایران اور دولت عثمانیہ کی جنگ کا یہی ایک سبب نہ تھا، اس قتل عام سے قبل بھی دونوں سلطنتوں کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے، مثلاً شاہ یزید ثانی کے عہد میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں پیش آچکی تھیں جن میں شاہ اسماعیل نے بعض ترک سرداروں کو جو ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقوں کے حاکم تھے، شکست دی تھی، علاوہ بریں اس نے دولت عثمانیہ کے مقابلہ میں سلطان مصر سے اتحاد کر لیا تھا، وہ سلطنت عثمانیہ کی رفتار ترقی کو روکنا چاہتا تھا، ان میں سے ہر سبب سلیم جیسے تند مزاج سلطان کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے کافی تھا لیکن جس چیز نے اس کو سب سے زیادہ برا بیچھینے کیا وہ یہ تھی کہ شاہ اسماعیل نے مرحوم شہزادہ احمد کے لڑکے شہزادہ مراد کو پناہ دی اور اعلانیہ اس کی حمایت کر رہا تھا، نہ صرف یہ بلکہ سلیم کو تخت سے اتار کر مراد کو اس کی جگہ بیٹھانے کے لیے وہ اب فوجیں بھی جمع کر رہا تھا، سلیم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے ایران پر حملہ کا تہیہ کر لیا اور شاہ اسماعیل کو میدان جنگ میں مقابلہ کی دعوت دی۔

عثمانی فوجیں نئی شہر کے میدان میں جمع ہوئیں اور سلیم ۲۳ صفر ۹۲۰ھ (۲۰ اپریل

۱۵۱۳ء) کو ایک لاکھ چالیس ہزار فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ ایران کے پایہ تخت تبریز کی طرف روانہ ہو گیا، نئی شہر سے تبریز کا فاصلہ ایک ہزار میل سے زیادہ تھا، راستہ بھی پہاڑی تھا اور درمیان میں کوئی سڑک نہ تھی، سب سے بڑی دشواری سامانِ رسد کی فراہمی کی تھی، جب سلیم ایران کی سرحد پر پہنچا تو شاہ اسماعیل نے بجائے مقابلہ کرنے کے تمام علاقے ویران کر دیے اور خود پایہ تخت کی طرف لوٹ گیا، اس سے سلیم کی مشکلات اور بڑھ گئیں، رسد کے ملنے میں سخت دشواری پیش آنے لگی، فوج میں جو اپنے طویل سفر سے بالکل خستہ ہو گئی تھی، بے دلی کے آثار نمایاں ہونے لگے اور اس نے آگے بڑھنے میں تامل کیا لیکن سلیم کی مستقل مزاجی بدستور قائم رہی اور باوجود اس کے کہ رسد کی فراہمی روز بروز زیادہ دشوار ہوتی جاتی تھی، اس کے قدم نہ رکے، بالآخر فوج نے علانیہ طور پر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا، سلیم کے لیے یہ موقع نہایت نازک تھا، مگر اس کی غیر معمولی شجاعت نے فوج کو قابو سے باہر نہ ہونے دیا، وہ دلیری کے ساتھ ان کے سامنے گیا اور یوں کہنے لگا ”کیا اسی طرح تم اپنے سلطان کی خدمت کرتے ہو؟ کیا تمہارا ادعائے وفا محض زبانی تھا؟ جو لوگ واپس جانا چاہتے ہیں وہ فوج سے علاحدہ ہو جائیں اور چلے جائیں لیکن میں نے تو اتنی دور کا سفر اس لیے نہیں کیا ہے کہ یہاں سے لوٹ جاؤں، تم میں سے جو بزدل ہیں وہ فوراً ان بہادروں سے علاحدہ ہو جائیں، جنہوں نے تیغ و تفتنگ اور جسم و روح کے ساتھ ہماری مہم کے لیے اپنی جانیں وقف کر دی ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے دستہ قائم کر کے فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور کسی ایک سپاہی کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ اپنا دستہ چھوڑ کر علاحدہ ہو جائے۔

ایرانیوں کی شکست | عثمانی فوج جب تبریز کے قریب پہنچی تو شاہ اسماعیل کو مجبوراً مقابلہ کے لیے نکلنا پڑا، دونوں فوجیں ۲۲ رجب ۹۲۰ھ (۲۳ اگست ۱۵۱۳ء) کو وادی چالدریان میں صف آراء ہوئیں، ترکی لشکر کی تعداد جس نے بارہ سو میل کی سخت دشوار گزار راہ صرف ایک سو چھبیس روز کی قلیل مدت میں طے کی تھی، اب ایک لاکھ چالیس ہزار سے گھٹ کر ایک

لاکھ بیس ہزار رہ گئی تھی، جس میں اسی ہزار سوار تھے، ایرانی فوج کی مجموعی تعداد اسی ہزار تھی، یہ سب سوار تھے اور اپنی شجاعت اور سپہ گری کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھے، عثمانی بالکل خستہ ہو رہے تھے، برخلاف اس کے ایرانی سوار تازہ دم تھے، جنگ کی ابتدا ایرانیوں کے موافق ہوئی، ایرانی سواروں کا جو دستہ شاہ اسماعیل کی سرکردگی میں تھا، اس نے اپنے مقابل ترکی دستہ کو پسپا کر دیا لیکن ترک فوراً ہی سنبھل گئے اور انہوں نے پلٹ کر نہایت دلیری سے مقابلہ کیا، اس درمیان میں عثمانی توپوں نے گولے برسانا شروع کر دیے، ایرانیوں کے پاس توپ خانے نہ تھے، وہ اس حملہ کی تاب نہ لاسکے اور پچیس ہزار لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگے، شاہ اسماعیل بھی زخمی ہو گیا تھا اور بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگ سکا۔

۱۲ رجب ۹۲۰ھ (۴ ستمبر ۱۵۱۴ء) کو سلیم تبریز میں فاتحانہ داخل ہوا، وہاں سے اس نے علاوہ شاہی خزانے کے ایک ہزار بہترین صنایع اور کاریگر قسطنطنیہ روانہ کیے، قسطنطنیہ میں ان لوگوں کو رہنے کے لیے مکانات اور اپنے پیشوں کے جاری رکھنے کے لیے تمام ضروری سامان دیے گئے، تبریز میں آٹھ روز قیام کے بعد وہ شمال میں قرہ باغ کی طرف بڑھا، اس کا ارادہ تھا کہ موسم سرما آذربائیجان کے میدانوں میں گزارنے کے بعد بہار شروع ہونے پر پھر فتوحات کا سلسلہ شروع کرے لیکن فوج اب بالکل خستہ ہو چکی تھی اور آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ تھی، سلیم کو اندیشہ ہوا کہ سختی کرنے سے ممکن ہے بغاوت برپا ہو جائے، اس لیے مجبوراً وہ قسطنطنیہ کی طرف واپس ہوا، شاہ اسماعیل سے کوئی صلح نامہ نہ ہوا اور دونوں سلطنتوں کی جنگ کا سلسلہ کسی نہ کسی حد تک سلیم کی حیات تک قائم رہا لیکن چالدریان کی جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیار بکر اور کردستان کے صوبے مکمل طور پر فتح کر لیے گئے اور ایران سے نکل کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گئے، سلیم نے ان صوبوں کا حاکم مشہور مورخ ادریس کو مقرر کیا، سلیم کے لیے پورے ایران کو عثمانی مقبوضات میں داخل کر لینا دشوار نہ تھا لیکن کسی مصلحت سے اس نے ایسا کرنا مناسب نہ خیال کیا، جیسا کہ ایور سلحے کا خیال ہے، شیعیت سے اسے اس درجہ نفرت تھی کہ

ممکن ہے اس نے ایران کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے بجائے علاحدہ رکھنا ہی بہتر سمجھا ہو، اسی تشدد کے تحت اس نے ایک فرمان نافذ کر کے ایران سے تجارت کرنا ممنوع قرار دیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ چند تاجروں نے اس فرمان کی حکم عدولی کی ہے تو اس نے ان سب کے قتل کا حکم دے دیا، مفتی جمالی نے بمشکل اس سے یہ حکم منسوخ کرایا۔

شام و مصر | ایران کے بعد سلیم شام اور مصر کی طرف متوجہ ہوا، یہ ممالک ڈھائی سو برس سے سلاطین مملوک کے زیر حکومت تھے، سلیم کے زمانہ میں ان کا حکم ران قابضہ غوری تھا، سلطان مصر کو حجاز کی فرما روائی بھی حاصل تھی، دولت عثمانیہ اور سلطنت مصر کے تعلقات بائزید ثانی ہی کے وقت سے غیر خوش گوار تھے، جولڑائیاں ان کے درمیان ہوئی تھیں ان میں عثمانیوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی تھی لیکن سلیم کی تخت نشینی کے بعد قانصوہ غوری کو معلوم ہو گیا کہ اب سلطنت عثمانیہ کی عنان حکومت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں ہے، جو بائزید ثانی سے بالکل مختلف ہے، یہی وجہ تھی کہ اس نے شاہ اسماعیل کی دعوت پر دولت عثمانیہ کے خلاف ایران سے اتحاد کر لیا تھا، کردستان اور دیار بکر کی فتح کے بعد عثمانی اور شامی مقبوضات ایک دوسرے سے بالکل قریب ہو گئے تھے، قانصوہ غوری نے ۵۲۲ھ (۱۵۱۶ء) میں ایک زبردست فوج شام کے علاقہ میں متعین کر دی تھی تاکہ افواج عثمانی کی نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی رہے، سنان پاشا نے جو ایشیائے کوچک کے جنوب مشرق میں ترکی لشکر کا سپہ سالار تھا، اس واقعہ کی اطلاع سلیم کو دی اور لکھ بھجھا کہ ایسی صورت میں سلطان کے حسب ہدایت وادی فرات کی طرف کوچ کرنا خطرہ سے خالی نہ ہوگا، سلیم نے قسطنطنیہ میں دیوان منعقد کر کے اس مسئلہ کو غور و بحث کے لیے پیش کیا۔

دنیا کے اسلام کا انتشار | یہ مسئلہ محض سلطنت مملوکیہ اور دولت عثمانیہ کی قوت آزمائی کا نہ تھا بلکہ حقیقتاً اس کا تعلق دنیا کے اسلام کے عام انتشار اور پراگندگی سے تھا، خلافت عباسیہ کے مصر میں منتقل ہونے کے بعد اسلام کی متحدہ سیاسی قوت پارہ پارہ ہو گئی تھی اور خلیفہ کا

اقتدار صرف مذہبی اور رسمی رہ گیا تھا، سلطان سلیم کے ابتدائے عہد میں دنیائے اسلام کے ضعف و انتشار کی جو حالت تھی، اس کا اندازہ مولانا سید سلیمان ندوی کے محققانہ رسالہ ”خلافت عثمانیہ“ کے حسب ذیل اقتباسات سے ہو سکتا ہے:

”نویں صدی کے اواخر میں دنیائے اسلام کے نقشہ پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس عظیم الشان جمہوریت کا قالب بے جان نکلے نکلے ہو گیا تھا، اس کے دل و دماغ (خلافت مصر) کی کم زوری اور ضعف کا یہ حال پہنچا ہے کہ وہ دور کے اجزائے بدن کی تو کیا آس پاس کے اعضا کی قوت کا سہارا بھی نہیں رہے ہیں، بڑی بڑی سلطنتیں اور حکومتیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں، امارتوں اور نکلڑیوں میں بٹ گئی ہیں، ہندوستان سے لے کر اسپین تک تم کو یہی کیفیت اور یہی نقشہ نظر آئے گا، ہندوستان کی طاقت سندھ، گجرات، مالوہ، احمد نگر، بیجاپور، برہان پور، بیدر، کشمیر، جون پور، بنگال، دہلی وغیرہ صوبہ دار حکومتوں میں منقسم ہو گئی ہے، ترکستان میں بخارا، بلخ، خوارزم، مرد اور کاشغر میں بیسیوں خان چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر حکم ران ہیں، روس کا علاقہ کریمیا، قازان، استراخان میں بٹ گیا ہے، علاقہ قفقاز میں آذربائیجان، داغستان، گرجستان، سب بکھرے ہوئے اجزا ہیں، افغانستان و خراسان میں مختلف تیوری شہزادے اور ترکمانی امراء ادھر ادھر قسمت آزمائی کر رہے ہیں، عراق ایک مستقل حکومت ہے، مصر و شام میں مملوک سلطانوں کی سلطنت ہے، عرب چھوٹے چھوٹے شیوخ میں بٹا ہوا ہے، یہاں تک کہ یمن میں تو ایک ایک شہر کا الگ الگ امیر ہے، ججاز شرفا کے ایک خاندان کے ماتحت تھا، جو کبھی مصر کے زیر اثر بن جاتے تھے اور جب کبھی موقع ملتا تھا امام یمن سے ساز باز کر لیتے تھے، امام یمن اور سلطان مصر میں ایک سلسلہ جنگ برپا تھا، مصر کے پار سوڈان، طرابلس، تیونس، الجزائر، فاس کتنی ہی ریاستیں تھیں، اسپین کی ایک سلطنت کے غرناطہ، قرطبہ، طلیطلہ، شاطبہ، حمس، بطلپوس کتنے ہی نکلے ہو گئے تھے، جن میں سے اب صرف ایک یادو باقی تھے، غرض خانوادہ اسلام کا ایک ایک گھر اجڑ گیا تھا اور جامہ خلافت کا تار تارا لگ ہو گیا تھا۔“

یہ تو دنیائے اسلام کے انتشار کا نقشہ تھا، اس انتشار سے جو نتائج پیدا ہوئے ان کی تصویر بھی مولانا نے موصوف کے قلم نے کھینچ دی ہے:

”پورپ کے مسیحی سپاہیوں نے ایک ہی دفعہ اس پرچار گوشوں سے حملہ کیا، ۸۹۳ھ سے روس نے ایشیائے وسطیٰ کے صحرا سے اسلام پر اپنا حملہ شروع کیا، یہ قازان کی اسلامی ریاست تھی اور ایک طویل سلسلہ جنگ کے بعد ۹۹۳ھ میں اس کا خاتمہ ہو گیا، اس کے بعد استرخان اور کریمیا وغیرہ کی باری آئی، یہاں تک کہ اس کے ڈانڈے بحر اسود اور سرحد ایران سے آکر مل گئے، اسپین اور پرتگال ملک اندلس میں اسلام کا ۸۵۷ھ میں خاتمہ کر کے آگے کو بڑھے، اسپین نے دوستی کے پردہ میں تیونس اور الجزائر پر قبضہ کیا، پرتگال نے پورے افریقہ کو ناپ کر بحر عرب اور بحر ہند میں آکر اپنے ڈیرے ڈالے اور عرب اور ہندوستان کے اسلامی سواحل پر قتل و غارت گری کا آغاز کیا، دوسری طرف مراکش کے سواحل پر آکر وطاسی خاندان پر حملہ آور ہوئے، جو مغرب میں ایک نئی اسلامی حکومت کی بنیاد ڈال رہا تھا اور آسفی، ازموور اور معمورہ پر قبضہ کر لیا، صلیبی سپاہیوں کی چوتھی کمین گاہ بحر روم کے جزائر تھے، قبرص (سائپرس) روڈس، مالٹا اور ونیس کے صلیبی دستے مصر و شام کی ناکہ بندی میں مصروف تھے، خصوصاً قبرص، روڈس اور مالٹا تو سینٹ جان کے صلیبی مجاہدین کے بڑے بڑے مستحکم قلعے تھے، جو دن رات صرف مسلمانوں کے خون کے پیاسے رہتے تھے، اور یہی ان کی زندگی کا مذہبی فرض تھا، یہ درحقیقت گذشتہ صلیبی سپاہیوں کی یادگار اور فلسطین کی مسیحی نوے سالہ حکومت کی شکست خوردہ فوج کی نسل تھے، یہ بحر روم کے دربان تھے، جن کے سامنے سے کوئی اسلامی جہاز مسلمان ملکوں کو روانہ نہیں ہو سکتا تھا، قیچاق، کریمیا اور روم کے مسلمان حج نہیں کر سکتے تھے، ونیس کا بازار مسلمان عورتوں کی ناموس اور مسلمان مردوں کی آزادی کی خرید و فروخت کی بڑی منڈی بن گئی تھی، جو قیدی کسی حال میں اسلام سے پھر ناگوار نہیں کرتے تھے، اگر مرد ہوتے وہ مصر لا کر بیچ ڈالے جاتے تھے، جہاں وہ مملوک سپاہیوں میں بھرتی کر لیے جاتے تھے اور اگر

لڑکیاں ہوتیں تو وہ اٹلی کے امراء اور دولت مندوں کے عیش خانوں میں بھیج دی جاتی تھیں اور جب کبھی موقع ملتا وہ اسکندر یہ تک دھاوا کرتے چلے آتے۔

اس سے زیادہ بد قسمتی یہ کہ اسی زمانہ میں ۹۰۵ھ میں ایران و خراسان میں صفوی خاندان کا ظہور ہوا، جس نے تنگ نظری سے اسلام کے بجائے شیعیت کو اپنے سیاسی کارناموں کا مرکز قرار دیا، اہل سنت یا تو اس ملک جلا وطن ہونے پر مجبور ہوئے یا ہنگاموں میں قتل ہوئے یا وہ شیعہ بنا ڈالے گئے، اس سے بڑھ کر یہ کہ صفویوں نے سلطنت عثمانیہ کے باغی شہزادوں کو اپنے یہاں پناہ دی اور سلطان مصر سے خط و کتابت کر کے سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک متحدہ حملہ کا سامان کیا، اس کا نتیجہ باہمی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں اور مجموعی حیثیت سے اسلام کی تباہی۔“

دیوان کا فیصلہ | دنیاے اسلام کی یہ حالت سلیم سے پوشیدہ نہ تھی، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس ضعف و انتشار کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ خلافت اور سلطنت دو علاحدہ علاحدہ شخصیتوں میں تقسیم کر دی گئی ہے، اسلام کے گذشتہ اقتدار کو از سر نو قائم کرنے کے لیے اس کے نزدیک ان دونوں شخصیتوں کو ایک ہی ہستی میں مدغم کر دینا نہایت ضروری تھا اور چون کہ دولت عثمانیہ سے زیادہ طاقت و راس وقت کوئی دوسری اسلامی سلطنت نہ تھی اور دفاع و جہاد کا فرض جو منصب خلافت کا پہلا مقصد ہے، ڈیڑھ سو برس سے وہی ادا کر رہی تھی، اس لیے دنیاے اسلام کی امامت کا حق دار بھی اس سے زیادہ کوئی دوسرا نہ تھا لیکن حجاز و مصر و شام پر، جو اسلامی دنیا کے اصلی عناصر تھے، مصر کے مملوک سلاطین کی حکومت تھی اور ان اجزا کو شامل کیے بغیر خلافت کا دائرہ اقتدار مکمل نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ جب سلیم نے سنان پاشا کی تحریروں کے سامنے پیش کی تو نہ صرف قانصوہ غوری کے معاندانہ روش پر غور کیا گیا جو اسماعیل سے ملا ہوا تھا اور جس نے ایران کی جنگ کے موقع پر سامان رسد کے قافلہ کو عثمانی لشکر میں جانے سے روک دیا تھا بلکہ خلافت و امامت کے مسئلہ پر بھی مذکورہ بالا حالات کی روشنی میں بہت دیر

تک بحث ہوتی رہی، بالآخر یہ طے پایا کہ حرمین شریفین کی خدمت کا حق سلطان عثمانی سے زیادہ کسی دوسرے مسلمان حکمراں کو نہیں پہنچتا اور اس کے لیے جنگ ناگزیر ہے، رئیس آفندی محمد پاشا نے اس رائے کی موافقت میں ایک نہایت پر زور تقریر کی اور کہا کہ وہ دولت علیہ کا فرض ہے کہ اس حق کو بے ذریعہ فتح حاصل کرے، سلیم محمد پاشا کی تقریر سے اس قدر خوش ہوا کہ اسی وقت اس کو وزیر اعظم مقرر کر دیا، غرض دیوان نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے قانصوہ غوری سے اطاعت کا مطالبہ کرنا چاہیے اور اگر وہ انکار کرے تو لڑائی شروع کر دی جائے۔

شام کی فتح | قانصوہ غوری اس وقت حلب میں مقیم تھا، سلیم کے ایلچی جب یہ پیغام لے کر اس کے پاس پہنچے تو اس نے برا فر وختہ ہو کر ان کو قید میں ڈال دیا لیکن سلیم لڑائی کا عزم پہلے ہی کر چکا تھا، ایلچیوں کے روانہ کرنے کے فوراً ہی بعد وہ خود بھی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے شام کی طرف روانہ ہو گیا تھا، جب عثمانی لشکر شام کی سرحد میں داخل ہوا تو قانصوہ غوری کو اپنی غلطی کی اہمیت معلوم ہوئی، اس نے سلیم کے ایلچیوں کو فوراً رہا کر دیا اور صلح کی گفتگو شروع کی، مگر سلیم صلح کے لیے قسطنطنیہ سے نہیں روانہ ہوا تھا، ۲۵ رجب ۹۲۲ھ (۲۳ اگست ۱۵۱۶ء) کو حلب سے قریب مرج وابق کے میدان میں پہلا معرکہ پیش آیا، جس نے شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، مملوک نہایت بہادری سے لڑے لیکن آپس کے اختلافات سے ان کی قوت پہلے ہی کم زور ہو گئی تھی، علاوہ بریں قانصوہ غوری کے دونوں سرداروں یعنی خیر بے اور غزالی نے لڑائی شروع ہونے سے قبل سلیم سے ساز باز کر لیا تھا، خیر بے حلب کا گورنر تھا اور غزالی فوج کا ایک بڑا افسر تھا، ان دونوں نے عین موقع پر غداری کی، جلابانوں کے دستوں کو لے کر جو چر کسی مملوکوں سے نیچے درجہ کے مملوک تھے اور چرکسوں سے حریفانہ رقابت رکھتے تھے، میدان جنگ سے بھاگ گئے، قانصوہ غوری کے پاس تو پیش نہ تھیں، عثمانی توپوں کی گولہ باری نے مصری فوج کو جس کی قوت خیر بے اور غزالی کی غداری سے ٹوٹ چکی تھی، زیادہ دیر تک میدان جنگ میں ٹھہرنے نہ دیا، صرف ایک گھنٹہ کے اندر لڑائی ختم ہو گئی، بوڑھا سلطان قانصوہ غوری بھی یہ دیکھ

کر کہ اب مقابلہ بے سود ہے، بھاگا لیکن شاید اپنے ہی سپاہیوں کی بھیڑ میں دب کر مارا گیا۔

حلب کا خیر مقدم | سلیم فاتح کی حیثیت سے حلب میں داخل ہوا، خیر بے نے شہر کی کنجیاں پیش کیں، باشندگان شہر نے حاضر ہو کر وفاداری کا حلف لیا، مفتی وحلان کی لکھتے ہیں کہ حلب کے باشندے اپنے علما اور صلحا کے ساتھ سروں پر قرآن رکھے ہوئے سلطان کے استقبال کو آئے، فتح کی تہنیت پیش کی اور رحم و درگزر کے خواست گار ہوئے، سلیم ان سب سے مہربانی کے ساتھ پیش آیا، پھر جب وہ جامع مسجد میں گیا تو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، پہلے سلاطین مصر کے القاب میں ”خادم الحرمين الشريفين“ کا لقب شامل کیا جاتا تھا لیکن حلب کی فتح کے بعد جامع مسجد کا خطیب جب خطبہ دینے کھڑا ہوا تو سلطان سلیم خان کے نام کے ساتھ اس لقب کا اضافہ کیا، سلیم نے اسے آئندہ کامیابی کی بشارت خیال کیا اور اس قدر خوش ہوا کہ جو حملہ پہنچے ہوئے تھا، اتار کر اسی وقت خطیب کو دے دیا۔

دیگر فتوحات | حلب میں چند دنوں قیام کرنے کے بعد سلیم شام کے دوسرے شہروں کی فتح کے لیے روانہ ہوا، ہر شہر نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنے دروازے کھول دیے اور وہاں کے لوگوں نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا، سلیم نے ان کے ساتھ بہت نرمی کا سلوک کیا، اور اپنے الطاف و اکرام سے انہیں بالکل مطمئن کر دیا، چنانچہ دمشق، بیت المقدس، حمص اور متعدد دوسرے شہر نہایت آسانی سے فتح ہو گئے اور ہر جگہ سلیم کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، دمشق میں اس نے شیخ محی الدین بن عربی کے مزار پر ایک مقبرہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور وہاں کے فقرا کے لیے ایک مطبخ بھی قائم کیا اور اس کے اخراجات کے لیے کافی جائیداد وقف کر دی۔

طومان بے | شام کے اس آسانی سے فتح ہو جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ قانصوہ غوری کی وفات پر اس کے جانشین کے انتخاب کے لیے مملوکوں کے تمام بڑے بڑے فوجی سردار فوراً

۱۔ فتوحات اسلامیہ، جلد ۲، ص ۱۲۳ ۲۔ الاعلام باعلام بیت اللہ والحرام بر حاشیہ خلاصۃ الکلام، ص ۱۸۸،

قاہرہ روانہ ہو گئے اور میدان عثمانیوں کے لیے خالی ہو گیا، مملوکوں میں دستور یہ تھا کہ سلطان کا انتخاب چوبیس بلند پایہ امراء کیا کرتے تھے، جو فوج و حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مامور ہوتے تھے، چنانچہ اس موقع پر بھی یہ امراء کھاہرہ میں جمع ہوئے اور انہوں نے طومان بے کو جو اپنی حیرت انگیز شجاعت، فوجی قابلیت اور شریفانہ اوصاف و خصائل کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز تھا، سلطان منتخب کیا، طومان بے کے انتخاب سے مملوکوں میں ایک تازہ روح پیدا ہو گئی۔

معمر کہ روانیہ | شام کی فتح کے بعد سلیم نے مصر کی طرف کوچ کی تیاری کی، ادھر طومان بے بھی مدافعت کا سامان کر رہا تھا، سب سے پہلے اس نے ایک فوج غزہ روانہ کی تاکہ عثمانی لشکر کو مصر کی طرف بڑھنے سے روکے اور خود قاہرہ کے قریب مصری افواج کے بڑھے حصہ کو جمع کرنا شروع کیا، غزہ میں مملوکوں اور عثمانیوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا لیکن صدر اعظم سان پاشا کی سپہ سالاری اور ترکی توپوں کی گولہ باری نے مملوکوں کے قدم اکھاڑ دیے، اس کے بعد مصر کی سرحد تک پھر کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور سلیم کی فوج نے دس روز کے اندر ریگستان کو عبور کر لیا، سلیم نے اس مہم کے لیے کئی ہزار اونٹ خرید لیے تھے، ان پر فوج کے لیے پانی کے مشکیزے لدے ہوئے تھے، مصری فوجیں قاہرہ سے تھوڑے فاصلہ پر روانیہ میں خیمہ زن تھیں، وہیں ۲۹ رزی الحجہ ۹۴۲ھ (۲۲ جنوری ۱۵۱۷ء) کو مقابلہ ہوا، اس معرکہ میں بھی اگرچہ پہلی جنگوں کی طرح توپ خانوں کی وجہ سے میدان ترکوں کے ہی ہاتھ رہا تاہم مملوکوں نے جیسی غیر معمولی شجاعت اور جاں بازی کا ثبوت دیا، اس کی مثال تاریخ کے صفحات میں کم ملتی ہے، ہڑائی کے شروع میں ہی سواروں کا ایک دستہ جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھا، عثمانی فوج کے قلب پر جہاں سلطانی علم لہرا رہا تھا، حملہ آور ہوا، اس دستہ کی قیادت خود طومان بے اور اس کے دو بہترین افسران بے اور قرط بے کر رہے تھے، ان لوگوں نے قسم کھائی تھی کہ یا تو سلیم کو زندہ گرفتار کریں گے یا اسے قتل کر کے چھوڑیں گے، یہ قسم پوری ہو کر رہتی مگر حسن اتفاق سے اس وقت بجائے سلیم کے صدر اعظم سان پاشا وہاں

چند خاص خاص فوجی افسروں کے حلقہ میں کھڑا ہوا تھا، طومان بے اسی کو سلیم سمجھ کر ایک نیزہ ایسا مارا کہ سینہ کے پار ہو گیا، الان بے اور قرط بے نے بھی ایک ایک پاشا کو قتل کیا اور پھر گھوڑے موڑ کر یہ تینوں بہ حفاظت اپنی فوج میں واپس آ گئے، البتہ الان بے کو بندوق کی گولی سے ایک زخم لگ گیا تھا، یہ سب کچھ دیکھتے دیکھتے ہو گیا، طومان بے سمجھتا تھا کہ سلیم کے قتل کے بعد ترکوں کی ہمت چھوٹ جائے گی، دوسرے مملوکوں نے بھی اپنے سرداروں کی طرح سپہ گری اور جاں بازی کا حق ادا کر دیا لیکن ان کی بے مثل شجاعت اور سرفروشی ترکی توپوں کے مقابلہ میں بے سود ثابت ہوئی، پچیس ہزار مملوک سواروں کی لاشیں تحفظ وطن کی قیمت نہ ادا کر سکیں اور طومان بے کو بالآخر اپنے بقیہ سواروں کے ساتھ میدان چھوڑنا پڑا۔

قاہرہ میں قتل عام | جنگ روانیہ کے ایک ہفتہ بعد عثمانی فوج کا ایک دستہ بلا مزاحمت قاہرہ میں داخل ہوا لیکن طومان بے نے آ کر دفعۃً اس پر چھاپا مارا اور پورے دستہ کو تہ تیغ کر دیا، اب سلیم نے اپنی بہترین فوجیں قاہرہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیں، شہر کے گرد باقاعدہ استحکامات نہ تھے لیکن مملوکوں نے گویا ہر سڑک کو میدان جنگ اور ہر مکان کو قلعہ بنا دیا تھا، عثمانیوں کو ہر قدم پر مزاحمت کا سامنا تھا، تین دن تک نہایت سخت لڑائی ہوتی رہی، آخر کا خیر بے کے مشورے سے سلیم نے یہ اعلان کر دیا کہ جو مملوک ہتھیار ڈال دیں گے، ان کی جانیں بخش دی جائیں گی، اس اعلان پر اعتبار کر کے مملوکوں نے لڑائی موقوف کر دی اور ان میں سے آٹھ سو ممتاز آدمیوں نے اپنے کو سلیم کے حوالہ کر دیا، سلیم نے خلاف عہد ان سب کو قتل کر دیا، اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ شہر کے تمام باشندے تہ تیغ کر دیے جائیں، کریمی کا بیان ہے کہ پچاس ہزار آدمی اس قتل عام میں مارے گئے۔

قرط بے | قرط بے کچھ دنوں تک قاہرہ میں چھپا رہا لیکن پھر سلیم کے وعدوں پر اعتماد کر کے اس نے بھی اپنے کو پیش کر دیا، اس موقع پر سلیم اور قرط بے کے درمیان جو گفتگو ہوئی اسے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں، کریمی نے ان دونوں کی ملاقات کا حال اور ان کی گفتگو فان ہیر کے

حوالہ سے نقل کی ہے اور فان ہیر من جملہ اور اسناد کے ایک ایسے شخص کی سند بھی پیش کی ہے جو طومان بے کے دربار کا ایک عہدہ دار تھا، قرط بے جب سلیم کے سامنے آیا تو وہ فوج کے تمام بڑے بڑے افسروں کے حلقہ میں تخت پر بیٹھا ہوا تھا لیکن فاتح سلطان کی یہ شان اس بہادر مملوک کو مطلق متاثر نہ کر سکی، سلیم نے اس کے بے خوف چہرے پر نظر ڈالی اور پوچھا ”تو ایک نامور شہ سوار تھا، تیری شجاعت اب کہاں ہے؟“ فرط بے نے جواب دیا کہ ”وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہے“ سلیم نے کہا ”کیا تجھے معلوم ہے کہ تو نے میری فوج کے ساتھ کیا کیا ہے؟“ ”مجھے خوب معلوم ہے“ یہ جواب بھی پہلے جواب کا سا مختصر اور مسکت تھا، اس کے بعد سلیم نے اس دلیرانہ حملہ پر اظہارِ تعجب کیا جو قرط بے نے روانیہ کے میدان میں طومان بے اور الان بے کے ساتھ اس پر کرنا چاہا تھا اور جو ستان پاشا کے لیے اس قدر مہلک ثابت ہوا قرط بے اپنی خوش بیانی کے لیے بھی اسی قدر مشہور تھا جس قدر اپنی بہادری کے لیے، اس نے اس کو جواب میں مملوکوں کی شجاعت پر ایک پرزور تقریر کی، جس میں توپ اور بندوق کا ذکر نفرت اور حقارت کے ساتھ کیا کیوں کہ ان کا وار بہادرانہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ بزدلانہ طریقہ پر مارتی ہیں، اس نے سلیم کو بتایا کہ بندوقیں مصر میں سب سے پہلے اشرف قانصوہ کے عہد میں لائی گئی تھیں، جب کہ ماریشش کے ایک شخص نے مملوکوں کو بندوق سے مسلح کر دینے کے لیے آمادگی ظاہر کی تھی لیکن سلطان اور اس کے فوجی افسروں نے جنگ میں اس بدعت کے جاری کرنے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ ایک تو یہ حقیقی شجاعت کے شایان شان نہیں، دوسرے آنحضرت ﷺ کے طریقہ کے بھی خلاف ہے، قرط بے نے کہا کہ جب اس شخص سے انکار کیا گیا تو وہ چلا اٹھا اور کہنے لگا کہ تم میں سے کچھ لوگ اس وقت تک زندہ رہیں گے اور دیکھیں گے کہ یہ سلطنت ان ہی گولیوں سے ختم ہو کر رہے گی، یہ بیان کر کے قرط بے نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا کہ افسوس وہ پیشین گوئی پوری ہوئی لیکن تمام قدرت اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھوں میں ہے، سلیم نے پوچھا کہ ”اگر تم

خدا پر بھروسہ رکھتے ہو تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم نے تمہیں شکست دی اور تمہارے قلعوں سے تم کو مار بھگا یا اور خود تو اس وقت میرے سامنے ایک قیدی کی حیثیت سے کھڑا ہوا ہے، قرط بے نے جواب دیا کہ ”خدا کی قسم ہمیں شکست اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ تم لڑائی میں ہم سے زیادہ بہادر یا ہم سے بہتر شہ سوار تھے، بلکہ ہم اس لیے ہارے کی یہی ہماری تقدیر میں تھا کیوں کہ ہر وہ شے جو ابتدا رکھتی ہے، ایک روز ختم ہو کر رہے گی اور سلطنت کی مدت بھی محدود ہے، خلفا یعنی اسلام کے وہ زبردست حامی آج کہاں ہیں؟ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت و سلطنتیں کہاں ہیں؟ اے آل عثمان! تمہارا وقت بھی آنے والا ہے اور تمہاری حکومت بھی اپنے وقت پر ختم ہو کر رہے گی، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے اے سلطان سلیم! میں تیرا قیدی نہیں ہوں بلکہ تیرے وعدوں اور عہد و پیمان کی بنا پر یہاں آزاد اور بے خطر کھڑا ہوں“ اس کے بعد قرط بے خیر بے کی طرف متوجہ ہوا جو سلیم کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا اور اس پر نہایت سخت لعن و طعن کرنے کے بعد سلیم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ ”اس عدار کا سراڑ اداے ورنہ کہیں تجھے بھی اپنے ساتھ یہ جہنم میں گھسیٹ نہ لے جائے“ اس پر سلیم نے غضب ناک ہو کر کہا ”میں نے سوچا تھا کہ تجھے آزاد کر دوں گا، بلکہ اپنے اعلیٰ فوجی عہدہ داروں میں بھی شامل کر لوں گا لیکن تو نے بے ادبی کے ساتھ گفتگو کی ہے اور میری موجودگی کا احترام ملحوظ نہیں رکھا ہے، جو شخص پادشاہوں کے حضور میں خلاف ادب طریقہ اختیار کرتا ہے، وہ فضیحت کے ساتھ نکالا جاتا ہے“ قرط بے نے دلیری کے ساتھ جواب دیا ”خدا مجھے تیرا عہدہ دار ہونے سے بچائے“، یہ سن کر سلیم کا غصہ ناقابل برداشت ہو گیا اور اس نے جلا دوں کو طلب کیا، قرط بے نے سلیم سے کہا ”تہا میرے قتل سے تجھے کیا فائدہ پہنچے گا، جب کہ بہت سے بہادر خود تیرے سر کی فکر میں ہیں اور طومان بے اب بھی اپنی کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ رکھتا ہے“ سلیم نے جلا دوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا، جلا دنے جوں ہی تلو اور اٹھائی قرط بے نے ایک بار پھر خیر بے کی طرف متوجہ ہو کر کہا ”اے عدار! میرے خون آلود سر کو لے جا اور اپنی بیوی کی گود میں ڈال دے، خدا عدار کو اس کے فعل کا

ویسا ہی بدلہ دے، یہ آخری الفاظ تھے جو اس بہادر مملوک کی زبان سے ادا ہوئے۔

طومان بے کا قتل | قاہرہ کے مفتوح ہو جانے کے بعد بھی طومان بے مایوس نہیں ہوا تھا، چونکہ مملوکوں کی بہت بڑی تعداد قتل ہو چکی تھی، اس لیے اس نے مملوک سلاطین کی سابق روایات کے برخلاف عربوں کو اپنی فوج میں داخل کیا اور چند دنوں تک کام یابی کے ساتھ عثمانی دستوں کا مقابلہ کرتا رہا، سلیم نے اس کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر دولت عثمانیہ کی سیادت قبول کر لو تو مصر کا تخت تمہارے لیے چھوڑ دیا جائے لیکن قاہرہ کے غدارانہ قتل عام اور قرط بے کے قتل سے نہ صرف سلیم کے وعدوں کا اعتبار اٹھ گیا تھا بلکہ مملوکوں کی آتش غضب بھڑک اٹھی تھی، چنانچہ جب سلیم کا ایلیچی یہ پیغام لے کر طومان بے کے دربار میں پہنچا تو اس نے اسے اور اس کے تمام ہم راہیوں کو قتل کر دیا، سلیم نے اس کے جواب میں تین ہزار مملوک قیدیوں کو تہ تیغ کر دیا، ان واقعات سے یہ صاف ظاہر تھا کہ صلح کی کوئی امید نہیں، کچھ عرصہ تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا، مگر بد قسمتی سے اسی زمانہ میں جب عثمانی فوج حملہ کر رہی تھی، خود عربوں اور مملوکوں میں باہم جھگڑے شروع ہو گئے، جس سے طومان بے کی قوت کو سخت نقصان پہنچا، آخر میں اس کی تمام فوج منتشر ہو گئی اور اسے بھاگ کر روپوش ہونا پڑا لیکن بعض ساتھیوں نے اس کے ساتھ دعا کی اور اسے عثمانیوں کے حوالہ کر دیا، سلیم کو جب کی اس کی گرفتاری کی اطلاع ہوئی تو وہ جوش مسرت میں چلا اٹھا کہ ”الحمد للہ! مصراب فتح ہوا“، بہر حال اس نے شروع میں طومان بے کے ساتھ مناسب عزت و احترام کا سلوک کیا لیکن چند دنوں کے بعد غزالی اور خیر بے نے طومان بے کے خلاف اس کے کان بھرنا شروع کیے اور اسے یقین دلایا کہ طومان بے کو آزاد کرانے کے لیے ایک زبردست سازش کی جا رہی ہے، سلیم نے ان غداروں کے فریب میں آ کر طومان بے کو قتل کر دیا، سلاطین مصر کے مملوک سلسلہ کی یہ آخری کڑی تھی جو ۱۷ اپریل ۱۵۱۷ء کو ٹوٹ گئی۔

مصراع نظام حکومت | مصر فتح ہو گیا لیکن اس کے نظم و نسق کا مسئلہ بہت مشکل تھا، باوجود

اس کے کہ مملوکوں کی قوت ٹوٹ چکی تھی، سلیم کو ان کی طرف سے اطمینان نہ تھا اور چوں کہ مصر قسطنطنیہ سے بہت زیادہ فاصلہ پر واقع تھا، اس لیے مملوکوں کی بغاوت کا اندیشہ اور بھی زیادہ قوی تھا، اس خطرہ کو دور کرنے کے لیے سلیم نے مصر کا دستور حکومت مرتب کرتے وقت جو چیز خاص طور پر پیش نظر رکھی وہ یہ تھی کہ حکومت ملک کے مختلف طبقات میں اس طرح تقسیم کردی جائے کہ دولت عثمانیہ کے خلاف ان کے باہم متحد ہونے کا امکان کم سے کم رہ جائے، چنانچہ اسی غرض سے اس نے نہ تو مملوکوں کا بالکل قلع قمع کیا اور نہ ان کے سرداروں کو سرکیشیا سے نئے غلام بھرتی کرنے سے روکا، مملوک سلاطین کے عہد میں مصر و شام کی حکومت چوبیس اضلاع میں تقسیم تھی اور ہر ضلع پر ایک مملوک امیر حاکم تھا، سلیم نے اس نظام کو برقرار رکھا اور دونوں کو بارہ بارہ سبقتوں میں تقسیم کر کے ہر سبقت پر ایک مملوک سردار کو مقرر کیا، مرکزی حکومت کے لیے اس نے ایک مجلس مقرر کی جو دیوان کبیر کے نام سے موسوم تھی، اس کا صدر پورے ملک کا والی بنایا گیا، سلیم نے اس عہدہ پر خیر بے کو مقرر کیا لیکن چوں کہ وہ اپنے سابق آقا قانصوہ غوری کے ساتھ غداری کر چکا تھا، اس لیے سلیم نے اس کے بیویوں اور بچوں کو ضمانت کے طور پر یورپ بھیج دیا، اسی طرح غزالی شام کا والی مقرر ہوا، دیوان کبیر کے ارکان کو یہ اختیار دیا گیا کہ معقول اسباب کی بنا پر والی کے احکام کو منسوخ کر سکتے ہیں اور اگر ضرورت سمجھیں تو اسے معزول کر کے دوسرا والی منتخب کر سکتے ہیں لیکن اس انتخاب کے لیے باب عالی کی منظوری لازمی قرار دی گئی، ان اختیارات کے عطا کرنے سے سلیم کا مقصد یہ تھا کہ کوئی والی اتنی قوت حاصل نہ کر سکے کہ آگے چل کر اس کے اندر خود مختاری کا حوصلہ پیدا ہو، والی کو قابو میں رکھنے کے لیے سلیم نے پانچ ہزار سواروں اور پانچ سو سنی چری سپاہیوں کی ایک مستقل فوج بھی قاہرہ میں متعین کردی اور آغا خیر الدین کو اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا، اسے خاص طور پر یہ حکم تھا کہ کسی حالت میں بھی قلعہ کے باہر نہ جائے، تقسیم اقتدار کے اسی اصول کے ماتحت سلیم نے اکثر عدالتی اور مذہبی عہدوں پر عرب شیوخ کو مامور کیا، جن

کا اثر مصر کی عربی النسل آبادی پر بہت زیادہ تھا، یہ لوگ مملوکوں سے زیادہ عثمانیوں کی جانب مائل تھے، محاصل کی تحصیل و وصول کا کام عموماً قبیلوں اور یہودیوں کے سپرد کیا گیا۔

خادم الحرمین الشریفین | مصر کی فتح کے بعد حجاز پر بھی جو اس وقت تک مملوک سلاطین

کے زیر حکومت تھا، دولت عثمانیہ کا اقتدار قائم ہو گیا لیکن شروع میں سلیم کو امید نہ تھی کہ حرمین شریفین کی خدمت کا شرف بغیر جنگ کے حاصل ہو سکے گا کیوں کہ حجاز کی حکومت سابق

سلطان مصر کے عمال کے ہاتھوں میں تھی، چنانچہ ان عمال کو برطرف کرنے کے لیے اس نے ایک فوج حجاز میں بھیجنا چاہی لیکن قاضی صلاح الدین کے مشورہ سے جو ایک مشہور عالم تھے،

اور جنہیں سلیم نے سلطان غوری کی قید سے رہا کیا تھا، اصل مقصد بغیر کسی جنگ کے حاصل ہو گیا، مفتی و حلان لکھتے ہیں کہ قاضی موصوف نے سلطان سلیم کے وزیر کو یہ مشورہ دیا کہ حجاز میں

فوج بھیجنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ شریف برکات بن حسن بن عجلان (جو اس وقت مکہ معظمہ کے امیر تھے) سلطان کی اطاعت کے لیے آمادہ ہیں اور ان کے اثر سے اہل حرمین

اور باشندگان حجاز بھی سلطان کی بیعت کے لیے تیار ہو جائیں گے، اس لیے بجائے فوج کے شریف کے نام صرف ایک فرمان بھیج دینا کافی ہوگا، سلیم نے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور امیر

مصلح بیگ کی معرفت فرمان ہمایونی مع دو پیش قیمت خلعتوں کے ایک خود شریف برکات کے لیے اور دوسرا ان کے بیٹے ابونمی کے لیے جو مکہ کی امارت میں اپنے باپ کا شریک تھا، بھیجا

اور دونوں کو بدستور ان کے عہدوں پر قائم رکھا، حج کا زمانہ قریب تھا، اس لیے سلیم نے مصلح بیگ کے ساتھ محمد شریف کو بھی روانہ کیا، چنانچہ جب مصلح بیگ مکہ کے قریب پہنچا تو شریف

برکات اپنے بیٹے اور دیگر معززین کو لے کر اس کے استقبال کے لیے نکلے، باپ بیٹوں نے خلعت سلطانی کو پہنا اور مکہ معظمہ واپس آ کر لوگوں سے سلطان کی بیعت لی اور سلیم کے نام

کا خطبہ پڑھا، ”خادم الحرمین الشریفین“ کا لقب جو ایک مسلمان فرماں روا کے لیے سب

سے زیادہ معزز لقب ہے، سلطان سلیم کے نام کے ساتھ شامل کیا گیا اور اس کا اعلان اس مقدس سرزمین میں ایسے وقت ہوا، جب تمام دنیا کے مسلمان حج کے لیے اکٹھا ہوئے تھے، حرین شریفین کی خدمت کا شرف سلیم کے بعد اس کے جانشینوں کو چار سو برس تک حاصل رہا، اس طویل مدت میں انہوں نے باشندگان حجاز اور خصوصاً اہل حرین کی خدمت کا حق جس طرح ادا کیا اس کی تفصیلات سے تاریخ کے صفحات پر ہیں اور اس کی یاد اب ان عربوں کو خون کے آنسو لارہی ہے جنہوں نے جنگ عمومی میں اپنی آزادی کی پیاس ترکوں کے خون سے بجھانی چاہی مگر طلسم فرنگ کے پیدا کردہ سراب سے حقیقی حریت کی موجیں آج تک نہ اٹھ سکیں۔

سلیم کو اہل حرین کی خدمت کا موقع صرف تین سال کے لیے حاصل ہوا، اس قلیل مدت میں اس نے جو کچھ کیا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے ہو سکتا ہے، جو مفتی وحلان کی مستند تالیف ”فتوحات اسلامیہ“ سے ماخوذ ہیں:

”سلاطین مملوک کی طرف سے شریف مکہ کو جو وظیفہ ملتا تھا، سلیم نے اس میں پانچ سو دینار کا اضافہ کر دیا، اس نے ایک دفتر قائم کیا جس میں حرم محترم کے مجاوروں کے نام لکھے گئے، ان میں سے ہر ایک کا وظیفہ سو دینار مقرر کیا گیا، جو مصر کے خزانہ سے ادا کیا جاتا تھا، اس نے تیس آدمیوں کی ایک جماعت بھی مقرر کی جو روزانہ قرآن پاک کا ایک ختم پڑھتی تھی اور ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ بارہ دینار مقرر کی، سلاطین مصر ہر سال بدوؤں، فقراء مکہ کے لیے غلہ بھیجا کرتے تھے، سلیم نے اس دستور کو جاری رکھا اور حکم دیا کہ ہر سال سات ہزار اردب (کم و بیش من) غلہ اہل حرین کے لیے بھیجا جائے، اس میں سے پانچ ہزار اردب مکہ معظمہ کے لیے اور دو ہزار اردب مدینہ منورہ کے لیے مقرر ہوا، مفتی وحلان لکھتے ہیں کہ سلیم کے بعد دوسرے سلاطین عثمانی غلہ کی مقدار میں اضافہ کرتے گئے یہاں تک کہ مکہ معظمہ کے لیے بارہ ہزار اردب اور مدینہ منورہ کے لیے سات ہزار اردب غلہ آنے لگا، سلیم نے مکہ معظمہ میں مقام حنفی کو از سر نو تعمیر کرایا اور مدینہ منورہ میں امیر مصلح بیگ کو بھیج کر بہت سے رفاہی کام

اتجام دیے، اس کی داد و دہش اور امور شیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں حرین شریفین میں فارغ البالی پھیل گئی، شیخ قطبی جو مکہ کے ایک مشہور عالم اور سلیم کے معاصر تھے، بیان کرتے تھے کہ میں اپنے بچپن میں مطاف کو اکثر خالی پاتا تھا اور تہا طواف کرتا تھا، بازار سچی کو بھی چاشت کے وقت تک سنسان دیکھتا تھا اور اکثر دیکھتا تھا کہ غلہ فروشوں کے قافلے آئے ہوئے ہیں، مگر خریدنے والے بہت کم ہیں لیکن اب دولت عثمانیہ کے عہد میں لوگوں کی کثرت ہے، رزق وسیع ہے، خوش الحالی اور فارغ البالی ہے اور لوگ اس سلطنت کے زیر سایہ امن و اطمینان میں ہیں اور اس کے انعام و اکرام کے دریا میں غوطے لگا رہے ہیں۔“

خلافت | غرض حرین شریفین کی خدمت کا شرف جب سلیم کو حاصل ہو گیا تو آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے جو قاہرہ میں سلاطین مملوک کے زیر سایہ ظاہری شان و شوکت کے ساتھ مگر ہقیقہً بغیر کسی اختیار و اقتدار کے زندگی بسر کر رہا تھا، خلافت کے تمام حقوق و امتیازات بھی اسے تفویض کر دیے اور مقامات مقدسہ و حرین شریفین کی کنجیاں، نیز بعض آثار نبویہ مثلاً آنحضرت ﷺ کی تلوار، علم اور چادر بطور سند خلافت اس کے حوالہ کر دیے، اس تاریخ سے سلاطین عثمانی خلیفہ کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے اور خطبوں میں ان کا ذکر بحیثیت امیر المومنین کے ہونے لگا، اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت دنیائے اسلام کی خلافت کا حق بھی انہی کو پہنچتا تھا، کوئی دوسری اسلامی سلطنت طاقت اور وسعت میں دولت عثمانیہ کے برابر نہ تھی، یہی سلطنت تمام دوسری سلطنتوں سے زیادہ شرع و ملت کی حفاظت کی طاقت رکھتی تھی اور قریباً بیڑھ صدی سے جہاد کا فرض ادا کرتی آرہی تھی، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب سلطان سلیم کی خلافت کا اعلان کیا گیا تو دنیائے اسلام کے کسی گوشہ سے اس کی مخالفت نہیں ہوئی، اس منصب کے لیے سلاطین عثمانی کا حق اس قدر مسلم سمجھا گیا کہ سلیم کے عہد سے لے کر گذشتہ جنگ عمومی تک پوری چار صدیوں میں ایک مدعی خلافت بھی ان کے مقابلہ میں نہیں

اٹھا، بنو امیہ اور عباسیہ کے عہدوں میں خلافت کے بہت سے دعوے دار نظر آتے ہیں لیکن خلفائے عثمانیہ کی پوری تاریخ میں کسی ایک حریف کو بھی سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

منصب خلافت پر فائز ہو جانے سے سلطان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا، حکومت کے علاوہ اب اسے اپنی مسلمان رعایا کی مذہبی پیشوائی بھی حاصل ہو گئی اور اس دینی اقتدار کا دائرہ صرف سلطنت عثمانیہ کے مسلمان باشندوں تک محدود نہ رہا بلکہ اس کے اندر تمام دنیائے اسلام کے باشندے آگئے، خواہ وہ کسی قوم یا ملک کے ہوں، علاوہ ایرانیوں اور بعض دوسری شیعہ جماعتوں کے جو بمقابلہ اہل سنت والجماعۃ کے تعداد میں بہت کم ہیں۔

واپسی | مصر اور حجاز کے ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر شعبان ۹۲۳ھ (ستمبر ۱۵۱۷ء) میں سلیم شام کی طرف واپس ہوا، ہزاروں سونے اور چاندی سے لدے ہوئے ساتھ تھے، مال غنیمت کا زیادہ قیمتی حصہ جہازوں کے ذریعہ اس سے پہلے قسطنطنیہ بھیجا جا چکا تھا، انہی جہازوں پر قاہرہ کے بہترین صنّاع اور کاریگر بھی روانہ کیے گئے تھے، جو قسطنطنیہ لے جا کر آباد کیے گئے، ۲۰ رمضان ۹۲۳ھ کو سلیم دمشق پہنچا اور وہاں ۲۲ صفر ۹۲۴ھ تک قیام کیا، دمشق سے حلب گیا اور وہاں بھی دو مہینہ قیام کیا، اس مدت میں اس نے شام کی حکومت کے انتظامات کیے، ۱۷ رجب ۹۲۳ھ (۲۵ جولائی ۱۵۱۸ء) کو وہ قسطنطنیہ پہنچا، اس کو وہاں سے روانہ ہوئے صرف دو سال گزرے تھے، اس تھوڑی مدت میں اس نے شام، مصر اور حجاز کو فتح کر کے سلطنت مملوکیہ کا خاتمہ کر دیا اور سلطنت عثمانیہ کے رقبہ کو تقریباً دو چندان کر دیا۔

اسپین سے معاہدہ | سلیم جب قسطنطنیہ واپس آیا تو اسپین کا سفیر عیسائیوں کے لیے بیت المقدس کی زیارت کی اجازت حاصل کرنے کی غرض سے اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے معاوضہ میں وہ رقم جو پہلے سلاطین مصر کی دی جاتی تھی، دولت عثمانیہ کو ادا کرتے رہنے کا وعدہ کیا، سلیم نے اس درخواست کو منظور کر لیا مگر یہ تصریح کر دی کہ باضابطہ طور پر اس معاہدہ کا تکلیف ہونا چاہیے۔

روڈس پر حملہ کی تیاریاں | اس کے بعد سلیم دولت عثمانیہ کی بحری طاقت کو ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوا، اس نے مختلف سائز کے ڈیڑھ سو نئے جہاز تعمیر کرائے، ان کے علاوہ سو جہاز اور بھی بنوائے اور حکم دیا کہ وہ کسی مہم پر روانہ ہونے کے لیے ہر وقت پوری طرح مسلح اور تیار رکھے جائیں، ساٹھ ہزار فوج بھی مع ایک بڑے توپ خانہ کے ایشیائے کوچک میں اکٹھا کی گئی، بعض لوگ خیال کرتے تھے کہ یہ تیاریاں ایران پر حملہ کی غرض سے کی جا رہی ہیں لیکن عام رائے یہ تھی کہ حملہ روڈس پر ہونے والا ہے، جہازوں، بندرگاہوں اور سلاح خانوں کی تعمیر سے اسی رائے کی تائید ہوتی تھی، سلیم نہایت انہماک کے ساتھ ان تیاریوں میں مصروف تھا اور اس مہم کو اس وقت تک ملتوی رکھنا چاہتا تھا، جب تک روڈس جیسے مضبوط قلعہ پر کامیابی کے ساتھ حملہ کرنے کے لیے کافی سامان فراہم نہ ہو جائے، چنانچہ ایک روز اس نے اپنے وزیروں کو بلا کر کہا کہ ”تم روڈس کی فتح کے لیے مجھ سے عجلت کرانا چاہتے ہو، مگر تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ایسی مہم کے لیے کتنے سامان کی ضرورت ہے، تم بتا سکتے ہو کہ اس وقت کس قدر بارود تمہارے پاس موجود ہے؟“ وزراء اس سوال کے جواب کے لیے تیار نہ تھے لیکن دوسرے روز انہوں نے آ کر سلیم سے کہا کہ ”ہمارے پاس چار مہینہ کے محاصرہ کے لیے کافی سامان موجود ہے،“ سلیم یہ سن کر برا فرخستہ ہوا اور کہنے لگا کہ ”چار ماہ کے سامان جنگ سے کیا ہوتا ہے جب کہ اس کی دوچند مقدار بھی کافی نہ ہوگی، کیا تم چاہتے ہو کہ سلطان محمد ثانی کی سی رسوائی مجھے بھی نصیب ہو، میں اس وقت تک لڑائی نہیں شروع کروں گا اور نہ ایسی ناکافی تیاریوں کے ساتھ روڈس کا سفر کروں گا، علاوہ بریں میرا خیال ہے کہ اب مجھے صرف ایک ہی سفر اختیار کرنا ہے یعنی سفر آخرت۔“

وفات | اس کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا، وہ اور نہ کے لیے قسطنطنیہ سے روانہ ہوا، مزاج پہلے ہی سے ناساز تھا، مگر اطباء کی ممانعت کے باوجود اس نے گھوڑے کی سواری نہ چھوڑی، راستہ میں مرض کی شدت اتنی بڑھی کہ اسے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اتر جانا پڑا اور وہیں ۹ شوال ۹۲۶ھ (۲۲ ستمبر ۱۵۳۰ء) کو اپنی حکومت کے نوے اور عمر کے چوٹیس سال میں اس کا انتقال ہو گیا۔

سلیمان اعظم قانونی

۹۲۶ھ تا ۹۷۴ھ مطابق ۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء

سلیمان اعظم کا عہد حکومت نہ صرف تاریخ عثمانیہ بلکہ تاریخ عالم کا ایک نہایت اہم دور ہے، مغربی یورپ کی سلطنتیں قرون وسطیٰ کے خلفشار سے نکل کر عہد جدید کی معرکہ آرائیوں کے لیے تیار ہو رہی تھیں، سلطنت عثمانیہ اور ان کے درمیان چالیس سال سے کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی تھی، یورپ میں بازنیدانی کی لڑائیاں چھوٹی چھوٹی مسیحی حکومتوں کے ساتھ محدود ہیں، سلیم کی توجہ تمام تر اسلامی سلطنتوں کی جانب مبذول رہی، اس مدت میں یورپ کی سلطنتوں نے بہت نمایاں طور پر ترقی کر لی تھی، اسپین سے مورس کا اخراج ہو چکا تھا اور وہاں کی مختلف مسیحی ریاستیں متحد ہو کر ایک فرماں روا کے زیر حکومت آ چکی تھیں، فرانس اپنی خانہ جنگیوں کو ختم کر کے دوسرے ملکوں کی فتوحات کے لیے نکل چکا تھا، انگلستان اور سلطنت اسٹریا میں بھی قوت و استحکام کی علامتیں ظاہر تھیں، من جملہ دیگر فنون کے فن حرب میں خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ ترقی ہو گئی تھی، باقاعدہ تنخواہ دار پیدل فوجیں بڑی تعداد میں رکھ لی گئی تھیں، آتشیں اسلحوں کا استعمال کثرت سے کیا جا رہا تھا، عیسائی سلطنتوں میں اپنی قوت کی ترقی کا احساس اور مسلمانوں سے تازہ مقابلہ کا حوصلہ شدت سے پیدا تھا، یورپ مذہبی جوش سے لبریز تھا اور باہمی عداوتوں کے باوجود تمام مسیحی سلطنتیں دولت عثمانیہ کے مقابلہ کے لیے آمادہ و مستعد تھیں، شہنشاہ چارلس پنجم جس کی وسیع سلطنت یورپ کے نصف سے زیادہ حصہ پر پھیلی

ہوئی تھی، خاص طور پر اس مسیحی اتحاد میں پیش پیش تھا، دولت عثمانیہ کے لیے چارلس اور اس کے معاونین سے قوت آزمائی کرنا آسان نہ تھا، خصوصاً ایسی حالت میں کہ ایران کی وسیع سلطنت دشمنی پر آمادہ تھی اور شام و مصر میں ہر وقت بغاوت کا خطرہ تھا، تاہم وہ نہ صرف ان بیرونی اور اندرونی خطرات سے محفوظ رہی بلکہ سولہویں صدی کی پوری مدت میں اس کی قوت و سطوت میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور عیسائی سلطنتوں کے بہترے صوبے اس کے مقبوضات میں شامل ہو گئے، اس میں شبہ نہیں کہ سولہویں صدی میں ترکوں کی عظیم الشان کام یابی کا سبب ان کی زبردست فوجی قوت اور اپنی قومی عظمت کا احساس تھا لیکن اس کام یابی کا اصلی سبب یہ تھا کہ عنان سلطنت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں تھی جو دولت عثمانیہ کا سب سے بڑا تاج دار اور اس وقت تمام دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ تھا۔

ذاتی اوصاف و اخلاق | سلطان سلیمان چھبیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، بایزید ثانی کے زمانہ میں جب اس کی عمر بہت کم تھی وہ مختلف صوبوں کا حاکم رہ چکا تھا، پھر جب سلیم نے ایران پر حملہ کیا تو سلیمان کو نائب سلطنت کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں چھوڑ گیا، اس کے بعد جنگ مصر کے دوران میں وہ اور نہ کا حاکم تھا اور پھر سلیم کے عہد کے آخری دو سالوں میں ولایت صادر خان کا انتظام اسی کے سپرد تھا، چنانچہ جب سلیم کی وفات کے بعد وہ تخت پر آیا تو ایک کام یاب مدبر اور لائق فرماں روا کی شہرت حاصل کر چکا تھا، ذاتی عظمت میں وہ اپنے تمام پیش روؤں سے بڑھا ہوا تھا اور فتوحات اور وسعت سلطنت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت لے گیا، اس عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی انتہائی حد کمال تک پہنچ گئی، اس کی خانگی زندگی بالکل بے داغ تھی، وہ اپنے رحم و کرم کے لیے خاص طور پر مشہور تھا، انصاف اس کا مخصوص شیوہ تھا اور اس کی عدالت میں نسل، رنگ اور مذہب کی کوئی تفریق نہ تھی، رعایا کی فلاح و بہبود اس کا ^{مطم} نظر تھا، چنانچہ جب وہ تخت نشین ہوا تو تمام رعایا نے اس نوجوان سلطان کا، جو اپنے اخلاق، شجاعت، انصاف، رحم دلی اور دانش مندی کی بنا پر حد درجہ ہر دل عزیز تھا، نہایت مسرت کے

ساتھ استقبال کیا، اپنی حکومت کے پہلے ہی سال میں اس نے انصاف اور رحم دلی کی ایسی مثالیں پیش کیں جس سے اس کے آئندہ طرز عمل سے متعلق نہایت خوش آئند توقعات قائم کی جانے لگیں، سلطان سلیم نے چھ سو مصریوں کو بہ جبر مصر سے قسطنطنیہ منتقل کر دیا تھا، سلیمان نے ان سب کو اپنے وطن واپس جانے کی اجازت دے دی، سلیم نے بعض تاجروں کا سامان تجارت ایران سے تجارت کرنے کی پاداش میں ضبط کر لیا تھا، سلیمان نے نقد روپیہ دے کر ان کے نقصان کی تلافی کر دی، اس کے حکم سے سلطنت کے بعض اعلیٰ حکام بددیانتی اور ظلم کے جرم میں گرفتار کیے گئے اور ان کو سخت سزائیں دی گئیں، ان واقعات کی خبریں تمام سلطنت میں پہنچیں اور رعایا کو اپنی جان و مال کی طرف سے اطمینان ہو گیا، سلیمان نے تمام صوبہ داروں کے پاس احکام بھیجے کہ رعایا کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی روا نہ رکھی جائے اور امیر و غریب، مسلم و غیر مسلم سب کے ساتھ یکساں طور پر انصاف کیا جائے، ان احکام کے نفاذ سے ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا، البتہ غزالی نے جسے سلطان سلیم نے مصری حکومت سے غداری کے صلہ میں شام کا حاکم بنایا تھا، سرکشی کا اظہار کیا اور خود مختار ہو جانا چاہا، سلیمان نے فوراً اس کی سرکوبی کے لیے ایک فوج روانہ کی، غزالی کو شکست ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا، اس کے قتل سے نہ صرف شام کا فتنہ فرو ہو گیا بلکہ شاہ اسماعیل کے معاندانہ ارادوں کا بھی خاتمہ ہو گیا، جس نے غزالی کی بغاوت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے شام کی سرحد پر اپنی فوجیں تیار کر رکھی تھیں۔

بلغراد کی فتح | سلیم کے آخری دور حکومت میں سلطنت عثمانیہ اور سلطنت ہنگری کے درمیان آویزش پیدا ہو گئی تھی اور سرحدی علاقہ میں برابر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، اس خلش کو دور کرنے کے لیے سلیمان کو بلغراد اور زباکنز (Szabacez) کے سرحدی قلعوں کو فتح کر لینا ضروری ہو گیا، ان قلعوں کی فتح سرحد کے استحکام کے لیے بھی ضروری تھی اور یورپ میں مزید فتوحات حاصل کرنے کے لیے بھی، چنانچہ سلیمان نے ہنگری کے بادشاہ لوئی ثانی کے پاس اپنے سفیر بھیجے اور اس سے خراج کا مطالبہ کیا، لوئی نے اس مطالبہ

کے جواب میں عثمانی سفراء کو قتل کر دیا، سلیمان کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ فوراً ہنگری کی فتح کے لیے روانہ ہو گیا، اس کے فوجی سرداروں نے زابا کو اور دوسرے قلعوں کا محاصرہ کر کے قبضہ کر لیا، اس کے بعد سلیمان خود بلغراد کی طرف بڑھا اور اس شہر کے گرد جس نے محمد فاتح جیسے سلطان کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا، اپنے خیمے نصب کر دیے، سات روز کی گولہ باری کے بعد ۲۵ رمضان ۹۲۷ھ (۲۹ اگست ۱۵۲۱ء) کو بلغراد فتح ہو گیا، فتح کے بعد نہ قلعہ کے فوجی دستہ کا قتل عام ہوا اور نہ شہر کے باشندے قتل کیے گئے، سلیمان نے وہاں کے سب سے بڑے گرجا میں نماز ادا کی اور تثلیث کے اس عظیم الشان معبد کو خدائے واحد کی پرستش کے لیے مخصوص کر دیا، اس کے بعد اس نے بلغراد میں ایک ترکی دستہ متعین کیا، اور قلعہ کو از سر نو مضبوط اور مستحکم کر کے قسطنطنیہ واپس ہوا، بلغراد کے علاوہ سرحد کے دوسرے قلعوں پر بھی عثمانیوں نے قبضہ کر لیا اور ہنگری میں داخل ہونے کے تمام دروازے ان کے لیے کھل گئے، سلیمان اب ہنگری کے دارالسلطنت بودا کی طرف بڑھ سکتا تھا لیکن روڈس کی فتح اس کے نزدیک زیادہ ضروری تھی اور بلغراد کے بعد اس نے اسی جانب رخ کیا۔

جمہوریہ وینس کا باج گزار ہونا | بلغراد کی فتح کا ایک اثر یہ ہوا کہ جمہوریہ وینس نے از سر نو اپنے کو سلطنت عثمانیہ کا باج گزار تسلیم کر لیا اور جزائر قبرص (سائپرس) و زانطہ کا خراج دوچند کر دیا۔

روڈس کی فتح | روڈس کی فتح مختلف وجوہ سے ضروری تھی، بلغراد اور روڈس یہی دو معرکے تھے، جن میں سلطان محمد فاتح نے شکست کھائی تھی، بلغراد کی فتح نے سلطنت عثمانیہ کے دامن سے ایک شکست کا داغ تو دھو دیا، سلیمان کی عالی حوصلگی دوسرے دھبہ کے دھونے کے لیے بھی بے قرار تھی، علاوہ بریں روڈس کے جہاز بحر روم کے مشرقی حصہ میں اور مجمع الجزائر اور اناطولیہ کے ساحلوں پر لوٹ مار چمچائے رہتے تھے، روڈس کی فتح اس وجہ سے بھی ضروری تھی

کہ قسطنطنیہ اور شام و مصر کے درمیان جو تعلقات اب قائم ہو گئے تھے ان میں مبارزین روڈس اپنے جہازوں کے ذریعہ رخنہ انداز ہوتے رہتے تھے، ان اسباب کی بنا پر سلیمان نے اس جزیرہ پر قبضہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور تین سو جہازوں کا عثمانی بیڑا قسطنطنیہ سے روڈس کی جانب روانہ کیا، ساتھ ہی وہ خود بھی ایک لاکھ فوج لے کر ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کی طرف بڑھا، بحری اور بری فوجوں کے جمع ہونے کی جگہ خلیج مارمریس قرار پائی، جو روڈس کے محاذ میں واقع ہے، ۲۸ جولائی ۱۵۲۲ء کو سلیمان روڈس کے ساحل پر اتر اور یکم اگست ۱۵۲۲ء کو محاصرہ شروع ہوا، جو تقریباً پانچ مہینہ تک جاری رہا، روڈس کے راہب مبارزوں نے نہایت شجاعت کے ساتھ مدافعت کی لیکن محاصرین کی قوت سے مجبور ہو کر بالآخر انہیں ۶ صفر ۹۲۹ھ (۲۵ دسمبر ۱۵۲۲ء) کو ہتھیار ڈال دینے پڑے، سلیمان نے ان کے ساتھ جو مراعات برتیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی شجاعت کا کس درجہ قدردان تھا، اس نے مبارزین کو اجازت دے دی کہ بارہ روز کے اندر اپنے تمام اسلحوں اور سامانوں کو لے کر اپنے ہی جہازوں پر روڈس سے چلے جائیں اور اگر ضرورت سمجھیں تو عثمانی جہازوں کو بھی کام میں لائیں، روڈس کے باشندوں کو سلطان کی رعایا بننے کے بعد پوری مذہبی آزادی دے دی گئی، سلطان نے صراحت کے ساتھ وعدہ کیا کہ ان کے کلیساؤں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، ان کے بچے والدین سے چھینے نہ جائیں گے اور پانچ سال تک ان سے کسی قسم کے ٹیکس یا محصول کا مطالبہ نہ ہوگا، سلیمان نے اپنی فوجیں قلعہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہٹالیں تاکہ مبارزین امن و سکون کے ساتھ قلعہ سے نکل جائیں لیکن نئی چری باوجود سخت روک تھام کے بے قابو ہو گئے اور شہر میں داخل ہو کر تھوڑی دیر تک لوٹ مار کرتے رہے، تاہم اور تمام شرائط سلیمان کی طرف سے نہایت دیانت داری کے ساتھ پورے کیے گئے، مبارزین روڈس نے وہاں سے نکلنے کے بعد آٹھ سال تک جزیرہ کریٹ میں قیام کیا اور پھر مستقل طور پر جزیرہ مالٹا میں جا کر آباد ہو گئے۔

مصر اور نئی چری کی بغاوت | بلغراد اور روڈس کی فتح کے بعد ہنگری، سسلی اور اٹلی کے راستے سلیمان کے لیے کھل گئے لیکن مصر کی بغاوت اور ایشیائے کوچک کی شورش کے باعث اسے پہلے مشرق کی جانب متوجہ ہونا پڑا اور یورپین سلطنتوں کو دو سال کی مہلت مل گئی، احمد پاشا نے جو خیر بے کے انتقال کے بعد ۹۲۸ھ (۱۵۲۲ء) میں مصر کا حاکم مقرر ہوا تھا، علم بغاوت بلند کیا، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے سلیمان نے ایک فوج مصر روانہ کی، احمد پاشا کو شکست ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا، اس کے بعد سلیمان نے صدر اعظم ابراہیم پاشا کو حکومت مصر کے انتظام و استحکام کے لیے مامور کیا اور خود سلطنت کے داخلی انتظامات کی طرف متوجہ ہوا، ۹۳۱ھ (۱۵۲۵ء) کے اوائل سرما میں وہ شکار کی غرض سے قسطنطنیہ سے اور نہ چلا گیا، روڈس کی فتح کو ڈیڑھ سال کی مدت گزر چکی تھی، اس درمیان میں کوئی دوسری جنگ پیش نہیں آئی تھی، نئی چری کو امن کا یہ زمانہ نہایت گراں گزر رہا تھا، چنانچہ سلیمان کی عدم موجودگی میں انہوں نے قسطنطنیہ میں بغاوت برپا کر دی اور وزرا اور دوسرے بڑے بڑے عہدہ داروں کے مکانات لوٹ لیے، یہ خبر سن کر سلیمان اور نہ سے قسطنطنیہ کو لوٹا اور اس شورش کو فرو کرنے کی کوشش کی، اس نے باغیوں کے بعض سرداروں کو قتل کر دیا، دو کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور پھر عام سپاہیوں کو انعام و اکرام دے کر بغاوت کا خاتمہ کیا۔

ہنگری کی فتح | وزیر اعظم ابراہیم پاشا اس وقت مصر میں تھا، سلیمان نے اسے واپس بلا لیا اور ہنگری کی مہم کی تیاری شروع کر دی، نئی چری کی بغاوت سے اس کو تجربہ ہو گیا تھا کہ سلطنت کے امن کے لیے اس فوج کو جنگ میں مصروف رکھنا ضروری ہے، بلغراد کی فتح کے بعد سے اگرچہ کوئی بڑی جنگ ہنگری کے ساتھ پیش نہیں آئی تھی، تاہم چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ قائم تھا، علاوہ بریس فرانس اول شاہ فرانس نے جسے شہنشاہ چارلس پنجم نے پیو یا کی جنگ ۱۵۲۵ء میں شکست دے کر قید کر لیا تھا، سلیمان سے ہنگری پر حملہ کرنے کی بہ منت استدعا کی، تاکہ چارلس کو اپنی توجہ فرانس سے ہٹا کر ہنگری کی جانب مبذول کرنی پڑے،

جس کی سرحد سلطنت آسٹریا سے ملی ہوئی تھی، پھر اسی زمانہ میں شاہ ایران نے شہنشاہ چارلس اور شاہ ہنگری کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک جارحانہ اور مدافعانہ اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی، ان وجوہ سے سلیمان نے ہنگری پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا، ایک لاکھ فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ روانہ ہوا، قسطنطنیہ سے روانہ ہونے کے پانچ ماہ بعد ۲۰ رزی ۹۳۲ھ (۲۸ اگست ۱۵۲۶ء) کو موباکز کے میدان میں ہنگری کی فوج سے مقابلہ ہوا، عثمانی لشکر کو اپنی کثرت تعداد اور توپ خانوں کی بنا پر بہت کچھ فوقیت حاصل تھی، دو گھنٹہ سے کم ہی میں جنگ اور ساتھ ہی ہنگری کی قسمت کا بھی فیصلہ ہو گیا، شاہ لوئی، اس کے آٹھ اسقف، اعیان ہنگری کی ایک بڑی تعداد اور چوبیس ہزار سپاہی مارے گئے، لوئی بھاگتا ہوا دریا میں ڈوب کر مرا، ۳۰ رزی الحجہ ۹۳۲ھ (۱۰ ستمبر ۱۵۲۶ء) کو سلیمان ہنگری کے پایہ تخت بودا میں پہنچا، باشندگان شہر نے ہتھیار ڈال کر دروازے کھول دیے، ہنگری کے جو امرا موباکز کی تباہی سے بچ گئے تھے، انہوں نے سلیمان کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت کا حلف لیا، چونکہ شاہ لوئی لا ولد مر گیا تھا، اس لیے سلیمان کی تحریک سے ان امرائے ہنگری کے تخت کے لیے کانٹ زاپولیا (Count Zapolya) کا انتخاب کیا، جو ٹرانسلوینیا کا امیر اور ہنگری کے اکابر میں تھا، اس کے چند دنوں کے بعد سلیمان کو اطلاع ملی کہ ایشیائے کوچک میں کچھ بغاوت کی صورتیں رونما ہو رہی ہیں، چنانچہ وہ فوراً بودا سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو گیا، ہنگری کے بعض سرحدی قلعوں میں ترکی دستے متعین کر دیے گئے۔

ہنگری میں خانہ جنگی | ہنگری کے تخت کے لیے زاپولیا کا انتخاب خانہ جنگی کا باعث ثابت ہوا، آرک بوک فرڈیننڈ جو شہنشاہ چارلس پنجم کا بھائی تھا اور جسے چارلس نے آسٹریا کی آرنج ڈچی منتقل کر دی تھی، ایک صلح نامہ کے رو سے جو چارلس اور سابق شاہ لوئی کے درمیان ہو چکا تھا، ہنگری کے تخت کا دعوے دار ہوا، دوسری طرف زاپولیا اور اس کے حامیوں نے اپنی موافقت میں ہنگری کا ایک قدیم قانون پیش کیا، جس کی رو سے ہنگری کے باشندے

کے علاوہ کوئی دوسرا شخص وہاں کا بادشاہ منتخب نہیں ہو سکتا تھا لیکن باوجود اس قانون کے مغربی ہنگری کے امر نے فرڈیننڈ کو منتخب کر لیا، اس کے بعد جنگ ناگزیر ہو گئی، فرڈیننڈ کے ساتھ آسٹریا کی مدد شامل تھی، اس نے زاپولیا کو شکست دے کر ملک کے باہر بھاگ دیا، زاپولیا نے پولینڈ میں پناہ لی اور وہاں سے سلطان کی خدمت میں مدد کی درخواست بھیجی، یہ سن کر فرڈیننڈ نے بھی اپنا ایک سفیر سلیمان کے دربار میں بھیجا اور نہ صرف ہنگری کے تخت کے لیے حمایت کی استدعا کی بلکہ بلغراد اور ہنگری کے دوسرے شہروں کی واپسی کا بھی جو سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکے تھے، مطالبہ کیا، سلیمان نے فرڈیننڈ کے مطالبہ سے براہ فرودختہ ہو کر اس کے سفیر کو رخصت کر دیا اور زاپولیا کے سفیر کو اطمینان دلایا کہ وہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔

فرڈیننڈ کی شکست | ۱۰ مئی ۱۵۲۹ء کو سلیمان قسطنطنیہ سے روانہ ہوا اور ڈھائی لاکھ فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ ہنگری میں داخل ہو کر ۳ ستمبر کو پایہ تخت بودا پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا، چھ روز میں بودا فتح ہو گیا اور زاپولیا دوبارہ تخت پر بٹھا دیا گیا، اس کے بعد سلیمان آسٹریا کے مشہور دارالسلطنت ویانا کی طرف بڑھا۔

ویانا کا محاصرہ | آسٹریا کا شہنشاہ چارلس پنجم اس وقت یورپ کا سب سے بڑا فرماں روا تھا، وہ اسپین، نیدر لینڈ، سسلی اور جرمنی کی مملکتوں کا تہما مالک تھا، محاصرہ ویانا کے وقت وہ اٹلی میں فرانس اول، شاہ فرانس سے جنگ میں مصروف تھا، اس لیے ترکوں کے مقابلہ کے لیے کوئی فوج نہ بھیج سکا اور آسٹریا کو صرف اپنی ذاتی قوت پر بھروسہ کرنا پڑا، چنانچہ محاصرہ سے قبل ہر دس آدمیوں میں سے ایک آدمی فوج میں بھرتی کیا گیا، ہم سایہ ریاستوں نے فوجی دستوں سے مدد کی، پھر بھی یہ فوج ترکوں کے مقابلہ کے لیے بالکل ناکافی تھی، فرڈیننڈ نے مجلس سلطنت سے مدد کی درخواست کی، جس نے صرف بارہ ہزار پیدل اور چار ہزار سوار فوج بھیجنا منظور کیا، مجلس کو یہ مشکل یقین دلایا جاسکا کہ سلیمان ویانا کی طرف بڑھتا آ رہا ہے، بہر حال جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ آسٹریا اتنی فوجیں جمع کرنے سے قاصر ہے، جو ترکوں

کو آگے بڑھنے سے روک سکیں، اس لیے عیسائیوں نے اب صرف دارالسلطنت کی حفاظت کی تیاریاں شروع کیں، فرڈیننڈ خود تو سلیمان کے خوف سے ویانا سے بھاگ گیا تھا لیکن خوش قسمتی سے چند جاں باز افسر اور اسپین اور جرمنی کے آزمودہ کار دستے محاصرہ کے مکمل ہونے سے قبل شہر میں پہنچ گئے تھے اور ان کی مدد حد درجہ اہم ثابت ہوئی، ویانا کے فوجی دستوں کا سپہ سالار کانٹ ڈی سام (Count De Salm) تھا اور مدافعت کی اصلی نگرانی اسی کے ہاتھ میں تھی، ترکوں کے ویانا پہنچنے سے پہلے ہی تمام امکانی تیاریاں کر لی گئی تھیں، شہر کے استحکامات زیادہ تر بوسیدہ حالت میں تھے، تفصیل بھی ایک ہی تھی جو بہ مشکل چھ فٹ موٹی تھی، چنانچہ وہ تمام مکانات جو تفصیل سے بہت قریب واقع تھے، گرا کر زمین کے برابر کر دیے گئے، شہر کے اندر مٹی کی ایک نئی دھس تیار کی گئی، دریا کے ساحل پر خندق کھود کر لکڑی کے بڑے بڑے مضبوط لٹھوں سے باڑھ لگا دی گئی، آتش زدگی کے خیال سے چوبی کپریلیں جن سے عام طور پر مکانات چھائے ہوئے تھے، شہر کے ہر مکان سے نکال لی گئیں، سڑک کی سنگی پٹریاں بھی اکھاڑ لی گئیں تاکہ دشمن کے گولوں اثر زائل ہو جائے، سامان رسد اور گھوڑوں کے لیے چارہ فراہم کرنے کی غرض سے متعدد ڈولیاں گرد و نواح میں بھیجی گئیں، پھر اس خطرہ سے کہ محاصرہ زیادہ دنوں تک قائم رہ جائے، ایسے تمام لوگوں کو جو مدافعت کے کام کے نہ تھے، بلکہ جن کی ذات پر فوجی نقطہ نظر سے بیکار صرف ہو رہا تھا، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے اور پادری لوگوں کو شہر چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کیا گیا اور جب ترک ویانا کے قریب پہنچ گئے تو نواح شہر کو بھی مسمار کر دیا گیا تاکہ محاصرین اس سے روک اور پناہ کا کام نہ لے سکیں، وہاں کے باشندوں کو ایسے وقت میں بے خانماں ہونا پڑا جب انہیں بھاگ جانے کا بھی موقع نہ تھا، ان میں اکثر ترکوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے۔

۱۔ ترک اور ویانا کے دو محاصرے از شہر بحوالہ لین پول، ص ۱۸۲ Two Sieges Of Vienna By The

۲۷ ستمبر کو سلیمان ویانا پہنچا اور محاصرہ شروع ہوا، کثرت بارش کی وجہ سے سڑکیں اس قدر خراب ہو گئی تھیں کہ ترکوں کو اپنی بڑی بڑی توپیں ہنگری میں چھوڑ دینی پڑی تھیں اور اب انہیں زیادہ تر سرنکیں کھود کر دیواروں کو گرانے کی کوشش کرنی پڑی لیکن محصورین بھی ہر مقام پر نگاہ رکھتے تھے اور ۹ اکتوبر تک ترکوں کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں، بالآخر ۱۰ اکتوبر سرننگ کے ذریعہ سے شہر پناہ میں ایک چوڑا رخنہ پیدا ہو گیا، جس کے بعد ترکوں نے فوراً پے در پے حملے کیے، مگر ہر بار انہیں پسپا ہونا پڑا اور وہ رخنہ پر کر دیا گیا، اسی طرح ۱۱ اور ۱۲ اکتوبر کو بھی ترکوں نے ان مقامات پر جہاں سرنگوں نے بڑے بڑے رخنے کر دیے تھے، سخت حملے کیے لیکن عیسائی ایسی جاں بازی سے لڑے کہ ترک شہر کے اندر داخل نہ ہو سکے، سلیمان یہ حالت دیکھ دیکھ کر بہت بیچ و تاب کھا رہا تھا، ترک بھی موسم کی شدت، سامان رسد کی قلت اور سب سے بڑھ کر ان مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے روز بروز زیادہ دل شکستہ ہو رہے تھے، آخر کار یہ طے پایا کہ ۱۲ اکتوبر (۲۰ صفر ۹۳ھ) کو ایک آخری حملہ کیا جائے، سلیمان نے سپاہیوں کا دل بڑھانے کے لیے بہت فیاضی سے روپیہ تقسیم کیا اور وعدہ کیا کہ جو شخص سب سے پہلے دیوار پر چڑھ جائے گا اسے دولت سے مالا مال کر دیا جائے گا اور ایک بہت بڑا منصب عطا کیا جائے گا، چنانچہ ۹ بجے صبح کو نینی چری اور عثمانی فوج کے بہترین دستے حملہ کے لیے بڑھے، صدر اعظم ابراہیم پاشا اور فوج کے تمام بڑے بڑے افسر بھی ساتھ تھے لیکن عیسائیوں کی سرفروشی نے ترکوں کے قدم شہر کے اندر نہ آنے دیے، حالاں کہ سہ پہر میں عثمانی انجینیروں نے سرنگوں کے ذریعہ سے شہر پناہ کا ایک بڑا حصہ گرا دیا تھا، مغربی مورخین کا بیان ہے کہ ترکوں کی ہمتیں ٹوٹ چکی تھیں، یہاں تک کہ نینی چری نے بھی دل برداشتہ ہو کر حملہ کرنے سے انکار کر دیا، برخلاف اس کے عیسائیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے، آخر کار مایوس ہو کر سلیمان کو محاصرہ اٹھالینا پڑا اور اس نے فوج کو واپسی کا حکم دیا، ویانا کو اس کے مدافعتین کی سرفروشی نے بچا لیا لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے محاصرہ کی

ناکامی میں موسم کی شدت، جس کے ایشیائی ترک عادی نہ تھے اورینی چری کی سرکشی کو بھی بہت زیادہ دخل تھا، وسط یورپ میں عثمانی فتوحات کی موج ویانا کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آگئی۔

آسٹریا کی فتح | تین سال کے بعد سلیمان پھر ایک زبردست فوج کے ساتھ ہنگری پر حملہ آور ہوا اور وہاں سے ویانا کا رخ کیا، اب کی بار شہنشاہ چارلس نے آسٹریا کی فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لی لیکن قلعہ کنس (Guns) کی فتح میں جو راستہ میں واقع تھا، تین ہفتہ کی مدت صرف ہوگئی اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد سلیمان نے ویانا کی طرف بڑھنے کا ارادہ منسوخ کیا، بجائے اس کے وہ آسٹریا کی طرف متوجہ ہوا اور اسے فتح کرتا ہوا قسطنطنیہ کو لوٹ گیا، چارلس نے بھی سلیمان سے مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور ویانا کے قریب اپنی فوجیں لیے ہوئے پڑا رہا۔

ہنگری میں ترکی حکومت | سلیمان کے قسطنطنیہ لوٹ جانے کے بعد بھی چند سالوں تک زاپولیا اور فرڈیننڈ میں لڑائی کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا، بالآخر ۱۵۳۸ء میں ان دونوں کے درمیان ایک صلح نامہ ہو گیا، جس کے رو سے ہنگری کے دو حصے کر دیے گئے، مشرقی حصہ کا بادشاہ زاپولیا تسلیم کیا گیا اور مغربی حصہ فرڈیننڈ کی فرماں روائی میں دے دیا گیا، مگر دوسرے ہی سال زاپولیا کا انتقال ہو گیا اور اس کی بیوہ اور فرڈیننڈ کے درمیان جنگ پھر چھڑ گئی، فرڈیننڈ پورے ہنگری کا دعوے دار ہوا اور زاپولیا کی بیوہ نے اپنے بچے کے لیے سلیمان سے مدد کی درخواست کی، چنانچہ ۱۵۴۸ء میں سلیمان پھر ہنگری میں داخل ہوا اور فرڈیننڈ کو شکست دے کر بودا اور دوسرے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا اور ان میں ترکی دستے متعین کر دیے، اگرچہ ساتھ ہی اس نے اس امر کا بھی اعلان کر دیا کہ زاپولیا کے بچے کے بالغ ہونے کے بعد وہ اسے ٹرانسلوانیا اور ہنگری کے تخت پر بٹھا دے گا، بہر حال اس وقت سلیمان نے ہنگری کو سنبھالنے میں تقسیم کر دیا اور ان میں ترکی گورنر مقرر کر دیے، اس

جنگ میں گو عثمانیوں کو کہیں کہیں شکستیں بھی ہوئیں لیکن مجموعی طور پر سلیمان کی طاقت اتنی زیادہ تھی کہ ۹۵۱ھ (۱۵۴۳ء) میں شہنشاہ چارلس اور فرڈیننڈ نے صلح کی گفتگو شروع کر دی اور ۹۵۴ھ (۱۵۴۶ء) میں پانچ سال کے لیے صلح کر لی گئی اور صلح نامہ کی رو سے تقریباً تمام ہنگری اور ٹرانسلوانیا پر سلیمان کا قبضہ بدستور قائم رہا اور فرڈیننڈ نے باب عالی کو تیس ہزار دوکات سالانہ خراج دینا منظور کیا۔

سلیمان ”صاحب قرآن“ | یہ صلح نامہ جس میں شہنشاہ چارلس پنجم، پوپ، جمہوریہ وینس اور شہنشاہ فرانس شریک تھے، اس بات کا ثبوت ہے کہ مسیحی پورپ نے سلیمان کا ”صاحب قرآن“ ہونا تسلیم کر لیا تھا، آسٹریا کو سلطنت عثمانیہ کے سامنے اس حد تک جھکنا پڑا کہ اس سے قبل صلح کے متعلق جو مراسلت ہوئی تھی اس میں فرڈیننڈ نے اپنے کو صدر اعظم ابراہیم پاشا کا بھائی لکھنا منظور کیا اور اس طرح اپنا مرتبہ ایک ترکی وزیر کے مرتبہ کے برابر قرار دیا، فرانس اول نے بھی کئی بار نہایت ادب اور عاجزی کے ساتھ سلیمان سے مدد کی درخواست کی تھی اور سلیمان نے اس کی درخواست پر ہنگری اور جرمنی پر حملہ کر کے چارلس کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی فوجیں فرانس سے ہٹالے، نیر فرانس کے دشمنوں پر حملہ کرنے کے لیے اس نے ایک جنگی بیڑہ بحرہ روم میں بھی روانہ کیا تھا، یورپ کی خوش قسمتی تھی کہ اسی دوران میں سلیمان کو ایران کی جانب بھی متوجہ ہونا پڑا اور دولت عثمانیہ کی عسکری قوت دو محاذوں میں تقسیم ہو گئی، فرڈیننڈ کا سفیر بوس بکیس (Busbequius) جو سلیمان کے دربار میں مامور تھا، لکھتا ہے:

”ہمارے اور تباہی و بربادی کے درمیان اہل ایران ہی صرف ایک روک ہیں،

ترک ہمیں ضرور آدبا تے مگر ایرانی انہیں روکے ہوئے ہیں، ایرانیوں کے ساتھ ترکوں کی اس

جنگ سے ہمیں صرف مہلت مل گئی ہے، مخلصی اور نجات نہیں حاصل ہوئی ہے۔“

ایران کی مہم | ۹۴۱ھ (۱۵۳۳ء) میں سلیمان ایران کی مہم پر روانہ ہوا، چند ماہ قبل اس نے

ابراہیم پاشا کو ایک بڑی فوج کے ساتھ بھیج دیا تھا، ابراہیم سیدھا تبریز پہنچا اور اس پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا، تبریز ہی میں سلیمان بھی اس سے آکر مل گیا اور وہ دونوں وہاں سے موصل اور بغداد کی طرف روانہ ہوئے، راستہ اور موسم کی خرابی کی وجہ سے ترکی فوج کو بہت کچھ نقصان برداشت کرنا پڑا، بالآخر سلیمان بغداد پہنچا اور ۲۴ جمادی الآخر ۹۳۱ھ (۳۱ دسمبر ۱۵۳۳ء) کو وہاں کے حاکم نے شہر اس کے حوالے کر دیا کیوں کہ شاہ طہماسپ نے ترکوں سے مقابلہ کرنے کی زحمت ہی نہیں گوارا کی، اس طرح موصل اور بغداد کے دو بڑے صوبے آسانی کے ساتھ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے، پھر ۹۵۵ھ (۱۵۲۸ء) ۹۶۰ھ (۱۵۵۳ء) اور ۹۶۱ھ (۱۵۵۴ء) میں بھی سلیمان نے ایران پر حملے کیے اور ایڈان و دان کے مضبوط شہروں کے علاوہ آرمینیا، میسوپوٹامیا کے بعض بڑے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے، ایرانیوں نے متفرق طور پر ترکی فوج کا مقابلہ کیا اور ترکوں کو موسم کی سختی اور سامانِ رسد کی عدم فراہمی کے باعث کافی نقصان پہنچایا لیکن خود شاہ ایران کی طرف سے کوئی مدافعت نہیں ہوئی اور ترک اپنے مفتوحات پر بدستور قائم رہے، ان علاقوں کے علاوہ سلیمان نے اپنی بحری قوت کے زور سے عدن پر بھی مستقل قبضہ کر لیا اور سواحل عرب اور ایران نیز شمالی مغربی ہند پر اس کا اثر قائم ہوا۔

بحری طاقت | بحری قوت کے لحاظ سے ایشیا یا یورپ کی کوئی سلطنت دولت عثمانیہ کی ہم سر نہ تھی، بحری طاقت کے اعتبار سے بھی اس کی فوقیت تمام دوسری سلطنتوں پر مسلم تھی، اس وقت اسپین اور ونیس کے بحری بیڑے سارے یورپ پر حاوی تھے لیکن ترکی بیڑے نے متعدد معرکوں میں ان کو شکست دی، بحری قوت کے اعتبار سے اسپین اور سلطنت عثمانیہ میں زیادہ فرق نہ تھا لیکن اسپین کے ساتھ ونیس اور پوپ کے بیڑوں کے شامل ہونے کے بعد اتحادیوں کے بیڑے جہازوں کی کثرت تعداد اور سائز کے لحاظ سے ترکی بیڑے سے بہت زیادہ بڑھ جاتے تھے، تاہم دو بڑے معرکوں میں جب کہ یہ زبردست اتحاد ان کے خلاف تھا، ترک کامیاب رہے اور سلیمان کے عہد حکومت میں برابر ترکی بیڑے کا اقتدار بحرِ روم

میں قائم رہا، جس کی وجہ سے سلیمان نے الجزائر، اردن اور طرابلس کے صوبے اور بحر اہمیں کے متعدد جزیرے جو وینس کے قبضہ میں تھے، فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔

بحری قزاق | سلیمان کے ابتدائی عہد میں شمالی افریقہ کے مسلمان فرماں روا اس قدر کم زور تھے کہ وہ ساحلی علاقوں کے علاوہ اپنی مملکت کے جنوبی حصوں پر اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتے تھے اور خود ساحل کے شہر بھی بحری قزاقوں کی آماج گاہ تھے، جن میں سے بعض ان فرماں رواؤں کی اطاعت برائے نام تسلیم کرتے تھے لیکن اکثر بطور خود بحر روم میں لوٹ مار مچاتے رہتے تھے، یہ بحری قزاق دس دس اور بیس بیس بحری جہازوں کے بیڑے بنا کر اپنے جری اور نہایت تجربہ کار سرداروں کی قیادت میں مال غنیمت کے لیے بحر روم میں پھر آتے تھے اور اسپین، اٹلی اور فرانس اور کبھی کبھی انگلینڈ اور آئرلینڈ کے ساحلوں پر بھی حملے کیا کرتے تھے۔

سلطان سلیم نے بحری قوت پر خاص توجہ کی تھی اور جہازوں کی تعداد اور ساز سز میں بہت کچھ اضافہ کیا تھا، سلیمان نے بھی اس کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھا اور بحری قوت کو پہلے سے بہت زیادہ ترقی دی لیکن اس کے بحری سردار بے خونی اور مہارت فن میں بحری قزاقوں کے ہم پلہ نہ تھے، یہ دیکھ کر اس نے ان قزاقوں کو جو اپنی قابلیت اور تجربہ میں دوسروں سے ممتاز تھے، سلطنت عثمانیہ کی خدمت کے لیے مدعو کیا اور انہیں ان کے جہازوں اور آدمیوں کے ساتھ بلا کر ترکی بیڑے کے اعلیٰ منصب پر مقرر کیا۔

خیر الدین پاشا بحری | ان میں سب سے پہلا اور اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے سب سے زیادہ مشہور بحری سردار خیر الدین باربروسہ (سرخ داڑھی والا) تھا، یہ شخص پہلے چند جہازوں کو ساتھ لے کر بحر روم کے تجارتی جہازوں پر چھاپا مارا کرتا تھا اور پھر ساحلی علاقوں پر حملہ آور ہونے لگا، چنانچہ اس نے بطور خود الجزائر پر حملہ کیا، شہر اور گرد و نواح کے علاقوں پر قبضہ کر لیا لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ اپنی خود مختار حکومت قائم نہ رکھ سکے گا، اس نے سلطان سلیم کی فرماں روائی قبول کر لی، یہ وہ زمانہ تھا جب اندلس کے مسلمانوں پر اسپین کی

عیسائی حکومت انتہائی مظالم کر رہی تھی، خیر الدین نے ان مظلوموں میں سے ستر ہزار کو اپنے جہازوں کے ذریعہ اندلس سے الجزائر پہنچادیا، پھر جب سلیمان تخت پر آیا تو اس نے خیر الدین کو عثمانی بحریہ کا امیر اعظم مقرر کیا، چنانچہ ۹۴۱ھ (۱۵۳۴ء) میں اس نے شہنشاہ چارلس کے زبردست بیڑے پر حملہ کیا اور کورن، پڑاس اور دوسرے ساحلی شہروں کو جن پر چارلس کے مشہور امیر البحر اینڈ ریڈوریا (Andrea Doria) نے قبضہ کر لیا تھا، واپس لے کر سواحل اٹلی پر حملہ آور ہوا، اس کے بعد سلیمان کی تحریک سے اس نے تونس پر قبضہ کر کے اسے الجزائر کی ریاست میں شامل کر لیا، تونس کے حفصی سلطان حسن نے شہنشاہ چارلس سے فریاد کی، چارلس خود پانچ سو جہازوں کا بیڑا اور تیس ہزار فوج لے کر تونس پر حملہ آور ہوا، خیر الدین کو شکست ہوئی اور اسے تونس چھوڑنا پڑا، چارلس فاتحانہ طور پر شہر میں داخل ہوا اور گو وہاں کے باشندوں نے اپنی حملہ کے خلاف خیر الدین کو کسی طرح کی مدد نہ دی تھی، تاہم چارلس نے اپنے سپاہیوں کو شہر لوٹ لینے کی اجازت دے دی، اس واقعہ پر ایور سلے کا بیان ہے کہ مظالم اور غارتگری کا جو منظر پیش آیا وہ ناقابل یقین ہے، شہر کے تیس ہزار بے قصور باشندے قتل کر دیے گئے اور دس ہزار غلاموں کے طور پر فروخت کیے گئے، مسجدیں اور تمام خاص خاص عمارتیں جلا کر برباد کر دی گئیں، مسجدیں گرجوں کی شکل میں تبدیل کر دی گئیں، کتب خانے برباد کر دیے گئے، اتنی کتابیں راستہ میں پڑی ہوئی تھیں کہ ان کے ڈھیروں کو روندے بغیر کوئی جامع مسجد تک پہنچ نہیں سکتا تھا، لوگوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا، مسلمانوں کی جائیدادیں اور مکانات چھین چھین کر عیسائیوں کو دیے جانے لگے، بہر حال اس تمام قتل و غارتگری کا نتیجہ یہ ہوا کہ تونس سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل کر پھر سلطان حسن کے زیر حکومت آ گیا لیکن حسن کو سلطنت اسپین کی اطاعت قبول کرنی پڑی اور اس کی خود مختاری کا

۱ "ترکی سلطنت" از لارڈ ایور سلے، ص ۱۲۵ ج ۲ المونس فی اخبار افریقہ و تونس لابن ابی دینار بحوالہ خلافت

خاتمہ ہو گیا، اس کے بعد تونس پر ترکوں کا مستقل قبضہ ۹۸۲ھ (۱۵۷۳ء) تک نہ ہو سکا۔
 فرانس کے ساتھ مخصوص مراعات | ۹۳۲ھ (۱۵۳۵ء) میں شہنشاہ چارلس اور فرانس
 اول میں پھر جنگ چھڑ گئی اور فرانس نے سلیمان سے مدد کی درخواست کی، اس درخواست کی
 بنا پر سلیمان اور فرانس کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کی
 سطوت و اقتدار یورپ میں کس حد تک تسلیم کر لیا گیا تھا، فرانسیسی مصنف البین (Albin) اس
 معاہدہ کو ”رعایت“ سلطانی سے تعبیر کرتا ہے، سلیمان نے اہل فرانس کے لیے سلطنت عثمانیہ
 کے ہر حصہ میں وہ حقوق عام کر دیے جو ۱۵۲۸ء میں انہیں مصر میں عطا ہوئے تھے، فرانسیسیوں
 کو پانچ فیصدی محصول کے معاوضہ میں تمام ترکی بندرگاہوں سے تجارت کرنے کی اجازت
 دی گئی، کوئی غیر ملکی جہاز جس پر فرانس کا نشان نہ ہو سلطنت عثمانیہ کے زیر اثر سمندروں
 میں داخل ہونے کا مجاز نہ تھا، فرانسیسی تاجروں کے مقدمات دیوانی اور فوج داری دونوں
 صیغوں کے، خود ان ہی کے فیصلوں کے سپرد کر دیے گئے اور ترکی عہدہ داروں کو اس بات کا
 ذمہ دار قرار دیا گیا کہ وہ ان قونصلوں کے فیصلوں کی تعمیل کراتے رہیں گے، سلطنت عثمانیہ کے
 فرانسیسی باشندوں کو انتقال جائیداد کے متعلق وصیت کرنے کے مخصوص حقوق عطا کیے گئے،
 انہیں نہ صرف اپنے لیے کامل مذہبی آزادی بخشی گئی بلکہ مقامات مقدسہ کی نگہبانی بھی تفویض
 ہوئی اور اس طرح گویا سلطان کی تمام عیسائی رعایا کی حمایت کا حق انہیں حاصل ہو گیا، یورپ
 کے تمام فرماں رواؤں میں صرف فرانس کے بادشاہ کو سلطان نے بجائے بے کے بادشاہ کے
 لقب سے سرفراز کیا اور اس معاہدہ کے بعد اس کے ساتھ ہم سہری کا برتاؤ روا رکھا۔

جزائر الجبلین پر قبضہ | چنانچہ ۹۳۲ھ (۱۵۳۵ء) میں فرانس اور چارلس کے درمیان
 جو جنگ چھڑی اس میں معاہدہ مذکور کی بنا پر سلیمان نے فرانس کا ساتھ دیا، بحر روم میں
 خیر الدین پاشا کا اقتدار بدستور قائم تھا، اس نے جزیرہ مائزکا پر حملہ کر کے وہاں سے بہت

کچھ مال غنیمت حاصل کیا اور کورن پر دوبارہ قبضہ کر لیا، ۹۳۴ھ (۱۵۳۳ء) میں سلیمان نے فرانس کی درخواست پر جمہوریہ وینس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جو چارلس کی مستقل حلیف تھی، خیر الدین پاشا نے سلیمان کی معیت میں جزیرہ کارفور حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا لیکن اہل وینس نے جاں بازی کے ساتھ مدافعت کی اور سلیمان کو محاصرہ اٹھالینا پڑا، تاہم خیر الدین نے موقع پا کر بحر الجین کے تقریباً تمام جزائر پر جو وینس کے زیر حکومت تھے، قبضہ کر لیا اور یہ سب سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے، ۹۳۵ھ (۱۵۳۸ء) میں یورپ اور فرڈیننڈ شاہ ہنگری نے چارلس اور جمہوریہ وینس سے مل کر ترکوں کے خلاف ایک ”اتحاد مقدس“ قائم کیا اور ستمبر ۱۵۳۸ء میں اتحادیوں کا زبردست بیڑا جو اپنے جہازوں کی تعداد اور قوت کے لحاظ سے ترکی بیڑے سے کہیں بڑھا ہوا تھا، شہنشاہ چارلس کے مشہور امیر البحر انڈریا ڈوریا کی سرکردگی میں پریوےسیا (Prevesa) کے سامنے عثمانی بیڑے سے مقابل ہوا، ڈوریا کی شہرت اور اتحادی بیڑے کی مجموعی طاقت عیسائیوں کی فتح کی کافی ضمانت سمجھی جاتی تھی، مگر خیر الدین پاشا نے اتحادیوں کو زبردست شکست دے کر ان کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا، اسی دوران میں فرانس نے وینس کے مقام پر چارلس سے ایک عارضی صلح کر لی، پھر ۹۳۶ھ (۱۵۳۹ء) میں جمہوریہ وینس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان صلح کی گفتگو شروع ہوئی اور تین ماہ کے لیے ایک صلح نامہ مرتب کیا گیا لیکن دوسرے ہی سال مستقل طور پر صلح ہو گئی، جمہوریہ وینس نے تین لاکھ دوکات تاوان جنگ دینا منظور کیا اور وہ ساحل ڈلماشیا کے متعدد مقامات سلطان کے حوالہ کر کے بحر الجین کے ان جزائر سے دست بردار ہو گئی جن پر خیر الدین نے قبضہ کر لیا تھا۔

چارلس سے جنگ کا سلسلہ | لیکن اس صلح کا کوئی اثر سلیمان اور چارلس کی جنگ پر نہ پڑا، الجزائر پر خیر الدین پاشا کا قبضہ چارلس کے اسپینی اور اطالوی مقبوضات کے لیے ایک مستقل خطرہ کا باعث تھا، لہذا ۹۳۸ھ (۱۵۴۱ء) میں چارلس نے الجزائر کو فتح کرنے کے لیے ایک بیڑا روانہ کیا، مگر یہ بیڑا اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہا، دوسرے سال فرانس نے

صلح نامہ وینس کا (۱۵۳۸ء) کا خاتمہ کر کے چارلس سے پھر جنگ شروع کردی اور ترکی بیڑے کی مدد سے شہر وینس پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا، فرانس نے اپنے حلیف کی مدد کا اعتراف کیا اور اس کے معاوضہ میں ٹولوں کی بندرگاہ ترکوں کے حوالہ کردی، ۱۵۹۵ھ (۱۵۴۴ء) میں فرانس اور چارلس کے درمیان پھر صلح ہو گئی (صلح نامہ کرپسی) لیکن سلیمان اور چارلس کی جنگ بحر روم اور ہنگری میں بدستور جاری رہی، فرانس اگرچہ دولت عثمانیہ کا حلیف تھا اور ۱۵۳۵ء کے معاہدہ کے بعد ہر جنگ میں سلیمان نے پوری وفاداری کے ساتھ فرانس کا ساتھ دیا تھا مگر فرانس کو جب بھی اپنا فائدہ نظر آیا اس نے سلیمان کی اجازت کے بغیر چارلس سے صلح کر لی، چنانچہ صلح نامہ وینس (۱۵۳۸ء) اور صلح نامہ کرپسی (۱۵۴۴ء) کا تکملہ عین اس حالت میں ہوا جب سلیمان فرانس کے حلیف کی حیثیت سے چارلس سے جنگ میں مصروف تھا، فرانس کے اس طرز عمل کو میریٹ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں مناسب طریقہ پر واضح کر دیا ہے، وہ لکھتا ہے:

”فرانس اور خاندان ہابس برگ (The Habsburgs) یعنی فرماں روا بیان

آسٹریا و ہنگری کے درمیان جنگ کا سلسلہ بہت قلیل وقفہ کے ساتھ ۱۵۳۵ء سے ۱۵۵۹ء تک قائم رہا اور مکمل طور پر صلح تو ۱۵۹۸ء تک نہ ہو سکی، اس پوری مدت میں اور اس کے بعد بھی فرانس ترکوں کے وفادارانہ تعاون پر اعتماد کر سکتا تھا، اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ترکوں نے فراسیسیوں کی بہ نسبت بہت زیادہ مستقل اور مسلسل طور پر اس اتحاد کے ساتھ وفاداری برتی، برخلاف اس کے موخر الذکر کے مقاصد کے لیے یہ اتحاد جب اور جتنے دنوں تک مفید ثابت ہوا، انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا لیکن جب ان کے ذاتی اغراض کا تقاضا یہ ہوا کہ ترکوں کے دشمنوں سے صلح کر لی جائے تو انہوں نے اس میں کوئی تامل نہیں کیا۔“

خیر الدین پاشا کی وفات | ۹۵۳ھ (۱۵۴۶ء) میں خیر الدین پاشا کا انتقال ہو گیا،

اس نے اپنی حیرت انگیز شجاعت اور قابلیت سے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات میں بہت کچھ اضافہ کیا بلکہ بحر روم، بحر احمر اور بحر ہند میں اس کی بحری قوت کو درجہ کمال تک پہنچا دیا، یہاں تک کہ یورپ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ طاقت ور شہنشاہ چارلس پنجم بھی تنہا ان کے مقابلہ کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، گو وہ محض ایک سپاہی تھا تاہم علوم و فنون کی سرپرستی کا شوق اسے اتنا زیادہ تھا کہ اس نے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ ایک کالج قائم کرنے میں صرف کر دیا۔

طور غوث | خیر الدین پاشا کے علاوہ سلیمان کو اسی قسم کے دواور بحری کپتانوں کی خدمات بھی حاصل ہو گئی تھیں، جن کی غیر معمولی شجاعت اور قابلیت کا سلسلہ بحر روم اور اس کے ساحلی علاقوں پر بیٹھا ہوا تھا، ان میں سے ایک طور غوث اور دوسرا پیالے تھا، طور غوث بھی ابتدا میں ایک بحری قزاق رہ چکا تھا، چنانچہ ایک بار اس نے تیس جہازوں کا بیڑا تیار کر کے جزیرہ کارسیکا پر حملہ کر دیا لیکن ڈوریانے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا اور زنجیروں میں ڈال دیا، آخر کار مہینوں کے بعد خیر الدین باربروسہ کی دھمکی سے کہ اگر طور غوث رہا نہ کیا گیا تو جنوا (ڈوریا کا وطن) برباد کر دیا جائے گا، ڈوریانے اسے آزاد کیا، طور غوث اپنی مہارت فن اور شجاعت میں خیر الدین سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا، اٹلی اور اسپین کے ساحلی علاقے اس کے نام سے کانپتے تھے، عثمانی رعایا ہونے کے باوجود اس کو سلطان کے حلیفوں کے جہاز گرفتار کر لینے میں بھی کوئی تاہل نہ ہوتا، چنانچہ ایک بار اس نے وینس کے چند تجارتی جہاز گرفتار کر لیے اور جب سلیمان نے باز پرس کرنے کے لیے اس کو قسطنطنیہ میں طلب کیا تو اس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا اور اپنے بیڑے کو لے کر مراکش چلا گیا اور وہاں کے سلطان کی ملازمت اختیار کر لی، پھر خیر الدین پاشا کی وفات کے بعد سلیمان نے معافی اور اعلیٰ منصب کا وعدہ کر کے اسے بلا لیا اور چند دنوں کے بعد طرابلس کی فتح کے لیے روانہ کیا، طرابلس اس وقت مبارزین مالٹا کا مقبوضہ تھا، طور غوث نے حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور سلطنت عثمانیہ میں شامل

کردیا، اس کے بعد وہ طرابلس کا حاکم مقرر ہوا، ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) میں جب ترکوں نے مالٹا پر حملہ کیا تو وہ بھی اپنا بیڑا لے کر دولت عثمانیہ کی مدد کو آیا لیکن اسی معرکہ میں وہ مارا گیا۔

پیالے | پیالے بھی ایک مدت تک بحری قزاق رہ چکا تھا، پھر اس نے سلیمان کی ملازمت اختیار کر لی اور رفتہ رفتہ عثمانی بیڑے کا امیر البحر مقرر ہو گیا، ۹۶۶ھ (۱۵۶۰ء) میں دوسو جہازوں کا ایک عظیم الشان عیسائی بیڑا طرابلس کو ترکوں سے واپس لینے کے لیے ڈوریا کی سرکردگی میں روانہ کیا گیا تھا پیالے اس کے مقابلہ کے لیے دردنیاں سے نکلا اور عثمانی جزیرہ جربہ کے قریب جس پر عیسائیوں نے اپنی فوجیں اتار دی تھیں اور ایک قلعہ بھی تعمیر کر لیا تھا، ۱۴ مئی ۱۵۶۰ء کو ڈوریا کے بیڑے پر حملہ آور ہو کر اسے نہایت سخت شکست دی، عیسائیوں کے تقریباً پچاس جہاز برباد ہو گئے اور سات گرفتار کر لیے گئے، جزیرہ پر جو عیسائی فوجیں پہنچ چکی تھیں انہیں بھی قلعہ کا محاصرہ کر کے پیالے نے گرفتار کر لیا اور جربہ پر عثمانی علم پھر لہرانے لگا، اس کے بعد اس نے اردن کے صوبہ پر جو الجزائر کے مغرب میں واقع ہے، حملہ کر کے اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا، ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) میں جب مالٹا پر حملہ ہوا تو وہی عثمانی بیڑے کا امیر البحر تھا۔

پرتگال سے بحری جنگ | پندرہویں اور سولہویں صدی میں اسپین کے بعد جس ملک سے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا وہ پرتگال تھا، اندلس میں جب اسلامی حکومت قائم تھی تو پرتگال بھی اسی کے زیر سایہ تھا لیکن جب اس سرزمین میں مسلمانوں کا آفتاب اقبال غروب ہوا اور اسپین کی عیسائی حکومت نے اسلام کشی کا عمل شروع کیا تو پرتگال نے بھی اخوت دینی کا حق پوری طرح ادا کیا، تفصیل آگے آتی ہے، ہندوستان، چین، سیام، جاوا، سماترا، جزائر ہند، سیلون، ملبار، ممباسہ، زنجبار، حبش، مصر و عرب وغیرہ مشرقی ممالک کی بحری تجارتیں عرب تاجروں کے ہاتھوں میں تھیں، ان کے جہاز بحر ہند، بحر عرب، خلیج فارس اور بحر احمر کے تجارتی راستوں پر قابض تھے، یہ لوگ چین، ہندوستان اور ایران وغیرہ سے مال لے جا کر مصر

پہنچاتے تھے اور وہاں سے وینس اور جنوا کے سوداگرا سے یورپ لے جاتے تھے، پھر اسی طریقہ سے یورپ کا مال عربوں کے جہازوں پر ہندوستان، ایران اور چین وغیرہ مشرقی ملکوں میں پہنچتا تھا، اس تجارت سے مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کو بہت فائدہ تھا لیکن جب واسکوڈی گاما نے راس امید کی راہ سے ہندوستان تک پہنچنے کا راستہ دریافت کیا تو پرتگال نے اس بات کی کوشش شروع کی کہ جس طرح ممکن ہو یہ تجارت عربوں کے ہاتھوں سے چھین لی جائے اور مشرقی ممالک سے تجارت کرنے کے لیے بجائے قدیم راستہ کے وہ جدید راستہ اختیار کیا جائے جس کو واسکوڈی گاما نے دریافت کیا تھا، اس مقصد کے حصول کے لیے پرتگیزیوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس کی نوعیت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مستند رسالہ ”خلافت عثمانیہ“ سے واضح ہوتی ہے، مولانا فرماتے ہیں:

”اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عرب جہازوں پر تاخت شروع کی، عرب، حبش، ہندوستان اور فارس کے ساحلی مقامات پر حملے کیے اور نامسلموں کو مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں اور عربوں کے ہاتھ اپنا اسباب تجارت فروخت نہ کریں، ملیبار کے موپلہ تاجروں پر بڑی زیادتیاں کیں، یمن اور حجاز کے ساحلی شہروں پر قبضہ جمایا اور ہندوستان میں سندھ سے لے کر مدراں و گجرات و بمبئی تک بندرگاہوں پر دھاوے کیے، ساحلوں اور جزیروں میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، مسجدیں توڑ کر کلیسا بنائی جا رہی تھیں، کالی کٹ کے راجہ کو اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو عرب آنے جانے سے روک دے، کوچین ساحل ہند پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو قتل کیا اور مسجد کو کلیسا بنا لیا اور پھر رفتہ رفتہ عرب کے سواحل پر عدن، ہرمز، پریم وغیرہ کو اور ہندوستان کے سواحل میں سے گوا، چیول، وائل، دیپ، دمن، مہامتم وغیرہ کو تاخت و تاراج کیا، ۹۱۵ھ میں کالی کٹ پر حملہ کر کے شہر کو لوٹ لیا اور وہاں کی جامع مسجد کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، یہی حال انہوں نے عرب کے ساحلی مقامات کا کر دیا، حج کے بحری مسافران قزاقوں کے ہاتھوں سے بہ مشکل جاتے رہ سکتے تھے، گوا کا مشہور بندرگاہ سلطنت بیجاپور سے

چھین لیا اور سلطان گجرات کے تمام بندرگاہوں پر غارت گری شروع کر دی، جدہ اور عدن پر کئی حملے کیے، کبھی کامیابی ہوئی اور کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، انتہا یہ ہے کہ پرتگالی یہ خواب دیکھنے لگے کہ جدہ پر قبضہ کر کے جاز پر حملہ کیا جائے اور خاکم بدہن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو ویران اور حریم محترم کو منہدم کر کے اسلام کی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔^۱

یہ حالات تھے جن کے دفعیہ کی ذمہ داری سلطان نے تخت پر آنے کے بعد بحیثیت خلیفۃ المسلمین کے محسوس کی اور پھر اس ذمہ داری سے عہدہ براہو آنے کی حتی الامکان پوری کوشش کی، چنانچہ ۹۳۱ھ (۱۵۲۵ء) میں اس نے ایک بیڑا رئیس سلیمان کی ماتحتی میں عدن کے محاصرہ کے لیے روانہ کیا، جس پر اس وقت پرتگیزیوں کا قبضہ تھا، مگر اس مہم میں ترکوں کو شکست ہوئی، پھر بھی وہ دل شکستہ نہیں ہوئے اور بحر ہند میں برابر پرتگال کے جہازوں پر حملہ کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ گجرات کے ساحل تک پہنچ گئے، جہاں ان میں اور پرتگیزیوں میں متعدد معرکے پیش آئے، اس کے بعد ۹۳۵ھ (۱۵۳۸ء) میں ایک عظیم الشان ترکی بیڑا سلیمان پاشا والی مصر کی سرکردگی میں سوئز اور عدن پر قبضہ کرتا ہوا گجرات کی طرف روانہ ہوا، دیپ پہنچنے کے بعد گجراتیوں سے مل کر اس نے پرتگیزیوں پر حملے شروع کیے، سلیمان پاشا نے دیپ کا محاصرہ کر لیا اور اگر وہ استقلال کے ساتھ محاصرہ کو جاری رکھتا تو یہ بندرگاہ پرتگال کے قبضہ سے ضرور نکل جاتی لیکن غالباً سلیمان پاشا کی خودداری اور استبداد نے امرائے گجرات کو آزر دہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے سامان رسد کا بھیجنا بند کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز دفعۃً ترکی بیڑے نے لنگر اٹھا کر کوچ کر دیا اور دیپ پر پرتگیزیوں کا قبضہ بدستور قائم رہا، سلیمان کو جب یہ خبر پہنچی تو اسے بہت غصہ آیا، اس نے سلیمان پاشا کو اپنے دربار میں طلب کیا اور غضب ناک ہو کر کہنے لگا کہ ”میں نے تم دیپ سے فرنگیوں کو نکالنے کے لیے لے لیے اور وہاں کے بادشاہ کی مدد کے لیے بھیجا تھا، ہندوستان کے مسلمانوں پر حاکم بنا کر نہیں بھیجا تھا۔“

۱۔ ان واقعات کی تفصیل و اسناد کے لیے رسالہ مذکور ہے صفحات ۲۳۶ تا ۲۵۷ ملاحظہ فرمائیں۔ ۲۔ خلافت عثمانیہ، ص ۶۱۔

پیری رئیس | ترکوں کی اس ناکامی سے پرتگیزیوں کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے کہ انہوں نے عدن پر دوبارہ قبضہ کر لیا، اس لیے ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں سلیمان نے مشہور ترکی امیر البحر پیری رئیس کے زیر قیادت ایک مضبوط بیڑا بحر ہند میں روانہ کیا، اس بیڑے نے پہلے عدن کو پرتگیزیوں کے قبضہ سے چھڑایا، پھر وہ عرب کے ساحلی مقامات سے گزرتا ہوا مسقط پہنچا جہاں اس نے پرتگالی بیڑے کو غافل پا کر گرفتار کر لیا لیکن جب خلیج فارس کے ساحل پر پرتگیزیوں کو شکست دے کر یہ ہرمز پہنچا تو وہاں ایک سخت معرکہ پیش آیا، جس میں دشمنوں کو فتح ہوئی اور پیری رئیس صرف دو جہازوں کو لے کر نکل سکا، بقیہ گرفتار ہو گئے، پیری رئیس ایک جغرافیہ داں کی حیثیت سے بھی اسی قدر مشہور ہے جس قدر ایک امیر البحر کی حیثیت سے، اس نے بحر الہین اور بحر روم پر دو کتابیں لکھی ہیں، جن میں ذاتی معلومات کی بنا پر ان سمندروں کے دھاروں، گردو پیش کے علاقوں، بندرگاہوں اور ساحل پر اترنے کی مناسب جگہوں کے حالات بیان کیے ہیں۔

سیدی علی | پیری رئیس کی شکست کی خبر سن کر سلیمان نے ایک دوسرے امیر البحر مراد بے کو روانہ کیا تا کہ عثمانی بیڑے کو آزاد کرائے، ہرمز کے سامنے پرتگالی بیڑے سے مقابلہ ہوا، جس میں ترکوں کو پھر شکست ہوئی اور ان کے جہازوں کا بڑا حصہ ڈوب گیا، اس کے بعد سلیمان نے اپنے مشہور امیر البحر سیدی علی کو اس مہم پر روانہ کیا، یکم شوال ۹۶۱ھ (۱۵۵۳ء) کو وہ بصرہ سے روانہ ہوا اور خلیج فارس کے کنارہ کنارہ ہوتا ہوا جب اس موسم نام کے قریب پہنچا تو پرتگالی بیڑا سامنے نظر آیا، ایک سخت معرکہ کے بعد پرتگیزیوں کو شکست ہوئی اور سیدی علی کے لیے آگے کا راستہ صاف ہو گیا، چنانچہ وہ کھلے سمندر میں داخل ہو کر مسقط کے سامنے نمودار ہوا، یہاں پرتگیزیوں نے پھر مقابلہ کیا اور اس جنگ میں طرفین کو شدید نقصان پہنچا، رات کے وقت جب دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو دفعۃً ہوا اس قدر تیز ہوئی کہ سیدی علی کے جہاز بے قابو ہو گئے اور وہ بہہ کر بلوچستان کے ساحل پر نکل آیا، چند دنوں کے بعد اس نے پھر بحر احمر کا رخ کیا لیکن ایک ناگہانی طوفان اسے دوبارہ بحر ہند میں بہا لے گیا، سیدی علی نے سورت

کی بندرگاہ میں آکر جہازوں کو چھوڑ دیا اور خشکی کا راستہ اختیار کیا، وہ افغانستان، ایران اور عراق ہوتا ہوا قسطنطنیہ واپس آیا اور یہ مہم نامتو ہی رہی، اس کے بعد سلیمان کے عہد میں پرتگیزیوں سے کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں مگر کوئی بڑا مقابلہ پیش نہیں آیا۔

پیری رئیس نے گجرات سے قسطنطنیہ تک سیاحت کے حالات ایک سفرنامہ میں قلم بند کیے ہیں، وہ شاعر بھی تھا، اس نے ریاضیات اور فن جہازرانی پر بھی چند رسالے لکھے ہیں جو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، خصوصاً اس کی تصنیف ”محیط“ جو بحر ہند کی جہازرانی پر ہے، نہایت مستند خیال کی جاتی ہے، جرمن مؤرخ فان ہیمبر کا بیان ہے کہ بحر لہین اور بحر روم کے حالات پر جو کتابیں پیری رئیس نے لکھی ہیں، ان کے نسخے برلن اور ڈرسدن کے شاہی کتب خانوں، نیز روسہ میں پوپ کے کتب خانہ اور بولونا میں سیدی علی کی ”محیط“ کا واحد معلوم نسخہ نیپلز میں ہے۔

مالٹا | مالٹا مبارزین سینٹ جان کا مقبوضہ تھا، جہاں روڈس سے نکلنے کے بعد انہوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، یہ اور اس کے قریب کا چھوٹا سا جزیرہ غوزا شہنشاہ چارلس نے انہیں دے دیا تھا، مالٹا میں آنے کے بعد انہوں نے اس کو نہایت مستحکم کر لیا تھا، مبارزین کے جہاز اسپین اور دوسری مخالف طاقتوں کے بیڑوں کے ساتھ مل کر عثمانی بیڑوں پر حملہ آور ہوتے تھے اور ترکوں سے ان کی جنگ برابر جاری رہتی تھی، یہ لوگ سلطنت عثمانیہ کے تجارتی جہازوں پر بھی حملہ آور ہوتے رہتے تھے اور بحر روم میں لوٹ مار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے، مجبوراً سلیمان کو مالٹا پر حملہ کرنے کا تہیہ کرنا پڑا، حملہ کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مالٹا میں ایک کثیر تعداد مسلمان غلاموں کی موجود تھی، جو وہاں کے عیسائیوں کے مظالم سے تنگ آ گئے تھے، علاوہ بریں بحر روم میں یہ جزیرہ اپنے موقع کے لحاظ سے نہایت اہم تھا، چنانچہ یکم اپریل ۱۵۶۵ء کو سلیمان نے ۱۸۱ جہازوں کا ایک زبردست بیڑا تیس ہزار فوج کے ساتھ مصطفیٰ پاشا کی سرکردگی میں قسطنطنیہ سے روانہ کیا، ۱۹ مئی کو یہ بیڑا مالٹا پہنچا اور دوسرے ہی روز حملہ شروع

ہو گیا، ۲۳ جون ۱۵۶۵ء کو قلعہ سینٹ ایلمو (St. Elmo) فتح ہو گیا لیکن ترکوں کی انتہائی کوشش اور شدید نقصان کے باوجود سینٹ انجیلو (St. Angelo) اور سینٹ مائیکل (St. Micheal) کے قلعوں پر قبضہ نہ ہو سکا اور بالآخر چار ماہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۱ ستمبر ۱۵۶۵ء کو مصطفی پاشا نے محاصرہ اٹھالیا، اس محاصرہ میں پچیس ہزار ترک اور پانچ ہزار عیسائی مارے گئے۔

ہنگری کی مہم اور سلیمان کی وفات | جس وقت محاصرہ اٹھالینے کی خبر قسطنطنیہ پہنچی، سلیمان آسٹریا سے ایک نئی جنگ کی تیاری کر رہا تھا، وجہ یہ تھی کہ ہنگری کی حلیف جماعتوں میں پھر نزاع شروع ہو گئی تھی اور میکسی میلن ثانی (Maximilian-II) نے جو فرڈیننڈ کے انتقال کے بعد اس کا جانشین تھا، کانٹ زاپولیا کے لڑکے کو تخت سے محروم کر دینے کا عزم کر لیا تھا، چنانچہ اسی سلسلہ میں اس نے بعض اہم قلعوں پر قبضہ بھی کر لیا تھا، یہ معلوم کر کے سلیمان نے بذات خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا اور باوجود اس کے کہ اس کا سن ۶۷ سال کا ہو چکا تھا اور ضعف عمر اور علالت کے باعث وہ گھوڑے پر بیٹھ نہیں سکتا تھا، بالکی میں سوار ہو کر کیم مئی ۱۵۶۶ء کو فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے ہنگری کی طرف روانہ ہوا، اس میں شبہ نہیں کہ آسٹریا کی جنگ نے اس سال مبارزین مالٹا کو دوسرے حملہ سے محفوظ کر دیا جو یقیناً ان کے لیے مہلک ثابت ہوتا، ۲۷ جون ۱۵۶۶ء کو سلیمان سلین کے مقام پر پہنچا اور وہاں نوجوان سچمنڈ زاپولیا (Sigismund Zapolya) نے جو سلطنت عثمانیہ کے زیر سرپرستی اور ٹرانسلوینیا کا بادشاہ تھا، اس کے سامنے نذر اطاعت پیش کی، آگے بڑھنے سے پہلے سلیمان اربرو (Erbru) اور زیتھتھ (Szigeth) کے قلعوں کو فتح کر لینا چاہا تھا، چنانچہ ۱۵ اگست ۱۵۶۶ء کو عثمانی فوجوں نے زیتھتھ شہر کے گرد اپنے خیمے نصب کر دیے، پانچ روز میں شہر فتح ہو گیا لیکن وہاں کے حاکم زرنی (Zriny) اور اس کے باقی ماندہ ۳۲۰۰ آدمیوں نے قلعہ میں پناہ لی اور وہاں سیاہ علم نصب کر کے اس بات کی قسم کھائی کہ جب تک ایک سپاہی بھی زندہ رہے گا ہتھیار نہ ڈالیں گے، اگست اور ستمبر میں ترکوں نے اس قلعہ پر تین حملے کیے لیکن ہر بار انہیں پسپا ہونا پڑا،

بالآخر انہوں نے قلعہ کے سب سے بڑے برج کے نیچے سرنگ کھود کر بارود بچھا دیا اور ۱۵ ستمبر ۱۵۶۶ء کو علی الصباح بارود میں آگ لگا دی، پھر بھی چار روز کی مسلسل گولہ باری کے بعد ۱۸ ستمبر کو یہ قلعہ فتح ہوا لیکن ۱۵ ستمبر کی رات ہی کو سلیمان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی، صدرِ اعظمِ صوفوتلی نے سلطان کی وفات کی خبر بالکل مخفی رکھی اور اسی کے نام سے تمام احکام جاری کرتا رہا، اس سے پوشیدہ طور پر شہزادہ سلیم کے پاس اس حادثہ کی اطلاع بھیج دی، اس درمیان میں عثمانی فوجیں جن کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی متعدد مقامات فتح کرتی رہیں، صوفوتلی نے سلیمان کی لاش پر مصالحہ لگا کر اسے خراب ہونے سے محفوظ کر دیا تھا اور کوچ کے وقت لاش کو پاکی میں رکھ کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جاتا تھا، اس نے لشکر میں یہ خبر مشہور کرادی تھی کہ سلطان علالت کی وجہ سے باہر نکلنے سے معذور ہے، اس تدبیر سے اس نے سات ہفتہ تک اس کی وفات کو پوشیدہ رکھا اور بالآخر یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ قسطنطنیہ میں شہزادہ سلیم تخت پر بیٹھ چکا، اس نے ۲۳ اکتوبر ۱۵۶۶ء کو تمام فوج کو جمع کر کے سلیمان کی وفات کا اعلان کر دیا۔

سلطنت عثمانیہ کی وسعت | سلیمان کے عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی وسعت، قوت اور خوش حالی کے لحاظ سے حد کمال تک پہنچ گئی تھی، اس کے بعد جزائر سائپرس اور کریٹ کے علاوہ اس میں بہت کم اہم اور مستقل اضافے ہوئے، اس وسیع و عریض سلطنت کا رقبہ چالیس ہزار مربع میل سے زیادہ تھا، یہ بودا سے بصرہ تک اور بحرِ کاسپین سے بحرِ روم کے مغربی حصہ تک پھیلی ہوئی تھی اور یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک اس میں شامل تھے، شمال میں ازف کی دیواریں، روس کے مقابل سلطنت عثمانیہ کی سرحد کی حفاظت کرتی تھیں، جنوب میں عدن کی پہاڑی نے سلاطین کی حکومت عرب کے جنوبی ساحل پر مستحکم کر دی تھی، انہیں بحرِ ہند میں بااثر بنادیا تھا اور بحرِ احمر پر کامل اختیار دے رکھا تھا، سلطان کا یہ فخر کوئی بے جا فخر نہ تھا کہ وہ بہت سی مملکتوں کا فرمان روا، تین براعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں کا مالک ہے۔^۱

سلطنت کی انتظامی تقسیم | سلیمان نے اس عظیم الشان سلطنت کو اکیس ولایتوں اور پھر ان ولایتوں کو ۲۵۰ سنجقوں میں تقسیم کر دیا تھا، ولایتیں حسب ذیل تھیں:

۱- رومیلیا، اس میں یورپ کے وہ تمام عثمانی مقبوضات شامل تھے، جو دریائے ڈینیوب کے جنوب میں واقع تھے اور جن میں یونان، مقدونیا، تھریس، پارس، ایلیریا، دلماشیا اور میسیا کے صوبے بھی داخل تھے۔

۲- مجمع الجزائر، بحر روم، یہ ولایت قبو دان پاشا (امیر البحر اعظم) کے سپرد تھی۔

۳- الجزائر اور اس کے علاقے۔

۴- طرابلس۔

۵- افرنجس میں مغربی ہنگری کے مفتوحہ علاقے شامل تھے۔

۶- تھیسوار بہ شمول بنات، ٹرانسلوانیا و مشرقی ہنگری۔

۷- اناطولیہ، عموماً اس سے تمام ایشیائے کوچک مراد لیتے ہیں لیکن یہاں اس سے

ایشیائے کوچک کا صرف شمالی مغربی حصہ مراد ہے۔

۸- کرمانیہ، ۹- روم جیسے ولایت سیواس اور بعض اوقات حکومت اماسیا بھی کہتے

ہیں۔

۱۰- سوا القدر، اس میں ملاٹیا، سموٹا اور البوستان کے شہر اور ملحق علاقے اور کوہ طور

کے مشرقی درے شامل تھے۔

۱۱- طرابزون۔

۱۲- دیار بکر، ۱۳- دان، ان دو ولایتوں میں آرمینیا اور کردستان کے بیش تر حصے

شامل تھے۔

۱۴- حلب، ۱۵- دمشق، ان دونوں میں شام اور فلسطین کی ولایتیں شامل تھیں۔

۱۶- مصر۔

۱- مکہ، مدینہ اور حجاز کے علاقے۔

۱۸- یمن و عدن، یہ ولایت جنوبی عرب، خلیج فارس کے ساحلی علاقے اور شمالی مغربی ہند تک پھیلی ہوئی تھیں۔

۱۹- بغداد، ۲۰- موصل، ۲۱- بصرہ، یہ تینوں ولایتیں ان فتوحات پر مشتمل تھیں جو سلیم اور سلیمان نے مسوپوٹامیا اور اس سے ملحق جنوبی علاقوں میں ایرانیوں سے حاصل کی تھیں۔ ان ولایتوں کے علاوہ ولاچیا، مولڈیویا، رگوسا اور کریمیا کی ملکیتیں بھی سلیمان کی باج گذار تھیں، ولاچیا اور مولڈیویا سے خراج زیادہ مقدار میں آتا تھا اور کریمیا عثمانی افواج کے لیے بہادر تارکیوں کے دستے مہیا کرتا تھا۔

آبادی | سلیمان اعظم کی وسیع سلطنت میں بیس مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے، ان میں سے عثمانی ترکوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ کروڑ تھی، ان کا بیش تر حصہ (۲/۵) ایشیا اور خصوصاً ایشیائے کوچک میں آباد تھا، تیس لاکھ یونانی یورپین ترکی کے جنوبی حصہ میں آباد تھے اور دس لاکھ ایشیائے کوچک میں، آرمینی نسل کے لوگ جن کی تعداد بیس اور تیس لاکھ کے درمیان تھی، زیادہ تر ایشیا میں تھے، سب سے زیادہ تعداد سیلانی نسل کے باشندوں کی تھی، بلغاریا، سرویا، بوسینیا، مونٹی نیگرو اور ہرزگووینا میں کثرت تعداد ان ہی لوگوں کی تھی، مولڈیویا اور ولاچیا میں بھی ان کی تعداد زیادہ تھی اور ان میں سے کئی ہزار ٹرانسلوینیا اور البانیا میں بھی آباد تھے، ان کی مجموعی تعداد تخمیناً ۶۵ لاکھ تھی، رومی نسل کے لوگ زیادہ تر ولچیا اور مولڈیویا میں پائے جاتے تھے، ان کی تعداد چالیس لاکھ تھی، اہل البانیا جنہیں ترک ارناؤط (Skipetars) کہتے ہیں تقریباً پندرہ لاکھ تھے، تاتاریوں کی تعداد بھی تخمیناً پندرہ لاکھ تھی، عربی نسل کثرت سے شام، عرب، مصر اور شمالی افریقہ کے ساحلی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی اور سلیمان کے عہد میں اس کا شمار تقریباً ساٹھ لاکھ تھا، مارونی، کالڈی اور روزی نسل کے لوگ بھی مجموعی طور پر دس لاکھ کے اندر تھے، کردوں کی تعداد بھی غالباً اسی قدر تھی، دیار بکر اور ملحق علاقوں کے ترکمانوں کا شمار

ایک لاکھ تھا، ان کے علاوہ ترکی، ہنگری کے مکیار اور ٹرانسلوینیا کے جرمن نسل والے الجیریا اور دوسرے افریقی صوبوں کے برابر مصر کے قبلی، یہود، سگانی (Tsigenes) مملوک اور وہ ہندوستانی جو ترکی گورنر عدنان کے زیر حکومت تھے، یہ سب سلطان سلیمان اعظم کی عظیم الشان سلطنت میں آباد تھے، سلطنت کی مجموعی آبادی کا تخمینہ ساڑھے چار کروڑ سے پانچ کروڑ تک کیا جاتا ہے۔

فوج | سلیمان کی سلطنت کی وسعت کا ایک بڑا سبب اس کی فوجی قوت تھی، چھپالیس سال کی حکومت میں اس نے عثمانی فوجوں کی تعداد دو چند کر دی تھی، نئی چری کی تعداد اس نے بیس ہزار تک پہنچادی، مستقل اور تنخواہ دار فوج کا شمار جس میں شاہی سوار اور دوسرے دستے شامل تھے، اڑتالیس ہزار تھا، سلیمان کی توجہ سب سے زیادہ نئی چری پر رہتی تھی کیوں کہ یہی فوج اکثر معرکوں میں فتوحات کی ضامن ہوتی، اس نے اس فوج کا ایک علاحدہ دستہ قائم کیا تھا، جس میں وہی سپاہی داخل کیے جاتے تھے، جو ایک طویل مدت کی خدمات کے بعد ضعیف ہو جاتے یا زخموں کے باعث کسی جنگ میں شریک ہونے کے قابل نہ رہ جاتے، سلیمان کی نظر میں نئی چری کی جواہیت اور قدر تھی اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اعزازی طور پر وہ خود اس فوج میں داخل ہو گیا تھا اور جس روز تنخواہ تقسیم کی جاتی تھی، ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے خود بھی تنخواہ لینے کے لیے حاضر ہوتا تھا، یہ طریقہ اس کے جانشینوں نے بھی جاری رکھا، جو فوجیں سلطنت کے جاگیر دار جمع کرتے تھے یا جو بے ضابطہ طور پر جنگ کے موقعوں پر خود جمع ہوتی تھیں، ان کا شمار دو لاکھ سے زیادہ تھا، ان کے علاوہ تین سو توپیں اور تین سو جہاز تھے۔

سولہویں صدی کی ابتدا سے یورپ کی مسیحی سلطنتوں کی فوجوں میں بہت کچھ اصلاح و ترقی ہونے لگی تھی لیکن عثمانی فوجیں اپنی تنظیم اور ساز و سامان میں مسیحی فوجوں سے

بہت آگے تھیں، توپ خانوں کی تعداد اور قوت کے علاوہ قلعہ بندی اور قلعہ سازی اور فوجی انجینئرنگ کی تمام شاخوں میں ترک یورپ کی سلطنتوں پر بہت زیادہ فوقیت رکھتے تھے، کرہی لکھتا ہے کہ سلیمان اپنی فوجوں کے جسمانی آرام اور اخلاقی نگرانی پر جس قدر توجہ رکھتا تھا اس کو اس بے پروائی سے کوئی مناسبت نہ تھی جو اس کے حریفوں کے لشکر میں بدنصیب سپاہیوں کے ساتھ برتی جاتی تھی۔

محاصل سلطنت | محاصل سلطنت کے لحاظ سے سلیمان کو اپنے تمام ہم عصر فرماں رواؤں پر فوقیت حاصل تھی، اس کے عہد میں خالصہ کی آمدنی پچاس لاکھ دوکات تھی، عشر، جزیرہ، محصول در آمد برآمد اور دوسرے مستقل محصولوں کی آمدنی ملا کر یہ رقم ستر اور اسی لاکھ دوکات تک پہنچ جاتی تھی، رعایا پر محصول کا بار ہلکا تھا اور صرف دو موقعوں پر ایک بار جب وہ بلغراد اور روڈس کے محاصرہ کی تیاری کر رہا تھا اور دوسری مرتبہ جب اسے جنگ موہاکز کے لیے سامان فراہم کرنا تھا، سلیمان کو ایک زائد محصول لگانا پڑا، جس میں اس کی تمام رعایا بلا امتیاز مذہب و حیثیت شریک کی گئی لیکن دونوں مرتبہ محصول کی رقم قلیل تھی اور ان موقعوں کے علاوہ پھر کبھی کسی زائد محصول کی ضرورت پیش نہیں آئی، جنگوں کے اخراجات مال غنیمت سے پورے ہوتے رہتے تھے، ان اخراجات کے علاوہ ہر فتح سے کافی رقم سلطان کو بھی ملتی تھی، ہنگری، بڑا سلوینیا، گوسا، مولڈیویا اور لاجپا سے خراج آتا تھا، آمدنی کا ایک ذریعہ ان اعلیٰ حکام سلطنت کا ضبط کردہ سامان اور جائیدادیں بھی تھیں جو کسی جرم میں سلطان کے حکم سے قتل کر دیے جاتے تھے۔

نظام جاگیری | سلیمان نے ترکی نظام جاگیری کی تنظیم خاص توجہ کے ساتھ کی اور ان بدعنوانیوں کو دور کیا جو اس نظام میں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں، اس نے قانون بنا دیا کہ کوئی تیمار (چھوٹی جاگیر) ایک خاص حد سے نیچے قائم نہ رکھی جائے، متعدد چھوٹی جاگیروں کو ملا کر

ایک زعامت (بڑی جاگیر) بنالینے کی اجازت تھی لیکن کوئی زعامت تقسیم کر کے تیار نہیں بنائی جاسکتی تھی، علاوہ اس صورت کے کہ کسی زعامت کا جاگیردار جنگ میں قتل ہو گیا ہو اور اس نے ایک سے زیادہ لڑکے چھوڑے ہوں، سلطان کی اجازت سے متعدد اشخاص مل کر کسی جاگیر کو اپنی مشترکہ کاشت میں رکھ سکتے تھے لیکن جاگیر اس وقت بھی ایک جاگیر شمار کی جاتی تھی، جاگیر کی کوئی تقسیم جس کے لیے باب عالی سے خاص طور پر اجازت حاصل نہ کر لی گئی ہو سخت سزا کی مستوجب ہوتی، ان قوانین سے ان برائیوں کا انسداد ہو گیا جو جاگیروں کے ٹکڑے کر دینے سے مسیحی یورپ کے نظام جاگیری میں پھیلی ہوئی تھی جاگیردار کو وصیت نامہ یا کسی دوسرے ذریعہ سے جاگیر کے انتقال کا اختیار نہ تھا، اگر کوئی دوسرا جاگیردار اولاد ذریعہ چھوڑے بغیر مر جاتا تو اس کی جاگیر سلطان کے قبضہ میں چلی جاتی، سلیمان سے پہلے وزرا اور صوبے کے حاکموں کو اجازت تھی کہ وہ اس قسم کی جاگیریں دوسرے اشخاص کو دے دیں لیکن سلیمان نے اس اختیار کو صرف چھوٹی جاگیروں تک محدود کر دیا، سلطان کے علاوہ کوئی دوسرا کسی ایسی رعایت کو دینے کا اختیار نہ رکھتا تھا، جو سابق جاگیردار کی وفات پر سلطان کے قبضہ میں آچکی ہو، اگر کوئی شخص کسی چھوٹی جاگیر (تیمار) کو سلطان کے علاوہ کسی اور سے بھی پاتا تب بھی اس کے جاگیری فرائض تمام تر سلطان ہی سے متعلق ہوتے اور جاگیر کے عطا کرنے والے کو اس شخص پر کسی قسم کا جاگیری حق حاصل نہ ہوتا، ”سپاہی“ اس نظام جاگیری میں صرف اپنے سلطان کا تابع تھا۔

سلیمان کے عہد میں بڑی جاگیروں (زعامت) کی تعداد ۳۱۹۲ اور چھوٹی جاگیروں (تیمار) کی ۵۰۱۶۰ تھی، سپاہی (یعنی فوجی جاگیردار) کا فرض صرف یہ نہ تھا وہ جنگ کے موقع پر فوجی خدمت کے لیے خود حاضر ہو بلکہ اگر اس کی جاگیر کی قیمت ایک متعین رقم سے زیادہ ہوتی تو اس زیادتی کی مناسبت سے ایک ایک سے زیادہ مسلح سواروں کو بھی اپنے ساتھ حاضر کرنا پڑتا، سلیمان کے عہد میں فوجی جاگیرداروں کی مجموعی تعداد ڈیڑھ لاکھ سوار تھی، یہ سوار

بیلر بے اور سخق بے کی طلب پر متعین مقامات پر جمع ہو کر عثمانی فوجوں میں شامل ہو جاتے اور بغیر کسی تنخواہ کے جنگ میں شریک رہتے، مستقل تنخواہ دار فوج کا شمار اڑتالیس ہزار تھا، ان کے علاوہ تاتاری سواروں کے متعدد دستے تھے جنہیں خان کریمیا ایک نائب حاکم کی حیثیت سے ہر جنگ کے موقع پر بھیجتا، نیز بے ضابطہ سواروں اور پیادوں کا انبوہ کثیر تھا، جو بطور خود آ کر ترکی لشکر میں شامل ہو جاتا اور جسے مال غنیمت کے سوا اور کچھ نہ ملتا۔

”قانون رعایا“ | سلیمان نے اپنی غیر مسلم رعایا کے لیے جو قوانین وضع کیے تھے، وہ اس کی رواداری، روشن خیالی اور تدبیر کی ایک نمایاں مثال ہیں، اس نے لگان اور دیگر خدمات کو جو رعایا پر جاگیر دار کی طرف سے عائد ہوتی تھیں تصریح کے ساتھ ”قانون رعایا“ میں درج کر دیا تاکہ جاگیر دار اپنے حق سے زیادہ مطالبہ نہ کر سکے، ”قانون رعایا“ کی رو سے مزروعہ زمین کی ملکیت کاشت کار کو حاصل ہوتی تھی اور اس کے معاوضہ میں اسے لگان اور بعض محصول ادا کرنے ہوتے تھے اور اپنے جاگیر دار کے لیے چند متعین خدمات انجام دینی ہوتی تھیں، سلطنت عثمانیہ کی غیر مسلم رعایا اور مسیحی یورپ کے زرعی غلاموں (Serfs) کی حالتوں کے فرق کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ سرحدی عیسائی ممالک کے باشندے بھاگ بھاگ کر سلطنت عثمانیہ میں پناہ لیتے تھے اور اپنے ہم مذہب عیسائی آقاؤں کے جو وعدے پر ترکوں کی نرم حکومت کو ترجیح دیتے تھے، کریمی سلیمان کے ایک ہم عصر مصنف کا قول نقل کرتا ہے:

”میں گروہ درگروہ ہنگری دہقانوں کو اپنے جھونپڑوں میں آگ لگا کر اور اپنے بیوی

بچوں، مویشی اور سامان کاشت کو لے کر ترکی علاقوں میں بھاگ کر جاتے ہوئے دیکھا ہے،

جہاں وہ جانتے تھے کہ عشر کے علاوہ ان پر اور کسی قسم کا محصول یا تکلیف دہ بار عائد نہ کیا جائے گا۔“

عام قوانین | قانون فوج داری، قانون پولیس اور دیگر عام قوانین پر بھی سلیمان نے خاص توجہ کی اور ان سب میں مناسب ترمیم و اصلاح کی، اس کے زیر نگرانی ملا ابراہیم حلبی

نے جو مجموعہ قوانین تیار کیا تھا، اس میں سلطنت عثمانیہ کے متعلق تمام ضروری قوانین درج ہیں، پہلے بہت سے جرائم کے لیے نہایت سخت سزائیں مقرر تھیں مثلاً قتل کر دینا اور اعضا کا کاٹ ڈالنا، سلیمان نے ان سزاؤں کی سختی میں تخفیف کر دی، اس نے مختلف ایشیا کی قیمتیں اور اجرت کی شرحیں بھی مقرر کر دیں، اتہام رکھنے والوں کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ اپنے شرکی تلافی کریں، جھوٹی شہادت دینے والوں، جعل بنانے والوں اور کھوٹے سکے چلانے والوں کی سزایہ مقرر ہوئی کہ ان کا داہنا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے، گیارہ فیصدی سے زیادہ سود لینا خلاف قانون ٹھہرایا گیا، مسلسل تین وقتوں کی نماز یا ایک روزہ قضا کرنے والے کے لیے جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی، بار برداری کے جانوروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنے کی تاکید کی گئی۔

تجارتی مراعات | سلیمان کا عہد حکومت غیر ملکی تاجروں سے حسن سلوک کے لیے خاص طور پر ممتاز تھا، موجودہ جمہوریہ ترکی کے قیام تک سلطنت عثمانیہ میں وہ تجارتی معاہدے جاری تھے جو سلاطین نے غیر ملکی تاجروں کے ساتھ کر رکھے تھے اور جن کی رو سے حکومت عثمانیہ نہ صرف ان تاجروں کے جان و مال اور مذہبی آزادی کے تحفظ کی ذمہ دار ہو جاتی تھی بلکہ ان کے مقدمات کے لیے ان ہی کے ہم قوم افراد کی عدالتیں بھی قائم کر دیتی، ان تجارتی معاہدہ (Capitulations) میں سب سے پہلا معاہدہ سلیمان ہی نے ۱۵۳۵ء میں فرانس کے ساتھ کیا تھا، کریمی لکھتا ہے کہ غیر ملکی سامان تجارت پر ایک حد درجہ ہلکا محصول درآمد و برآمد لگایا گیا تھا، محصول تائین (Profictuir Duties) کا گراں بار اور تکلیف دہ رواج عثمانیوں میں بالکل مفقود رہا ہے۔

علم کی سرپرستی | علم کی اشاعت اور علما کی قدر دانی سلاطین آل عثمان کا ایک مخصوص امتیاز تھا، سلیمان اس وصف میں بھی بہت نمایاں تھا، اس نے بہت سے مدرسے اور دارالعلوم

بنوائے اور علما کی تعلیمی تنظیم اور ان کے منصب میں بہت سی اصلاحیں کیں، وہ علما کی قدر و منزلت میں اپنے تمام پیش روؤں سے آگے بڑھ گیا اور ان کے لیے سلطنت کے قانون میں بعض ایسی مخصوص رعایتیں کر دیں جو کسی اور جماعت کے لیے نہیں کی گئیں، مثلاً اس نے علما کی پوری جماعت کو ہر طرح کے محصول سے بری کر دیا اور ان کی جائیداد کے لیے یہ قانون بنا دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی ضبط نہ کی جائے گی۔

سلیمان نے مکہ معظمہ میں چاروں مذہب کے لیے چار مدرسے قائم کیے، ان کی بنیاد ۹۷۷ھ (۱۵۶۳ء) میں رکھی گئی، عمارت کی تکمیل سلیم خان ثانی کے عہد میں ہوئی، اس نے مدرسین اور طلبہ کے لیے شام کے اوقاف سے وظائف مقرر کیے۔

صدقات | سلیمان نے صدقہ رومیہ کی مقدار جو اس کے آبا و اجداد کے زمانہ سے حرین شریفین کے لیے آتا تھا، بہت بڑھادی اور اپنے خاص خزانہ سے بہت سی رقمیں اضافہ کیں، غلہ کا صدقہ سلیم اول کے وقت سے جاری ہوا تھا، سلیمان نے علاوہ مخصوص اوقاف کے انبار خاص سے بھی غلہ بھیجنا شروع کیا، اس نے مصر کے چند گاؤں بیت المال سے خرید کر ان کے غلہ کو اہل حرین کے لیے وقف کر دیا، شروع میں مدینہ منورہ کے لیے ڈیڑھ ہزار اردب غلہ بھیجا جاتا تھا مگر کچھ دنوں کے بعد سلیمان نے دو ہزار اردب مدینہ منورہ کے لیے اور تین ہزار مکہ معظمہ کے لیے مقرر کر دیا، اس کے علاوہ مصر میں اہل ذمہ سے جو رقم لی جاتی تھی، سلیمان نے اسے خزانہ اور عامرہ سے نکال کر حرین شریفین اور مصر کے علما و مشائخ کو دینا شروع کی، خزانہ شاہی اور سلطان کے جیب خاص سے جو رقمیں ان صدقات کے لیے نکالی جاتی تھیں وہ علاحدہ تھیں۔

تعمیرات کا ذوق | سلیمان کو تعمیرات کا بھی خاص ذوق تھا، اس نے قسطنطنیہ، بغداد، قونیہ، دمشق اور دوسرے شہروں میں نہایت خوب صورت اور عالی شان عمارتیں بنوائیں،

متعدد مسجدیں خود تعمیر کرائیں اور بہتیری مسجدوں کو از سر نو درست کرایا، ان کے علاوہ قسطنطنیہ میں ایک بہت بڑی نہر بنوائی اور مکہ معظمہ کی پرانی نہروں کی مرمت کرائی، سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اسپتال اور پبل تعمیر کرائے۔

علمی اور شاعرانہ مذاق | سلیمان علم و فضل کا نہایت قدر دان تھا اور خود بھی علمی اور شاعرانہ مذاق رکھتا تھا، اس کی تصانیف ترکی لٹریچر میں بلند پایہ خیال کی جاتی ہیں، یہی حیثیت اس کے شاعرانہ کلام کی بھی ہے، دوران جنگ میں وہ روزمرہ کے واقعات قلم بند کرتا جاتا تھا اور اس کے یہ روزنامے اپنے اندر نہایت قیمتی تاریخی مواد رکھتے ہیں، ان روزناموں سے اس کے احساس فرض اور اس کی جفاکشی کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سلطنت کے تمام ملکی اور فوجی معاملات پر کس درجہ توجہ رکھتا تھا۔

عدل و انصاف | سلیمان کی عظمت، اس کے بری اور بحری فتوحات اور توسیع سلطنت ہی میں نمایاں نہ تھی بلکہ سلطنت کے ہر شعبہ میں اس کی غیر معمولی شخصیت کا اثر پایا جاتا تھا، اس کے عدالت میں ہر طبقہ اور ہر جماعت کے لوگ برابر تھے اور سب کے ساتھ یکساں انصاف کیا جاتا تھا، صوبوں کے گورنر یا دوسرے اعلیٰ حکام جو بے انصافی یا ظلم کا ارتکاب کرتے، فوراً برطرف کر دیے جاتے اور اکثر انہیں اپنے جرائم کے پاداش میں قتل کی سزا ملتی، سلیمان کو عدل و انصاف کا اس قدر خیال تھا کہ تخت سلطنت پر آتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ بعض حکام کو جو اپنے فرائض کی ادائیگی میں بدعنوانیاں کرتے تھے، برخاست کر دیا، اس امر میں وہ کسی شخص کی رعایت نہ کرتا، خواہ وہ شخص اس سے کیسا ہی قریبی تعلق رکھتا ہو، چنانچہ فرہاد پاشا کو جو اس کا داماد تھا، سلیمان نے ظلم اور رشوت ستانی کے جرم میں ایک صوبہ کی حکومت سے معزول کر دیا، فرہاد پاشا کی بیوی اور سلیمان کی ماں نے بڑی التجاؤں کے بعد اس کو دوبارہ مقرر کر لیا لیکن جب اس نے اپنی سابق بدعنوانیاں پھر شروع کر دیں تو سلیمان نے اسے دوبارہ معزول کیا اور اب کی بار اس کو قتل کر دیا۔

خون کے چند دھبے | سلیمان کی خانگی زندگی بالکل بے داغ تھی، وہ اپنی طبعی شرافت اور رحم دلی کے لیے مشہور تھا لیکن خون کے چند بدنما دھبوں نے اس کے دامن کو بھی داغ دار بنا دیا، اس کا سب بے بڑا لڑکا مصطفیٰ ایک نہایت لائق اور ہونہار شہزادہ تھا، سلیمان نے اس کو ایک صوبہ کا حاکم بنا دیا تھا، جہاں اس کی غیر معمولی قابلیت کے جوہر نمایاں ہو چکے تھے، اس میں سلیمان کے تمام اعلیٰ اوصاف پائے جاتے تھے، وہ فوج کا محبوب اور اپنے ملک کا مایہ امید تھا لیکن یہی ہردل عزیزی اس کی ہلاکت کا باعث ثابت ہوئی، سلطانہ خرم جو ایک روسی خاتون تھی، سلیمان کی سب سے زیادہ محبوب حرم تھی اور اس کے مزاج میں حد درجہ دخیل ہو گئی تھی، وہ اپنے لڑکے سلیم کے لیے تخت کو محفوظ کر لینا چاہتی تھی لیکن سلیم علاوہ اس کے کہ شہزادہ مصطفیٰ سے عمر میں چھوٹا تھا، نہایت نالائق اور عیش پسند بھی تھا اور مصطفیٰ کے مقابلہ میں اسے تخت پر بٹھانے کا خیال بھی کسی کو نہیں آسکتا تھا، خرم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھی، اس لیے اس نے سلیم کے لیے راستہ صاف کرنے کی کوشش کی اور مصطفیٰ کے خلاف سلیمان کے کان بھرنا شروع کیے، اس نے سلیمان کو یقین دلایا کہ مصطفیٰ اس کی حیات میں تخت پر قبضہ کرنے کی درپردہ کوشش کر رہا ہے اور چوں کہ تمام فوج اس پر جان دیتی ہے، اس لیے بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے، جس طرح سلطان سلیم اول نے سلطان بایزید ثانی کو معزول کر کے خود تخت پر قبضہ کر لیا تھا، سلیمان خرم کے بیانات سے کچھ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے مصطفیٰ کو اپنی صفائی میں ایک حرف بھی کہنے کا موقع نہ دیا اور ۱۵۵۳ء میں جب ایران کی دوسری لڑائی کے لیے وہ لشکر کے ساتھ کوچ میں تھا، مصطفیٰ کو اپنے خیمہ میں طلب کر کے فوراً گلا گھونٹ کر مروا ڈالا، دوسرا لڑکا بایزید بھی خرم کے محبوب فرزند سلیم ہی کی خاطر قتل کیا گیا لیکن اس کے قتل کا سبب ایک حد تک معقول تھا، مصطفیٰ کے قتل کے بعد اس کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی جان بھی زیادہ دنوں تک سلامت نہ رہ سکے گی، اس کے بعض مشیروں نے سازش کر کے اسے قسمت آزمائی کے

لیے آمادہ کیا اور ۱۵۱۵ء میں اس نے سلیم کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا لیکن سلیم کے ساتھ سلیمان کی قوت بھی شامل تھی اور بایزید کو شکست کھا کر ایران میں پناہ لینے پڑی، شاہ طہماسپ نے نہایت احترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور بالتصریح وعدہ کیا کہ اسے اس کے دشمنوں کے ہاتھ میں نہ دے گا لیکن سلیمان نے جنگ کی دھمکی دے کر اور چار لاکھ اشرفیوں کا وعدہ کر کے طہماسپ کو مجبور کیا کہ وہ بایزید اور اس کے چاروں بیٹوں کو سلیم کے سفیروں کے حوالے کر دے، اس سفیر نے بایزید اور اس کے سب بیٹوں کو فوراً قتل کر دیا، بایزید کے قتل کے بعد اب تنہا سلیم ہی تخت کا وارث رہ گیا۔

ابراہیم پاشا | خون کے جن چھینٹوں سے سلیمان کا دامن داغ دار نظر آتا ہے، ان میں سے ایک اس کے وزیر ابراہیم کا خون بھی ہے، ابراہیم نسلایونانی تھا، بڑکپن میں گرفتار ہو کر وہ فروخت ہو گیا تھا، مغنیشیا کی ایک مسلمان دولت مند بیوہ نے اسے خرید اور اس کی ذہانت کا اندازہ کر کے اعلیٰ تعلیم دلوائی، ایک بار سلیمان اس صوبہ میں گیا اور وہاں اس کی نظر ابراہیم پر پڑی، ابراہیم فن موسیقی کا ماہر تھا، اس کے اس کمال کا اثر سلیمان پر خاص طور سے پڑا اور وہ اسے اپنے ساتھ قسطنطنیہ لیتا آیا، وہاں پہنچ کر وہ اپنی قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے روز بہ روز سلیمان کی نظر میں زیادہ محبوب ہوتا گیا، یہاں تک کہ سلیمان نے اپنی بہن کا عقد اس سے کر دیا اور ۱۵۲۳ء میں اسے سلطنت عثمانیہ کا وزیر اعظم مقرر کیا، سلیمان ابراہیم پر حد درجہ اعتماد رکھتا اور اس سے بے حد محبت کرتا، دونوں ساتھ ہی کھانا کھاتے، تمام امور سلطنت دونوں کے باہمی مشورہ سے طے پاتے، جن معرکوں میں سلیمان کسی معذوری کی وجہ سے خود شرکت نہ کر سکتا، ان میں ابراہیم کو سر عسکر بنا کر بھیجتا، تیرہ سال تک سلیمان کے اعتماد کی یہی کیفیت رہی لیکن پھر اس کے دل میں ابراہیم کی طرف سے شکوک پیدا ہونے لگے جو ابراہیم کی بے احتیاطی سے بڑھتے گئے، چونکہ سلیمان نے اس کو سلطنت کے تمام اختیارات دے رکھے تھے، اس لیے ابراہیم اپنے کو سلطان کا ہم پلہ خیال کرنے لگا اور یہی خیال اس کے لیے مہلک ثابت ہوا، اس کی خود

اعتمادی یہاں تک ترقی کر گئی کہ آخر میں اس نے اپنے نام کے ساتھ سلطان کا لقب بھی شامل کر لیا، یہ دیکھ کر سلیمان کے وہ شکوک جو خرم نے ابراہیم کے خلاف اس کے دل میں پیدا کر دیے تھے، یقین کی حد تک پہنچ گئے، خرم وزیر اعظم کے عہدہ پر اپنے داماد ستم پاشا کو مقرر کرانا چاہتی تھی، خرم کی تدبیر کارگر ہو گئی اور ۱۵۳۵ء میں ایک روز جب ابراہیم حسب دستور کھانا کھانے کے لیے محل شاہی میں داخل ہوا تو پھر اس میں سے زندہ نہیں نکلا اور دوسرے روز محل میں اس کی لاش پائی گئی، ابراہیم کی تمام جائیداد اور دولت ضبط کر لی گئی۔

زوال سلطنت کی ابتدا | سلیمان نے اپنے طویل عہد حکومت میں سلطنت عثمانیہ کی عظمت کو حد کمال تک پہنچا دیا تھا، اس کے بعد ہی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا، گو چند سالوں تک زوال کے آثار نمایاں نہ ہوئے، ایک ترک مورخ قوچی بے نے ۱۶۶۳ء میں سلطنت عثمانیہ کے زوال پر ایک کتاب لکھی تھی، جس میں اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ زوال کی بنیاد سلیمان کے عہد ہی میں پڑ چکی تھی، وہ زوال سلطنت کو حسب ذیل اسباب کا نتیجہ قرار دیتا ہے:

۱- پہلے دستور یہ تھا کہ دیوان کی ہر مجلس میں سلطان خود موجود رہتا تھا اور وزراء نے سلطنت سے خود مشورے کرتا تھا، سلیمان نے اس دستور کو موقوف کر دیا، وہ بجائے دیوان میں بیٹھنے کے اس سے متصل ایک علاحدہ کمرے میں بیٹھنے لگا اور وہیں سے مجلس کی تمام کارروائیوں کو سنا کرتا تھا، اس کے جانشینوں نے دوسرے کمرے میں بیٹھنا بھی موقوف کر دیا، اس طرح سلاطین کی مطلق العنانی میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا اور وزراء کے مشوروں کا اثر کم ہونے لگا، جب تک سلیمان جیسا مدبر اور عالی دماغ سلطان تخت پر تھا، اس تبدیلی کی خرابی ظاہر نہ ہوئی لیکن اس کے بعد اس کے مضر اثرات نمایاں ہونے لگے، وزراء نے سلطنت کے بجائے خواتین حرم یا دوسرے غیر ذمہ دار اور خود غرض اشخاص امور سلطنت میں مشورے دینے لگے، سلطان کے فیصلے اکثر ان ہی مشوروں سے متاثر ہوتے تھے۔

۲- سلیمان نے ایک جدت یہ بھی کی کہ بعض ایسے اشخاص کو جنہوں نے بتدریج ضروری مدارج طے نہیں کیے تھے، محض اپنی مردم شماری کی بنا پر اعلیٰ عہدوں پر مقرر کر دیا، اس کی سب سے پہلی اور سب سے نمایاں مثال ابراہیم کا واقعہ ہے، سلیمان ابراہیم کی لیاقت سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے چند سال کے اندر ہی اسے سلطنت عثمانیہ کی وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر مقرر کر دیا، ابراہیم کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ اسی طرح اونچی اونچی جگہوں پر مقرر کیے گئے، اس میں شبہ نہیں کہ سلیمان کو مردم شناسی کا خاص ملکہ حاصل تھا اور اس نے اپنے انتخاب میں شاید ہی کبھی غلطی کی لیکن اس کے جانشینوں نے جن کو یہ خدا داد ملکہ حاصل نہ تھا، اس جدت پر عمل کر کے بیش تر ایسے اشخاص کا انتخاب کیا جو کسی طرح ان عہدوں کے اہل نہ تھے اور جن کا تقرر محض سلطان کے حسن ظن یا حرم کے اثر سے ہوا تھا۔

۳- زوال سلطنت کا تیسرا سبب رشوت ستانی تھی، جس کی بنیاد رستم پاشا نے ڈالی، یہ شخص سلیمان کا داماد تھا اور پندرہ سال تک وزیر اعظم رہا، وہ شاہی خزانہ کے لیے روپیہ حاصل کرنا خوب جانتا تھا، سلطنت کے انتظامی عہدوں پر جو لوگ مقرر کیے جاتے رستم پاشا ان کے تقرر کے موقع پر ان سے بڑی بڑی رقیس وصول کرتا، سلیمان کے عہد میں یہ رقیس ہر عہدہ کی تنخواہ کی مناسبت سے ایک متعین مقدار میں مقرر تھیں لیکن یہ جدت صرف انتظامی عہدوں تک محدود تھی اور بحری اور فوجی ملازمتوں میں داخل نہیں کی گئی تھی، سلیمان کے بعد رقم کی متعین مقدار بھی اٹھادی گئی اور انتظامی عہدوں کی قید بھی باقی نہ رہی، بڑی بڑی رقیس وصول کی جانے لگیں اور فوجی اور بحری عہدوں پر وہی اشخاص مقرر کیے جانے لگے جو اپنے تقرر کے وقت کثیر رقیس پیش کرتے، گویا تمام ملازمتیں نیلام ہونے لگیں، ان کثیر رقموں کی ادائیگی کے لیے صوبہ کے حاکم سے لے کر ادنیٰ عہدہ دار تک سب ہر طرح کے جاوے جا طریقے استعمال کرتے تھے۔

۴- سلیمان کی عادت یہ تھی کہ جن وزراء سے خوش ہوتا ان پر بے انتہا انعام و اکرام

کرتا اور خواہ وہ کسی قدر زرو مال جمع کر لیں ان سے تعرض نہ کرتا، چنانچہ ابراہیم جو تیرہ سال تک اور رستم پاشا جو پندرہ سال تک سلطنت کے وزیر اعظم رہے، ان دونوں نے بے انتہا دولت جمع کی، انہوں نے ایک ایسی شاہ خرچ اور شاہانہ زندگی کا نمونہ قائم کر دیا جس کی اتباع دوسرے وزرا اور اعلیٰ عہدہ دار بھی کرنے لگے، رستم پاشا نے اپنی وفات پر جو جائیداد چھوڑی اس کی مختصر فہرست حسب ذیل ہے، اناطولیہ اور روسیلیا میں ۸۱۵ زر و زرعی زمینیں، ۶۷۶۰۰۰ / پن چکیاں، ۱۷۰۰۰ / غلام، ۲۹۰۰۰ / زرہ بکتر، ۸۰۰۰ / اما سے، ۷۶۰ / تیغ، ۶۰۰ / جلدیں قرآن پاک کی، ۵۰۰۰ / دوسری کتابیں اور بیس لاکھ دوکات۔

ان اسباب کے علاوہ زوال سلطنت کا ایک اور قوی سبب بھی سلیمان کے عہد میں پیدا ہو چلا تھا یعنی امور سلطنت میں خواتین حرم کی مداخلت، یہ مداخلت سلیمان کے جانشینوں کے زمانہ حکومت میں روز بہ روز بڑھتی گئی، سلیمان کے عہد میں ابراہیم کا زوال و قتل، شہزادہ مصطفیٰ کا قتل اور شہزادہ بایزید کی بغاوت اور قتل، یہ سب حرم ہی کی سازشوں کا نتیجہ تھے۔

سلیم ثانی

۹۷۷ھ تا ۹۸۲ھ مطابق ۱۵۶۶ء تا ۱۵۷۷ء

سلیمان اعظم کے بعد عثمان سلطنت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں آئی جو کسی طرح اس کا اہل نہ تھا، سلیمان نے سلطنت عثمانیہ کو ہر حیثیت سے پایہ کمال تک پہنچا دیا تھا، جس سلطنت کی بنیاد تیرہویں صدی عیسوی میں عثمان خان نے رکھی تھی، اس کا تکمیلی پتھر سولہویں صدی میں سلیمان کے ہاتھ سے رکھا گیا، تین سو برس کی مدت میں یہ سلطنت جو ابتداءً اناطولیہ کی چند جاگیروں پر مشتمل تھی، مکہ معظمہ سے بودا تک اور بغداد سے الجزائر تک پھیل گئی لیکن سلیمان کی وفات کے بعد زوال شروع ہو گیا اور یہ عظیم الشان سلطنت اپنی قوت میں روز بہ روز گھٹتی گئی، اس زوال کے اسباب خارجی اور داخلی دونوں تھے، پندرہویں صدی سے یورپ کی مسیحی سلطنتوں میں نمایاں ترقی ظاہر ہونے لگی تھی، روس کی سلطنت جو پہلے اپنے دور وحشت کی منزلیں طے کر رہی تھی، سولہویں صدی سے مہذب اور طاقت ور سلطنتوں میں شمار کی جانے لگی، دولت عثمانیہ کی ہم سایہ سلطنت ہونے کی وجہ سے ان دونوں کا تصادم ناگزیر تھا اور سولہویں صدی کے بعد یورپ کی جن حکومتوں نے سلطنت عثمانیہ پر حملے شروع کر دیے ان میں روس سب سے آگے تھا لیکن مسیحی سلطنتوں کا کوئی اتحاد سلطنت عثمانیہ کو زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا، اگر خود نظام سلطنت میں اندرونی طور پر فساد پیدا نہ ہو گیا ہوتا اور زوال کے اسباب خود سلطان اور امرائے دولت کے ہاتھوں فراہم نہ ہو گئے ہوتے، انحطاط کی بنیاد سلیمان ہی کے عہد میں پڑ

چکی تھی لیکن اس کی غیر معمولی اور عظیم الشان شخصیت نے ان خرابیوں کو ظاہر نہ ہونے دیا، جو اس کے جانشینوں کے عہد میں سرعت کے ساتھ بڑھتی گئیں، سلیمان کے بعد جتنے سلطان تخت نشین ہوئے ان میں سے بہ استثنائے چند کوئی بھی اتنی وسیع سلطنت کی جو تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی اور جس میں تقریباً دو درجن مختلف نسلیں اور قومیں آباد تھیں، فرماں روائی کا اہل نہ تھا، نااہلوں کی اس طویل فہرست میں سب سے پہلا نام سلیم ثانی کا نظر آتا ہے، جس نے اپنے مختصر دور حکومت کو بادہ پرستی اور عیش کوشی کی نظر کر دیا اور امور سلطنت سے منھ موڑ کر اپنا تمام وقت عیش و عشرت میں ضائع کر دیا، یہ پہلا عثمانی تاج دار تھا جو میدان جنگ میں جانے سے گریز کرتا تھا اور جس میں انتظام سلطنت کی مطلق اہلیت نہ تھی۔

لیکن سلیم کی تخت نشینی کے ساتھ ہی سلطنت کا زوال نمایاں نہیں ہونے لگا، جو سلطنت تین سو برس کی تدریجی ترقی کے بعد سلیمان اعظم کے زمانہ میں اپنے کمال عروج تک پہنچی تھی، اس میں دفعۃً انحطاط کا نمودار ہو جانا ممکن نہ تھا، سلیمان کی وفات کے بعد بھی تمام ملکی اور فوجی انتظامات چند سالوں تک استحکام کے ساتھ بدستور قائم رہے اور متعدد وزرا و عہدہ داران سلطنت جو سلیمان اعظم کے تربیت یافتہ تھے، بدستور سلطنت کی خدمت کرتے رہے، جب تک یہ وزرا اور ملکی و فوجی حکام زندہ رہے، سلطنت کا زوال ظاہر نہ ہو سکا، بلکہ تقریباً بارہ سال تک حدود سلطنت میں اضافہ ہی ہوتا گیا، عہد آخر کے ان وزرا میں محمد صوفوقلی ہی سلطنت کا حقیقی فرماں روا تھا۔

محمد صوفوقلی کی دواہم تجویزیں | محمد صوفوقلی کے پیش نظر دواہم تجویزیں تھیں، وہ خاکنائے سوز میں ایک نہر کھود کر بحر احمر اور بحر ہند کو ملا دینا چاہتا تھا، تاکہ ترکی بیڑا ان دونوں سمندروں میں آسانی کے ساتھ داخل ہو سکے، دوسری تجویز دریائے ڈان اور دریائے والگا کو ایک نہر کے ذریعہ سے ملا دینے کی تھی، یہ دونوں دریا روس سے نکل کر دور تک متوازی خطوط میں بہتے آتے ہیں اور ایک مقام پر ایک دوسرے سے اس قدر فریب ہو جاتے ہیں

کہ درمیانی فاصلہ صرف تیس میل رہ جاتا ہے، وہاں پہنچ کر پھر وہ علاحدہ ہو جاتے ہیں اور ایک بحر اُزف میں جا کر شامل ہو جاتا ہے اور دوسرا بحر کا سپین میں، ان دریاؤں کو ایک نہر کے ذریعہ سے اس مقام پر ملا دینے سے جہاں درمیانی فاصلہ صرف تیس میل رہ جاتا ہے، ترکی جہازوں کے لیے دریاے ڈان اور دریاے والگا سے گزر کر بحر کا سپین میں پہنچ جانا اور وہاں سے صوبہ تبریز پر حملہ آور ہونا جو سلطنت ایران کا مقبوضہ تھا، بہت آسان ہو جاتا، علاوہ بریں اس تجویز کی کامیابی سے تجارتی فائدے بھی بہت کچھ حاصل ہو سکتے تھے لیکن اس مقصد کا پورا ہونا اسی وقت ممکن تھا جب استراخان پر قبضہ کر لیا جاتا، یہ شہر مملکت روس کے قبضہ میں تھا جس کی وسعت و قوت چند سالوں سے برابر ترقی کر رہی تھی۔

۹۷۶ھ (۱۵۶۸ء) میں صوفوئی نے پچیس ہزار نی چری اور سپاہیوں کو اُزف روانہ کیا، وہاں کریمیا کے تیس ہزار تاتاری بھی ان کے ساتھ ہو گئے اور یہ متحدہ فوج استراخان پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھی، جو دریاے والگا کے دہانہ پر واقع تھا، یہاں پہلی بار روسیوں اور ترکوں کا مقابلہ ہوا، ترکی فوج استراخان پر قبضہ نہ کر سکی اور تاتاریوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی، عثمانی فوجیں مجبوراً اُزف کی طرف واپس ہوئیں لیکن قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے ان کا بیش تر حصہ بحر اسود میں ایک طوفان سے ضائع ہو گیا اور صرف سات ہزار سپاہی بہ خیریت واپس پہنچ سکے، اس ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈان اور والگا کو ملا دینے کی تجویز منسوخ کر دی گئی، روس میں ابھی اتنی قوت نہ تھی کہ وہ خود سلطنت عثمانیہ پر حملہ آور ہوتا، زار آئیوان (Gzar Ivan) نے ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں اپنا ایک سفیر باب عالی میں بھیجا اور استراخان کے حملہ کی شکایت کی، نیز دونوں سلطنتوں کے درمیان امن و اتحاد قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ ایک صلح نامہ مرتب کیا گیا اور تقریباً ایک صدی تک روس اور سلطنت عثمانیہ میں پھر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔

خاکنائے سوز کی تجویز بھی ایک نامعلوم مدت کے لیے ملتوی کر دی گئی، کیوں کہ

یمن میں بغاوت چھڑ گئی تھی اور سنان پاشا کی سرکردگی میں ایک فوج وہاں روانہ کرنی پڑی، سنان پاشا اس بغاوت کے فرو کرنے میں کامیاب ہوا اور یمن اور عرب کے دوسرے حصے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے۔

تونس | یمن کی دوبارہ فتح کے بعد صوفوتلی نے تونس کو اسپینوں کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء) میں اولوچ پاشا کو الجزائر کا حاکم بنا کر اس کی سرکردگی میں ایک ترکی بیزاروانہ کیا، اولوچ پاشا نے اسپینوں کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا لیکن اسپینی فوج قلعہ میں محصور ہو گئی اور ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) تک اس پر قابض رہی۔

قبرص کی فتح | ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں سلیم نے قبرص پر حملہ کرنے کا قصد کیا، یہ جزیرہ جمہوریہ وینس کا مقبوضہ تھا، جو سلطنت عثمانیہ کی حلیف تھی، صوفوتلی نے اس تجویز کی مخالفت کی لیکن قرہ مصطفیٰ پاشا کے اصرار اور خود سلیم کی خواہش نے اس کی مخالفت کو بے اثر رکھا اور ایک حلیف کے مقبوضہ پر حملہ کرنے کے لیے مفتی اعظم نے علت جواز پیش کی کہ قبرص اس سے قبل ایک اسلامی حکومت (مصر) کے زیر نگیں رہ چکا تھا، چنانچہ ۱۵۷۰ء میں مصطفیٰ پاشا نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ قبرص پر چڑھائی کی، سات ہفتہ کے محاصرہ کے بعد اس کا پایہ تخت نائکوسیا (Nicosia) فتح ہو گیا، پھر مصطفیٰ پاشا نے اس جزیرہ کے سب سے مضبوط قلعہ فاماگوستا (Famagosta) کا بھی محاصرہ کیا اور ایک طویل مدت کے بعد اگست ۱۵۷۱ء میں محصورین نے ہتھیار ڈال دیے، قلعہ کی سپردگی کے وقت مصطفیٰ پاشا نے قبرص کے سپہ سالار براگاڈینو (Bragadino) کے سامنے نہایت نرم شرائط پیش کیے، اس نے عیسائی فوج اور وہاں کے عیسائی باشندوں کی جان و مال اور مذہب کی حفاظت کا ذمہ لیا اور وعدہ کیا کہ یہ فوج ترکی جہازوں پر جزیرہ کریٹ پہنچادی جائے گی اور وہاں آزاد کردی جائے گی لیکن عین اس وقت کہ یہ جہاز ودان کی تیاری کر رہے تھے، مصطفیٰ پاشا اور براگاڈینو میں بعض گذشتہ واقعات کے متعلق تکرار ہو گئی اور یہ بات یہاں تک بڑھی کہ مصطفیٰ پاشا نے غصہ میں آ کر

تمام عیسائی فوج کے قتل کا حکم دے دیا اور اس کے ایک ہفتہ کے بعد براگا ڈینیو کی زندہ کھال نکلوالی، فارماگوستا پر قبضہ پا جانے کے بعد ترکوں نے پورے جزیرہ کو فتح کر لیا لیکن اس فتح میں ان کے تقریباً پچاس ہزار آدمی کام آئے، تین سو برس تک قبرص سلطنت عثمانیہ کے زیر تسلط رہا، ۱۸۷۸ء میں باب عالی نے اسے گورنمنٹ برطانیہ کے حوالہ کر دیا۔

مسیحی اتحاد | قبرص کے حملہ سے یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں نہایت تشویش پیدا ہوئی اور یورپ نے ترکوں کی بحری طاقت کا سدباب کرنے کے لیے بحروم کی عیسائی حکومتوں کا ایک اتحاد قائم کیا، جس کے خاص ارکان اسپین، وینس اور مبارزین مالٹا تھے اور اس متحدہ بحری بیڑے کا سالار اعظم ڈان جان (Don John) کو مقرر کیا جو شہنشاہ چارلس پنجم کا ناجائز لڑکا اور باوجود اپنی نوعمری کے اس عہد کا نہایت ممتاز کمانڈر تھا، اتحادی بیڑا ستمبر ۱۵۷۱ء کو مسینا (Messina) میں جمع ہوا لیکن قبرص اس وقت تک فتح ہو چکا تھا، ترکی بیڑا جو اپنے جہازوں کی کثرت تعداد میں عیسائی بیڑے سے بڑھا ہوا تھا، خلیج لیپانٹو (Lepanto) میں لنگر انداز ہوا، امیر البحر علی پاشا ایک نوعمر سردار تھا، اس کو بحری جنگ کا زیادہ تجربہ نہ تھا، اولوچ پاشا جس کی عمر کے ۴۳ سال بحری جنگوں میں صرف ہو چکے تھے، اس بیڑے کا نائب امیر تھا، اس نے اتحادیوں پر فوراً حملہ کرنے سے اس بنا پر اختلاف کیا کہ تیاری جیسی چاہیے ابھی مکمل نہ ہو سکی تھی لیکن علی پاشا کو بلا توقف حملہ کر دینے پر اصرار تھا، اولوچ پاشا کو خاموش ہو جانا پڑا۔

جنگ لیپانٹو | ۷ اکتوبر ۱۵۷۱ء کو خلیج لیپانٹو کے دہانہ کے قریب دونوں بیڑوں کا مقابلہ ہوا، جنگ صرف چند گھنٹوں تک قائم رہی، مگر فریقین کو شدید نقصانات برداشت کرنے پڑے، دونوں بیڑے ایک دوسرے سے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ تلوار کی لڑائی ہونے لگی جس میں امیر البحر علی پاشا مارا گیا، عیسائیوں نے اس کا سر کاٹ کر جہاز کے مستول پر لٹکا دیا، یہ دیکھ کر ترکوں کے قدم اکھڑ گئے اور اولوچ پاشا کی کوشش کے باوجود انہیں بری طرح شکست ہوئی، اولوچ پاشا بہ مشکل چالیس جہازوں کو لے کر سلامتی کے ساتھ وہاں سے نکل

سکا، باقی پورا ترکی بیڑا جس کے جہازوں کی تعداد ۴۶۶ تھی، عیسائیوں کے قبضہ میں آ گیا، ان میں سے کچھ غرق بھی کر دیے گئے، اس جنگ میں تیس ہزار ترک کام آئے اور پندرہ ہزار عیسائی غلام آزاد ہوئے۔

خیال تھا کہ اتحادی اپنی عظیم الشان کامیابی سے فائدہ اٹھا کر آگے قدم بڑھائیں گے لیکن اس فتح سے وہ کچھ ایسا مطمئن ہوئے کہ فوراً اپنے اپنے ملک کو روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر خوشیاں منانے لگے۔

برخلاف اس کے ترکوں نے فوراً اس نقصان کی تلافی شروع کر دی، سلیم نے بھی جو عموماً عیش و عشرت میں سرشار رہتا تھا، اپنی جیب خاص سے ایک کثیر رقم عطا کی اور اپنے محل کے باغ کا ایک حصہ نئے جہازوں کی تعمیر کے لیے دے دیا، چنانچہ ۱۶۸۱ء جہازوں کی تعمیر فوراً شروع کر دی گئی اور چند مہینوں میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ یہ نیا بیڑا تیار ہو گیا، ۱۶۸۰ء (۱۵۷۲ء) میں اتحادی بیڑا پھر بحر روم کے مشرقی حصہ میں جمع ہوا، اولوچ پاشا اپنے نئے بیڑے کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لیے نکلا لیکن چون کہ اس کے جہاز رانوں کو ہنوز کافی تجربہ نہ تھا، اس لیے اس نے خود حملہ کرنا مناسب نہیں خیال کیا اور اتحادیوں کی پیش قدمی کا انتظار کرتا رہا، اتحادی ترکوں کی اس خلاف توقع تیاری سے بظاہر اس قدر مرعوب ہوئے کہ ان کی طرف سے بھی کوئی حملہ نہ ہوا اور اولوچ پاشا اپنے پورے بیڑے کے ساتھ واپس آ گیا۔

وینس سے صلح | ۱۶۸۱ء (۱۵۷۳ء) میں وینس نے باب عالی سے صلح کی گفتگو شروع کی اور حسب ذیل معاہدہ مرتب ہوا، وینس نے نہ صرف قبرص کی فتح اور اس پر سلطنت عثمانیہ کا قبضہ تسلیم کر لیا بلکہ اس کے حاصل کرنے میں جو اخراجات دولت علیہ کو برداشت کرنے پڑے تھے اور جن کا تخمینہ تین لاکھ دوکات تھا، ان کی ادائیگی بھی منظور کی، جزیرہ زانطہ کے لیے جمہوریہ وینس اب تک پانچ سو دوکات خراج ادا کرتی تھی، اس معاہدہ کی رو سے خراج کی مقدار ڈیڑھ ہزار دوکات مقرر ہو گئی، البتہ قبرص کا خراج جو آٹھ ہزار دوکات سالانہ آیا

کرتا تھا وہ اب موقوف کر دیا گیا، ڈلماشیا اور البانیا میں فریقین کے جو مقبوضات جنگ لیپانٹو سے قبل تھے وہی برقرار رکھے گئے۔

تونس کا الحاق | ونیس اور سلطنت عثمانیہ کی صلح کے بعد ڈان جان ایک اسپینی بیڑے کے ساتھ تونس پر حملہ آور ہوا اور چوں کہ قلعہ پراپین کا قبضہ جاری تھا، اس لیے آسانی کے ساتھ شہر کو فتح کر لیا، اس نے تونس میں ایک جدید قلعہ تعمیر کرایا اور اسپینی سپاہیوں کا ایک طاقتور دستہ وہاں چھوڑ کر خود واپس چلا گیا، اس واقعہ کی خبر جب قسطنطنیہ پہنچی تو صدر اعظم صوفی نے اولوچ پاشا کو ایک زبردست بیڑے کے ساتھ روانہ کیا، اولوچ پاشا نے اسپینیوں کا قلعہ فتح کر کے شہر، قلعہ اور تونس کے پورے صوبے پر قبضہ کر لیا اور اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر دیا۔

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) میں سلیم کا انتقال ہو گیا۔

مراد ثالث

۹۸۲ھ تا ۱۰۰۳ھ مطابق ۱۵۷۳ء تا ۱۵۹۵ء

سلیم کے انتقال کی خبر سن کر اس کا بڑا لڑکا مراد جو حکومت مغنسیا پر مامور تھا، ۲۱ دسمبر ۱۵۷۳ء کو قسطنطنیہ پہنچا اور ۲۸ رسال کی عمر میں تخت نشین ہوا، محمد فاتح کے قائم کردہ دستور کے مطابق اس نے زمام سلطنت کو ہاتھ میں لیتے ہی اپنے پانچ بھائیوں کو قتل کر دیا اور اس کے بعد سب سے پہلا فرمان شراب کی ممانعت میں صادر کیا، جس کا رواج سابق سلطان کے عہد میں بہت زیادہ ہو گیا تھا۔

امور مملکت میں حرم کا دخل | مراد ثالث کے عہد کے ابتدائی چار برس صوفی لالی پاشا کی صدارت کے تھے، پھر بھی سلطان پر حرم کا اثر روز بہ روز زیادہ ہوتا جا رہا تھا، حرم کی چار خاتونوں کا اثر خصوصیت کے ساتھ اس پر بہت زیادہ تھا اور امور سلطنت کا انصرام حقیقتاً ان ہی خواتین کی منشا کے مطابق ہوتا تھا، ان میں سے ایک سلطانہ والدہ نور بانو تھی، دوسری مراد کی محبوب سلطانہ صفیہ تھی، جو وینس کے مشہور اور سربرآوردہ خاندان بفو (Baffo) کی رئیس زادی تھی اور اپنے حسن صورت اور ذکاوت طبع کے باعث مراد پر حد درجہ حاوی تھی، صفیہ کی سلطنت کی جنگ و صلح میں خاص دخل تھا، چنانچہ باوجود اس کے کہ وینس نے ایک سے زائد بار سلطان کو برا بیخیز کیا، محض صفیہ کی کوششوں سے جنگ کی نوبت نہ آئی، تیسری ایک ہنگروی خاتون تھی، جس نے کچھ دنوں کے لیے صفیہ کی محبوبیت کو زائل کر دیا تھا اور مراد کی توجہ کا مرکز

بنی رہی، چوتھی خاتون جان فدا حرم سلطانی کی خاص مہتمم تھی اور وہ بھی اپنی لیاقت اور سلیقہ شعاری کی وجہ سے مراد کے مزاج میں بہت کچھ ذخیل تھی، یہی چار خواتین سلطان کی خاص مشیر کار اور انتظام حکومت کی حقیقی نگران تھیں۔

جنگ ایران | تاہم سلیمان اعظم کے تربیت یافتہ فوجی اور بحری افسروں میں سے اب بھی کچھ باقی رہ گئے تھے اور مراد ثالث کے عہد میں جوڑائیاں پیش آئیں ان میں عثمانی فوجوں کو اہم اور نمایاں فتوحات حاصل ہوئیں اور دولت علیہ کے مقبوضات میں قیمتی اضافے ہوئے، اس عہد کی سب سے بڑی جنگ ایران کی جنگ تھی، جس کا سلسلہ ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) سے ۹۹۸ھ (۱۵۹۰ء) تک قائم رہا، ۱۵۷۶ء میں شاہ طہماسپ کا انتقال ہو گیا اور اس کی وفات پر تخت سلطنت کے لیے ایران میں جواندرونی خلفشار برپا ہوا اس سے دولت عثمانیہ نے فائدہ اٹھانا چاہا اور لالہ مصطفیٰ پاشا عثمانی فوجوں کے ساتھ جارجیا پر حملہ آور ہوا جو ایران کی حلیف مملکت تھی اور اس کے پایہ تخت تفلس کو فتح کر کے پورے جارجیا پر قبضہ کر لیا، جارجیا کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ پر ایک ترکی افسر مقرر کر دیا گیا، عثمان پاشا شردان کا حاکم تھا، چار ایرانی فوجوں نے بیک وقت جارجیا پر حملہ کیا اور اسے ترکوں کے قبضہ سے چھڑالینا چاہا، عثمان پاشا نے شہزادہ حمزہ کی فوج کو شکست دی لیکن جب سلطنت ایران کی سب سے بڑی فوج نے حملہ کیا تو اسے شردان چھوڑ کر پسا ہونا پڑا اور وہ درند چلا گیا، سائمن لورسب (Simon Luarseb) سابق امیر جارجیا نے اپنے قدیم پایہ تخت تفلس کا محاصرہ کر لیا مگر ترک محصورین نے نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، یہاں تک کہ حسن پاشا جو محمد صوتولی پاشا کا لڑکا کمک لے کر پہنچ گیا اور سائمن کو محاصرہ اٹھالینا پڑا، اس کے بعد ۱۵۸۳ء میں عثمان پاشا نے داغستان پر حملہ کیا اور اس پر پوری طرح قبضہ کر کے اس نے عین موسم سرما میں کوہ قاف کو عبور کیا اور کاف پہنچ گیا، وہ محمد کرائی خان کریمیا کو تخت سے معزول کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ خان نے عثمانی افواج کو مدد دینے سے انکار کر دیا تھا، محمد کرائی

نے یہ اطلاع پا کر علم بغاوت بلند کیا اور چالیس ہزار سواروں کو لے کر کافہ میں عثمان پاشا کا محاصرہ کر لیا، سلطان نے محمد کرائی کے بھائی اسلام کرائی کو کریمیا کے تخت پر بٹھا دینے کا وعدہ کیا اور اس کے معاوضہ میں فوجی مدد چاہی، چنانچہ اسلام کرائی اپنے بھائی خان کریمیا کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور محمد کرائی ۱۵۸۴ء میں قتل کر دیا گیا، عثمان پاشا اس باغی کا سر لے کر قسطنطنیہ پہنچا جہاں اس کا نہایت شان دار استقبال ہوا اور سلطان نے اپنی خاص تلوار اور اپنے عمامہ کے بیش بہا جواہرات اسے عطا کیے، اس کے بعد عثمان پاشا ایک لاکھ ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ تبریز کی طرف بڑھا، شہزادہ حمزہ مرزا نے عثمانی مقدمہ اکبیش کو شکست دی لیکن ایرانی ترکوں کی کثرت تعداد کا مقابلہ نہ کر سکے اور بالآخر شکست کھا کر انہیں تبریز خالی کر دینا پڑا، عثمان پاشا صحت کی خرابی کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا، اس کے بعد چھ سال تک مسلسل ایرانی اور عثمانی فوجوں میں لڑائیاں ہوتی رہیں، اسی درمیان میں عثمان پاشا کا انتقال ہو گیا، ۱۵۹۰ء میں دولت عثمانیہ اور سلطنت ایران کے درمیان صلح ہو گئی، جس کے رو سے جارجیا، شردان، اورستان، شہر تبریز اور آذربایجان کا ایک حصہ مراد ثالث کی سلطنت میں شامل ہو گیا، صلح نامہ کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ آئندہ اہل ایران خلفائے ثلاثہ کے خلاف تبرا کرنے سے باز رہیں گے۔

پورپین حکومتوں سے تجارتی اور سیاسی تعلقات | مراد کے عہد حکومت میں دولت علیہ اور یورپ کی سلطنتوں کے درمیان صلح کے تعلقات عموماً قائم رہے، علاوہ متفرق چھیڑ چھاڑ کے جو ہنگری کی سرحد پر ترکی پاشاؤں اور عیسائی قلعہ داروں میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی، دوسری یورپین حکومتوں سے سلطنت عثمانیہ کے تعلقات دوستانہ رہے، البتہ مراد کی وفات سے دو سال قبل آسٹریا سے جنگ کی نوبت آ گئی، مراد کے عہد میں خصوصاً صدر اعظم صوفو تلی پاشا کے مشورہ سے مغربی یورپ کی بیش تر حکومتوں سے تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم ہوئے، انگلستان نے جواب تک سلطنت عثمانیہ کے لیے ایک نا آشنا حکومت تھی، اول

اول ۱۵۷۹ء میں اپنے تین تاجروں ولیم ہیر بون (William Harebone) ایڈورڈ ایلیس (Edward Ellis) اور رچرڈ اسٹپیل (Richard Stapel) کو قسطنطنیہ بھیجا، انہوں نے باب عالی سے انگلستان کے لیے وہی تجارتی مراعات حاصل کیے جو یورپ کی دوسری قوموں کو حاصل تھے، ۱۵۸۳ء میں ملکہ الزبتھ نے ولیم ہیر بون کو اپنا سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیجا اور سلطان سے یہ درخواست کی کہ وہ انگلستان سے متحد ہو کر اسپین کے عیسائی فرماں روا فلپ ثانی پر حملہ آور ہو جو سلطنت عثمانیہ اور حکومت انگلستان دونوں کا یکساں دشمن تھا۔

محمد صوقوللی کا قتل | اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مراد کے عہد حکومت کے ابتدائی چار سالوں میں عنان سلطنت صدر اعظم محمد صوقوللی پاشا کے ہاتھوں میں تھی لیکن مراد کے بعض دوسرے درباریوں مثلاً شمش پاشا، اولیس، خواجہ سعد الدین مؤرخ اور خواجہ سرغنفر آغا کا اثر شروع ہی سے بڑھتا گیا، یہ سب محمد صوقوللی کے مخالف تھے، بد قسمتی سے مراد پر حرم کا اثر بھی بہت زیادہ تھا، چنانچہ شمش پاشا وغیرہ اور حرم کی سازش سے صدر اعظم کا اقتدار روز بہ روز کم ہوتا گیا، پہلے اس کے معتمد عہدہ داروں کو پایہ تخت سے علاحدہ کیا گیا اور پھر سازش کی تکمیل کے بعد خود محمد پاشا کو ۱۱ اکتوبر ۱۵۷۸ء کو قتل کر دیا گیا۔

سلطنت کا انتہائی عروج | لارڈ ایورسلے کی رائے ہے کہ سلطنت عثمانیہ اپنے کمال عروج کو سلیمان اعظم کے عہد حکومت کے آخری سال میں نہیں بلکہ صدر اعظم محمد پاشا صوقوللی کے عہد وزارت کے آخری سال میں پہنچی کیوں کہ سلیمان کے بعد بھی اس بارہ سال کی مدت میں جب صوقوللی عملاً سلطنت کا فرماں روا تھا، دولت علیہ نے اہم فتوحات حاصل کیں، جن میں جزیرہ قبرص، صوبہ تونس، مملکت جارجیا اور سلطنت ایران کے زرخیر صوبے اور یمن شامل تھے، یہی فتوحات سلطنت عثمانیہ کی آخری فتوحات تھیں، ان کے بعد صرف کریٹ ۱۰۸۹ھ (۱۶۷۸ء) میں فتح ہوا، ورنہ اور ہر طرف زوال کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوئے اور عثمانی مقبوضات پر رفتہ رفتہ ہم سایہ حکومتوں کا حملہ اور قبضہ ہونے لگا۔

صوقولئی پاشا کے قتل کے وقت سلطنت عثمانیہ شمال میں وسط ہنگری سے لے کر جنوب میں خلیج فارس اور سوڈان تک اور پھر مشرق میں بحر کاسپین اور سرحد ایران سے لے کر مغرب میں افریقہ کے صوبہ ادرن تک پھیلی ہوئی تھی، اس میں مراکش کے سوا بحر روم کا تقریباً تمام جنوبی ساحل اور بحر اسود اور بحر احمر کے تمام ساحل شامل تھے، بحر لچین کے تمام جزیرے علاوہ کریٹ کے ان کے زیر نگین تھے، ان ممالک میں بیس مختلف نسل کے لوگ آباد تھے، جن کی تعداد کا تخمینہ تین کروڑ سے زیادہ ہے۔

سلطنت کا زوال | صوقولئی کے قتل کے بعد ہی سلطنت میں بد نظمی کا دور شروع ہو گیا، یکے بعد دیگرے دس وزرا صدر اعظم کے عہدہ پر مقرر کیے گئے، سنان پاشا تین بار اس عہدہ پر مامور ہوا، عثمان پاشا داغستان سے واپس ہونے پر ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) میں صدر اعظم مقرر ہوا لیکن آٹھ ہی مہینے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا، صدر اعظم کی ان تبدیلیوں میں حرم کو بہت کچھ دخل تھا اور وہی وزیر اس عہدہ کا حوصلہ کر سکتے تھے جنہیں حرم کی سرپرستی حاصل تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا اور صرف وہ امیدوار مقرر کیے جانے لگے جو بڑی بڑی رقمیں پیش کرتے تھے، رشوت ستانی کی اس مہلک وبائے حکومت کا کوئی شعبہ محفوظ نہ رہ سکا، یہاں تک کہ فوجی، عدالتی اور انتظامی عہدوں میں بھی امیدوار کی ذاتی قابلیت کے بجائے اس کی پیش کردہ رقم کی سفارش قبول کی جانے لگی، خود سلطان کو بھی اپنے ذاتی مصارف کے لیے روپیہ کی زیادہ ضرورت رہا کرتی تھی اور آخر میں اس نے بھی ایسی رقموں میں اپنا حصہ لگانا شروع کیا، یہیں سے سلطنت میں وہ اندرونی اختلال نمایاں ہونے لگا جس نے اس کی بنیادوں کو بالکل ہلا دیا۔

فوج کی بغاوت اور عام بد نظمی | ان خرابی کے اثرات فوج میں بھی ظاہر ہونے شروع ہوئے، جس کا سبب صرف یہی نہ تھا کہ نا اہل اشخاص بڑے بڑے فوجی عہدوں پر مقرر کیے

جانے لگے بلکہ فوج کے نظام جاگیری میں بھی سخت بے عنوانیاں ہونے لگیں اور جو جاگیریں محض فوجی خدمات کے معاوضہ میں دی جاتی تھیں ان کی خرید و فروخت شروع ہو گئی، ان حالات کے ساتھ ساتھ فوج بھی بے قابو ہونے لگی اور آخر کار ۱۵۸۹ء میں نئی چری نے علانیہ علم بغاوت بلند کر دیا اور قصر سلطانی کے سامنے جمع ہو کر محمد پاشا، بیلر بے، رومیلیا کے سر کا مطالبہ کیا، ان کو محمد پاشا سے یہ شکایت تھی کہ اس کی تحریک سے فوج کی تنخواہ میں ایسے سکے تقسیم کیے گئے تھے جن میں چاندی بہت کم تھی، مراد کو ان کی دھمکی سے دبا پڑا اور اس نے حکم دے دیا کہ محمد پاشا کا سر کاٹ کر نئی چری کے حوالہ کر دیا جائے، مراد کے اس طرح دب جانے سے نئی چری کو اپنی قوت کا اندازہ ہو گیا اور چار ہی سال کے اندر انہوں نے دو بار اور بغاوت کی اور سلطان کو مجبور کیا کہ وہ موجودہ صدر اعظم کو معزول کر کے دوسرا صدر اعظم مقرر کر دے، ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء) میں انہوں نے پھر مراد کو مجبور کر کے مولد یویا کی باج گزار مملکت کے تخت پر اس امیدوار کو بٹھایا جس نے رشوت کے ذریعہ سے ان کی حمایت حاصل کر لی تھی، خود قسطنطنیہ میں نئی چری اور سپاہی فوجوں میں باہمی جنگ ہو گئی، صوبوں کی حالت مرکزی حکومت کی بد نظمی کی وجہ سے حد درجہ خراب تھی، رشوت کا بازار اپنے لازمی نتائج کے ساتھ وہاں بھی گرم تھا اور جو حکام رشوت کے ذریعہ سے مقرر ہوئے تھے وہ اپنی رقم کی تلافی اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے رعایا پر مظالم کر رہے تھے، ۱۵۸۹ء سے ۱۵۹۲ء تک ہر قسم کی بد نظمی اور بد امنی سلطنت میں برپا رہی، مصر کی ردیف (میشیا) اپنے صوبہ دار سے باغی ہو گئی، تبریز کی فوج نے بغاوت کر دی اور قسطنطنیہ کا تبدیل شدہ سکہ لینے سے انکار کر دیا، بودا کے فوجی دستہ نے جس کی تنخواہ چھ مہینے سے باقی تھی، اپنے پاشا کو قتل کر دیا، ایران میں ایک شخص شاہ طہماسپ کا لڑکا بن کر تخت کا دعوے دار ہوا لیکن ارض روم کے والی نے اسے گرفتار کر لیا، لبنان (شام) کا دروزی فرقہ وہاں کے حکام کی سخت گیریوں سے عاجز آ کر باغی ہو گیا، اس فتنہ کے فرو کرنے کے لیے مراد نے ابراہیم پاشا کو شام بھیجا جس نے دروزیوں کو شکست دے کر ان کو قابو میں کیا۔

ہنگری اور آسٹریا سے جنگ | سب سے زیادہ انتشاری جری کی خود سری سے پیدا ہو رہا تھا، اتفاق سے اسی زمانہ میں ہنگری اور آسٹریا سے جنگ چھڑ گئی اور نینی چری کو سلطنت کے باہر بھیجنے کا موقع ہاتھ آ گیا، ابتدا میں عثمانیوں کو کامیابی ہوئی مگر سیک کے محاصرہ میں حسن پاشا والی بوسینیا کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا اور وہ دریاعبور کرتے ہوئے ڈوب کر ہلاک ہو گیا، یہ خبر سن کر سنن پاشا فوراً ادھر روانہ ہوا، اسی درمیان میں بودا کے پاشا کو آسٹریا کی فوجوں سے شکست ہوئی اور چند عثمانی قلعوں پر آسٹریا کا قبضہ ہو گیا، تاہم فریقین کی فتوحات کے پلے اب تک تقریباً برابر تھے لیکن ۱۵۹۴ء میں مولڈیویا، ولاچیا اور ٹرانسلوینیا نے بغاوت کر کے آسٹریا سے اتحاد کر لیا اور اپنی ملکوں کے تمام مسلمان باشندوں کو قتل کر ڈالا، ابھی آسٹریا کی جنگ جاری ہی تھی کہ ایران سے بھی پھر لڑائی چھڑ گئی جس میں ابتداء عثمانی فوجوں کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

مراد کا انتقال | اسی اثنا میں ۱۶ جنوری ۱۵۹۵ء کو مراد کا انتقال ہو گیا، وہ فطرتاً بہت نیک اور صلح جو تھا، اس کی تخت نشینی کے وقت سلطنت عثمانیہ جس پایہ کمال کو پہنچ چکی تھی مراد میں اگرچہ اسے برقرار رکھنے کی صلاحیت نہ تھی اور حرم کی دخل اندازی سے نظام سلطنت میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں تاہم ان خرابیوں کی ذمہ داریوں کی ذات قرار نہیں دی جاسکتی، سلطنت کا انحطاط خود سلیمان کے وقت سے شروع ہو گیا تھا اور گوصوقو ملی پاشا کے تدبیر و اقتدار نے اسے سلیم کے عہد میں نمایاں نہ ہونے دیا تاہم دبی ہوئی چنگاریاں اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی تھیں اور مراد کے عہد میں ان کا بھڑک اٹھنا گزیر تھا۔

مراد ایک صوفی مشرب سلطان تھا، اس کو تصوف سے خاص شغف تھا، اکثر سلاطین عثمانیہ کی طرح وہ بھی شاعر تھا اور مراد ہی تخلص کرتا تھا، تصوف میں اس کی ایک مشہور تصنیف ”فتوحات الصیام“ ہے۔^۱

۱ انسایکلو پیڈیا آف اسلام، ص ۷۳۱۔

محمد ثالث

۱۰۰۲ھ تا ۱۰۱۲ھ مطابق ۱۵۹۵ء تا ۱۶۰۳ء

سلطان مراد کی وفات کے وقت اس کا سب سے بڑا لڑکا محمد ایشیائے کوچک میں صوبہ مغنیشیا کا حاکم تھا، اس کی ماں سلطانہ صفیہ نے مراد کی وفات کو مخفی رکھا، یہاں تک کہ محمد قسطنطنیہ پہنچ گیا، ایسا کرنا اس لیے ضروری خیال کیا گیا کہ مراد کے دوسرے لڑکے تخت سلطنت کے دعوے دار نہ بن سکیں لیکن اس تحفظ کی ضرورت آئندہ پھر کبھی پیش نہ آئی، کیوں کہ سلاطین آل عثمان میں محمد ثالث آخری سلطان تھا، جسے شہزادگی کے زمانہ میں کسی صوبہ کی حکومت سپرد کی گئی تھی، اس کے بعد تمام شہزادے محل کے ایک خاص حصہ میں نظر بند رکھے جانے لگے اور سلطنت کا کوئی عہدہ انہیں سپرد نہ کیا جاتا، انہیں صرف اسی وقت آزادی نصیب ہوتی جب تخت نشینی کے لیے اعیان سلطنت ان کو محل سے باہر لاتے، اس جدید نظام کا سبب یہ خطرہ تھا کہ مبادا شہزادے سلطان وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں لیکن اس کا جو اثر فرماں روایان سلطنت کی سیرت اور اہلیت پر پڑتا تھا وہ ملکہ حکم رانی کے لیے نہایت درجہ مضرت تھا۔

فوج کی شورش | محمد ثالث نے تخت نشین ہونے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بھائیوں کو فوراً قتل کرادیا، اس طرف سے مطمئن ہو کر تخت نشینی کے آٹھویں روز وہ جامع صوفیہ میں جلوس کے ساتھ نماز ادا کرنے گیا اور فوج کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے اتنی کثیر مقدار میں انعامات اور بخششیں تقسیم کیں کہ اس سے پہلے کسی سلطان نے نہ کی تھیں، پھر وہ منگری

میں کمک بھیجنے کی تیاری کرنے لگا لیکن اس تیاری کے دوران ہی میں فوج کے دوستوں نے جو سلطانی بخشش سے مطمئن نہ تھے اور مزید انعامات کے خواہش مند تھے، صدر اعظم فرہاد پاشا کو گھیر کر اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے سخت لہجہ میں اصرار کرنا شروع کیا، فرہاد پاشا نے انہیں سرحد پر جانے کا حکم دیا اور وعدہ کیا کہ ان کے مطالبات وہیں پورے کیے جائیں گے، اس پر انہوں نے اور زیادہ برہمی ظاہر کی اور فرہاد پاشا کو دھمکانے لگے، فرہاد پاشا نے ان کی یہ خود سری دیکھ کر کہا ”کیا تم نہیں جانتے کہ جو لوگ اپنے سرداروں کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں وہ کافر ہیں اور ان کی بیویاں عقیمہ ہیں“ اس طنز پر وہ نہایت برا فروختہ ہوئے اور مفتی اعظم کے پاس پہنچ کر فرہاد پاشا کے خلاف ایک فتویٰ چاہا، مفتی اعظم نے انہیں یہ سمجھا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی کہ فرہاد پاشا کے کہنے سے نہ وہ کافر ہو سکتے اور نہ ان کی بیویاں عقیمہ لیکن ان کو مفتی اعظم کے جواب سے تشفی نہ ہوئی اور انہوں نے علانیہ بغاوت کر دی، سپاہیوں (قسنطنیہ کے سوار دستوں) نے بھی ان کی حمایت کی اور سب نے مل کر فرہاد پاشا کے قتل کے لیے نعل چاٹنا شروع کیا، اس شورش میں حکومت کے بہت سے اعلیٰ عہدہ دار جنہوں نے باغیوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی، زخمی ہوئے، بالآخر بی چری دستوں کو باغیوں کی سرکوبی کے لیے آمادہ کیا گیا اور یہ بغاوت کسی طرح فرو ہوئی۔

سلسلہ جنگ | اس درمیان میں سرحد کی جنگ برابر جاری تھی اور ہنگری اور ولاچیا میں عثمانی فوجوں کو متعدد شکستیں بھی ہوئیں، یہ حالت دیکھ کر مدبرین سلطنت نے محمد کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ خود دشمنوں کے مقابلہ کے لیے روانہ ہو، کیوں کہ عیسائی جس تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے، اسے روکنے کی اس سے زیادہ امید افزا کوئی دوسری صورت نہ تھی، محمد کو قسنطنیہ چھوڑنا منظور نہ تھا اور سلطانہ صفیہ نے بھی جواب سلطانہ والدہ تھی اس کو میدان جنگ سے باز رکھنے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا، محمد ثالث ایک کم زور دل و دماغ کا آدمی تھا، سلطنت کے تمام امور میں سلطانہ صفیہ ہی کو زیادہ دخل تھا اور محمد پر اس کا حد سے

زیادہ اثر تھا وہ خوب سمجھتی تھی کہ قسطنطنیہ سے باہر ہونے کے بعد محمد اس کے قابو سے نکل جائے گا، اس لیے اس نے ہر ممکن کوشش سے اس کو روکنا چاہا لیکن جنگ کی حالت روز بروز زیادہ انتشار انگیز ہوتی جاتی تھی، ۱۵۹۳ء میں ولاچیا اور ٹرانسلوانیا کی حمایت میں آسٹریا اور ہنگری نے بھی باب عالی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تھا، ان کی فوجیں شہنشاہ میکسی میلین اور ہنگری کے مشہور جنرل کاؤنٹ فلٹی (Count Filfy) کے زیرِ نگرانی تیزی سے عثمانی سرحد کی جانب بڑھ رہی تھیں، انہوں نے دریائے ڈینوب تک پہنچنے سے پہلے گران، پست، بخارسٹ اور دوسرے متعدد قلعوں کو جن پر ترکوں کا قبضہ تھا، فتح کر لیا، اس کے بعد انہوں نے ڈینوب کو عبور کر کے وارنا، سیلسٹریا، رچک اور اکرمان پر قبضہ کر لیا، عثمانی فوجوں کو ان شکستوں کی خبر جس وقت قسطنطنیہ پہنچی تمام شہر میں تہلکہ مچ گیا اور ہر شخص نے اسی پر اصرار کرنا شروع کیا کہ سلطان کو فوج لے کر خود سرحد کی طرف روانہ ہونا چاہیے تاکہ جو شکستیں ترکوں کو ہو چکی تھیں ان کی تلافی ہو جائے اور جن مقامات پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا ہے وہ واپس لے لیے جائیں، مشہور مورخ خواجہ سعد الدین جو محمد کا استاد تھا اور جس کا محمد نہایت احترام کرتا تھا، اس نے بھی بے حد اصرار کے ساتھ اسی پر زور دیا، آخر میں نبی جری نے بھی یہ دھمکی دی کہ جب تک سلطان خود ان کی قیادت نہ کرے گا وہ دشمن کے مقابلہ کے لیے نہ بڑھیں گے، محمد نے مفتی اعظم کو بلا کر مشورہ طلب کیا، مفتی اعظم نے اس کے جواب میں اس عہد کے مشہور شاعر علی چلبی کی ایک نظم اس کے ہاتھ میں رکھ دی، اس نظم میں سلطنت کی زبوں حالی اور موجودہ جنگ کی تباہ کاری نہایت واضح اور موثر الفاظ میں بیان کی گئی تھی، ان تمام باتوں کا اثر بالآخر محمد پر بھی پڑا اور اس نے سلطانہ صفیہ کی شدید مخالفت کے باوجود سرحد پر جانے کا عزم کر لیا۔

جون ۱۵۹۶ء میں سلطان محمد نہایت تڑک و احتشام کے ساتھ سرحد کی طرف روانہ

ہوا، اس مہم میں علم نبوی ﷺ پہلی بار نکالا گیا تھا، جس کی وجہ سے فوج میں بے انتہا جوش تھا،

مؤرخ سعد الدین سلطان کے ہم رکاب تھا، فوج کی کمان صدر اعظم ابراہیم پاشا، حسن صوقولئی پاشا اور سیکالا پاشا کے ہاتھ میں تھی، جوں ہی ترکی فوج سرحد پر پہنچی، آسٹریا اور ہنگری کی فوجیں بلا مقابلہ پسپا ہو گئیں اور بلغاریا کے تمام مفتوحہ علاقوں کو خالی کر دیا، سلطان نے ایرلا کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد آسٹریا اور ہنگری کی فوجیں ٹرانسلوانیا سے مکمل حاصل کر کے پھر آگے بڑھیں لیکن ایرلا اس وقت تک فتح ہو چکا تھا، ۲۴ اکتوبر ۱۵۹۶ء کو فریقین کی فوجی سیرسٹیز (Cerestes) کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں اور پھر تین دن تک اس ہنگامہ خیز جنگ کا سلسلہ قائم رہا، جس میں ابتداء ترکوں کو شکست ہوئی لیکن آخر میں جنگ کے خاتمہ کے قریب انہوں نے عیسائیوں کی طاقت کو پاش پاش کر دیا۔

پہلے روز ترکی فوج کا ایک دستہ جو جعفر پاشا کی کمان میں تھا، نہایت جاں بازی کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا لیکن غنیم کی کثرت تعداد سے مغلوب ہو کر ایک ہزار بیٹی چری اور ایک سو سپاہی اور تینتالیس توپوں کے نقصان کے ساتھ اسے پسپا ہونا پڑا، اس ابتدائی شکست کے بعد سلطان نے فوجی افسروں کو جمع کر کے مشورہ کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ جنگ فی الحال موقوف کر دی جائے اور فوج کو واپسی کا حکم دے دیا جائے، مؤرخ سعد الدین نے اس رائے کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ ”یہ بات نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی گئی کہ عثمانیوں کے کسی بادشاہ نے انتہائی اور ناگزیر مجبوری کے بغیر دشمن کو پیٹھ دکھائی ہو،“ بعض سرداروں نے یہ مشورہ دیا کہ سلطان کی حفاظت کے خیال سے فوج کی کمان حسن صوقولئی پاشا کے ہاتھ میں دے دی جائے، سعد الدین نے اس کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ ”یہ معاملہ پاشاؤں کا نہیں ہے، یہاں خود سلطان کی ذاتی موجودگی قطعی طور پر ضروری ہے،“ چنانچہ محض سعد الدین کے عزم و استقلال کی وجہ سے آخر میں یہ طے پایا کہ جنگ جاری رکھی جائے اور سلطان ہی اس کی قیادت کا فرض انجام دے۔

فتح مبین | دوسرے روز بھی ترکوں کو کوئی خاص کام یا بی حاصل نہ ہوئی، لیکن تیسرے روز ۲۶ اکتوبر ۱۵۲۶ء کو دونوں فریق نے پوری تیاری کے ساتھ حملہ کیا اور یہی حملہ فیصلہ کن ثابت ہوا، شروع میں عیسائیوں نے مکمل طور پر غلبہ پایا، انہوں نے ترکوں اور تاتاریوں کو میدان سے بھگا کر ان کی تمام توپوں پر قبضہ کر لیا، سلطان نے یہ دیکھ کر کہ اب کوئی امید باقی نہیں رہی، بھاگنے کا قصد کیا لیکن سعد الدین نے اس موقع پر بھی ثابت قدمی دکھائی اور قرآن پاک کی ایک آیت تلاوت کر کے سلطان کو سمجھایا کہ صبری سے فتح حاصل ہوتی ہے اور رنج کے بعد خوشی کا آنا ضروری ہے، عین اس وقت جب کہ عیسائی دستے فاتحانہ جوش و خروش میں لوٹ مار میں مصروف تھے، سیکالا پاشا جواب تک بالکل خاموش کھڑا ہوا تھا، دفعۃً اپنے سواروں کے انبوه کے ساتھ بجلی کی طرف غنیم پر ٹوٹ پڑا اور اس بے جگری سے انہیں قتل کرنا شروع کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی میدان میں ٹھہرنہ سکے اور انتہائی سراسیمگی کی حالت میں جان بچانے کے لیے بھاگے لیکن باوجود اس کوشش کے ان کے پچاس ہزار سپاہی دلدل میں پھنس کر اور ترکوں کی تلواروں سے ہلاک ہو گئے، ان کی پانچانوے توپیں اور آرج ڈیوک میکسی میلیں (Maximilion) کا جو عیسائی فوجوں کا سپہ سالار اعظم تھا، تمام زرو جو اہر اور فوجی سامان ترکوں کے قبضہ میں آ گیا، ترکوں کی یہ فتح اپنی عظمت اور اہمیت کے اعتبار سے تاریخ آل عثمان کی نمایاں ترین فتوحات میں تھی۔

اس غیر متوقع فتح کے بعد جس کا سہرا **ھیتۃ سعد الدین پاشا اور سیکالا پاشا** کے سر تھا، سلطان محمد بڑے فخر و مسرت کے ساتھ قسطنطنیہ کو واپس ہوا اور پھر اپنی عیش و عشرت کی زندگی میں مصروف ہو گیا، ہنگری کے ساتھ جنگ کا سلسلہ کم و بیش برابر جاری رہا، یہاں تک کہ اس کے جانشین سلطان احمد اول کے عہد میں صلح نامہ ستوا توروک (Sitvatoroh) کے ذریعہ اس کا خاتمہ ہوا۔

فراری | قسطنطنیہ پہنچ کر سلطان محمد نے فوراً ہی سیکالا پاشا کو اس کی شجاعت اور کامیابی

کے صلہ میں صدر اعظم مقرر کیا لیکن یہ انتخاب نتائج کے اعتبار سے نہایت افسوس ناک ثابت ہوا اور چند ہی دنوں کے بعد سیکالا پاشا اس عہدے سے برطرف کر دیا گیا، ایک فوجی افسر کی حیثیت سے اس کی بے مثل شجاعت اور جاں بازی مسلم تھی تاہم انتظام سلطنت کے لیے جس تدبیر اور مصلحت بینی کی ضرورت تھی، اس سے وہ بڑی حد تک محروم تھا، جنگ سیریز کے موقع پر جب عیسائیوں نے غلبہ پایا تو عثمانی فوج کے پیش تر دستوں کے قدم اکھڑ گئے تھے، سیکالا پاشا کو تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان بھاگنے والوں کی تعداد تیس ہزار تھی، جن میں زیادہ تر ایشیا کے جاگیریں دستے تھے، اس نے ان سب کو ”فراری“ کے لقب سے موسوم کر کے ان کی تنخواہیں روک دیں اور ان کی جاگیریں ضبط کر لیں، بہتیروں کو اس نے علانیہ قتل کر دیا، ایک بڑی تعداد ایشیائے کوچک کو واپس چلی گئی اور سیکالا پاشا اور سلطنت کے خلاف بغاوت پھیلانے کی کوشش کرنے لگی، چنانچہ ایشیائے کوچک میں تھوڑے ہی دنوں کے بعد جو بغاوت برپا ہوئی اور جس کا سلسلہ کئی سال تک قائم رہا، اس میں نمایاں حصہ ان ہی ”فراریوں“ کا تھا۔

قرہ باز پچی | سلطان محمد کے بقیہ عہد حکومت میں فوج کی خود سری اور صوبہ داروں کی تعدی اور سخت گیری روز بہ روز زیادہ ہوتی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے خلاف ایک عام بے زاری پھیل گئی اور ہر طرف بغاوت کے آثار نمایاں ہونے لگے، چنانچہ ۱۵۹۹ء میں ایشیائے کوچک کے فوجی جاگیرداروں کا ایک سردار عبد الحمید جو ”قرہ باز پچی“ کے لقب سے مشہور تھا، اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے کھڑا ہو گیا اور سلطان کے خلاف عام بغاوت برپا کر کے خود ایک خود مختار فرماں روا بن جانا چاہا، اس نے کردوں، ترکمانوں اور جنگ سیرٹیز کے ”فراریوں“ کی ایک فوج تیار کی اور اپنے بھائی ولی حسن بغداد کی مدد سے عثمانی لشکر کو متعدد شکستیں دیں، اس کے بعد حسن صوفولئی پاشا باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا، اس نے عبد الحمید کو شکست دے کر بھگا دیا، عبد الحمید کو لڑائی میں ایک کاری زخم لگا

تھا، جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکا لیکن مرنے سے پہلے اس نے اپنے بھائی ولی حسن کو اپنی موت کا بدلہ لینے پر مامور کر دیا تھا، چنانچہ ولی حسن نے جنگ جاری رکھی اور بالآخر حسن پاشا کو قتل کر دیا، اس کی طاقت روز بہ روز بڑھتی گئی، یہاں تک کہ سلطان کو ۱۶۰۳ء میں مجبوراً اس سے صلح کرنی پڑی، سلطان نے اسے بوسینا کا حاکم مقرر کر دیا، جس کے معاوضہ میں ولی حسن نے آئندہ مطیح اور وفادار رہنے کا عہد کیا۔

ایران سے جنگ | اس بغاوت کے دوران ہی میں شاہ عباس نے اپنے قدیم دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ۱۶۰۱ء میں سلطنت عثمانیہ پر حملہ کر دیا اور گذشتہ عہد میں جو صوبے سلطنت ایران سے نکل کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گئے تھے، انہیں واپس لے لیا۔

وفات | جون ۱۶۰۳ء میں سلطان محمد نے اپنے سب سے بڑے لڑکے محمود کو جس کی شجاعت اور لیاقت کے جوہر ابتدا ہی سے نمایاں تھے اور جس نے باغیوں کو سر کرنے کے لیے ایشیائے کوچک کی سپہ سالاری کی درخواست سلطان سے کی تھی، محض اس شبہ کی بناء پر قتل کر دیا کہ وہ اس بہانہ سے خود تخت سلطنت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، اس شبہ کو کسی درویش کی پیشین گوئی سے کہ جلد ایک نیا سلطان تخت پر بیٹھے گا اور بھی تقویت پہنچی، سلطان نے اس پیشین گوئی کے خوف سے محمود کو قتل کر دیا لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۶۰۳ء اکتوبر ۱۶۰۳ء کو وہ خود بھی ختم ہو گیا، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک درویش نے اس سے کہا تھا کہ پچپن روز کے اندر اس پر کوئی سخت مصیبت آنے والی ہے، اس پیشین گوئی کا اثر یہ ہوا کہ وہ روز بہ روز مغموم اور ضعیف ہوتا گیا، یہاں تک کہ ٹھیک پچپنویں روز اس کا انتقال ہو گیا۔

احمد اول

۱۰۱۲ھ تا ۱۰۲۶ھ مطابق ۱۶۰۳ء تا ۱۶۱۷ء

سلطان محمد ثالث کے بعد اس کا بڑا لڑکا احمد اول چودہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، ابتداءً اس نے انتظام سلطنت میں جس قوت اور استقلال کا ثبوت دیا، اس سے توقع کی جاتی تھی کہ اس کا عہد حکومت کے پچھلے عہد کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب اور شاندار ثابت ہوگا، مثلاً جب صدر اعظم نے جوہنگری کی جدید مہم پر مامور کیا گیا تھا، ایک کثیر رقم کا مطالبہ کیا اور اس کے پورا نہ ہونے تک آگے قدم بڑھانے سے انکار کر دیا تو احمد نے اس کے مطالبہ کے جواب میں صرف یہ پیغام بھیجا کہ ”اگر تم کو اپنا سر عزیز ہے تو فوراً روانہ ہو جاؤ“ صدر اعظم کو اس حکم کی تعمیل بے چوں و چرا کرنی پڑی، سلطان سلیم ثانی کے زمانہ سے حرم کو امور سلطنت میں بہت کچھ دخل حاصل تھا اور مراد ثالث اور محمد ثالث کے عہد میں عنان حکومت زیادہ تر خواتین حرم ہی کے ہاتھ میں تھی، جن میں سب سے زیادہ اثر سلطانہ صفیہ کا تھا، جو مراد ثالث کی محبوبہ سلطانہ اور محمد ثالث کی والدہ تھی، سلطان احمد نے باوجود نو عمری کے سلطانہ صفیہ اور اس کے معتمد اشخاص کو سلطنت کے معاملات میں دخل دینے سے یک قلم روک دیا، یہ اقدام بالکل خلاف توقع اور بہت کچھ امید افزا تھا، اس کے بعد اس نے سیکالا پاشا کو ایران کی طرف روانہ کیا لیکن شاہ عباس کے مقابلہ میں اس کو شکست ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۶۰۵ء میں سیکالا پاشا کا انتقال ہو گیا، صدر اعظم لالہ مصطفیٰ نے جوہنگری

کی مہم پر روانہ کیا گیا تھا، بودا کو عیسائیوں کے ہاتھ سے چھڑا لیا، مگر موسم کی خرابی اور بی چری کے آغا کی کم ہمتی کے باعث اسے مجبوراً پست اور گران کا محاصرہ اٹھالینا پڑا، بہر حال چند ہی روز کے بعد اس نے گران کو فتح کر لیا۔

صلح نامہ سینیو اتوروک | ۱۱ نومبر ۱۶۰۶ء کو صلح نامہ سینیو اتوروک پر دستخط ہوئے، اس کے دو سے فریقین کے مقبوضات میں کوئی اہم تبدیلی واقع نہیں ہوئی، گران، ایرلا اور گراڈسکا (Gradiska) کے قلعے عثمانیوں کے قبضہ میں رہے اور آب اور کومورن پر آسٹریا کا قبضہ قائم رہا، ٹرانسلوینیا بھی اس صلح نامہ میں بطور ایک فریق کے شریک کیا گیا اور یہ صوبہ ایک حد تک سلطنت عثمانیہ کی محکومی سے آزاد ہو گیا، تیس ہزار دوکات سالانہ کی رقم جو آسٹر یا بطور خراج دولت عثمانیہ کو ادا کرتا تھا، موقوف کر دی گئی اور اس کے معاوضہ میں باب عالی نے دو لاکھ دوکات یک مشت قبول کر لیے لیکن اس صلح نامہ کی اصلی اہمیت وہ تبدیلی ہے، جو اس کے بعد دولت عثمانیہ اور یورپ کی عیسائی حکومتوں کے سفارتی تعلقات میں واقع ہوئی، اب تک عیسائی حکومتوں سے جو صلح نامے ہوتے تھے، ان کی عبارت سے ظاہر ہوتا تھا کہ صلح سلطان کی طرف سے عطا کی جا رہی ہے لیکن سینیو اتوروک کے صلح نامہ میں باب عالی نے بین الاقوامی قانون کے اصول و آداب کا لحاظ رکھا، نیز شاہ آسٹریا حکم راں ”ویانا“ کے بجائے ”شہنشاہ“ لکھنا منظور کیا، اب تک سلطان کی طرف سے جو سفراء ویانا بھیجے جاتے تھے، وہ باب عالی کے ادنیٰ ملازمین میں سے منتخب کیے جاتے تھے، اس صلح نامہ کے بعد یہ طے پایا کہ سفراء کم از کم سنخچ بے کے مرتبہ کے ہوں گے۔

ضعف سلطنت | اس صلح نامہ نے واضح کر دیا کہ دولت عثمانیہ کے عروج کا دور ختم ہو چکا اور اب وہ زوال و انحطاط کی جانب مائل ہو گئی ہے، سترہویں صدی کا ابتدائی زمانہ اس کے لیے نہایت خطرناک تھا، سلاطین عموماً کم زور تھے اور غنیم (سلطنت آسٹریا) روز بہ روز زیادہ طاقت حاصل کرتا جاتا تھا لیکن ۱۶۱۸ء میں جرمنی میں وہ عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑ گئی جس

کا سلسلہ تین سال تک قائم رہا اور جس نے سلطنت آسٹریا کو ترکوں کی کم زوری سے فائدہ اٹھانے کے بجائے بوہیمیا، سیکسنی، ڈنمارک، سویڈن اور فرانس سے معرکہ آرائی میں مصروف رکھا، سلطنت اسپین بھی دولت عثمانیہ کی ایک بہت بڑی دشمن تھی لیکن فلپ ثانی کی وفات (۱۵۹۸ء) کے بعد یہ سلطنت نہایت تیزی کے ساتھ گرنے لگی اور سترہویں صدی کی ابتدا میں اس قابل نہ تھی کہ اپنے سابق حریف کے ساتھ قوت آزمائی کر سکے، فرانس اور انگلستان دولت عثمانیہ سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، علاوہ بریں وہ سترہویں صدی کے نصف اول اپنے خانگی جھگڑوں میں اس قدر مصروف تھے کہ انہیں دوسری جانب توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ تھی، روس خانہ جنگیوں اور بغاوتوں سے پریشان تھا اور اس زمانہ میں جب سلطنت عثمانیہ کی کم زوری بہت نمایاں تھی، خود ان بغاوتوں کے فرو کرنے اور اہل سویڈن و پولینڈ سے اپنے بعض صوبے واپس لینے کی کوششوں میں مشغول و منہمک تھا، غرض سترہویں صدی کے ابتدائی تیس سالوں میں جو سلطنت عثمانیہ کے لیے نہایت نازک اور تشویش ناک دور تھا، یورپ کی کوئی بڑی حکومت اس قابل نہ تھی کہ ترکوں کی کم زوری سے فائدہ اٹھا سکے، اس زمانہ میں ترکوں کے خاص دشمن پولینڈ اور وینس تھے، پولینڈ اپنے خانگی انتشار کے باعث کوئی نمایاں فتح حاصل نہ کر سکا اور وینس کبھی اس قابل نہ تھی کہ تنہا سلطنت عثمانیہ کا مقابلہ کر سکے، علاوہ بریں تمام ظاہری نمائش کے باوجود اس کی قوت خود روز بہ روز کم زور ہوتی جا رہی تھی، سترہویں صدی کے نصف اول میں ایران سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا دشمن تھا، تاہم اس سے یہ اندیشہ نہ تھا کہ اس کی فوجیں مغرب کی جانب اس حد تک بڑھ آئیں گی کہ سلطنت کے اصلی مقبوضات خطرہ میں پڑ جائیں۔

صلح نامہ سینیو اتوروک کے بعد سلطان احمد اول نے گیارہ سال حکومت کی، اس مدت میں صدر اعظم مراد پاشا نے ایشیائے کوچک کی بغاوت فرو کرنے میں ایک حد تک کام یابی حاصل کی لیکن ایران سے جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہا، جس میں زیادہ تر ترکوں

کا ہی نقصان ہوا، ۱۶۱۳ء میں قزاقوں نے سینوپ پر جو ایشیائے کوچک کا ایک نہایت دولت مند شہر اور بحر اسود کا بہت مضبوط بندرگاہ تھا، حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کر ڈالا، ترکی بیڑا موقع سے دور تھا اور شہر کی بربادی کے بعد بھی حملہ آوروں سے انتقام نہ لے سکا۔

وفات | ۲۳ رزیقعدہ ۱۰۲۶ھ (۲۲ نومبر ۱۶۱۱ء) کو سلطان احمد اول نے اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

مصطفیٰ اول و عثمان ثانی

۱۰۲۶ھ تا ۱۰۳۲ھ مطابق ۱۶۱۷ء تا ۱۶۲۳ء

سلطان احمد اول نے اپنی وفات کے وقت سات لڑکے چھوڑے جن میں سے تین تخت نشین ہوئے لیکن اس کا پہلا جانشین اس کا بھائی مصطفیٰ تھا، اب تک چودہ پشتوں سے سلطنت عثمانیہ کی وراثت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی تھی، یہ پہلا اتفاق تھا کہ بیٹے کے بجائے سلطان سابق کا بھائی تخت نشین ہوا، فان ہمیر کی روایت کے مطابق خاندان کے سب سے بڑے فرد کو تخت نشین کرنے کا دستور دولت عثمانیہ نے آل چنگیز سے لیا تھا لیکن جب سے سلاطین نے محمد فاتح کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کرنا شروع کیا اور تاج و تخت کی حفاظت کے لیے بھائیوں کو قتل ضروری خیال کیا جانے لگا، اس وقت سے سلطنت کا وارث بھائی کے بجائے بڑا لڑکا ہوتا تھا، احمد اول نے چون کہ اپنے بھائی مصطفیٰ کو قتل نہیں کرایا تھا اور صرف اس کی قید ہی پر اکتفا کیا تھا، اس لیے قانون آل عثمان کی رو سے مصطفیٰ تخت سلطنت پر بٹھایا گیا لیکن مصطفیٰ کی سادہ لوحی اور نااہلیت تین ہی مہینے میں اس درجہ واضح اور نمایاں ہو گئی کہ اراکین سلطنت نے ۱۶ فروری ۱۶۱۸ء کو اسے معزول کر کے سلطان احمد کے چہارم سالہ فرزند شہزادہ عثمان کو تخت پر بٹھا دیا، فوج سے خطرہ تھا مگر اس نے بھی اپنے مالی فائدہ کو پیش نظر رکھ کر اس تجویز سے بہ خندہ پیشانی اتفاق کیا اور نئے سلطان کی تخت

نشین کے موقع پر حسب دستور قدیم جدید انعامات کا مطالبہ کیا، جس کی وجہ سے صرف تین ماہ کے اندر خزانہ کو ساٹھ لاکھ دوکات کا بار پھر برداشت کرنا پڑا۔

عثمان ثانی | سلطان عثمان ثانی کا مختصر عہد حکومت خود اس کے اور سلطنت کے لیے نہایت

نامبارک ثابت ہوا، ہزکوں کو مسلسل شکستوں سے مجبور ہو کر ایران سے صلح کرنی پڑی (۱۶۱۸ء)

اور وہ تمام فتوحات جو مراد ثالث اور محمد ثالث کے عہد میں حاصل ہوئی تھیں، ایرانیوں کو واپس

کردی گئیں، سلطنت عثمانیہ کی مشرقی سرحد پھر اسی خط پر پہنچ گئی جس پر سلطان سلیم ثانی کے

زمانہ میں تھی، ادھر سے فارغ ہو کر عثمان سلطنت کے اندرونی دشمنوں یعنی نی چری و سپاہی

دستوں کی جانب متوجہ ہوا، جن کی خود سری اور سرکشی سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ

تھی، خصوصاً نی چری کا ترم سلطان اور رعایا دونوں کے لیے یکساں طور پر تشویش ناک تھا،

۱۶۱۲ء میں عثمان نے پولینڈ سے جنگ چھیڑ دی جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس کی فوج کی

قوت بھی کچھ کم زور ہو جائے، یہ مقصد ایک حد تک پورا تو ہوا اور سلطانی فوجوں کو جزوی کام

یابی کے بعد کافی نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا لیکن اس جنگ کے نتیجے سے عثمان کے خلاف

ایک عام ہرگشتگی پیدا ہو گئی، بجائے اس کے کہ وہ رعایا کو اپنا موافق بنانے کی کوشش کرتا، اس

نے قوانین و ضوابط میں نامناسب تبدیلیاں اور سختیاں نافذ کر کے اور زعمائے سلطنت کو اپنے

برتاؤ سے ناخوش کر کے ہر طبقہ کے لوگوں کو بے زار کر دیا، ۱۶۲۲ء میں اس نے سفر حج کا ارادہ

ظاہر کیا لیکن یہ پوشیدہ نہ تھا کہ اس کا اصلی مقصد دمشق پہنچ کر کر دوں اور دوسرے سپاہیوں کی

ایک فوج مرتب کرنا ہے جسے جدید طرز پر منظم کر کے وہ نی چری اور سپاہی کی بیخ کنی کے

لیے قسطنطنیہ لانا چاہتا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا تو سلطنت

کی بہتری خرابیاں دور ہو جاتیں لیکن اس قسم کی مہم کے لیے جیسی رازداری اور قوت عمل کی

ضرورت تھی، عثمان اس سے خالی تھا، نی چری کو اس کے اصلی مقصد کا علم ہو گیا اور انہوں نے

برافروختہ ہو کر سلطان کو اس سفر سے روک دیا اور پھر موجودہ وزیروں کے قتل کا مطالبہ کیا،

عثمان کے پاس نہ کوئی ایسی فوج تھی جوینی چری کے مقابلہ میں اس کی حمایت کرتی اور نہ رعایا میں کوئی طبقہ اس کا ہمدرد تھا، جس سے وہ مدد طلب کر سکتا، خود سابق سلطان مصطفیٰ کی والدہ بھی باغیوں کی طرف دار تھی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اگر یہ بغاوت فرو ہوگی تو عثمان اپنی ذات کو محفوظ کرنے کی غرض سے اپنے تمام اعزہ کو جس میں مصطفیٰ سب سے پہلے تھا، قتل کرا دے گا، فوج کے مطالبات بڑھتے ہی گئے اور باغیوں نے وزرا سے گزر کر خود سلطان کی ذات پر حملہ شروع کیا، چنانچہ انہوں نے عثمان کو گرفتار کر کے قید کر دیا اور مصطفیٰ کو رہا کر کے دوبارہ تخت سلطنت پر بیٹھایا، داؤد پاشا جس کو اس بغاوت میں بہت زیادہ دخل تھا، صدر اعظم کے عہدہ پر متمکن ہوا لیکن اسے اندیشہ تھا کہ مبادا کوئی انقلاب پھر پیش آئے، لہذا اس خطرہ کو ہمیشہ کے لیے رفع کرنے کی غرض سے وہ اپنے تین ساتھیوں کو لے کر عثمان کے قید خانہ میں داخل ہوا اور نہایت بے رحمی اور شقاوت کے ساتھ اسے پھانسی دے کر ختم کر دیا۔

عثمان کا خون تھوڑے ہی دنوں کے بعد رنگ لایا اور خودینی چری میں قاتلوں کے خلاف برہمی پیدا ہوئی، مصطفیٰ نے بھی اس حادثہ پر رنج و غم کا اظہار کیا اور قاتلوں کی سزا کا حکم نافذ کیا، تاہم حکومت میں جو انتشار پیدا ہو چکا تھا وہ بدستور قائم رہا اور مصطفیٰ کی نااہلی میں ذرا بھی فرق ظاہر نہ ہوا، اس کی ماں سلطانہ والدہ اصلی فرماں روا تھی، سلطنت کے اعلیٰ عہدوں کے لیے ہر امیدوار رشوت کے ذریعہ سے نیی چری اور ”سپاہی“ فوجوں کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا، قسطنطنیہ میں بد امنی اور شورش یہاں تک بڑھی کہ خود فوج پر بھی اس کا اثر پڑا اور اس نے عاجز آ کر وزرائے سلطنت کی یہ خواہش منظور کر لی کہ مصطفیٰ کی معزولی کے بعد نئے سلطان کی تخت نشینی کے موقع پر وہ اپنے دستوری انعامات کا مطالبہ نہ کرے گی، چنانچہ اگست ۱۶۲۳ء میں مصطفیٰ دوسری مرتبہ معزول کیا گیا اور سلطان عثمان کا بھائی شہزادہ مراد جس کی عمر صرف بارہ سال تھی، تخت پر بیٹھایا گیا۔

مصطفیٰ کے دوسرے دور حکومت کا قیام ایک سال سے کچھ ہی زائد رہا لیکن یہ قلیل

مدت میں بھی سلطنت کے لیے نہایت مضرت رساں ثابت ہوئی، اسی دوران میں ایران سے جنگ پھر چھڑ گئی تھی اور بغداد و بصرہ دونوں سلطنت عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل گئے، باطا پاشا والی ارض روم مقتول سلطان کے خون کا انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور تمام ایشیائے کوچک میں بغاوت برپا کر دی، وہ نئی چری کا خاص طور پر دشمن تھا اور اس نے اس خود سرفوج کو بھی عاجز کر دیا، اس عام خلفشار اور بد نظمی میں سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا، رعایا کا حال حد درجہ خراب تھا، وہ ہر طرح کی سختیوں اور تباہیوں کی شکار تھی، مرکزی حکومت بالکل کم زور ہو گئی تھی اور رشوت ستانی کا اثر سلطنت کے ہر شعبہ میں نمایاں تھا، اگر اس وقت یورپ کی کوئی مضبوط طاقت حملہ کر دیتی تو سلطنت عثمانیہ کے لیے اس کا مقابلہ دشوار ہو جاتا لیکن یورپ کی حکومتیں خود باہمی جنگ اور خانگی انتشار میں مبتلا تھیں اور ان میں دولت عثمانیہ کی اس کم زوری سے فائدہ اٹھانے کی قوت نہ تھی۔

پہلا برطانوی سفیر | ۱۶۲۲ء میں سر طامس رو برطانیہ کے سب سے پہلے سفیر کی حیثیت سے باب نالی میں آیا، یہ شاہ جیمس اول کا فرستادہ تھا اور اس کی سفارت کا خاص مقصد ان بحری قزاقوں کے خلاف احتجاج کرنا تھا، جو الجزائر اور تونس کے برطانوی جہازوں پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے، وہ پانچ سال تک قسطنطنیہ میں مقیم رہا اور کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوا، اس نے اپنے دوران قیام میں سلطنت عثمانیہ کے اختلال و زوال سے متعلق واقعات اور حالات قلم بند کیے ہیں، ان سے مبالغہ کا حصہ نکال دینے کے بعد بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سترہویں صدی کے ابتدائی دور میں سلطنت کی زبوں حالی کس حد کو پہنچ گئی تھی۔

مراد رابع

۱۰۳۲ھ تا ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۲۳ء تا ۱۶۴۰ء

سلطان مراد رابع صرف بارہ سال کی عمر میں ۱۰ ستمبر ۱۶۲۳ء کو تخت نشین ہوا لیکن اس نوعمری میں بھی اس نے جس قوت ارادی کا اظہار کیا اس سے وزراء کو اندازہ ہو گیا کہ عنان حکومت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں آئی ہے جو سلطنت کی تمام بد نظمیوں کو اپنی سطوت و جبروت سے دور کر دے گا، ترک مؤرخ اولیا کا بیان ہے کہ:

”تخت نشینی کے بعد جب سلطان مراد خزانہ میں داخل ہوا تو میراباپ درویش محمد اس کے ساتھ تھا، خزانہ میں طلائی اور نقرئی ظروف میں سے کچھ بھی باقی نہ تھے، صرف بیس ہزار پیاستر اور الماریوں میں چند مونگے اور چینی کے برتن رہ گئے تھے، بادشاہ نے سجدہ کیا اور پھر کہا کہ ان شاء اللہ میں اس خزانہ کو ان ہی لوگوں کی جائیداد سے پر کر دوں گا جنہوں نے اسے لوٹا ہے۔“

سلطانہ والدہ | مراد کی نوعمری کے باعث سلطنت کا انتظام ابتداءً اس کی والدہ سلطانہ ماہ پیکر کے ہاتھ میں تھا، جو نہایت دانش مند اور مدبر خاتون تھی، سلطانہ والدہ کی قابلیت اس وقت سلطنت کے لیے بے حد اہم اور مفید ثابت ہوئی، خطرات اور تباہیوں کے بادل ہر طرف گھرے ہوئے تھے، سلطنت کے ہر حصہ سے تشویش ناک خبریں آرہی تھیں، سرحد پر ایرانی

۱۔ چھوٹے نقرئی سکے ۲۔ کریمی، ج ۱، ص ۳۹۴۔

نوجیس فتح یاب تھیں، بانٹا پاشا اپنی بغاوت میں کامیاب ہو کر ایشیائے کوچک کا حاکم بنا ہوا تھا، لبنان کے لوگ علانیہ باغی ہو گئے تھے، مصر اور دوسرے صوبوں کے والی بھی اپنی فرماں برداری میں منزلزل تھے، الجزائر، تونس اور طرابلس کی حکومتیں خود مختار ہو چکی تھیں اور بہ اختیار خود یورپ کی حکومتوں سے معاہدے کر رہی تھیں، روسی قزاقوں کے حملہ اور ان کی تباہ کاریاں نہ صرف بحر اسود کے ساحل پر جاری تھیں بلکہ انہوں نے باسفورس میں داخل ہو کر قسطنطنیہ کے ملحق علاقہ میں بھی لوٹ مار شروع کر دی تھی، خود پایہ تخت میں خزانہ خالی تھا، سلح خانہ کا سامان تقریباً ختم ہو چکا تھا، رعایا فاقہ کشی میں مبتلا تھی اور فوج کی سرکشی اور بے راہ روی حد کو پہنچ چکی تھی، ان حالات کے باوجود جب کہ بد امنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور خود مراد کی زندگی خطرہ سے خالی نہ تھی، سلطانہ والدہ نے اپنے تدبیر اور اعلیٰ قابلیت سے سلطنت کو نہ صرف سنبھالے رکھا بلکہ رفتہ رفتہ فوج اور وزراء پر کچھ قابو بھی حاصل کر لیا، یہاں تک کہ مراد نے تخت نشینی کے نویں سال زمام حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لی اور پھر وہ تمام خرابیاں جو سلطنت کو تباہ و برباد کر رہی تھیں، نہایت سرعت کے ساتھ دور ہونے لگیں۔

فتنہ بغداد | مراد کی کم سنی کے زمانہ میں عباس صفوی شاہ ایران کو اپنی سلطنت کے وسیع کرنے کا موقع مل گیا، بکیر آغانے جو بغداد کا کوتوال تھا، وہاں کے والی کو قتل کر کے شہر پر خود قبضہ کر لیا، دولت علیہ نے اس کے مقابلہ میں حافظ پاشا کو روانہ کیا اور اس نے بغداد کا محاصرہ کر لیا، بکیر آغانے شاہ عباس کو دعوت دی اور لکھا کہ اگر آپ مجھے یہاں کا والی مقرر کر دیں تو میں شہر آپ کے حوالے کر دوں، شاہ عباس نے یہ شرط منظور کر لی اور فوراً فوج لے کر روانہ ہوا، اس درمیان میں بکیر آغانے حافظ پاشا سے بھی یہی گفتگو کی اور حافظ پاشا نے بھی اس کی یہ شرط منظور کر لی، چنانچہ اس معاہدہ کے مطابق ترکی نوجیس بغداد میں داخل ہو گئیں، اس کے بعد شاہ عباس نے بغداد پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا، تین ماہ تک محاصرہ جاری رہا، بکیر آغانے پھر وہی پہلی شرط شاہ عباس کے سامنے پیش کی اور شاہ عباس کی منظوری حاصل کرنے کے بعد

ترکوں سے غداری کر کے ایرانی لشکر کو شہر کے اندر داخل کر دیا، ۱۶۲۳ء میں شاہ عباس نے بغداد پر قبضہ کر لینے کے بعد بیکر آغا کو اس غداری کے صلہ میں قتل کر دیا۔ (فرید بک، ص ۱۲۵)

صدر اعظم کمالکش علی پاشا کے مخالفوں نے بغداد کی شکست کی ذمہ داری اسی کے سرعاند کی اور مراد کو مجبور کر کے اسے قتل کر دیا، اس کے بعد چرکس محمد پاشا صدر اعظم مقرر ہوا لیکن وہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد مر گیا، ۱۶۲۴ء میں یہ عہدہ حافظ احمد پاشا کو تفویض ہوا، اسی سال اس نے بغداد پر فوج کشی کر کے اس کا محاصرہ کر لیا، جو بہت دنوں تک قائم رہا لیکن محصورین کے استقلال میں کوئی فرق نہ آیا اور نینی چری نے گھبرا کر محاصرہ جاری رکھنے سے انکار کر دیا، مجبوراً حافظ پاشا محاصرہ اٹھا کر دیار بکر چلا آیا، یہاں پہنچ کر نینی چری نے پھر بغاوت کی، جس کی وجہ سے حافظ پاشا معزول کر دیا گیا اور خلیل پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، خلیل پاشا نے ابان پاشا کو مطیع بنانے کی کوشش کی لیکن اس میں وہ ناکام رہا اور اس کے مخالفوں نے دوسرے ہی سال اسے بھی معزول کر دیا، اس کی جگہ خسرو پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، اس نے ارض روم پر فوج کشی کر کے ابان پاشا کو مطیع کیا اور ۱۶۲۸ء میں اسے بوسنیا کا والی مقرر کیا، اس درمیان میں قسطنطنیہ کی شورش برابر بڑھتی رہی، دارالسلطنت پر تمام تر سرکش نینی چری اور سپاہی فوجوں کا قبضہ تھا، عہدہ داروں کا تقرر اور معزولی ان ہی کی مرضی پر تھی اور وزرائے سلطنت میں سے جو ذرا بھی ان کی مخالفت کرتا قتل کر دیا جاتا۔

ایران پر چڑھائی | ۱۶۲۸ء میں شاہ عباس صفوی نے وفات پائی اور اس کا نو عمر لڑکا شاہ مرزا تخت نشین ہوا، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خسرو پاشا نے ایران پر فوج کشی کی اور ۱۶۳۰ء میں ہمدان میں داخل ہو گیا، ہمدان فتح کرنے کے بعد وہ بغداد کی طرف بڑھا، درمیان میں کئی بار ایرانیوں نے مقابلہ کیا لیکن خسرو پاشا نے ہر مرتبہ انہیں شکست دی، بغداد پہنچ کر اس نے شہر کا محاصرہ کر لیا، مگر تھوڑے دنوں کے بعد فوج نے لڑنے سے انکار کر دیا اور اسے نومبر ۱۶۳۰ء میں محاصرہ اٹھا کر مجبوراً واپس آنا پڑا، محاصرہ اٹھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خسرو پاشا

معزول کر دیا گیا اور حافظ پاشا دوبارہ صدر اعظم مقرر ہوا۔

خون شہید | یوں تو بی چری اور سپاہی فوجوں کی خود سری بارہا بغاوت کے مناظر پیش کر چکی تھی لیکن فروری ۱۶۳۲ء میں انہوں نے جس سرکشی کا ثبوت دیا وہ مراد کے لیے جس نے اسی سال انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لیا تھا، ایک نہایت تلخ تجربہ تھا، ان باغیوں نے بغداد کی مہم سے ناکام لوٹنے کے بعد جب پاشا کے بھڑکانے سے ایک روز قصر سلطانی کے سامنے جمع ہو کر صدر اعظم حافظ پاشا، مفتی اعظم بیگی، دفتر دار مصطفیٰ اور سلطان کے چند دوسرے معتمد عمدہ داروں کے قتل کا مطالبہ نہایت گستاخی اور اصرار کے ساتھ پیش کیا، مراد نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے، بلکہ انہوں نے اسے یہ دھمکی دی کہ اگر وہ ان کے مطالبات منظور نہ کرے گا تو اس کا نتیجہ خود اس کے حق میں بہت برا ہوگا، آخر کار مراد نے نہایت مجبور ہو کر حافظ پاشا کو بلایا اور اس سے باغیوں کے مطالبہ کا ذکر کیا، حافظ پاشا نے جواب دیا ”میرے بادشاہ! حافظ جیسے ایک ہزار غلاموں کی جان تجھ پر نثار، میری استدعا صرف یہ ہے کہ تو مجھے اپنے ہاتھ سے قتل نہ کر، بلکہ ان ہی لوگوں کے سپرد کر دے تاکہ مجھے شہادت حاصل ہو اور میرے خون کا وبال ان کے سروں پر آئے“

اس کے بعد بسم اللہ الرحمن الرحیم لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم انا للہ وانا الیہ راجعون کہتا ہوا نہایت دلیری کے ساتھ وہ باغیوں کی طرف بڑھا، مراد اس منظر کو دیکھ کر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا، وزرائے سلطنت بھی جو اس موقع پر موجود تھے، اشک بار آنکھوں سے اس خونیں تماشاً کو دیکھ رہے تھے، جوں ہی حافظ پاشا آگے بڑھا، باغی خوں خوار درندوں کی طرح اس پر چھٹے، حافظ پاشا نے پہلے حملہ آور کو ایک ہی وار میں ختم کر دیا، یہ دیکھ کر بقیہ سپاہی اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے خنجروں سے ہلاک کر ڈالا، ایک بی چری سپاہی نے اس کے سینہ پر چڑھ کر اس کا سر کاٹ ڈالا، جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو لیے تو مراد نے کہا ”خدا کی مرضی پوری ہو لیکن اے خوں خوار انسانو! جو وقت اس نے مقرر کر دیا ہے، اس

وقت ضرورت سے اس کا انتقام لیا جائے گا، تمہیں نہ خدا کا خوف ہے نہ رسول ﷺ کی شریعت کا احترام، لیکن باغیوں پر اس وقت اس دھمکی کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

فکر انتقام | دو مہینے کے اندر بہت سے دوسرے بے گناہ باغیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، خود مراد کی معزولی کے مسئلہ پر بھی فوج میں علانیہ گفتگو ہوتی تھی اور مراد کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ اس کے سامنے صرف دو ہی صورتیں ہیں، یا تو وہ اپنے عزل و قتل کے لیے تیار ہو جائے یا پھر باغیوں کی بیخ کنی کے لیے کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھے، خوش قسمتی سے فوج میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو اپنے ساتھیوں کی سرکشی اور بے راہ روی سے نہایت بے زار تھے، ان لوگوں نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی حمایت کا وعدہ کیا، چنانچہ خفیہ طور پر ایک دلیر اور جاں باز دستہ جس پر ہر حال میں اعتماد کیا جاسکتا تھا، رفتہ رفتہ تیار کر لیا گیا، نی چری اور سپاہی دستہ کا باہمی افتراق و حسد بھی سلطان کے مقصد میں بہت کچھ معین ہوا اور اس نے ان کی نزاع سے کافی فائدہ اٹھایا، اس نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اس شورش کے اصلی بانی رجب پاشا کو دفعۃً خفیہ طور پر قتل کر دیا، اس کے بعد پھر وہ باغیوں کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوا، ۲۹ مئی ۱۶۳۲ء کو اس نے ایک دیوان عام منعقد کیا جس میں مفتی اعظم، وزراء سلطنت، اکابر علماء اور فوجی سردار جنہوں نے باغیوں کے خلاف سلطان کی اطاعت کا حلف لیا تھا، حاضر تھے، سواروں کے چھ دستے بھی جن کی وفاداری پر اعتماد کیا جاسکتا تھا، مستعد کھڑے تھے، مراد نے پہلے نی چری دستوں کو اپنے سامنے بلا کر ان کی وفاداری پر اطمینان ظاہر کیا اور کہا کہ مجھے امید ہے تم باغیوں کو سزا دینے میں میرا ساتھ دو گے، نی چری دستوں نے باواز بلند اعلان کیا کہ بادشاہ کے دشمن ہمارے دشمن ہیں اور قرآن پاک ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ ہم سلطنت کی کامل اطاعت کریں گے، اس کے بعد مراد ”سپاہیوں“ کے وفد کی طرف متوجہ ہوا، جو نی چری فوج کے اس جوش کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے، اس نے ان کی سرکشی پر ملامت کی، ”سپاہیوں“ نے ادب کے ساتھ معذرت پیش کی کہ گو سلطان کی شکایتیں بجا ہیں تاہم وہ خود

ذاتی طور پر دولت علیہ کے مطیع اور وفادار ہیں، البتہ اپنے ماتحتوں کی اطاعت پر قابو نہیں رکھتے، مراد نے جواب دیا کہ اگر تم وفادار ہو تو وہی حلف لو جو تمہارے بھائی بنی چری دستوں نے ابھی لیا ہے اور اپنے دستوں سے باغیوں کے سرداروں کو گرفتار کر کے میرے حوالے کر دو، سپاہی افسروں نے خوف زدہ ہو کر اطاعت کا حلف لے لیا، اس کے بعد مراد نے قضاة سلطنت کو مخاطب کر کے ان کے فیصلوں کی جانب داری پر انہیں ملامت کی، جس پر ایشیا کے ایک عربی النسل قاضی نے کھڑے ہو کر نہایت بے خوبی کے ساتھ عرض کیا ”میرے بادشاہ! ان تمام باتوں کا علاج صرف تلوار کی دھار ہے“ اس قاضی کا یہ اعلان لکھ لیا گیا اور پھر سلطان، وزرائے سلطنت، مفتی اعظم اور تمام حاضرین نے متفقہ طور پر ایک محضر پر اپنے دستخط کیے، جس کا مضمون یہ تھا کہ وہ بد امنی اور شورش کو دور کرنے کی حتی الوسع پوری کوشش کریں گے۔

شدت انتقام | مراد نے اسی روز سے اپنی آزاد حکومت شروع کر دی، باغیوں کے تمام سردار اور وہ سب لوگ جن کو مراد اس بغاوت میں شریک سمجھتا تھا، قتل کر دیے گئے، قسطنطنیہ کے علاوہ صوبوں میں بھی باغیوں کا استیصال یوں ہی کیا جانے لگا اور مہینوں تک قتل و خون ریزی کا سلسلہ جاری رہا، خفیف سے شبہ پر بھی بڑے بڑے عہدہ دار فوراً قتل کر دیے جاتے، نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر سلطنت کے ہر شعبہ کی تمام خرابیاں دور ہو گئیں اور فوج کی سرکشی کا خاتمہ ہو گیا، سلطنت کے طول و عرض میں امن و امان قائم ہو گیا اور عدل و انصاف کی حکومت نظر آنے لگی۔

ایشیائے کوچک کی بغاوت ۱۶۳۰ء ہی میں فرو ہو چکی تھی اور مراد نے ابا ظاہر پاشا کی جان بخشی کر کے اسے بوسنیا کا والی مقرر کر دیا تھا لیکن بنی چری کو مطیع کرنے کے بعد اس نے ابا ظاہر پاشا کو قسطنطنیہ بلا کر اس فوج کا حاکم بنا دیا، کچھ دنوں تک تو ابا ظاہر پاشا مراد کے حسب اطمینان کام کرتا رہا لیکن پھر اپنی کسی بات سے اس کو ناخوش کر دیا جس کی پاداش میں قتل کر دیا گیا (۱۶۳۳ء)۔

مفتی اعظم کا قتل ۱۶۳۳ء میں مراد ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا لیکن وہ نائیکو میڈیا سے تھوڑی ہی دور آگے بڑھا تھا کہ اس نے وہاں کے قاضی کو کسی جرم میں قتل کرا دیا، اس قتل سے دارالسلطنت کے علماء کی جماعت میں بڑی برہمی پیدا ہوئی اور اس جماعت کے سرداروں نے مراد کے خلاف کہنا شروع کیا، سلطانہ والدہ نے اس کی اطلاع مراد کو دی، وہ فوراً قسطنطنیہ واپس ہوا اور آتے ہی مفتی اعظم کو قتل کرا دیا، تاریخ آل عثمان میں سلطان کے حکم سے کسی مفتی اعظم کے قتل کی یہ پہلی اور آخری مثال ہے، اس قتل کے بعد علماء کی شورش بالکل فرو ہو گئی۔

اریواں کی فتح ۱۶۳۵ء میں مراد پھر اپنی مہم پر روانہ ہوا، اس مرتبہ اس کا مقصد صرف ایشیائی صوبوں کا معائنہ کرنا نہ تھا بلکہ ان مقامات کو فتح کرنا بھی مقصود تھا جو پہلے عثمانی مقبوضات میں شامل تھے، چنانچہ اسی سال اس نے اریواں فتح کرا لیا، یہ شہر پہلے سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں رہ چکا تھا۔

بغداد کی فتح ۱۶۳۸ء میں مراد اپنے عہد کی آخری اور سب سے بڑی مہم پر روانہ ہوا، بغداد پندرہ سال سے ایرانیوں کے قبضہ میں تھا اور باوجود کئی محاصروں کے ترک اسے واپس لینے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے، اسے اول اول سلطان سلیمان اعظم نے فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا تھا لیکن مراد کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال جب کہ بغاوتوں اور بد نظمیوں کے باعث سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو رہا تھا، شاہ عباس صفوی نے بکیر آغا کی غداری سے فائدہ اٹھا کر اس پر قبضہ کرا لیا تھا، اب ۱۶۳۸ء میں مراد اس سابق مقبوضہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوا، ۱۵ نومبر ۱۶۳۸ء کو عثمانی فوجوں نے بغداد پہنچ کر شہر کا محاصرہ کرا لیا، محصورین جن کی تعداد تیس ہزار تھی، نہایت دلیری اور جاں بازی سے مقابلہ کرتے رہے لیکن ترکوں کی تعداد، ان کی فوجی تنظیم اور سب سے بڑھ کر خود مراد کی غیر معمولی شجاعت تمام مدافعت پر غالب آئی، دوران محاصرہ میں مراد معمولی سپاہیوں کے دوش بہ دوش کھائیوں میں کام کر رہا تھا

اور ان کی ہمت قائم رکھنے کے لیے وہ ہر کام میں ان کا شریک رہتا تھا، جب ایرانیوں کے دیکھا کہ وہ کام یابی کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکیں گے تو ایک روز انہوں نے اپنے سب سے بڑے پہلوان اور بہادر کو باہر نکال کر ترکوں کو چیلنج دیا کہ وہ بھی دست بہ دست لڑائی کے لیے اپنی فوج کے سب سے بڑے بہادر کو آگے بڑھائیں، یہ چیلنج سن کر مراد خود اس ایرانی پہلوان کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا اور دیر تک شمشیر زنی کے جوہر دکھا کر ایک تیغہ ایسا مارا کہ ایرانی کا سر کٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا، مراد اپنی جسمانی قوت اور حربی قابلیت کے لحاظ سے تمام عثمانی لشکر میں کوئی حریف نہیں رکھتا تھا، بہر حال ۲۲ دسمبر ۱۶۳۸ء کو ترکی توپوں نے فصیل شہر میں آٹھ سو گز چوڑا ایک رخنہ پیدا کر دیا اور اس وقت سے دونوں فوجوں کا اصل مقابلہ شروع ہوا، ترک شہر میں داخل ہونے کے لیے دوڑے لیکن ایرانیوں نے اپنی قابل داد جاں بازی سے دور و زنگ انہیں اندر قدم رکھنے سے روک رکھا، بالآخر (۲۵ دسمبر ۱۶۳۸ء) تیسرے روز صدر اعظم طیار محمد پاشا فوج لے کر آگے بڑھا اور گوہ خود گولی کھا کر گرا تا ہم ترک گولیوں کی باڑھ سے بے خوف ہو کر لڑتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے، بارہ سو سواروں کا ایک دستہ بغداد کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر مراد فروری ۱۶۳۹ء میں قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوا اور ۱۷ جون ۱۶۳۹ء کو نہایت شان و شوکت کے ساتھ دارالسلطنت میں داخل ہوا، قسطنطنیہ اس سے قبل سلاطین عثمانیہ کی ایسی فاتحانہ واپسی بارہا دیکھ چکا تھا لیکن سلطان مراد رابع کا یہ داخلہ اس قسم کا آخری داخلہ تھا، اس کے بعد پھر کوئی سلطان فتوحات حاصل کر کے پایہ تخت میں نہیں آیا۔

ایران سے صلح | ۱۵ ستمبر ۱۶۳۹ء کو ایران اور دولت علیہ کے درمیان ایک صلح نامہ مرتب ہوا، جس کی رو سے اریوان ایرانیوں کو واپس کر دیا گیا لیکن بغداد اور اس کے ملحق علاقہ پر عثمانیوں کا قبضہ باقی رہا۔

وفات | ۹ فروری ۱۶۴۰ء کو مراد نے اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پائی، بغداد سے واپس آنے کے بعد سب سے پہلے اس نے سلطنت کی بحری قوت کو جو بہت کچھ کم زور ہو گئی

تھی، درست کرنے کی کوشش کی اور البانیا اور اس کے قریبی اضلاع میں بغاوت کی جو شورش اس کی ایشیائی مہم کے زمانہ میں پیدا ہو گئی تھی، اسے دور کیا، لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی آئندہ جنگ وینس سے ہوگی اور اس نے اس جنگ کے لیے تیاریاں شروع بھی کر دی تھیں لیکن اسی دوران میں وہ بخار میں مبتلا ہو گیا جس سے جاں بر نہ ہو سکا، موت سے پہلے اس نے اپنے بھائی ابراہیم کے قتل کا حکم دیا، ابراہیم مراد کے بعد سلطنت کا تہاواراٹ تھا، سلطانہ والدہ نے اس کی حکم کی تعمیل نہ ہونے دی اور مراد کے پاس کہلا بھیجا کہ ابراہیم اس کی خواہش کے مطابق قتل کر دیا گیا، مراد اس وقت حالت نزع میں تھا، قتل کی اطلاع پا کر وہ مسکرایا اور پھر فوراً ہی ختم ہو گیا۔

ذاتی اوصاف | سلطان مراد رابع آل عثمان کا آخری جنگجو اور فاتح فرماں روا تھا، اس نے صرف آٹھ سال حکومت کی اور صرف اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پا گیا لیکن اس قلیل مدت اور نو عمری میں اس نے سلطنت عثمانیہ کو، جس کا شیرازہ درہم برہم ہو چکا تھا اور جو فوج کی بغاوت، صوبے داروں کے تمرد اور ہر شعبہ کے انتشار کے باعث تباہی اور بربادی سے بالکل قریب پہنچ گئی تھی، تمام خرابیوں اور فسادات سے پاک کر کے ازسرنو ایک تازہ زندگی بخش دی، وہ حد درجہ تشدد اور سخت گیر تھا لیکن اس کا تشدد اور اس کی سخت گیری سلطنت کی بقا کے لیے ضروری تھی، اس کا احتساب بعض اوقات ظلم کی حد تک پہنچ جاتا تھا اور سیکڑوں بے گناہ محض شبہ کی بنا پر اس کے حکم سے قتل کر دیے گئے لیکن ایسی حالت میں کہ تمام سلطنت میں بد امنی پھیلی ہوئی تھی اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک حکومت کا کوئی شعبہ فساد سے پاک نہ تھا، ان بے گناہوں کا خون بھی بہر حال مفید ہی ثابت ہوا، یہ اسی سختی کا نتیجہ تھا کہ فوج کی باغیانہ سرکشی ایک قلم موقوف ہو گئی، عدالتوں میں انصاف ہونے لگا، رعایا کو لگان وصول کرنے والوں کی تعدی کی شکایت باقی نہ رہی اور ملک میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک امن عام اور خوش حالی ہی کے مناظر نظر آنے لگے۔

ابراہیم

۱۰۳۹ھ تا ۱۰۵۸ھ مطابق ۱۶۴۰ء تا ۱۶۴۸ء

سلطان مراد رابع کے بعد اس کا بھائی ابراہیم جو سلطنت عثمانیہ کا تہاوارث رہ گیا تھا، تخت نشین ہوا، تھوڑے ہی دنوں میں اس نے مراد کے تمام کارناموں پر پانی پھیر دیا، آٹھ سال تک محل میں قید رہنے کی وجہ سے حکومت کی جو تھوڑی بہت اہلیت اس میں پہلے تھی، وہ بھی جاتی رہی اور تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو صرف عیش پرستی کی نذر کر دیا، قتل و خون ریزی میں وہ بھی مراد ہی کی طرح بے باک تھا لیکن مراد نے اپنے سامنے مفاد سلطنت کا جو مقصد رکھا تھا، ابراہیم کے تشدد کو اس سے دور کا تعلق بھی نہ تھا، اس کی سخت گیری تمام تر اپنے ذاتی اغراض کے لیے تھی، اس نے وہ تمام خزانہ جو مراد نے حسن تدبیر کا کفایت شعاری سے جمع کیا تھا، حرم کے تہتشات پر صرف کر ڈالا، وہ تمام برائیاں جو سلطنت کو برباد کر رہی تھیں اور جن کا استیصال مراد نے اپنی حکومت کا واحد مقصد قرار دیا تھا، ابراہیم کے عہد میں از سر نو پیدا ہو گئیں اور نہایت سرعت کے ساتھ بڑھنے لگیں، امور سلطنت میں حرم کا دخل پھر شروع ہو گیا، کچھ دنوں تک تو صدر اعظم قرہ مصطفیٰ نے ابراہیم کو سنبھالنے کی کوشش کی اور مالیات کا انتظام درست رکھنا چاہا لیکن سلطنت کے لیے اس کی خیر خواہی خود اس کے حق میں مہلک ثابت ہوئی اور اس کے مخالفوں نے حرم سلطانی کے ساتھ سازش کر کے ابراہیم کو اس کے قتل پر آمادہ کر دیا، قرہ مصطفیٰ کے قتل کے بعد اس کے جانشین سلطان

زادہ پاشا نے ابراہیم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کے ہر فعل کو سراہنا شروع کیا اور اسے یقین دلایا کہ چون کہ وہ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہے، اس کا ہر قول و فعل حقیقۃً الہام ربانی کے مطابق ہوتا ہے، ابراہیم اب پہلے سے بھی زیادہ آزاد ہو گیا، مراد کا جمع کیا ہوا خزانہ جب اس کی ضروریات عیش پوری نہ کر سکا تو اس نے سلطنت کے تمام بڑے بڑے عہدوں کو جن میں فوجی عہدے بھی شامل تھے، فروخت کرنا شروع کیا اور ان عہدوں پر وہی امیدوار مقرر کیے جانے لگے جو بڑی سے بڑی رقم پیش کر سکتے تھے، قدیم محصولوں کے علاوہ متعدد جدید محصول بھی عائد کیے گئے جن میں سے بعضوں کے نام ہی سے ان کی مضحکہ خیز ضرورت ظاہر ہوتی ہے، ابراہیم کو خوش بو خصوصاً عنبر کا بہت شوق تھا، اس شوق کو پورا کرنے کے لیے اس نے ایک ”عنبر ٹیکس“ نافذ کیا، اسی طرح اسے سمور کا بھی بہت شوق تھا اور اس کے لیے بھی اس نے ایک خاص ٹیکس جاری کیا جس کا نام ”سمور ٹیکس“ تھا، اس نے سلطنت کے تمام والیوں اور بڑے بڑے عہدہ داروں کے نام جاری کیے کہ ایک متعین تعداد سمور کی فراہم کر کے قسطنطنیہ روانہ کی جائے، یہ مطالبہ قاضیوں اور فوجی افسروں سے بھی کیا گیا، ان جدید محصولوں سے تمام سلطنت میں ایک عام برہمی پیدا ہو گئی، حرم کے اخراجات اور تعیشات کے لیے جب یہ رقمیں بھی ناکافی ثابت ہوئیں تو ابراہیم نے مختلف حیلوں سے بعض بڑے بڑے آدمیوں کی موروثی جائیدادوں کو ضبط کر کے فروخت کر ڈالا، رعایا کے صبر و تحمل کا پیمانہ اب لب ریز ہو رہا تھا اور وہ بغاوت کے لیے بالکل آمادہ تھی، ابراہیم نے اپنی بے راہ روی سے ہر طبقہ کو بے زار کر دیا تھا، فوج، علماء کی جماعت اور پایہ تخت کا ہر طبقہ بغاوت کے لیے تیار تھا، چنانچہ ابراہیم کو معزول کرنے کے لیے ایک جماعت نے، جسے اکابر علماء کی حمایت حاصل تھی، کوشش شروع کی، اس سازش کے بانیوں میں نبی چری کے سردار پیش پیش تھے، باغیوں نے ابراہیم کے خلاف حسب ذیل فرد جرم قائم کی:

”بادشاہ نے اپنے جبر و تعدی سے عالم عثمانی کو تباہ کر دیا ہے، عنان سلطنت

عورتوں کے ہاتھوں میں ہے، خزانہ ان کے اخراجات پورا کرنے سے قاصر ہے، رعایا برباد ہو گئی ہے، کفار کی فوجیں سرحدی شہروں کا محاصرہ کر رہی ہیں، ان کے بحری بیڑے درد انیال کو روکے ہوئے ہیں۔“

ابراہیم کی معزولی | غرض متفقہ طور پر ابراہیم کو تخت سے اتارنے کا فیصلہ کر لیا گیا، سلطانہ والدہ نے اس کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن بالآخر اسے بھی باغیوں کا مطالبہ منظور کرنا پڑا، چنانچہ ۱۸ ابرجب ۱۰۵۸ھ (۸ اگست ۱۶۴۸ء) کو فوجی سرداروں اور دارالسلطنت کے تمام بڑے بڑے عہدہ داروں نے شہزادہ محمد کو جس کی عمر اس وقت صرف سات سال کی تھی، تخت پر بیٹھا کر اطاعت کا حلف لیا اور ابراہیم کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔

ابراہیم کا قتل | ابراہیم کو قید میں صرف دس روز گزرے تھے کہ ”سپاہی“ فوج میں اس کی حمایت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور اسے معزول کرنے والوں کو اندیشہ ہوا کہ وہ پھر تخت پر بیٹھا دیا جائے گا، اس خطرہ کو ہمیشہ کے لیے رفع کرنے کی غرض سے انہوں نے مفتی اعظم سے یہ استفتاء کیا:۔ کیا ایسے فرماں روا کو معزول اور قتل کرنا جائز ہے جو سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر ان لوگوں کو معمور نہیں کرتا جو ان کے اہل ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو مقرر کرتا ہے جو ان عہدوں کو قیمتاً خریدتے ہیں، مفتی اعظم نے صرف ایک لفظ ”ہاں“ میں اس فتویٰ کا جواب دیا اور اس کے بعد ابراہیم فوراً قتل کر دیا گیا۔

ازف کی مہم | ابراہیم کا مختصر عہد حکومت اندرونی اختلال کے باوجود بیرونی فتوحات کے لحاظ سے اہمیت سے خالی نہ تھا، اس عہد میں دو معرکے پیش آئے اور دونوں میں آخر کار دولت عثمانیہ کو فتح حاصل ہوئی، ان میں ایک ازف کی مہم تھی اور دوسری جزیرہ کریٹ کی، ازف کا شہر جو بحر اظفر پر واقع ہے اور تجارتی اور حربی دونوں حیثیتوں سے بہت کچھ اہمیت رکھتا ہے، ابراہیم کی تخت نشینی سے چار سال قبل روسی قزاقوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا، ابراہیم کے پہلے صدر اعظم قرہ مصطفیٰ نے یہ دیکھ کر کے بحر اسود کے شمالی حصہ میں ترکی قوت کو برقرار رکھنے

کی کس قدر ضرورت ہے، ۱۶۴۱ء میں ازف کو ان قزاقوں سے واپس لینے کے لیے ایک فوجی بیزار وانہ کیا، قزاقوں نے کام یابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور ترکوں کو مجبوراً واپس ہونا پڑا، دوسرے سال پھر ایک فوج روانہ کی گئی، جس کے ساتھ خان کریمیا، جو دولت علیہ کا باج گزار تھا، ایک لاکھ تاتاریوں کو لے کر شامل ہو گیا، قزاق اس زبردست فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور شہر چھوڑنے پر مجبور ہوئے لیکن روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے اس میں آگ لگا دی، ترکوں نے اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ از سر نو تعمیر کیا اور قلعہ بند کر کے اسلام پاشا کی ماتحتی میں چھبیس ہزار کا ایک دستہ متعین کر دیا۔

روس سے آویزش | قزاق برابر ترکی علاقوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، جس کے جواب میں تاتاری بھی روسی علاقوں پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے، چون کہ قزاق سلطنت روس کی رعایا سمجھے جاتے تھے، اس لیے ان کے اس طرز عمل سے دولت علیہ اور روس کے درمیان اکثر شکایتیں پیدا ہوتی رہتی تھیں، زار روس ان قزاقوں کے فعل سے اپنی بریت ظاہر کرتا تھا، چنانچہ اس نے ایک خط سلطان کو لکھ کر یہی معذرت پیش کی کہ قزاق اس کے قابو سے باہر ہو گئے ہیں اور اپنے جرائم کی سزا سے بچنے کے لیے اتنے دور دراز مقامات میں چلے گئے ہیں کہ حکومت روس کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، مگر اس کو دولت علیہ سے یہ گلہ تھا کہ وہ روس کے خلاف تاتاریوں کی حمایت کرتی ہے، آخر کار سلطان نے وعدہ کیا کہ اگر زار ان قزاقوں کو قابو میں رکھے گا اور خراج کی رقم حسب دستور قدیم خان کریمیا کو ادا کرتا رہے گا تو ترکی فوج روس کے خلاف تاتاریوں کی حمایت نہ کرے گی لیکن زار اور سلطان کے اس معاہدہ کا کوئی خاص اثر ان کی رعایا پر نہ پڑا اور ابراہیم کے عہد میں قزاقوں کا تاتاریوں کی سرحدی جنگ کا سلسلہ برابر قائم رہا، ۱۶۴۶ء میں تاتاری ان قزاقوں کو روس کے صوبوں میں دور تک بھگا لے گئے اور وہاں سے تین ہزار قیدی گرفتار کر لائے، زار نے اس کے جواب میں ازف پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کی لیکن اس فوج کو کئی بار شکست ہوئی اور موسیٰ

پاشا نے چار سو قیدی اور آٹھ سو روسیوں کے سر مال غنیمت کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیے۔ اسلام گرائی، خان کریمیا روسیوں کا سخت دشمن تھا، اوائل ۱۶۳۸ء میں پولینڈ اور روس کے علاقوں پر حملہ کر کے ان ملکوں کی چالیس ہزار رعایا کو گرفتار کر لایا، پولینڈ اور روس نے اپنے سفراء باب عالی میں بھیجے اور خان کریمیا کے اس فعل کا تدارک چاہا، ابراہیم نے اپنے دو افسروں کو خان کے پاس بھیجا اور اس کو لکھا کہ ان مسیحی قیدیوں کو قسطنطنیہ روانہ کر دو تا کہ وہ سفراء کے حوالہ کر دیے جائیں، خان نے سلطان کا خط پڑھ کر خشکی سے جواب دیا، میں اور یہاں کے سب لوگ سلطان کے خادم ہیں لیکن اہل روس محض ظاہری طور پر صلح کے خواست گار ہیں، وہ صرف ہماری فتوحات سے دب کر صلح چاہتے ہیں، اگر ہم انہیں مہلت دیے دیتے ہیں تو وہ انا طویلہ کے ساحلوں کو تاراج کر ڈالیں گے، میں ایک سے زائد بار دیوان عالی سے عرض کر چکا ہوں کہ قریبی علاقہ میں دو مضبوط مقامات ایسے تھے جن کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی لیکن جن پر قبضہ کر لینا ہمارے لیے دانش مندی کی بات ہوتی، مگر اب روسیوں نے ان مقامات پر قبضہ کر لیا ہے اور انہوں نے وہاں بیس سے زیادہ فوجی چوکیاں بنالی ہیں، اگر ہم اس سال بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو وہ اگر مان پر بھی قبضہ کر لیں گے اور پھر تمام مولڈیویا کو فتح کر لیں گے، یہ جواب دے کر اس نے سلطان کے قاصدوں کو قسطنطنیہ واپس کر دیا۔

کریٹ کی مہم | ۱۶۳۵ء میں ابراہیم نے ایک فوج کریٹ کی فتح کے لیے روانہ کی، یہ جزیرہ جمہوریہ وینس کا مقبوضہ تھا، وینس اور دولت عثمانیہ کے درمیان اس وقت کوئی جنگ نہ تھی، کریٹ پر حملہ کرنے کا سبب یہ ہوا کہ مالٹا کے چند بحری قزاقوں نے ترکی تجارتی جہازوں کے ایک بیڑے کو جو قسطنطنیہ سے مصر جا رہا تھا، گرفتار کر لیا اور اسے لے کر کریٹ کے شمالی ساحل پر لنگر انداز ہوئے، ابراہیم اس واقعہ کی خبر پا کر نہایت برہم ہوا اور اس نے پہلے مالٹا ہی پر حملہ کرنا چاہا لیکن اس کے افسروں نے سمجھایا کہ مالٹا کی مہم جسے سلیمان اعظم

جیسا طاقتور سلطان بھی سر نہ کر سکا، آسان نہ ہوگی، اس لیے مالٹا کے بجائے کریٹ پر حملہ کرنا زیادہ مناسب ہے، کریٹ چوں کہ بحر یونان کے مدخل کے قریب نیز قسطنطنیہ اور مغربی ولایتوں (تونس والجزائر وغیرہ) کے راستہ پر واقع تھا، اس لیے اپنے موقع کے لحاظ سے سلطنت عثمانیہ کے لیے بہ نسبت مالٹا کے زیادہ موزوں بھی تھا، پھر چوں کہ مالٹا کے بحری قزاق عثمانی جہازوں کو گرفتار کر کے کریٹ ہی کے بندرگاہوں میں لنگر انداز ہوئے تھے، اس لیے جمہوریہ وینس کی گوشمالی بھی ضروری تھی، چنانچہ ایک جنگی بیڑا ۳۰ اپریل ۱۶۲۵ء کو دردانیال سے روانہ ہوا، اعلان مالٹا پر حملہ کرنے کا ہوا لیکن امیر البحر کو خفیہ ہدایتیں کریٹ کے متعلق دی گئیں، ۲۴ جون کو یہ بیڑا کریٹ کے مغربی بندرگاہ کانیا (Canea) میں پہنچ گیا، جمہوریہ وینس کو سلطان کے اصلی ارادہ کی اطلاع پہلے سے ہو چکی تھی، اس لیے کریٹ کے تمام قلعے مدافعت کے لیے تیار تھے، جزیرہ کی مقامی فوجیں اکٹھا کر لی گئی تھیں اور وینس سے کمک بھی آگئی تھی، پھر بھی ساحل کی حفاظت کے لیے یہ فوجیں ناکافی ثابت ہوئیں اور ترکوں نے آسانی کے ساتھ کانیا پر قبضہ کر لیا، دوسرے سال انہوں نے ریٹینو (Retino) کو بھی لے لیا، ان دونوں شہروں پر قبضہ کرنے کے بعد عثمانی فوج جزیرہ میں داخل ہوئی اور پھر ۱۶۲۸ء میں کریٹ کے پایہ تخت کینڈیا (Candia) کا محاصرہ شروع ہوا جو تقریباً اکیس سال تک جاری رہا، اہل وینس نے کینڈیا کے بچانے کی حتی المقدور پوری کوشش کی، انتقاماً انہوں نے لیمناس (Lemnos) اور ٹینڈاس (Tenedos) کے جزیروں پر جو عثمانی مقبوضات تھے، قبضہ کر لیا اور قسطنطنیہ کے ساحلی علاقوں پر کئی بار چھاپے مارے لیکن ان تمام تدبیروں کے باوجود وہ ترکوں کو کینڈیا کے محاصرہ سے ہٹانہ سکے اور سلطان محمد رابع کے دور میں یہ شہر فتح ہو گیا اور کریٹ کا جزیرہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔

محمد رابع

۱۰۵۸ھ تا ۱۰۹۹ھ مطابق ۱۶۳۸ء تا ۱۶۷۸ء

تخت نشینی کے وقت محمد رابع کی عمر صرف سات سال کی تھی، اس نے انتالیس سال حکومت کی، ابتدائی آٹھ سال سلطنت کے لیے ہر طرح کے اندرونی اور بیرونی خطرات سے پر تھے، سلطان کی نوعمری کے زمانہ میں عنانِ حکومت حرم کے ہاتھ میں تھی، اس سے بڑھ کر بد قسمتی یہ تھی کہ خود حرم میں دو جماعتیں ایک دوسرے کی حریف تھیں، ایک کی سردار سابق سلطان ابراہیم کی والدہ تھی، دوسری کی سیادت سلطان وقت کی والدہ کو حاصل تھی، سلطنت کا شیرازہ ان حریفوں کی کشمکش سے پراگندہ ہو رہا تھا، فوج میں دونوں جماعتوں کے حامی موجود تھے اور قسطنطنیہ کی سڑکوں پر اکثر بد امنی اور کشت و خون کے مناظر پیش آتے رہتے تھے، سلطنت کے مختلف صوبوں میں بھی تقریباً یہی حالت تھی، بغاوت اور سرکشی کے آثار ہر طرف نمایاں تھے، ۱۶۳۹ء میں ایک شخص قاطر جی اوغلی نے ایشیائے کوچک میں علم بغاوت بلند کیا، کورجی یعنی نامی ایک دوسرا باغی بھی اس کے ساتھ ہو گیا اور دونوں نے مل کر احمد پاشا والی اناطولیہ کو شکست دے دی، اس کے بعد وہ قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوئے، لیکن اثنائے راہ میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا اور دونوں ایک دوسرے سے علاحدہ ہو گئے، عثمانی فوج نے کورجی یعنی کو شکست دے کر اسے قتل کر دیا، قاطر جی اوغلی نے بھی شکست کھائی لیکن سلطان نے اسے معاف کر کے کرمانیہ کا والی بنا دیا اور یہ بغاوت ختم ہوئی، تاہم سلطنت

کے اور حصوں میں جو شورش پیدا ہو گئی تھی وہ بدستور جاری رہی، پایہ تخت میں یہ صورت بہت زیادہ نمایاں تھی، آخر کار حرم کی سازشیں سابق سلطانہ والدہ کے قتل پر ختم ہوئیں۔

آسٹریا کے لیے حکومت عثمانیہ کی یہ پراگندگی نہایت مفید تھی اور وہ اس کے اختلال سے فائدہ اٹھا کر آسانی ہنگری کو واپس لے سکتی تھی لیکن جنگ سی سالہ نے اس کو اتنا زیادہ چور کر دیا تھا کہ وہ اس اقدام کی جرأت نہ کر سکی، البتہ جمہوریہ وینس سے جنگ کا سلسلہ جس کا آغاز کریٹ کے حملہ سے ہوا تھا، برابر جاری رہا اور جمہوریہ کے ایک جنگی بیڑے نے دردانیال کے قریب ایک عثمانی بیڑے کو شکست دے کر جزائر لیمیناس اور ٹیڈیداس پر قبضہ کر لیا، اس نے دردانیال کے دہانہ کی ناکہ بندی بھی کر دی، جس کی وجہ سے قسطنطنیہ کے سامان رسد کا راستہ بند ہو گیا، دارالسلطنت میں سخت گرانی پھیل گئی، ان بیرونی حملوں کے علاوہ سلطنت کے اندرونی حصہ میں ہر طرح کی بے امنی اور بد نظمی پھیلی ہوئی تھی، خوش قسمتی سے عین اس وقت جب کہ دولت علیہ ایک نہایت نازک دور سے گزر رہی تھی اور بہ ظاہر اس کی اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی، سلطانہ والدہ نے صدر اعظم کے عہدہ پر ایک ایسے شخص کو مقرر کیا جس نے پانچ ہی سال کے اندر تمام فوجی اور ملکی شعبوں کی کامل اصلاح کر کے سلطنت کو نہ صرف تباہی سے بچا لیا بلکہ اس میں از سر نو وہ طاقت و سطوت بھی پیدا کر دی جسے سلطان مراد رابع کے بعد دولت علیہ تقریباً تمام ترکھو چکی تھی۔

محمد کوپرلی | صدر اعظم محمد کوپرلی کا آبائی وطن البانیا تھا، مگر اس کا دادا اماسیا واقع ایشیائے کوچک کے ایک چھوٹے سے گاؤں کوپری میں آکر آباد ہو گیا تھا، محمد کو ابتدائی تعلیم بھی نصیب نہ ہوئی اور ابھی وہ لڑکا ہی تھا کہ اپنا پیٹ پالنے کے لیے اسے گھر سے نکلنا پڑا، حسن اتفاق سے اس کو سلطان کے مطبخ میں نوکری مل گئی، وہاں اپنی فطری ذہانت کی وجہ سے اس نے بہت جلد ترقی کر لی اور کچھ عرصہ کے بعد شاہی مطبخ کا باورچی ہو گیا لیکن حکومت کے بعض اہل نظر نے اس نوجوان کی قابلیت کا اندازہ کر کے اسے باورچی خانہ سے نکالا اور

زیادہ معزز خدمات اس کے سپرد کیں، ہر جگہ اس نے اپنی غیر معمولی لیاقت کا ثبوت دیا، چنانچہ آخر میں وہ یکے بعد دیگرے دمشق، طرابلس اور یروشلم کا والی مقرر ہوا اور ان میں سے ہر صوبہ میں اس نے ایک عادل، مضبوط اور نرم دل حاکم کی حیثیت سے شہرت حاصل کی، پھر جب سلطان محمد رابع کی تخت نشینی کے بعد سلطنت کے ہر حصہ اور حکومت کے ہر شعبہ میں شورش اور ابتری بڑھنے لگی تو صدارت عظمیٰ کی ذمہ داریوں کو تفویض کرنے کے لیے سلطانہ والدہ کی نظر انتخاب بھی محمد کو پرلی، ہی پر پڑی، چنانچہ ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) میں محمد کو پرلی نے دولت عثمانیہ کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی، اس وقت اس کی عمر ستر سال کی تھی، چوں کہ وہ بوڑھا اور لکھنے پڑھنے سے بالکل نابلد تھا، اس لیے علماء اور اعیان سلطنت نے اس کے تقرر کے خلاف احتجاج کیا لیکن دمشق، طرابلس اور یروشلم کی ولایت کے زمانہ میں محمد کو پرلی نے اپنی قابلیت کا جو ثبوت دیا تھا وہ سلطانہ والدہ کے انتخاب کی پر زور تائید کر رہا تھا، تاہم اس جلیل القدر عہدہ کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے پہلے محمد کو پرلی نے سلطانہ والدہ سے جو نو عمر سلطان کی نمائندہ تھی، چند شرطیں بہ حلف منظور کرائیں، پہلی شرط یہ تھی کہ سلطان اس کی تمام کارروائیوں کو جو وہ بہ حیثیت صدر اعظم عمل میں لائے گا، بغیر کسی بحث کے منظور کر لیا کرے گا، دوسری شرط یہ تھی کہ اسے تمام عہدوں کے تقرر اور امتیازات کے عطا کرنے میں پورا اختیار حاصل ہوگا، تیسری شرط یہ تھی کہ سلطان کو اس پر کامل اعتماد رہے گا اور اس کے خلاف ہر شکایت کو وہ فوراً مسترد کر دے گا۔

ان غیر محدود اختیارات کے ساتھ محمد کو پرلی نے سلطنت کی اصلاح کا کام شروع کیا اور ہر شعبہ کی خرابیوں کو اس سختی کے ساتھ دور کیا جو مرد رابع کے طریق اصلاح کی نمایاں خصوصیت تھی، غیر متدین عہدہ دار، غیر منصف قضاة، فوج کے سرکش سردار و سپاہی سب کے سب فوراً قتل کر دیے گئے، یہی حشر ان لوگوں کا ہوا جو کو پرلی کے خلاف سازش کرتے ہوئے پائے گئے یا جن پر اس سازش کا شبہ بھی ہوا، قسطنطنیہ میں درویشوں کی ایک جماعت

نے شورش برپا کر رکھی تھی، کوپرلی نے ان سب کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا، ان میں سے ایک درویش نے جس کا اثر عوام پر بہت زیادہ تھا، کوپرلی کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا چاہا، اس نے اسے پھانسی پر لٹکا دیا، اسی طرح اس نے کلیسائے یونان کے بطریق اعظم کو بھی جو درپردہ امیر ولاچیا کو بغاوت کے لیے ابھارنا چاہتا تھا، گرفتار کر کے سولی دے دی، اس کی باریک بین نگاہ سے کوئی بے عنوانی اور کسی سازش کی خفیہ سے خفیہ تیاری بھی چھپی نہ رہتی، اس کے جاسوس سلطنت کے بعید ترین حصوں میں بھی نہایت سرگرمی سے کام کرتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے اس کی ہیبت صوبے داروں اور فوج کے بڑے بڑے عہدہ داروں سے لے کر حکومت کے ادنیٰ ملازموں تک کے دلوں میں یکساں طور پر بیٹھی ہوئی تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی پنج سالہ صدارت میں چھتیس ہزار آدمی اس کے حکم سے قتل کیے گئے، باب عالی کے خاص جلاذد و الفقار کا بیان ہے کہ خود اس کے ہاتھ سے چار ہزار سے زیادہ آدمی پھانسی پا کر باسفورس میں پھینک دیے گئے۔

محمد کوپرلی کا یہ تشدد بادی النظر میں نہایت ظالمانہ معلوم ہوتا ہے لیکن سلطنت میں جو شورش اور بغاوت پھیلی ہوئی تھی اس کا تدارک تشدد کے بغیر ممکن ہی نہ تھا، یہ اسی سختی کا نتیجہ تھا کہ صرف پانچ سال کی مدت میں ہر طرف امن و امان اور عدل و انصاف دکھائی دینے لگا، تمام شورشیں دیکھتے دیکھتے فرو ہو گئیں، فوج کی سرکشی جاتی رہی اور سلطنت کے ہر شعبہ کا نظام درست ہو گیا۔

محمد کوپرلی نے نہ صرف سلطنت کے اندرونی نظم و نسق کو درست کیا بلکہ بیرونی حملوں کو بھی روکا، اس نے عثمانی بیڑے کو از سر نو تعمیر کرایا، جس کی وجہ سے بحر الجین میں دولت علیہ کی سطوت پھر قائم ہو گئی، اس نے وینس کے جہازوں کو شکست دے کر جزائر لیبیناس و ٹینید اس واپس لے لیے اور کینڈیا کا محاصرہ جو محمد رابع کے ابتدائی عہد میں فوج کی سرکشی کے باعث کسی حد تک کم زور ہو گیا تھا، پھر پوری شدت کے ساتھ جاری کرایا۔

۱۰۷۶ھ (۱۶۶۱ء) میں محمد کوپرلی نے وفات پائی، انتقال سے پہلے اس نے سلطان اور سلطانہ والدہ سے اپنے لڑکے احمد کوپرلی کو اپنا جانشین نام زد کر لیا تھا، مرتے وقت بھی وہ سلطنت کی بہبودی سے غافل نہ تھا، چنانچہ اس نے سلطان سے مندرجہ ذیل چار نصیحتوں پر خاص طور سے کاربند رہنے کی تاکید کی:

۱- عورتوں کا مشورہ کبھی نہ سنا جائے، ۲- کسی رعیت کو حد سے زیادہ دولت مند نہ ہونے دیا جائے، ۳- سلطنت کا خزانہ ہمیشہ پر رکھا جائے، ۴- سلطان خود ہمیشہ گھوڑے کی پیٹھ پر رہے اور فوج کو ہمیشہ حرکت میں رکھے۔

احمد کوپرلی | محمد کوپرلی کی وفات کے وقت سلطان محمد رابع بیس سال کا ہو چکا تھا اور اب وہ عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا لیکن اسے شکار کا بے حد شوق تھا اور اسی میں اپنا تمام وقت صرف کرتا تھا، اس نے سلطنت کا سارا انتظام نئے صدر اعظم احمد کوپرلی کے سپرد کر دیا تھا اور اس پر پورا اعتماد رکھتا تھا، ۱۶۶۱ء سے لے کر اپنی وفات (۱۶۷۶ء) تک احمد کوپرلی ہی دراصل سلطنت عثمانیہ کا فرماں روا تھا، وہ اپنی لیاقت، اپنے تدبیر اور اپنی عظمت کے لحاظ سے دولت عثمانیہ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ ممتاز صدر اعظم خیال کیا جاتا ہے، تمام عثمانی اور مسیحی مورخین کو اس کی حیرت انگیز قابلیت پر اتفاق ہے، تقرر کے وقت اس کی عمر صرف چھبیس سال کی تھی، محمد کوپرلی نے اسے بہترین تعلیم دلوائی تھی اور انتظام سلطنت کی تعلیم خود اپنی نگرانی میں دی تھی، نیز ایک صوبہ کی ولایت پر مامور کر کے صدارت عظمیٰ کی ذمہ داریوں کے لیے بھی اسے پہلے سے تیار کر دیا تھا، ذاتی خوبیوں کے لحاظ سے بھی احمد کوپرلی نہایت مدوح تھا، اس کی خوش خلقی اور منکسر مزاجی خاص طور پر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی، وہ شرعی احکام کی پابندی نہایت سختی سے کرتا اور اس کی زندگی اسلامی زندگی کا ایک قابل تقلید نمونہ تھی، جس کا اثر اس کے ہم عصروں اور عہدہ داروں پر بھی پڑا، اس کے لہن ہی محاسن کی بنا پر ترک اسے فاضل احمد کہتے تھے۔

احمد کو پر ملی بھی اپنے والد کی طرح ایک مضبوط قوت ارادی اور پختہ عزم رکھتا تھا تاہم اس میں وہ تشدد نہ تھا، جو محمد کو پر ملی کی وزارت کی خصوصیت تھی، احمد فطرتاً زیادہ حلیم اور نرم دل تھا، تقرر کے بعد ایک سال تک تو اس نے سختی جاری رکھی لیکن پھر اس کی ضرورت باقی نہیں رہی اور سلطنت کا انتظام بغیر کسی سختی کے ہوتا رہا، اسے رعایا کا بہت زیادہ خیال تھا، ان کی بہبودی کے لیے اس نے وہ سب کچھ کیا جو اس کے امکان میں تھا، خصوصاً اس نے محصولوں کا بار بہت ہلکا کر دیا، سپاہی جاگیر داروں کی سخت گیری اور پاشاؤں نیز مقامی عہدہ داروں کے مظالم سے رعایا بہت پریشان تھی، احمد نے ان مصیبتوں سے بھی اسے نجات دلائی، کچھ عرصہ سے مسیحی کلیساؤں کی تعمیر پر پابندی عائد کر دی گئی تھی، احمد نے ان رکاوٹوں کو بالکل دور کر دیا، باوجود اس کے کہ اسے مختلف ملکوں سے جنگ کرنی پڑی، اس نے خزانہ کو ہمیشہ پر رکھا، اس کی غیر معمولی قابلیت کا اندازہ فوج مہمات سے زیادہ اس کے ملکی انتظامات سے ہوتا ہے، اس کی حربی لیاقت بھی اعلیٰ درجہ کی تھی اور اس نے متعدد اہم فتوحات سے سلطنت کو وسعت دی تاہم اسے دوبار سخت شکست اٹھانی پڑی، جس سے دولت علیہ کی عظمت کو خاصہ صدمہ پہنچا، پہلی اہم شکست آسٹریا کے مقابلہ میں پیش آئی اور دوسری پولینڈ کے مقابلہ میں۔

آسٹریا سے جنگ | ۱۶۶۳ء میں آسٹریا سے لڑائی چھڑ گئی، یہ جنگ ان مناقشات کا نتیجہ تھی جو ڈیڑھ صدی سے ہنگری اور ٹرانسلوینیا میں جاری تھے، دو سال پیش تر سے آسٹریا اور دولت عثمانیہ کے حامیوں کے درمیان صوبوں میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہو رہی تھیں، جن میں دونوں سلطنتوں کے فوجی افسر جو سرحدی علاقوں پر متعین تھے حصہ لیتے رہے، ۱۶۶۳ء میں احمد کو پر ملی ایک زبردست فوج لے کر آسٹریا کے مقابلہ میں روانہ ہوا، اس نے بلغراد پہنچ کر دریائے ڈینوب کو عبور کیا اور پھر شمال میں نوہزل کی طرف بڑھا، یہ قلعہ یورپ کے سنگین ترین قلعوں میں تھا اور آسٹریا کو اس کی مضبوطی پر پورا بھروسہ تھا لیکن پانچ ہفتہ کے محاصرہ کے بعد ۲۵ صفر ۱۰۷۲ھ مطابق ۲۸ ستمبر ۱۶۶۳ء کو محصورین نے ہتھیار ڈال کر قلعہ عثمانیوں

کے سپرد کر دیا، نوہزل کی فتح کے بعد احمد کو پرلی نے متعدد دوسرے قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا، اس کے بعد موسم سرما گزارنے کے لیے وہ بلغراد واپس گیا۔

دوسرے سال مئی میں وہ پھر نوہزل آیا اور وہاں سے دریائے مور کو عبور کر کے ۱۶۶۳ء کو قلعہ سرینوار فتح کر لیا، ۲۶ جولائی کو وہ کومورن (Komorn) پہنچا جو ہنگری اور آسٹریا کی سرحد پر دریائے راب کے لب ساحل واقع تھا، اگر وہ اس دریا کو عبور کر لیتا تو ویانا کا راستہ صاف ہو جاتا لیکن آسٹریا اور ہنگری کی فوجیں اس کی راہ میں حائل تھیں، آسٹریا کی مدد کے لیے کانٹ کولینی (Count Coligny) کی سرکردگی میں فرانس کے مبارزین بھی آگئے تھے، مسیحی فوج کا یہ سالار کانٹ مونٹے کوکولی (Count Montecucoli) تھا جو اپنے وقت کا نہایت ممتاز جنرل تھا، عیسائیوں کی تعداد عثمانیوں سے بہت کم تھی لیکن جنگ سیرسٹیز (۱۵۹۶ء) کے بعد سے جب کہ عثمانیوں نے آسٹریا کو بری طرح شکست دی تھی، آسٹریا اور ہنگری کی فوجوں نے اپنی تنظیم اور اسلحوں میں بہت زیادہ ترقی کر لی تھی، برخلاف اس کے عثمانیوں کے فوجی نظام میں اندرونی کم زوریاں پیدا ہو گئی تھیں اور وہ اسلحوں کی ترقی میں عیسائی حکومتوں کا ساتھ نہ دے سکے تھے، جنگ سی سالہ کے دوران میں فن حرب میں بعض اہم اصلاحیں ہو گئی تھیں، جس سے عثمانی فوجیں نا آشنا تھیں، اس لحاظ سے اگرچہ مسیحی فوج کی تعداد عثمانی فوج سے بہت کم تھی تاہم فنی حیثیت سے وہ اپنے مقابل پر فوقیت رکھتی تھی۔

جنگ سینٹ گاتھرڈ | ۸ محرم ۱۰۷۵ھ (یکم اگست ۱۶۶۳ء) کو دونوں فوجیں خانقاہ

سینٹ گاتھرڈ (St. Gotthard) کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل آئیں، عثمانیوں کو اپنی کثرت تعداد کے باوجود شکست ہوئی اور ان کے دس ہزار آدمی مارے گئے، آسٹریا کی فوجوں کو بھی اتنا کافی نقصان پہنچا کہ وہ ترکوں کا تعاقب نہ کر سکیں اور احمد کو پرلی اپنی بقیہ فوج کو آسانی کے ساتھ واپس لے آیا۔

اس جنگ کی اہمیت | یہ دولت عثمانیہ کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ پہلی زبردست شکست تھی جو عثمانیوں کو آسٹریا کے ہاتھوں پہنچی، جنگ موہاکز (۱۵۲۶ء) کے بعد سے اس وقت تک آسٹریا کی فوجوں پر عثمانیوں کی فوقیت مسلم تھی، جنگ سینٹ گاتھر ڈنے دولت علیہ کی اس دیرینہ فوقیت کو صدمہ پہنچایا اور یورپ کو پہلی بار معلوم ہوا کہ عثمانیوں کی فوجی قوت مائل بہ انحطاط ہے، ترک سپاہیوں کی ذاتی شجاعت میں اب بھی کوئی فرق نہ تھا لیکن ان کے اسلحے اور جنگ کے طریقے اس وقت بھی وہی تھے جو سلیمان اعظم کے عہد میں رائج تھے، فن حرب میں وہ یورپ کی ترقی یافتہ فوجوں سے پیچھے پڑ گئے تھے، یہی ان کی شکست کا اصلی سبب تھا۔

صلح نامہ واسوار | سینٹ گاتھر ڈ کی شکست کے بعد جو صلح نامہ بیس سال کے لیے واسوار میں مرتب ہوا، اس کی دفعات بہ حیثیت مجموعی دولت علیہ کے موافق تھیں اور وہ دراصل صلح نامہ سیلو اتورک کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی تھیں، اس صلح نامہ کی رو سے طے پایا کہ اہل آسٹریا اور ترک دونوں ٹرانسلوینیا کو خالی کر دیں اور اپانی (Apafy) کو جس کی حمایت باب عالی نے کی تھی، وہاں کا فرماں روا بنایا جائے اور وہ سلطان کو خراج ادا کرتا رہے، یعنی ٹرانسلوینیا پر سلطان کی سیادت تسلیم کر لی گئی، سیر یوار اور نوہزل کے قلعوں پر تو ترکوں کا قبضہ قائم رکھا گیا، ہنگری کی سات ولایتوں میں سے تین آسٹریا کو دے دی گئیں اور چار سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئیں، اس کے علاوہ شہنشاہ آسٹریا نے دولاکھ فلورن تاوان جنگ سلطان کو ادا کرنا منظور کیا، یہ صلح نامہ دولت علیہ کے لیے ہر طرح قابل اطمینان تھا، احمد کو پریلی نے میدان جنگ میں زبردست شکست کھانے کے بعد بھی سلطنت کے مقبوضات میں اضافہ کر دیا تھا۔

کینڈیا کی فتح | ۱۶۶۶ء میں احمد کو پرلی کینڈیا کی مہم پر روانہ ہوا، جس کا محاصرہ بیس سال

سے جاری تھا، اہل واپس موروسینی (Morosini) کی قیادت میں جو بعد میں فاتح موریا کے لقب سے مشہور ہوا، نہایت جاں بازی کے ساتھ کینڈیا کی مدافعت کر رہے تھے، احمد کو پرلی کے پہنچ جانے کے بعد محاصرہ کی شدت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی لیکن اسی کے ساتھ محصورین کا جوش و استقلال بھی بڑھتا گیا، تاہم جب انہوں نے یہ دیکھا کہ زیادہ دنوں تک مقابلہ نہ کر سکیں گے تو ایک بہت بڑی رقم احمد کو پرلی کے سامنے پیش کر کے درخواست کی کہ وہ محاصرہ اٹھا کر واپس چلا جائے، صدر اعظم نے جواب دیا ”ہم لوگ روپیہ کا کاروبار نہیں کرتے، ہم کینڈیا کو فتح کرنے کی غرض سے جنگ کر رہے ہیں اور کسی قیمت پر اسے نہ چھوڑیں گے“ چنانچہ محاصرہ اسی سختی کے ساتھ جاری رہا، ۱۶۶۹ء میں ایک فرانسیسی جنگی بیڑا جس میں چھ ہزار سپاہی اور فرانس کے طبقہ امراء کے بہترین مبارزین تھے، کینڈیا کی مدد کے لیے پہنچا، اس کے بعد ہی پوپ اور مبارزین مالٹا کی کمک بھی آگئی، اس متحدہ بیڑے نے جس میں ستر جہاز تھے، عثمانیوں پر سمندر کی جانب سے گولے برسانا شروع کیے اور محصورین سامنے سے گولہ باری کرتے رہے لیکن اس دو طرفہ حملہ کے باوجود احمد کو پرلی نے کوئی قدم پیچھے نہ ہٹایا، آخر کار مجبور ہو کر موروسینی نے ۶ ستمبر ۱۶۶۹ء کو باعزت شرائط کے ساتھ ہتھیار ڈال دیے اور یہ محاصرہ جو تقریباً اکیس سال سے جاری تھا، ختم ہوا، کریٹ کے پورے جزیرہ پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا، چند دنوں کے بعد جمہوریہ وینس اور دولت علیہ کے درمیان ایک صلح نامہ ہو گیا، جس کی رو سے وینس نے کریٹ کا سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا جانا تسلیم کر لیا، البتہ سال کے تیس چھوٹے چھوٹے بندرگاہوں پر تجارتی اغراض کے لیے وینس کا قبضہ باقی رکھا گیا، فتح کے بعد احمد کو پرلی کئی ماہ تک کینڈیا میں مقیم رہا اور وہاں کی حکومت کا نظم و نسق درست کر کے قسطنطنیہ واپس آیا۔

پولینڈ سے جنگ | احمد کو پرلی کی تیسری مہم خاص توجہ کی مستحق ہے، کیوں کہ اس سے اس نزاع کی ابتدا ہوتی ہے جس کا سلسلہ دولت عثمانیہ اور روس کے درمیان حال تک قائم رہا،

۱۶۷۰ء میں اوکریں کے قزاقوں نے جو پولینڈ کی رعایا تھے، حکومت سے بعض حقوق کا مطالبہ کیا، یہ مطالبہ نامنظور کر دیا گیا اور ان کو زیر کرنے کے لیے حکومت پولینڈ نے ایک فوج جنرل سویسکی (Sobieski) کی سرکردگی میں اوکریں روانہ کی، قزاقوں نے اپنے سردار ڈورہ سینسکو (Dorescensko) کے علم کے نیچے اس فوج کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن آخر کار انہوں نے محسوس کیا کہ دولت عثمانیہ کی مدد کے بغیر وہ کام یاب نہ ہو سکیں گے، چنانچہ ڈورہ سینسکو ۱۶۷۲ء میں قسطنطنیہ آیا اور اپنی قوم کی طرف سے باب عالی میں نذر اطاعت پیش کر کے سرپرستی کی استدعا کی، سلطان نے اس کی درخواست قبول کی اور اوکریں کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ قرار دے کر اسے وہاں کا استخجق بے مقرر کر دیا، ساتھ ہی خان کریمیا کو حکم بھیجا کہ قزاقوں کی مدد کرے اور چھ ہزار کا ایک ترکی دستہ بھی ان کی مدد کے لیے اوکریں روانہ کیا، باب عالی کی ان کارروائیوں کے خلاف پولینڈ نے احتجاج کیا، زار روس نے بھی سلطان کو دھمکی دی کہ اگر اس نے قزاقوں کی مدد کی تو روس پولینڈ کی حمایت کرے گا، صدر اعظم نے اس دھمکی کی پرواہ نہ کی اور پولینڈ اور روس دونوں کو یہ جواب دیا کہ اوکریں کی نسبت باب عالی کا فیصلہ اپنی جگہ پر قائم رہے گا، احمد کوپرلی نے خود اپنی قلم سے ایک خط سفیر پولینڈ کو لکھا جس میں اوکریں کے قزاقوں کی مظلومیت دکھا کر یہ بتایا کہ جب انہوں نے دولت عثمانیہ کے دامن میں پناہ لے لی تو ان کی حمایت کرنا باب عالی پر فرض ہو گیا، غرض ۱۶۷۲ء میں پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس کا سلسلہ چار سال تک قائم رہا۔

صلح نامہ بوزاکس | اس مہم پر احمد کوپرلی کے ساتھ سلطان محمد رابع خود بھی روانہ ہوا، وہ فوج لے کر پوڈولیا میں داخل ہوا، جو پولینڈ کا ایک صوبہ تھا، احمد کوپرلی نے پوڈولیا کے پایہ تخت کمینیک (Kaminiec) کا محاصرہ کر لیا، اس قلعہ کی تسخیر اس وقت تک ناممکن خیال کی جاتی تھی لیکن صرف نو روز کے محاصرہ کے بعد ۲۶ اگست ۱۶۷۲ء کو ترکوں نے اسے فتح کر لیا، ۹ ستمبر کو دوسرا مشہور اور مضبوط شہر لبرگ (Lemberg) بھی فتح ہو گیا، ان فتوحات کے بعد

مائیکل شاہ پولینڈ نے صلح کی درخواست کی اور صلح نامہ بوزاکس (Bucaks) پر دستخط کر کے پوڈولیا اور اوکراین کے صوبے سلطنت عثمانیہ کے حوالے کر دیے اور دولاکھ بیس ہزار دوکات سالانہ خراج دینا منظور کیا، صلح کے بعد محمد رابع ایک فاتح کی حیثیت سے اور نہ کو واپس ہوا۔

تجدید جنگ | لیکن یہ صلح بالکل عارضی ثابت ہوئی، سوپسکی اور پولینڈ کے دوسرے امراء نے اسے یک قلم مسترد کر دیا اور ازسرنو جنگ کی تیاریاں کرنے لگے، چنانچہ ۱۶۷۳ء میں احمد کوپرلی پولینڈ کی سرکوبی اور زار روس کی تنبیہ کے لیے جس نے گذشتہ جنگ میں پولینڈ کو مدد پہنچائی تھی، پھر روانہ ہوا لیکن ۱۱ نومبر ۱۶۷۳ء کو سوپسکی نے دفعہ ترکی لشکر پر جو خوزیم (Khoczim) کے قریب خیمہ زن تھا، چھاپا مارا اور کوپرلی کو سخت شکست دی، دلاچیا اور مولڈویا کے فرماں رواؤں نے عین وقت پر غداری کی اور اپنے اپنے دستے لے کر سوپسکی کی فوج سے مل گئے، دوسرے سال باب عالی نے پھر ایک فوج اوکراین کی مہم پر بھیجی لیکن سوپسکی کے مقابلہ میں جس کی حمایت سلطنت روس اب علانیہ طور پر کر رہی تھی، اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی اور پولینڈ اور روس کی متحدہ فوج کے سامنے اسے پسپا ہونا پڑا، ۱۶۷۴ء میں شاہ مائیکل کی وفات پر سوپسکی پولینڈ کے تخت پر بیٹھایا گیا اور دوسرے ہی سال اس نے لمبرگ میں ترکوں کو ایک اور زبردست شکست دی، مگر اس شکست کے باوجود ترکوں کے عزم و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا اور بالآخر سوپسکی کو زرانہ (Zurawna) میں شکست دے کر انہوں نے پوڈولیا کے پورے صوبے پر قبضہ کر لیا۔

صلح نامہ زرانہ | اب سوپسکی کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی، صلح نامہ زرانہ ۱۶۷۷ء اکتوبر ۱۶۷۶ء) میں کمینیک اور پوڈولیا پر ترکوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا اور تمام اوکراین علاوہ چند مقامات کے سلطنت عثمانیہ کے زیر سیادت آ گیا۔

احمد کوپرلی کی وفات | اس صلح کے تین ہی روز بعد احمد کوپرلی نے وفات پائی، اگرچہ اسے آسٹریا اور پولینڈ کے مقابلہ میں سینٹ گاتھرڈ اور خوزیم میں فاش شکستیں ہوئی تھیں،

تاہم اس نے خوش انتظامی اور حسن تدبیر سے ان کی پوری تلافی کر دی اور پوڈولیا، کریٹ، نوہزل اور سیرنورا (ہنگری) کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر کے اس کی وسعت میں اہم اضافے کر دیے، ان بیرونی فتوحات کے علاوہ اس نے سلطنت کی اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کو بھی ختم کر دیا، جہاں تک سلطنت کے حسن انتظام، عدل و انصاف نیز مالی اور فوجی قوت کا تعلق ہے، کسی وزیر نے اس سے زیادہ کارنامے نہیں دکھائے اور یہ سب کچھ اس نے بغیر کسی ظلم و تشدد کے کیا، اس نے رعایا کے تمام طبقوں کی سرپرستی کی اور ہر مذہب و ملت کے پیروؤں کے ساتھ یکساں طور پر عدل و انصاف برتا، عہد و پیمان کی پابندی اس کا ایک مخصوص وصف تھا، وہ علوم و فنون کا بہت بڑا مربی تھا، اپنی بے نظیر لیاقت اور کارگزاریوں کے لحاظ سے وہ سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا وزیر خیال کیا جاتا ہے۔

قرہ مصطفیٰ | احمد کو پرلی کی وفات پر توقع کی جاتی تھی کہ سلطان اس کے بھائی مصطفیٰ کو پرلی کو، جو مختلف صوبوں کا حاکم رہ چکا تھا اور جس میں احمد کے بہترے اوصاف پائے جاتے تھے، صدر اعظم مقرر کرے گا، لیکن اس توقع کے خلاف اس نے اپنے داماد قرہ مصطفیٰ کو اس عہدہ پر مامور کیا، یہ انتخاب سلطنت کے لیے حد درجہ مضرت رساں ثابت ہوا، قرہ مصطفیٰ کا نصب العین تمام تراپنی ذاتی ترقی تھا، اس میں وہ اہلیت مطلق نہ تھی جو دولت عثمانیہ کے وزیر اعظم میں ہونی چاہیے تھی، باایں ہمہ اس کے حب جاہ اور ہوس عظمت کی کوئی انتہا نہ تھی، دولت کا وہ بے حد حریص تھا، چنانچہ سلطنت کے بڑے بڑے عہدے اور امتیازات معمولی قیمتوں پر فروخت کر دیتا تھا، اس طرح اس نے بہت زیادہ دولت جمع کر لی، تھوڑے ہی دنوں میں اس کی نغیوں کی وجہ سے رعایا پریشان ہو گئی، اسی ہوس عظمت کے ماتحت جو اس کے مزاج کی نمایاں خصوصیت تھی، وہ آسٹریا پر حملہ کر کے ویانا کی فتح کا حوصلہ رکھتا تھا، کیوں کہ ویانا کی فتح کے بعد وہ اپنے لیے دریائے ڈینوب اور دریائے رہائن کے درمیانی علاقوں کی فرماں روائی حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن آسٹریا کی طرف بڑھنے سے پہلے روس سے

جنگ چھڑ گئی جس میں قرہ مصطفیٰ کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔

اوکرین | قرہ مصطفیٰ کی تختیوں کی وجہ سے اوکرین کے قزاق بہت عاجز آ گئے تھے، یہاں تک کہ مجبور ہو کر انہوں نے فروری ۱۶۷۷ء میں علم بغاوت بلند کر دیا، روس نے ان کی حمایت کی، یہ اطلاع پا کر قرہ مصطفیٰ ایک فوج لے کر اوکرین میں داخل ہوا، وہاں اسے باغیوں کے علاوہ روس اور پولینڈ کی فوجوں سے بھی مقابلہ پیش آیا اور اس کو شکست ہوئی، دوسرے سال تازہ فوجوں کے ساتھ وہ پھر لوٹا اور ۲۱ اگست ۱۶۷۸ء کو اس نے قلعہ سیزرائم (Cehzrym) فتح کر لیا، تین سال تک مختلف معرکے پیش آئے جس میں کبھی ایک فریق کو فتح ہوئی، کبھی دوسرے کو، بالآخر ۱۶۸۱ء سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان صلح ہو گئی اور باب عالی اوکرین سے دست بردار ہو گیا، پانچ سال بعد روس اور پولینڈ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے پورے اوکرین پر روس کی سیادت تسلیم کر لی گئی۔

ویانا کا دوسرا محاصرہ | ۱۶۸۲ء میں قرہ مصطفیٰ کو آسٹریا پر حملہ کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا، ہنگری کا جو حصہ آسٹریا کے زیر حکومت تھا، اس نے شہنشاہ لیوپولڈ کی مذہبی تعدیوں سے عاجز آ کر بغاوت کر دی، باغیوں کے سردار توکولی (Tokoly) نے آسٹریا سے آزادی کا اعلان کر کے اپنے کو ہنگری کا فرمان روا قرار دیا اور سلطان کی سیادت قبول کر لی، قرہ مصطفیٰ کے لیے یہ موقع نہایت غنیمت تھا، اس نے ایک بہت بڑی فوج جس کا تخمینہ دو لاکھ پچھتر ہزار کیا جاتا ہے، اور نہ میں جمع کی اور ۱۶۸۳ء کے اوائل میں ویانا کے قصد سے روانہ ہو گیا، راستہ میں اسے کوئی مزاحمت پیش نہیں آئی اور وہ آسانی کے ساتھ ویانا پہنچ گیا، شہنشاہ لیوپولڈ کے پاس اس زبردست فوج کے مقابلہ کے لیے کوئی سامان نہ تھا، اس کے سپاہیوں کی تعداد پینتیس ہزار سے زیادہ نہ تھی، جن میں سے گیارہ ہزار ویانا کے اندر متعین تھے، اس نے سویسکی سے مدد کی درخواست کی، پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ میں حال ہی میں ایک صلح نامہ ہو چکا تھا لیکن

۱۔ میریٹ، ص ۱۳۲۔

سویسکی نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی اور شہنشاہ کی مدد کے لیے پچاس ہزار سپاہیوں کو بھیجنے کا وعدہ کر لیا، لیکن سویسکی کی فوج ویانا سے زیادہ فاصلہ پر تھی اور آٹھ ہفتہ سے قبل نہیں پہنچ سکتی تھی، اس میں شبہ نہیں کہ اگر قرہ مصطفیٰ پوری مستعدی سے کام لیتا اور دوران محاصرہ میں پوری قوت سے حملہ کرتا تو ویانا پولینڈ کی کمک آنے سے پیش تر ہی فتح ہو جاتا لیکن اسے اپنی طاقت اور غنیم کی کم زوری پر حد سے زیادہ بھروسہ تھا اور وہ یقین رکھتا تھا کہ دنیا کی طاقت ویانا کو اس کے پنجے سے چھڑا نہیں سکتی۔

غرض ویانا کا دوسرا محاصرہ ۱۵ جولائی ۱۶۸۳ء کو شروع ہوا، شہنشاہ لیوپولڈ اپنے خاندان کے ساتھ بھاگ کر بویریا چلا گیا تھا لیکن محصورین نے کانٹ اسٹاربرگ (Stahremberg) کی سرکردگی میں نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، شہر کے بیس ہزار باشندے بھی سپاہیوں کے دستہ کے ساتھ شامل ہو گئے، انہوں نے بھی فوج کے ساتھ جاں بازی کے جوہر دکھائے، تاہم ترکی توپ خانوں نے شہر کی دیواروں کو کئی مقام پر بالکل مسمار کر دیا، اگر قرہ مصطفیٰ ایک عام حملہ کا حکم دیے دیتا تو شہر کے فتح ہو جانے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن اس کے حرص و ہوس نے یہ نادر موقع کھو دیا، وہ اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ اہل شہر محاصرہ سے عاجز آ کر آخر میں خود ہتھیار ڈال دیں گے اور پھر شہر کی تمام دولت پر وہ تنہا قبضہ کر لے گا، جو ایک عام حملہ کی کامیابی میں ممکن نہ تھا کیوں کہ اس وقت مال غنیمت تمام فوج کا حق ہو جاتا، اسی توقع اور ہوس نے آخری حملہ کو ملتوی رکھا، اس درمیان میں سویسکی تیزی کے ساتھ ویانا کی جانب کوچ کرتا رہا اور آخر کار شہزادہ چارلس آف لورین (Charles of Lorraine) سے آملاجو آسٹریا کی شاہی فوج کا سپہ سالار تھا اور ویانا سے کچھ فاصلہ پر اس کا انتظار کر رہا تھا، دونوں سپہ سالاروں نے متحد ہو کر ٹالم (Talm) کے مقام پر دریائے ڈینوب کو عبور کیا اور پھر وہ نہایت دشوار گزار راستہ سے ہو کر ترکی لشکر کے عقب پر پہنچ گئے، قرہ مصطفیٰ آسانی کے ساتھ سویسکی اور شہزادہ چارلس کو دریا عبور کرنے یا اس دشوار گزار راستہ کے طے

کرنے سے روک سکتا تھا لیکن اپنی طاقت پر حد سے بڑھے ہوئے اعتماد نے اس کو غافل رکھا اور وہ اس وقت متناسب ہو جب غنیم اس کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔

ترکوں کی شکست | سویسکی کو عثمانی لشکر کی ترتیب دیکھ کر اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا، اس نے قرہ مصطفیٰ کی نسبت حقارت کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا کہ ”اس شخص نے لشکر کی ترتیب غلط طریقہ پر دی ہے، وہ جنگ کے متعلق کچھ نہیں جانتا، ہم ضرور اسے شکست دیں گے“ پھر اس نے اپنی فوج کو مخاطب کر کے بتایا کہ ویانا تمام مسیحی یورپ کا قلب ہے، جس کی مدافعت ایک مقدس فرض ہے، ویانا کو ترکوں سے چھڑالینا حقیقتہً سارے یورپ کو محفوظ کر لینا ہے، فوج کے دینی جوش کو برا بھینٹہ کرنے کے بعد اس نے حملہ کا حکم دیا، حملہ اس قدر شدید تھا کہ عثمانی لشکر اس کی تاب نہ لاسکا، حملہ کی شدت سویسکی کی موجودگی کے باعث اور زیادہ محسوس ہو رہی تھی، اس کی فاتحانہ شہرت کا غلغلہ تمام یورپ میں پھیلا ہوا تھا، سب سے پہلے تاتاریوں کے قدم اکھڑے، ان کے بھاگنے سے ترکی فوج کے دوسرے دستوں پر بھی اثر پڑا اور پوری فوج میں انتشار پیدا ہو گیا، قرہ مصطفیٰ نے نئی چری کو شہر کے سامنے خندقوں میں چھوڑ دیا تھا اور بقیہ فوج کے ساتھ سویسکی اور شہزادہ چارلس کے متحدہ حملہ کا مقابلہ کر رہا تھا، جو اس کے عقب سے ہوا تھا، تاتاریوں کے پسپا ہوجانے کے بعد سویسکی نے ترکی لشکر کے قلب پر حملہ کر دیا، عثمانی فوج باوجود اپنی کثرت کے اس حملہ کا مقابلہ نہ کر سکی اور اس کے قدم اکھڑ گئے، عیسائیوں نے ترکوں کے تمام خیموں اور سامانوں پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد وہ نئی چری دستوں کی طرف بڑھے، جن پر اب دونوں طرف سے حملہ ہونے لگا، پشت سے سویسکی کی فوج حملہ کر رہی تھی اور سامنے سے آسٹریا کی شاہی فوج گولیاں برس رہی تھی، نئی چری اپنی بے مثل جاں بازی کے ساتھ ان حملوں کا مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کا ایک فرد ادشجاعت دیتا ہوا مارا گیا، سویسکی کی فتح اب مکمل ہو گئی، تین سو توپیں، نو ہزار گولہ بارود کی گاڑیاں اور پچیس ہزار خیمے مال غنیمت میں ہاتھ آئے۔

قرہ مصطفیٰ کا قتل | قرہ مصطفیٰ سویسکی کے تعاقب بے بیخ کر بودا پہنچا اور وہاں عثمانی فوج کے چند بڑے بڑے افسروں کو اس شکست کا ذمہ دار قرار دے کر جو تمام تر اس کی نااہلیت اور حرص و ہوس کا نتیجہ تھی، قتل کر دیا، اس کے بعد وہ موسم سرما گزارنے کے لیے بلغراد چلا گیا، وہاں سلطان کے حکم سے وہ خود قتل کر دیا گیا اور اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔

شکست ویانا کا اثر | ویانا کا یہ دوسرا محاصرہ جس میں ترکوں کو ایسی زبردست شکست ہوئی پہلے محاصرہ سے جو ۱۵۲۹ء میں سلیمان اعظم کی سرکردگی میں ہوا تھا، بہت کچھ مختلف تھا، سلیمان سامان رسد اور اسلحوں کی عدم فراہمی کی وجہ سے محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور ہو گیا تھا، غنیمت کو میدان جنگ میں اس سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اور وہ اپنی پوری فوج کے ساتھ قسطنطنیہ واپس آ گیا، برخلاف اس کے قرہ مصطفیٰ نے ایک ایسی فوج سے جو ترکی لشکر سے تعداد میں بہت کم تھی، میدان جنگ میں شکست کھائی اور اس کے ہزاروں سپاہی ہلاک ہو گئے، اس شکست کا اثر دولت عثمانیہ کی عظمت پر بہت برا پڑا، دنیا کو معلوم ہو گیا کہ عثمانی فتوحات کا دور اب ختم ہو گیا اور وسط یورپ کی سلطنتیں جو دوسو برس سے مستقل طور پر ترکی حملوں سے خائف چلی آتی تھیں، اب ہمیشہ کے لیے مطمئن ہو گئیں۔

مسیحی اتحاد | ویانا میں ترکوں کی شکست سے تمام یورپ میں شادیاں بجنے لگی اور ان عیسائی حکومتوں نے جو سلطنت عثمانیہ کی مغربی سرحدوں پر واقع تھیں بیک وقت اس پر حملہ کر دیا، یورپ نے ترکوں کے خلاف ایک مذہبی جنگ کا اعلان کیا اور اس کے لیے عیسائی حکومتوں کا ایک مقدس اتحاد ۱۶۸۴ء میں قائم کیا جس میں آسٹریا، پولینڈ، وینس اور مالٹا شریک ہوئے اور ۱۶۸۶ء میں روس بھی شامل ہو گیا۔

مزید شکستیں | جدید صدر اعظم ابراہیم پاشا نے ان حملہ آوروں کے مقابلہ کی حتی المقدور پوری کوشش کی لیکن ویانا کی شکست میں عثمانی فوجوں اور خصوصاً توپ خانوں کا جو نقصان ہوا تھا، اس کی تلافی فوراً ممکن نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریا کی شاہی فوجوں نے جن میں پولینڈ اور

جرمنی کے مختلف صوبوں کی فوجیں بھی شامل ہو گئی تھیں، شہزادہ چارلس کی سرکردگی میں گران، نوہزل، اوٹن اور زبجڈین جیسے اہم اور مضبوط مقامات پر قبضہ کر لیا اور پھر بلغراد کے علاوہ ہنگری کے ان تمام قلعوں کو فتح کر لیا جن پر ترک قابض تھے، کروشیا کا صوبہ بھی جو ڈیڑھ سو برس سے سلطنت عثمانیہ کا مقبوضہ تھا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

ادھر وینس نے بوسنیا اور البانیا پر حملہ کر دیا اور موروسینی جمہوریہ کی فوجیں لے کر موریا میں داخل ہوا اور کون، توارینو، کورنٹھ، ایتھنز اور دوسرے اہم شہروں پر قبضہ کر لیا، تقریباً پورا یونان وینس کے قبضہ میں آ گیا، یونانیوں نے اس حملہ کی مدافعت میں ترکوں کو کسی قسم کی مدد نہیں دی لیکن جمہوریہ کی فتح کے بعد انہیں معلوم ہو گیا کہ اہل وینس کی حکومت ترکوں کے مقابلہ میں کتنی زیادہ سخت اور ظالمانہ ہے، لارڈ ایورس نے بھی بادل ناخواستہ اس کا اعتراف کیا ہے۔

۱۸ جون ۱۶۸۶ء کو آسٹریا کی فوجوں نے شہزادہ چارلس کے زیر قیادت بوداکا محاصرہ کر لیا، صدر اعظم سلیمان پاشا نے اسے بچانے کی کوشش کی لیکن تازہ کمک پہنچنے سے قبل شہر فتح ہو گیا، عبدی پاشا اور ترکی دستہ جو قلعہ کی مدافعت کر رہا تھا، نہایت جاں بازی کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا، یہ شہر ایک سو پینتالیس سال سے ترکوں کے قبضہ میں تھا اور اس مدت میں اس نے چھ محاصروں کا کام یابی کے ساتھ مقابلہ کیا تھا لیکن ۱۳ شوال ۱۰۹۷ھ مطابق ۲ ستمبر ۱۶۸۶ء کو یہ ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور پھر کبھی سلطنت عثمانیہ کے قبضہ میں نہ آیا۔

۳ شوال ۱۰۹۸ھ (۱۲ اگست ۱۶۸۷ء) کو موہاکز کا معرکہ پیش آیا، ایک سو ساٹھ برس پہلے اسی مقام پر سلطان سلیمان اعظم نے اہل ہنگری کو زبردست شکست دے کر ان کے نصف ملک پر قبضہ کر لیا تھا، اس مرتبہ ویسی ہی شکست ترکوں کو اٹھانی پڑی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلاوونیا اور کروشیا کے علاقے مستقل طور پر سلطنت آسٹریا میں شامل کر لیے گئے، پانی امیر

ٹرانسلوینیا نے جو دولت عثمانیہ کا باج گزار تھا، اب آسٹریا کی سیادت قبول کر لی۔

سلطان کی معزولی | ان پیہم شکستوں کی وجہ سے عثمانی فوج میں سخت برہمی پھیلی ہوئی تھی، اس کے افسروں نے متفقہ طور پر سیاوش پاشا کو اپنا سپہ سالار اعظم منتخب کیا اور صدر اعظم سلیمان پاشا کے قتل کا مطالبہ پیش کیا، سلطان نے فوج کی برہمی اور بغاوت کے آثار دیکھ کر یہ مطالبہ منظور کر لیا اور سلیمان پاشا کی جگہ سیاوش پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، سلیمان پاشا سلطان کے حکم سے قتل کر دیا گیا، امید تھی کہ اس مطالبہ کے پورا ہونے کے بعد فوج مطمئن ہو جائے گی اور قسطنطنیہ کا رخ نہ کرے گی لیکن اور نہ پہنچنے کے بعد وہ دارالسلطنت کی طرف روانہ ہوئی اور وہاں آ کر خود سلطان کی معزولی کا مطالبہ کرنے لگی، سلطنت کے بڑے بڑے عہدہ داروں نے بھی جو قسطنطنیہ میں موجود تھے، متفقہ طور پر اس مطالبہ میں فوج کا ساتھ دیا، چنانچہ مصطفیٰ کو پرلی نے جو اس وقت قائم مقام صدر اعظم تھا، علماء کی ایک مجلس منعقد کر کے سلطان کے عزل کی نسبت استفتا کیا، تمام علماء نے بغیر کسی اختلاف کے معزولی کا فتویٰ دیا، ساتھ انہوں نے اس کے بھائی سلیمان کو اس کا جانشین منتخب کیا، چنانچہ ۲ محرم ۱۰۹۹ھ مطابق ۸ نومبر ۱۶۷۷ء کو محمد رابع تخت سے اتار کر محل کے اس حصہ میں نظر بند کر دیا گیا جہاں اب تک اس نے سلیمان کو نظر بند کر رکھا تھا اور سلیمان کو وہاں سے لا کر تخت پر بیٹھایا گیا، پانچ سال بعد ۸ ربیع الثانی ۱۱۰۴ھ مطابق ۷ ابر ۱۶۹۲ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

سلطان محمد رابع کو شکار سے بہت دل چسپی تھی اور وہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ اسی میں گزارتا تھا، اس نے سلطنت کا سارا انتظام صدر اعظم کے ہاتھ میں چھوڑ رکھا تھا، سلطنت کی خوش قسمتی سے ۱۶۷۶ء تک عمان حکومت ایسے وزیروں کے ہاتھ میں تھی جو سلطان کے تمام تر اعتماد کے مستحق تھے، محمد کو پرلی اور اس کے بعد احمد کو پرلی نے دولت علیہ کی جو عظیم الشان خدمتیں انجام دیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں لیکن احمد کو پرلی کی وفات پر قرہ مصطفیٰ کے تقرر نے وہ تمام خرابیاں از سر نو پیدا کر دیں جن کو دور کرنا اس کے ممتاز پیش روؤں

کا خاص مقصد تھا، قرہ مصطفیٰ کی نااہلیت اور پھر اس کی غیر معمولی حرص و ہوس مزید تباہیوں کا باعث ہوئی، جس کا پیش خیمہ ویانا کی زبردست شکست تھی، اس شکست نے تقریباً تمام یورپ کو بیک وقت سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کر دیا، قرہ مصطفیٰ کے جانشین ابراہیم پاشا اور سلیمان پاشا نے مدافعت کی انتہائی کوششیں کیں لیکن ویانا کی شکست نے سلطنت کی قوت کو توڑ دیا تھا اور تقریباً تمام معرکوں میں ترکوں کے قدم اکھڑتے ہی گئے، ان پے درپے ہزیمتوں سے فوج میں بغاوت کے جذبات پیدا ہوئے، پہلے تو اس نے صدر اعظم سلیمان پاشاہی کو ذمہ دار قرار دے کر قتل کر دینا چاہا لیکن اس کے قتل کے بعد بھی اس کا غصہ فرو نہ ہوا اور اس نے خود سلطان کی معزولی پر اصرار شروع کیا، گو محمد رابع براہ راست ان شکستوں کا ذمہ دار نہ تھا لیکن قرہ مصطفیٰ جیسے نالائق وزیر کا تقرر صرف اسی کے انتخاب سے عمل میں آیا تھا اور یہی تقرر سلطنت کی تمام خرابیوں اور تباہ کاریوں کا سبب ثابت ہوا۔

الجزائر و تونس کی آزادی | سلطان محمد رابع کے عہد میں دولت عثمانیہ کو ایک شدید صدمہ یہ بھی پہنچا کہ الجزائر اور تونس کی حکومتیں آزاد ہو گئیں، ان حکومتوں کی آزادی کے لیے کسی خاص سنہ کی تعیین نہیں کی جاسکتی لیکن مؤرخین کو اس پر اتفاق ہے کہ یہ آزادی سترہویں صدی کے وسط میں حاصل ہوئی، اس کے اسباب اس صدی کے ابتدا ہی میں پیدا ہو گئے تھے، جب کہ حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کا تقرر ذاتی لیاقت اور تجربہ کے بجائے سفارش اور رشوت کی بنا پر کیا جانے لگا تھا اور سلطنت کے دوسرے صوبوں کے حکام کی طرح الجزائر اور تونس کے صوبہ داروں نے بھی بڑی بڑی قیمتیں ادا کر کے اپنے عہدے حاصل کرنا شروع کر دیے تھے، کچھ دنوں کے بعد الجزائر اور تونس کے مقامی فوجی دستوں نے اپنے سردار خود ہی منتخب کرنا شروع کیے، ابتداءً تو یہ انتخاب منظوری کے لیے سلطان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا وہ یا تو منتخب شدہ امیدوار کو مقرر کر دیتا تھا یا اس کے بجائے کسی دوسرے کا تقرر کر دیتا تھا، یہ شکل بھی تھوڑے ہی دنوں قائم رہی اور پھر اس انتخاب کو سلطان

کے سامنے پیش کرنے کا رواج بھی جاتا رہا، رفتہ رفتہ ان فوجی سرداروں نے جو ڈے کہلاتے تھے، حکومت کی اصلی قوت اپنے ہاتھوں میں لے لی اور بالآخر ان پاشاؤں کو برطرف کر دیا جو برائے نام صوبہ دار بنا کر قسطنطنیہ سے بھیجے جاتے تھے، اس طرح ان دونوں صوبوں نے خود مختاری حاصل کر لی، کبھی کبھی وہ باب عالی کی مدد اپنے جنگی بیڑے سے کرتے رہتے تھے لیکن دولت عثمانیہ کے محکوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ اسلامی اخوت کی بنا پر، دونوں حکومتوں کے پاس جنگی جہازوں کے مضبوط بیڑے تھے جو بحر روم میں چکر لگاتے رہتے تھے اور وہاں سے نکل کر بحر اٹلانٹک کے علاقوں پر چھاپا مارا کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ آئیس لینڈ اور اسکینڈی نیویا بھی پہنچ جاتے تھے، آئر لینڈ پر تو ان کے حملہ اکثر ہوتے رہتے تھے، سلطنت عثمانیہ سے ان حکومتوں کی آزادی کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ دوسری سلطنتیں باب عالی سے جنگ کا اعلان کیے بغیر الجزائر اور تونس کے بحری جہازوں پر حملے کرتی رہتی تھیں اور ان حملوں سے ان کے اور دولت علیہ کے باہمی تعلقات پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑتا تھا، چنانچہ ۱۶۱۷ء میں ایک فرانسیسی بیڑے نے امیر البحر بولو (Beaulieu) کی سرکردگی میں الجزائر کے بیڑے پر حملہ کر کے اس کے بہت سے جہازوں کو غرق کر دیا، اسی طرح ۱۶۲۵ء میں انگریز امیر البحر سر رچرڈ مانسل نے الجزائر پر حملہ کیا کیوں کہ گذشتہ پانچ سال کے اندر الجزائر کے جہازوں نے چار سو انگریزی تجارتی جہازوں کو گرفتار کر لیا تھا لیکن اس حملہ سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا، ۱۶۵۵ء میں ایک دوسرے انگریزی بیڑے نے جو امیر البحر بلیک کی قیادت میں تھا، تونس پر گولے برسائے اس کے جہازوں کی ایک بڑی تعداد جلا ڈالی، اس کے بعد بلیک الجزائر کی طرف بڑھا، وہاں کے ڈے نے بغیر کسی جنگ کے تمام انگریزی قیدیوں کو رہا کر دیا، ان دونوں صورتوں میں انگلستان اور دولت علیہ کے درمیان کسی جنگ کا اعلان نہیں ہوا اور نہ سلطان نے انگلستان کے اس فعل پر کوئی شکایت کی۔

۱۶۶۳ء میں انگلستان، الجزائر اور دولت علیہ کے درمیان ایک صلح نامہ مرتب ہوا

جس کی رو سے انگلستان کو یہ حق دیا گیا کہ اگر الجزائر کی طرف سے معاہدہ شکنی ہو تو انگلستان اس سے انتقام لے سکتا ہے، مگر اس سے انگلستان اور دولت علیہ کے تعلقات میں کوئی کشیدگی پیدا نہ ہوگی، چنانچہ اس عہد نامہ کے مطابق انگلستان کو بارہا الجزائر پر حملہ کرنے کا اتفاق ہوا لیکن یہ حملے پیش تر بے سود ثابت ہوئے۔

غرض سلطنت عثمانیہ سے الجزائر اور تونس کی آزادی ۱۶۵۰ء کے قریب عمل میں آئی، الجزائر نے تقریباً دو سو برس تک اپنی خود مختاری قائم رکھی لیکن ۱۸۳۰ء میں فرانس نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، تونس کی آزادی نصف صدی سے زائد تک قائم رہی، ۱۸۸۱ء میں یہ حکومت بھی سلطنت فرانس میں شامل کر لی گئی۔

نظام نئی چری میں تبدیلی | سلطان محمد رابع کے عہد میں نئی چری کے نظہم میں ایک اہم ترمیم کی تکمیل ہوئی، ابتداءً یہ فوج تمام تر ان نوجوانوں پر مشتمل ہوتی تھی جو ہر سال سلطنت کی عیسائی رعایا میں سے منتخب کیے جاتے تھے لیکن۔ سلطان مراد رابع کے وقت سے عیسائی لڑکوں کی قید اٹھا دی گئی، چونکہ یہ فوج تمام افواج عثمانی میں سب سے زیادہ معزز خیال کی جاتی تھی اور اس کے سپاہیوں کو بہت سے ملکی اور فوجی فوائد حاصل تھے، اس لیے ترکی النسل اور مسلمان امیدوار بھی نہایت شوق کے ساتھ اس میں داخل ہونے کے خواستگار ہوئے، چنانچہ قدیم دستور میں پہلے یہ ترمیم کی گئی کہ نئی چری سپاہیوں کے بچوں کو بھی اس میں داخلہ کا حق دیا گیا، تھوڑے ہی دنوں کے بعد دوسرے مسلمان امیدوار بھی لیے جانے لگے اور عیسائی رعایا سے ہر سال جو مطالبہ ہوا کرتا تھا، اس میں بہت کچھ تخفیف ہو گئی لیکن ۱۶۷۵ء سے، جو صدر اعظم احمد کو پرلی کی وزارت کا آخری سال تھا، عیسائی لڑکوں کا داخلہ بالکل بند کر دیا گیا، اس ترمیم کے مکمل ہو جانے پر نئی چری کی تعداد میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو گیا، نئی چری سپاہیوں کے بڑے بڑے دستے سلطنت کے خاص خاص شہروں میں متعین کر دیے گئے، جہاں وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ مختلف کاروبار میں مشغول ہو گئے اور

صرف جنگ کے موقعوں پر سلطنت کی دوسری فوجوں کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے، ان کی خاص راہبانہ اور فوجی زندگی کا خاتمہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔

شکار سے حد درجہ شغف ہونے کے باوجود علوم و فنون کی سرپرستی میں سلطان محمد رابع اپنے پیش روؤں سے پیچھے نہ تھا، اسے علماء کی صحبت سے خاص دل چسپی تھی، مورخین کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کرتا تھا، وہ انہیں اپنے دربار میں مامور رکھتا اور ان کی کتابوں کی تصحیح خود اپنے قلم سے کرتا تھا۔

سلیمان ثانی

۱۰۹۹ھ تا ۱۱۰۳ھ مطابق ۱۶۸۷ء تا ۱۶۹۱ء

فوج کی سرکشی | سلطان سلیمان ثانی بچپن سے محل میں نظر بند رہنے کے بعد پینتالیس سال کی عمر میں تخت سلطنت پر آیا، اس طویل نظر بندی کے باوجود اس نے اپنے پیش رو سے کہیں زیادہ تدبیر اور بیدار مغزی کا ثبوت دیا اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس کی تخت نشینی چند سال قبل عمل میں آئی ہوتی تو سلطنت کو ان تباہیوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو محمد رابع کے عہد کے آخری سالوں میں اس پر ہر طرف سے نازل ہو گئی تھیں، دولت عثمانیہ کو جو صدہ گزشتہ عہد میں پہنچ چکا تھا، اس کی تلافی فوراً ممکن نہ تھی، خصوصاً اس صورت میں کہ فوج باغی ہو رہی تھی اور پایہ تخت کے علاوہ مختلف صوبوں میں بھی سرکشی اور بغاوت کے آثار نمایاں تھے، سلیمان پاشا کا قتل اور محمد رابع کا عزل فوج ہی کی بغاوت کا نتیجہ تھا، سلیمان ثانی نے فوج کی برہمی دور کرنے اور اسے قابو میں لانے کی غرض سے تخت نشینی کے موقع پر بہت کچھ انعام و اکرام تقسیم کیا اور اس کی سرکشی پر کوئی مواخذہ نہ کیا لیکن چند ہی روز کے بعد وہ پھر باغی ہو گئی اور قسطنطنیہ میں قتل و عارت گری کا بازار گرم ہو گیا، متعدد وزراء محض ان باغیوں کی خواہش پر علاحدہ کر دیے گئے، آخر میں انہوں نے صدر اعظم سیاوش پاشا کے محل پر بھی حملہ کیا اور اسے قتل کر کے حرم میں داخل ہو گئے اور اس کی بیوی (جو سلطان محمد رابع کی بیٹی تھی) اور بہن اور دوسری خواتین کے ساتھ نہایت گستاخی کے ساتھ پیش آئے، باغیوں کے ساتھ قسطنطنیہ

کے تمام بدمعاش اور اوباش بھی شریک ہو گئے تھے، جن میں عیسائی، یہودی اور مسلمان سب ہی شامل تھے، یہاں تک کہ ان کی شورش اور لوٹ مار نے شہر کے عام باشندوں کو بھی عاجز کر دیا، آخر کار علماء کے ابھارنے پر عوام اور خود بینی چری فوج کے وہ دستے جو محض فوری جوش سے متاثر ہو کر اس ہنگامہ میں شریک ہو گئے تھے، باغیوں کی سرکوبی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور بہ مشکل ان کو قابو میں لائے اور ان کے سرداروں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا، مفتی اعظم اور تین دوسرے بڑے علماء جو اس شورش میں کسی حد تک نیچری باغیوں کے زیر اثر تھے، اپنے عہدوں سے برطرف کر دیے گئے اور ان کی جگہ زیادہ متدین اور قابل اعتماد اشخاص مقرر کیے گئے، اس طرح پایہ تخت میں تھوڑا بہت امن قائم ہو گیا، لیکن بغاوت کا خطرہ قطعی طور پر زائل نہ ہوا اور صوبوں میں شورش و سرکشی کے مظاہرے عرصہ تک جاری رہے تاہم جون ۱۶۸۸ء میں امن و امان اس حد تک قائم ہو گیا تھا کہ سلطان نے ایک فوج مرتب کر کے ہنگری کی سرحد پر روانہ کی۔

ہجوم مصائب | آسٹریا کو دولت عثمانیہ کے اس اختلال و انتشار سے فائدہ اٹھانے کا کافی موقع مل گیا تھا، اس عرصہ میں اس کی تین فوجیں شہزادہ چارلس آف لورین (Charles of Lorraine) شہزادہ لوئی آف بیڈین (Louis of Baden) اور شہزادہ یوجین آف سوائے (Eugene of Savoy) کی سرکردگی میں جو اپنے وقت میں یورپ کے ممتاز ترین جنرل تھے، سلطنت عثمانیہ کے مختلف حصوں کی طرف بڑھتی رہیں، ۱۲ دسمبر ۱۶۸۱ء کو انہوں نے قلعہ ایرلا واقع ہنگری کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا، اس کے بعد بلغراد کا راستہ کھل گیا اور انہوں نے اس کا محاصرہ شروع کیا، صرف تین ہفتہ کی گولہ باری کے بعد بلغراد کے ترک کمانڈر کی غداری سے یہ حد درجہ اہم شہر جو ہنگری کا دروازہ تھا، ۲۰ اگست ۱۶۸۱ء کو دولت عثمانیہ کے ہاتھ سے آسانی کے ساتھ نکل گیا، شہزادہ لوئی نے تقریباً اسی زمانہ میں یونینیا پر حملہ کر کے اس کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، ادھر ڈلماشیا بغاوت کر کے عثمانی حکومت سے آزاد

ہو گیا، اس کے بعد آسٹریا کی فوجوں نے نیش اور وڈین پر بھی قبضہ کر لیا اور ۱۶۸۹ء میں ہنگری کے صرف دو قلعوں تمیسوار اور وار آژدین پر ترکوں کا قبضہ باقی رہ گیا، سرویا اور بوسنیا کے نیش تر علاقے ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

سلطنت کے جنوبی حصہ میں بھی غنیم کی فتوحات کا یہی حال تھا، موروسینی نے تمام موریا فتح کر کے اس میں وینس کی حکومت قائم کر دی تھی، البتہ پولینڈ اور روس کے مقابلہ میں ترک اور ان کے حلیف تاتار کام یاب تھے، ۱۶۸۸ء میں کریمیا کی تاتاری فوج نے ایک پولش فوج کو شکست دے کر پولینڈ کے ایک بڑے حصہ کو تاراج کر ڈالا، دوسرے سال روس بھی دولت علیہ کے خلاف اتحادیوں سے مل گیا اور ایک فوج کریمیا پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی لیکن ترکوں نے روسی فوج کو مار کر بھگا یا، ترکی فتوحات کا دائرہ وہیں تک پہنچ کر ختم ہو گیا، باقی ہر طرف شکستوں ہی کا سامنا تھا اور سلطنت عثمانیہ کے قدیم مقبوضات پر دشمنوں کا قبضہ دکھائی دے رہا تھا، صوبہ جات بلقان پر آسٹریا کی فوجیں حملہ آور ہو رہی تھیں، سرویا اور بوسنیا کے بہترین حصے آسٹریا کے زیر حکومت آچکے تھے، تمام یونان اور البانیا پر جمہوریہ وینس کے نمائندہ موروسینی کا قبضہ تھا، علاوہ بریس دولت عثمانیہ کا بحری بیڑا وینس، پوپ، مبارزین مالٹا اور ڈیوک آف ٹسکنی (Duke of Tuscony) کے متحدہ بیڑوں سے شکست کھا کر بہت کچھ کم زور ہو چکا تھا۔

مصطفیٰ کو پرلیلی | مصائب کا یہ ہجوم دیکھ کر سلطان نے نومبر ۱۶۸۹ء میں ایک دیوان اور نہ میں منعقد کیا اور موجودہ صورت حال کی نسبت ارکان مجلس سے مشورہ کیا، سب نے بالاتفاق یہی رائے دی کہ کو پرلیلی زادہ مصطفیٰ پاشا صدر اعظم مقرر کیا جائے، چنانچہ احمد کو پرلیلی کے انتقال کے تیرہ سال بعد جو دولت علیہ کے لیے ہر طرح کی خرابی اور بربادی کا زمانہ تھا، خاندان کو پرلیلی کا یہ تیسرا فرد سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لیے طلب کیا گیا۔

تقرر کے وقت مصطفیٰ کو پرلیلی کی عمر باون سال کی تھی، محمد اور احمد کو پرلیلی کے

دوران وزارت میں وہ مختلف ذمہ دار عہدوں پر کام کر چکا تھا، حمان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے اس نے تمام مشاہیر سلطنت کو مدعو کر کے ایک دیوان منعقد کیا اور ان کے سامنے دولت علیہ کی زبوں حالی کا صحیح صحیح نقشہ پیش کیا، اس نے بتایا کہ اگر ہمارا یہی حال رہا تو آئندہ معرکہ میں غنیم قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے نظر آئے گا، اس کے بعد وہ حکومت کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا اور بعض ایسے محصول جو اس کے پیش روؤں نے غیر ضروری طور پر عائد کر رکھے تھے، جن سے رعایا نہایت پریشان تھی، موقوف کر دیے اور بجائے ان کے امرائے دولت اور اعیان حکومت سے جنہوں نے رعایا پر سختی کر کے خوب دولت جمع کی تھی بڑی بڑی رقمیں وصول کیں اور سلطنت کا خزانہ پر کر دیا، اس نے خود اپنے تمام تقریقی ظروف خزانہ عامرہ میں منتقل کر دیے اور اس کے دسترخوان پر صرف تانبے کے برتن نظر آتے تھے، اس طرح فوج کی فوری ضروریات کے لیے سرمایہ جمع ہو گیا، اس کے بعد اس نے فوج کے لیے نئے سپاہی بھرتی کرنا شروع کیے اور ان تمام آزمودہ کار سپاہیوں اور افسروں کو جو گذشتہ جنگوں کے بعد برطرف کر دیے گئے تھے یا پنشن پارہے تھے دوبارہ طلب کر کے اس نئی فوج کے ہر دستہ میں تقسیم کر دیا تاکہ نئے سپاہی ان کے تجربہ سے فائدہ اٹھا سکیں، اس کے سلطنت کے اہم صوبوں میں ایسے گورنر مقرر کیے جن پر اسے پورا اعتماد تھا، ترکی بحریہ کی اصلاح اور مضبوطی کے لیے بھی جو گذشتہ معرکوں میں بہت کم زور ہو گیا تھا، اس نے مختلف تدبیریں اختیار کیں اور لائق افسروں کو مقرر کیا، اس نے بہت سی تجارتی پابندیاں بھی جو نامناسب اور غیر ضروری تھیں، اٹھا دیں۔

عیسائی رعایا کے ساتھ مخصوص رعایتیں | مصطفیٰ کو پرہیلی کو تمام رعایا کی فلاح و بہبود کا بے حد خیال تھا اور وہ سب کے ساتھ یکساں عدل و انصاف کرتا تھا، اس کی عدالت میں مذہب و ملت اور رنگ و نسل کی کوئی تمیز نہ تھی، اس عموم میں سلطنت کی عیسائی رعایا کو ایک خاص خصوص حاصل تھا، مصطفیٰ پاشا ان کے ساتھ خاص رعایتیں کرتا تھا، وہ دیکھتا تھا کہ

جو مسیحی حکومتیں ترکی پر حملہ آور ہو رہی ہیں انہیں دولت عثمانیہ کی عیسائی رعایا سے بہت کچھ مدد مل رہی ہے، چنانچہ البانیا کی عیسائی رعایا ونیس کی فوجوں میں شامل ہو رہی تھی اور سرویا کے باشندے شہنشاہ آسٹریا کی مدد کے لیے تیار تھے، یونان میں موروسینی کی کام یابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے عیسائیوں نے حملہ آوروں کا استقبال کیا اور ان کے لیے ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں، ان واقعات کو دیکھ کر مصطفیٰ پاشا نے عیسائیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی خاص طور پر کوشش کی، چنانچہ اس نے اپنے تقرر کے بعد فوراً ہی تمام پاشاؤں کے نام احکام جاری کیے کہ عیسائی رعایا پر کسی قسم کی سختی نہ کی جائے اور ان کو پوری مذہبی آزادی عطا کی جائے، ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس نے سخت سزائیں دینا شروع کیں، عیسائی رعایا پر مختلف محصول عائد تھے، اس نے جزیہ کے علاوہ تمام محصول معاف کر دیے، جزیہ کی بھی آمدنی کے لحاظ سے تین قسمیں کر دیں، طبقہ امراء پر چار و دوکات فی شخص مقرر کیے، متوسط درجہ کے لوگوں پر دو و دوکات اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں پر ایک و دوکات پہلے عیسائی رعایا کو صرف اپنے قدیم کنیسوں کی مرمت کا حق حاصل تھا وہ کوئی نیا کنیسہ تعمیر نہیں کر سکتے تھے، مصطفیٰ پاشا نے یہ پابندی اٹھادی اور انہیں جدید کنیسوں کی تعمیر کا حق بھی دے دیا، چنانچہ اس کے دور وزارت میں بہت سے نئے کنیسے تعمیر کیے گئے، ان تمام رعایتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی رعایا میں دولت علیہ کے ساتھ ایک عام ہمدردی پیدا ہو گئی، خصوصاً ان عیسائیوں میں جو کلیسائے یونان کے پیرو تھے کیوں کہ مغرب کی عیسائی حکومت جو کلیسائے رومہ کی تتبع تھیں ان پر قابو پانے کے بعد نہایت ظالمانہ برتاؤ کرتی تھیں اور انہیں بہ جبر اپنے مذہب کا پیرو بنانا چاہتی تھیں، چنانچہ یونان کے عیسائیوں کو موروسینی کی حکومت کا ایسا ہی تلخ تجربہ ہوا اور انہوں نے ان کی تعدیوں سے عاجز آ کر بغاوت کر دی، مصطفیٰ کو پر ملی نے لائبریس (Liberuez) نامی ایک یونانی کو جو سات سال سے ترکوں کی قید میں تھا، آزاد کر کے ایک ترکی فوج کے ساتھ موریا روانہ کیا، باغیوں نے اس

فوج کی مدد سے اہل ونبس کو اپنے ملک سے نکال کر باہر کیا اور پھر بہ طیب خاطر دولت علیہ کی حمایت میں آگئے، کیوں کہ یہ ان کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتی تھی۔

مصطفیٰ کو پر پیلی کا طرز زندگی نہایت سادہ تھا اور نمود و نمائش سے اسے بالطبع نفرت تھی، ضروری باتوں کے علاوہ وہ گفتگو نہ کرتا تھا، اس کے متعلق مشہور تھا کہ نہ اس نے کبھی کوئی جرم کیا اور نہ کوئی غیر ضروری لفظ استعمال کیا، بڑائیوں میں دوسرے سپاہیوں کے ساتھ وہ عام طور پر پیدل ہی کوچ کرتا تھا، اس کا خیمہ اپنی سادگی اور بے تکلفی میں ممتاز رہتا تھا، مطالعہ سے اسے خاص ذوق تھا اور اس سے کبھی نہ تھکتا، حتیٰ کہ دوران جنگ میں بھی جب وہ اپنے خیمہ میں واپس آتا تو کتابیں دیکھا کرتا تھا، اس کے اوصاف حمیدہ کی بنا پر لوگ اسے ”کو پر پیلی صالح“ کے لقب سے پکارتے تھے۔

مقدونیا کی فتح | مصطفیٰ کو پر پیلی کے تقرر کے وقت آسٹریا کی فوجیں مقدونیا تک پہنچ گئی تھیں اور وہاں کے عیسائی باشندے اپنے بطریق کی قیادت میں ان کو مدد پہنچا رہے تھے، ایک عیسائی سردار کارپوس (Karpos) نے آسٹریا کی سرپرستی میں آزادی کا اعلان کر کے کرال (Karal) کا قدیم لقب بھی اختیار کر لیا تھا، چنانچہ اب سلطنت عثمانیہ کے یورپین مقبوضات کے قلب پر حملہ شروع ہو گیا تھا، ان حالات میں کو پر پیلی نے ایک مجلس جنگ منعقد کی، جس میں سلیم گرائی، خان کریمیا اور ہنگرین سردار تکلی بھی حاضر تھا اور مجلس کا فیصلہ حاصل کرنے کے بعد خالد پاشا سرعسکر موریا کی سرکردگی اور سلیم گرائی کی معیت میں ایک فوج مقدونیا کو روانہ کی، ترکی اور تاتاری فوجوں نے جرمی، آسٹریا اور البانیا کی متحدہ فوجوں کو دو معرکوں میں شکست دی اور کارپوس کو گرفتار کر کے قتل کر دیا، مقدونیا اور اس کے نواح کے وہ تمام اہم مقامات جن پر آسٹریا کی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا، ترکوں نے واپس لے لیے۔

مزید عثمانی فتوحات | مقدونیا کی فتوحات کے بعد کو پر پیلی نے دوسرے حصوں کے

تحفظ کا سامان شروع کیا اور اگست ۱۶۹۰ء میں ایک زبردست فوج کے ساتھ بلغاریا اور سرویا سے ہوتا ہوا آسٹریں فوجوں کے مقابلہ کے لیے بڑھا، صوفیا اور نیش کے درمیان ڈراگومان کے مقام پر دو روز تک سخت معرکہ رہا، جس میں بالآخر آسٹریں فوجوں کو سخت شکست ہوئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں، اس کے بعد مصطفیٰ کو پرلی نے نیش کا محاصرہ کر لیا اور صرف تین ہفتہ میں اسے فتح کر لیا، ادھر ٹرانسلوینیا میں تکلیبی نے جسے ترکوں کی حمایت حاصل تھی، تخت پر قبضہ کر کے دولت عثمانیہ کی سیادت کا اعلان کر دیا، نیش کو فتح کرنے کے بعد کو پرلی سمندریا کی طرف بڑھا اور چار ہی روز میں اسے بھی فتح کر کے ودین پر دوبارہ قبضہ کر لیا، ودین کی فتح کے بعد اس نے بلغراد کا محاصرہ کیا اور محاصرہ کے بارہویں روز عثمانی لشکر قلعہ میں داخل ہو گیا، اس اہم شہر میں ایک فوجی دستہ متعین کرنے کے بعد اور سرویا سے آسٹریں فوجوں کو نکال کر مصطفیٰ کو پرلی فاتح کی حیثیت سے قسطنطنیہ کو واپس ہوا، دارالسلطنت میں اس کا استقبال بڑے جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا۔

سلیمان کی وفات | ۱۰ مئی ۱۶۹۱ء کو مصطفیٰ کو پرلی ایک تازہ لشکر کے ساتھ پھر آسٹریا کے مقابلہ میں روانہ ہوا لیکن اس جنگ کے ختم ہونے سے قبل ہی سلطان سلیمان ثانی کا انتقال ہو گیا۔

احمد ثانی

۱۱۰۲ھ تا ۱۱۰۶ھ مطابق ۱۶۹۱ء تا ۱۶۹۵ء

سلطان سلیمان ثانی کی وفات پر اس کا بھائی احمد ثانی ۱۳ جولائی ۱۶۹۱ء کو تخت نشین ہوا، اس نے مصطفیٰ کو پریمی کو صدر اعظم کے عہدہ پر برقرار رکھا اور سلطنت کے تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں چھوڑ دیے، کوپرلی نے عثمانی فوجیں بلغراد میں جمع کیں اور وہاں سے آسٹریا کی شاہی فوجوں کے مقابلہ کے لیے دریائے ڈینیوب کے دائیں ساحل سے ہوتا ہوا شمال کی طرف بڑھا، ۱۹ اگست ۱۶۹۱ء کو سلانکیمان (Salankeman) کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، ساتھ ہی عیسائی اور ترکی بیڑوں میں بھی دریائے ڈینیوب میں چھڑائی، ترکی بیڑے نے عیسائی بیڑے کو شکست دی لیکن اس فتح سے ترک فائدہ نہ اٹھا سکے کیوں کہ بری جنگ میں انہیں سخت ہزیمت ہوئی، مصطفیٰ کوپرلی نے اپنے آزمودہ کار رفقاء کے مشورہ کے خلاف کمک کا انتظار کیے بغیر آسٹریا فوج پر حملہ کر دیا، جب اس نے دیکھا کہ ترکوں کے قدم اکھڑ رہے ہیں تو خود تلوار لے کر عیسائی فوج کے قلب میں گھس گیا اور تیغ زنی کے جوہر دکھاتا ہوا مارا گیا، عثمانی فوجیں اس کی شہادت کے بعد میدان جنگ میں ٹھہرنے لگیں اور بھاگ کھڑی ہوئیں، اس کے بعد آسٹریا کی ایک فوج نے ٹرانسلوینیا پر حملہ کیا اور تکلیبی کو وہاں سے نکال کر اس علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

احمد ثانی کی بقیہ مدت سلطنت میں جنگ کا سلسلہ کم و بیش برابر جاری رہا لیکن یہ

تمام لڑائیاں چھوٹی چھوٹی تھیں اور ان کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، البتہ جمہوریہ وینس سے جو لڑائی ہوئی اس نے جزیرہ سافز سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل گیا، ان شکستوں اور اندرونی بغاوتوں کے علاوہ اس عہد میں وبا اور قحط کے بھی کئی حملے ہوئے، سمرنا میں ایک بڑا زلزلہ آیا جس سے بہت نقصان پہنچا اور پھر ستمبر ۱۵۳۱ء میں خود قسطنطنیہ میں ایک زبردست آگ لگی جو اس زلزلہ سے بہت زیادہ برباد کن ثابت ہوئی۔

۲۲ جمادی الثانی ۱۱۰۶ھ (۶ فروری ۱۶۹۵ء) کو احمد ثانی نے انتقال کیا۔

مصطفیٰ ثانی

۱۱۰۶ھ تا ۱۱۱۵ھ مطابق ۱۶۹۵ء تا ۱۷۰۳ء

احمد ثانی کی وفات پر معزول سلطان محمد رابع کالز کا شہزادہ مصطفیٰ تخت نشین ہوا، یہ نہایت شجاع اور اولوالعزم فرماں روا تھا، تخت نشینی کے تیسرے ہی روز اس نے ایک ”مخط شریف“ جاری کیا جس میں سلطنت کے افسوس ناک حالات بیان کر کے انہیں اپنے پیش روؤں کی غفلت اور عیش پسندی کا نتیجہ قرار دیا اور ان کی اصلاح کے لیے پوری آمادگی اور مستعدی ظاہر کی، اس وقت آسٹریا، روس، وینس اور پولینڈ سے لڑائی کا سلسلہ کم و بیش جاری تھا، مگر سب سے زیادہ خطرہ آسٹریا کی طرف سے تھا، چنانچہ مصطفیٰ نے دیوان منعقد کر کے اعیان حکومت سے یہ دریافت کیا کہ غنیم کے مقابلہ میں فوجوں کا روانہ کر دینا کافی ہوگا یا اسے خود بھی فوج کے ساتھ میدان جنگ میں جانا چاہیے، تین دن تک غور و مشورہ کرنے کے بعد دیوان اس فیصلہ پر پہنچا کہ میدان جنگ میں سلطان کا جانا نہ صرف اس کی ذات کو خطرہ میں ڈالتا ہے بلکہ اس سے لشکر کے اخراجات میں بھی بہت اضافہ ہو جائے گا، چنانچہ دیوان نے متفقہ طور پر یہ گزارش کی کہ ذات سلطانی کو جنگ کے خطرات میں ڈالنا مناسب نہیں، فوج کی کمان صدر اعظم کو سپرد کر دینا کافی ہوگا لیکن سلطان نے اس معروضہ کا صرف اس قدر جواب دیا کہ ”مجھے فوج کے ساتھ جانے پر اصرار ہے“ چنانچہ اس عزم کے مطابق ۱۶۹۵ء کے موسم گرما میں وہ بلغراد سے تھیسوار کو روانہ ہوا اور راستہ میں متعدد اہم قلعے جو

آسٹریا کے قبضہ میں جا چکے تھے، دوبارہ فتح کر لیے، ۲۲ ستمبر ۱۶۹۵ء کو آسٹریا کی فوج جو وٹیرانی (Veterani) کے زیرِ کمان تھی، لیوگوس کے قریب مقابلہ ہوا، سلطان کو شان دار فتح ہوئی اور وٹیرانی اور اس کی نصف فوج ماری گئی۔

جنگ کی تیاری | موسم سرما میں جنگ ملتوی ہو گئی، اس فرصت میں مصطفیٰ اپنے وزراء کی مدد سے مالیات کی درستگی اور فوج کے اضافہ و تنظیم میں ہمہ تن مصروف رہا، اس نے تمباکو، حبشی خواجہ سرا اور دیگر تعیشات پر بڑے بڑے ٹیکس عائد کیے، اکثر عمائدین سلطنت نے بھی وقت کی ضرورت اور سلطان کے جوش سے متاثر ہو کر سلطنت کی مدد میں سرگرمی دکھائی اور آئندہ جنگ کے لیے فوجیں اکٹھا کیں، جن کے مصارف انہوں نے خود برداشت کیے، مصطفیٰ نے قسطنطنیہ اور اورنہ کے شاہی باغبانوں (بوستانچی) میں سے تین ہزار پیدل سپاہیوں کی ایک فوج مرتب کی، جسے اس موقع پر اس نے تین رسالوں میں تقسیم کر کے خاص اہتمام سے تعلیم دلوائی۔

ابتدائی فتوحات | ۱۶۹۶ء میں مصطفیٰ ایک زبردست فوج کے ساتھ پھر آگے بڑھا اور تھیمیسوار کے قریب آسٹرین فوج کو جو ڈیوک ڈی ساکس (Duke Desaxe) کی سرکردگی میں تھی، شکست دے کر تھیمیسوار کو غنیم کے محاصرہ سے چھڑا لیا، اس کے بعد ہنگری کے ان قلعوں کو جو ابھی دولت عثمانیہ کے قبضہ میں تھے، مزید فوجی دستوں سے مستحکم کر کے اورنہ واپس آ گیا، ان فتوحات سے ترکوں کی ہمتیں بڑھ گئیں اور ان میں ایک تازہ جوش پیدا ہو گیا، عثمانی فوجوں نے جو ایک عرصہ سے مدافعانہ جنگ میں پسپا ہوتی آرہی تھیں، اب فاتحانہ طور پر دشمن کے مقابلہ میں بڑھنا شروع کیا اور توقع کی جانے لگی کہ مصطفیٰ تانی کے مبارک عہد میں پچھلے عہدوں کی تلافی ہو جائے گی لیکن دوسرے سال ۱۶۹۷ء میں آسٹریا کے ساتھ جو معرکہ پیش آیا اس نے تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا اور سلطنت عثمانیہ کی ہیبت بالآخر یورپ کے دل سے نکل گئی۔

زنیتا کی شکست | ۱۶۹۷ء میں مصطفیٰ ایک تازہ فوج کے ساتھ بلغراد سے روانہ ہو کر

ہنگری میں داخل ہوا اور شمال میں دریائے تھائیس کی طرف بڑھا، آسٹریا کی فوجیں اس وقت شہزادہ یوجین (Eugene) کے زیرِ کمان تھیں، جو اپنے عہد کا سب سے زیادہ مشہور جنرل تھا، ۱۱ ستمبر کو دونوں فوجوں کا مقابلہ لب ساحل زنتا (Zenta) کے مقام پر ہوا، ترکوں نے وہاں ایک پل بنا لیا تھا اور سلطان اپنے سواروں اور توپ خانہ کے بڑے حصہ کے ساتھ دریا کو عبور کر کے اس کے دوسرے کنارہ پر پہنچ چکا تھا لیکن پیدل سپاہی ابھی اسی کنارہ پر تھے، شہزادہ یوجین دفعۃً ان کے سر پر آپہنچا اور ان سپاہیوں پر جو اس وقت تک دریا عبور نہ کر سکے تھے، حملہ کر دیا، بد قسمتی سے ترکی فوج کے مختلف دستے اس وقت باہمی جھگڑوں میں مبتلا تھے، افسروں میں بھی اختلافات تھے اور ان میں سے بعض صدر اعظم الماس محمد پاشا سے بغض و عداوت رکھتے تھے، میدان جنگ ہی میں یینی چری کی ایک بڑی تعداد نے بغاوت کر دی اور خود اپنے افسروں کو قتل کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ترک شہزادہ یوجین کے حملہ کی تاب نہ لا سکے اور انہیں بری طرح شکست ہوئی، ان کے چھبیس ہزار آدمی میدان جنگ میں مارے گئے اور دس ہزار دریا عبور کرنے کی کوشش میں غرق ہو کر ہلاک ہو گئے، ان کے علاوہ صدر اعظم، چار وزیر اور بہت سے فوجی افسر کام آئے، سلطان جو دریا کے دوسرے کنارہ سے اس جنگ کو دیکھ رہا تھا، بھاگ کر میسوار پہنچا اور وہاں سے بلغراد ہوتا ہوا قسطنطنیہ واپس آ گیا، اس کے بعد اس کی بقیہ فوج بھی بلغراد سے ہو کر اور نہ چلی آئی، اس کے بعد شہزادہ یوجین دریائے ڈینوب کو عبور کر کے بوسنیا میں داخل ہوا اور اس کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، زنتا کی شکست ترکوں کی فوجی طاقت کے زوال کا ایک ایسا اعلان تھی جس کی آواز یورپ کے دور دراز گوشوں میں بھی جا پہنچی اور مغربی سلطنتیں اب اپنے کو عثمانی حملوں سے بالکل محفوظ خیال کرنے لگیں۔

حسین کو پریلی | جنگ زنتا کے چھ روز بعد سلطان مصطفیٰ ثانی پھر خاندان کو پریلی کی طرف متوجہ ہوا اور سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لیے اسی خاندان کے ایک فرد حسین

کو پرلی کو صدر اعظم مقرر کیا، حسین کو پرلی صدر اعظم محمد کو پرلی کا بھتیجا تھا اور اس میں انتظام سلطنت کا وہ غیر معمولی ملکہ جو کو پرلی خاندان کا نمایاں امتیاز تھا، بہت زیادہ پایا جاتا تھا، محاصرہ ویانا کی ناکامی تک حسین کو پرلی ایک آزاد مزاج نوجوان تھا اور محض عیش و عشرت سے سروکار رکھتا تھا لیکن ویانا کی عبرت ناک شکست کے بعد اس نے اپنے قومی فرض کو محسوس کیا اور اللہ تعالیٰ نے جو استعداد عطا فرمائی تھی اسے دولت علیہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا، صدر اعظم کے عہدہ پر فائز ہونے سے پیش تر وہ مختلف اعلیٰ عہدوں پر کام کر چکا تھا، اور اپنی لیاقت و اہلیت کا ثبوت دے چکا تھا، ۱۶۹۷ء میں صدر اعظم مقرر ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے سلطنت کی فوجی قوت کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں مالیات کی طرف خاص توجہ کی، گذشتہ جنگ میں خزانہ پر بہت زیادہ بار پڑ چکا تھا، اس کی تلافی کے لیے اس نے مختلف تدبیریں اختیار کیں، مثلاً پہلے کافی پر محصول لگایا، پھر حکومت کے تمام بڑے بڑے عہدہ داروں پر ایک قسم کا انکم ٹیکس عائد کیا اور آخر میں جائیداد موثوقہ کی آمدنی سے بھی دولت علیہ کی شدید ضروریات کے لیے ایک بڑی رقم حاصل کی، اس طرح اس نے کافی سرمایہ فراہم کر کے سلطنت کے یورپین صوبوں کی حفاظت کے لیے پچاس ہزار پیادوں اور اڑتالیس ہزار سواروں کی ایک فوج تیار کر لی، اس کے علاوہ اس نے ایک بیڑا بحر اسود میں بھیجا اور دوسرا بحر روم میں لیکن دراصل تمام تیاریاں اس نے مدافعت کے لیے کی تھیں اور ان سے کوئی جارحانہ اقدام مقصود نہ تھا کیوں کہ وہ سلطنت کی کم زوری سے خوب واقف تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر جنگ پھر شروع ہو گئی تو اس کا نتیجہ سلطنت کے حق میں مزید تباہیوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا، بہر حال ان تیاریوں کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ آسٹریا کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور ترکی فوج کے سپہ سالار وان طہان پاشا نے شہزادہ یوحین کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا یہاں تک کہ اس نے بوسنیا کو خالی کر دیا۔

سقوطِ ازف | اس درمیان میں وینس سے جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہا، اس کی فوجیں

ڈلماشیا میں آگے بڑھتی جا رہی تھیں، یونان میں اہل وینس کے قدم خاکتائے کورنٹھ سے آگے پہنچ چکے تھے، اگرچہ نگر و پونٹ پر وہ قبضہ نہ کر سکے اور ترکی امیر البحر نے ان کے بیڑوں کو دوبارہ شکست دے کر جزیرہ کیوس (Chios) کو واپس لے لیا، پولینڈ سے گو اس وقت کوگی جنگ نہ تھی لیکن خان کریمیا کے حملے کو ابھی دو ہی سال گزرے تھے اور اہل پولینڈ دولت علیہ کے خلاف ہر ممکن موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لیکن سب سے بڑا خطرہ روس کا تھا، پیٹر اعظم اپنی وسیع سلطنت کو روز بہ روز زیادہ طاقت ور بنا رہا تھا، اس نے آسٹریوی اور فرانسیسی فوجوں کے نمونہ پر ایک مضبوط فوج تیار کر لی تھی لیکن اصلی زور وہ بحری طاقت پر دے رہا تھا، کیوں کہ وہ بحر اسود میں اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا، اسی مقصد کے لیے وہ دولت عثمانیہ کے خلاف پوری قوت سے جنگ کرنا چاہتا تھا، سب سے پہلے اس نے اذف پر قبضہ کرنا چاہا اور ۱۶۹۵ء میں ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا، یہ محاصرہ ناکام رہا اور تیس ہزار سپاہیوں کی لاشیں میدان میں چھوڑ کر اسے پسپا ہونا پڑا لیکن دوسرے سال اس نے پھر تازہ فوجوں کے ساتھ شہر کا محاصرہ کیا اور اس کے بحری بیڑے نے ترکی بیڑے کو شکست دی، اب کی بار محاصرہ کامیاب رہا اور ۲۸ جولائی ۱۶۹۶ء کو اذف نے ہتھیار ڈال دیے۔

صلح نامہ کالووٹز | غرض زنتا کی شکست کے وقت دولت علیہ ہر طرف سے دشمنوں سے گھری ہوئی تھی اور حسین کو پریلی کے حسن انتظام کے باوجود اس میں بیک وقت تمام دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہ تھی، حسین کو پریلی اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھا، چنانچہ جب سفیر برطانیہ لارڈ پیجٹ (Lord Paget) نے برطانیہ اور ہالینڈ کی وساطت سے صلح کی تحریک شروع اور شرط صلح یہ قرار دی کہ ہر فریق کا قبضہ اس کی فتوحات پر قائم رکھا جائے تو حسین کو پریلی نے ایک دیوان منعقد کر کے اس مسئلہ کو ارکان حکومت کے مشورہ کے لیے پیش کیا، ذاتی طور پر وہ صلح کا حامی تھا اور اسی کی تحریک سے دیوان نے بھی برطانیہ اور ہالینڈ کی وساطت منظور کی مگر صلح کا مذکورہ بالا اصول سلطان مصطفیٰ کے لیے کسی طرح قابل

قبول نہ تھا اور اس نے اس کی منظوری چند اہم تر سمیات پر مشروط کر دی، بالآخر یہ طے پایا کہ صلح کا مسئلہ ایک کانگریس کے سپرد کر دیا جائے، جس میں دولت عثمانیہ، آسٹریا، روس، پولینڈ، وینس، برطانیہ اور ہالینڈ کے نمائندے شریک ہوں، اس کانگریس کے لیے کارٹوونز کے مقام تجویز ہوا، جو پیٹروارڈین کے قریب واقع تھا، ابتداءً روس کانگریس کی شرکت سے انکار کرتا رہا، کیوں کہ اور وہ ازف کے علاوہ اور مقامات پر بھی قبضہ کرنے کا خواہش مند تھا اور یہ لارڈ ہچٹ کے پیش کردہ اصول کی بنا پر ممکن نہ تھا لیکن دوسری سلطنتوں نے مجبور کر کے اسے بھی کانگریس میں شریک کیا، بہتر روز کے بحث و مباحثہ کے بعد فی الجملہ لارڈ ہچٹ کے اصول کے مطابق ایک صلح نامہ ۲۴ رجب ۱۱۱۰ھ (۲۶ جنوری ۱۶۹۹ء) کو مرتب کیا گیا، جو صلح نامہ کارلووٹز (Carlowitz) کے نام سے مشہور ہے، اس کے رو سے آسٹریا کا قبضہ ٹرانسلوینیا، سلاوینیا اور ہنگری کے ان تمام علاقوں پر جو دریائے مروش کے شمال اور دریائے تھائیس کے مغرب میں واقع تھے قائم رکھا گیا، اب ہنگری میں عثمانیوں کے سابق مقبوضات میں سے صرف ایک ٹکٹ پر ان کی حکومت باقی رہ گئی، آئندہ کے لیے وہ خراج بھی موقوف کر دیا گیا، جو شہنشاہ آسٹریا، ہنگری اور ٹرانسلوینیا کی طرف سے سلطان کی خدمت میں پیش کرتا تھا، وینس کا قبضہ موریا اور البانیا پر باقی رکھا گیا لیکن آبنائے کورنٹھ کے شمال میں جو مقامات اس نے فتح کیے تھے، وہ لارڈ ہچٹ کے اصول کے باوجود دولت عثمانیہ کو واپس دلادے گئے، البتہ جزیرہ زنت کا خراج اسے معاف کر دیا گیا، پولینڈ کو پوڈولیا اور کابینک واپس مل گئے، روس کا قبضہ شہر ازف اور بحر ازف کے شمالی علاقوں پر قائم رکھا گیا، پیٹرا عظیم کو اس سے سیری نہ ہوئی اور اس نے صرف دو سال کے لیے اس صلح نامہ پر دستخط کیے، دوسری حکومتوں نے پچیس سال کے لیے صلح کا معاہدہ کیا۔

صلح نامہ کارلووٹز کی نسبت کرلیسی آل عثمان کے مشہور جرمن مؤرخ فان ہیمر کی رائے نقل کرتا ہے کہ یہ صلح نامہ نہ صرف اس وجہ سے یادگار ہے گا کہ اس نے اہم ٹکلی

تبدیلیوں کو برقرار رکھا اور نہ محض اس وجہ سے کہ اس کے بعد ہی سلطنت عثمانیہ کی فاتحانہ طاقت کا رعب دلوں سے زائل ہو گیا، بلکہ اس وجہ سے بھی یادگار رہے گا کہ اس موقع پر باب عالی اور روس نے پہلی بار ایک عام یورپین کانگریس میں شرکت کی اور اس کانگریس میں برطانیہ اور ہالینڈ کے نمائندوں کو داخل کر کے جب کہ ان دونوں میں سے کوئی حکومت بھی جنگ میں شریک نہ تھی، سلطان اور زرروس دونوں نے اس اصول کو تسلیم کر لیا کہ مفاد عامہ کے لیے یورپ کی حکومتیں دوسری سلطنتوں کے باہمی نزاعات میں دخل دے سکتی ہے۔

ملکی اصلاحات | صلح نامہ کارلووٹز کے نکلنے کے بعد حسین کو پرلیلی نے سلطنت کے اندرونی معاملات کی جانب توجہ کی، گذشتہ جنگ کے آخری سالوں میں کریمیا، مصر اور عرب میں بغاوت شروع ہو گئی تھی، ایران کی سرحد پر بھی بہت شورش تھی، حسین کو پرلیلی نے ان تمام بغاوتوں کا استیصال کر کے سلطنت کے ہر حصہ میں امن و امان قائم کیا، اس کے بعد اس نے حکومت کے ہر شعبہ کی اصلاح شروع کی، چنانچہ فوج، بحریہ، مالیات، مدارس و جوامع، اوقاف، تمام شعبوں میں اصلاحات جاری کیں، بحریہ کے لیے اس نے ایک جدید ”قانون نامہ“ مرتب کیا، کو پرلیلی کو عیسائی رعایا کی بہبودی کا خاص طور پر خیال رہتا تھا اور وہ ان کے ساتھ بڑی رعایتیں کرتا تھا، چنانچہ اس نے بوسینا اور نبات کے عیسائیوں کا ایک سال کا جزیہ معاف کر دیا اور روسیلیا کے عیسائی رعایا کے ذمہ جو محصول باقی تھا، اسے بھی چھوڑ دیا، اس نے مسجدیں، مدرسے، بازار اور چھاؤنیاں سلطنت کے ہر حصہ میں بہت کثرت سے تعمیر کرائیں لیکن ان تمام خدمات کے باوجود بعض دشمنوں نے اس کے خلاف سلطان کے کان بھرنا شروع کیے، یہ دیکھ کر حسین کو پرلیلی نے ستمبر ۱۷۹۲ء میں اپنے عہدہ سے استعفادے دیا، چند ہی دنوں کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

دال طبان پاشا | حسین کو پرلیلی کی وفات پر سلطان نے دال طبان پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، وہ ایک جنگ جو سپاہی تھا اور جنگ کے علاوہ کسی اور بات سے دل چسپی نہ رکھتا تھا،

اس نے معاہدہ کارلوونو کچاک کر ڈالنا چاہا لیکن رعایا اور فوج دونوں اس کی پالیسی کو سلطنت کے لیے مضر خیال کرتے تھے اور دونوں نے مل کر سلطان سے اس کی معزولی کی درخواست کی، مفتی فیض اللہ بھی جو ابتداءً اس کا طرف دار تھا، بعد میں سخت مخالف ہو گیا اور اسی کی کوشش سے دال طہان پاشا معزول کر دیا گیا۔

مصطفیٰ کی معزولی | دال طہان پاشا کے بعد رومی محمد پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، وہ حسین کو پریلی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے ان مفاسد کی اصلاح شروع کی جو کو پریلی کے بعد پھر سلطنت میں رونما ہونے لگے تھے، اس سلسلہ میں بہت سے لوگ جن کو نقصان پہنچ رہا تھا، اس کے مخالف ہو گئے اور اس کے خلاف سازشیں کرنے لگے، چونکہ وہ کوئی ممتاز فوجی افسر نہ تھا، اس لیے نئی چری بھی اس سے خوش نہ تھے اور بعض مفسدوں کے ابھارنے پر انہوں نے سلطان سے اس کی معزولی کا مطالبہ کیا، اس مطالبہ نے جنوری ۱۷۰۳ء میں بغاوت کی شکل اختیار کر لی اور قسطنطنیہ نئی چری کی شورشوں کا مرکز بن گیا، فوج نے رومی محمد پاشا کے علاوہ مفتی فیض اللہ کی معزولی کا بھی مطالبہ کیا، سلطان اس وقت اور نہ میں تھا، اس نے مفتی فیض اللہ کو تو معزول کر دیا لیکن رومی محمد پاشا کا معاملہ اپنے قسطنطنیہ پہنچنے تک ملتوی رکھا، باغیوں نے اب خود سلطان کے عزل کی تحریک کی اور علماء سے اس کے متعلق فتویٰ حاصل کر لیا، سلطان نے اپنا خاص نئی چری دستہ باغیوں کے مقابلہ میں روانہ کیا لیکن دستہ بھی ان ہی میں شامل ہو گیا، یہ دیکھ کر مصطفیٰ ۲ رجب الاول ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) کو تخت سے اتر آیا اور باغیوں نے اس کے بھائی احمد کو تخت پر بیٹھایا، اسی سال ۲۲ شعبان (۳۱ دسمبر ۱۷۰۳ء) کو مصطفیٰ کا انتقال ہو گیا۔

سلطان مصطفیٰ ثانی ایک دانش مند اور بیدار مغز سلطان تھا، ابتدائے عہد میں اس نے بڑی ہمت اور شجاعت کا ثبوت دیا اور متعدد اہم فتوحات حاصل کیں لیکن زنتا کی شکست کے بعد سلطان کی فوجی قوت اتنی کم زور ہو گئی تھی کہ آسٹریا سے کام یاب مقابلہ کرنا ممکن نہ

تھا، ایسی حالت میں صلح کے لیے راضی ہو جانا مصلحت و وقت کے عین مطابق تھا، بعض یورپین مورخین مصطفیٰ پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ معاہدہ کارلوونز کے بعد اس کی جنگی سرگرمیاں بالکل موقوف ہو گئیں اور وہ عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا لیکن واقع یہ ہے کہ سلطنت میں جنگ کی طاقت نہ تھی، علاوہ بریں ہر طرف بغاوت برپا تھی، جس کا استیصال نہایت ضروری تھا، نیز حکومت کے تمام شعبے اصلاح کے محتاج تھے، مصطفیٰ نے ان ہی امور کی طرف اپنی توجہ رکھی اور صدر اعظم حسین کو پرہیزی کی مدد سے ان ہی کا تامل کیا، جب وہ ان اصلاحات سے فارغ ہوا تو دال طہان پاشا اور رومی محمد پاشا کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے اور ان کے بعد ہی فوج نے خود اس کی معزولی کا فیصلہ کیا، ان حالات میں اس نے جو کچھ سلطنت کے لیے کیا اس سے زیادہ ممکن بھی نہ تھا۔

احمد ثالث

۱۱۱۵ھ تا ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۰۳ء تا ۱۷۳۰ء

سلطان احمد ثالث کی تخت نشینی بنی چری کی بغاوت کا نتیجہ تھی، اس لیے تخت پر آنے کے بعد اس نے بہت کچھ انعام و اکرام دے کر باغیوں کو راضی کیا اور ان کے مطالبہ پر مفتی فیض اللہ آفندی کے قتل کی اجازت دے دی، مفتی موصوف کا جرم یہ تھا کہ وہ اس فوج کی خود سری کے مخالف تھے لیکن یہ خون جلد رنگ لایا اور سلطان نے قابو پانے کے بعد بنی چری سے پورا قصاص لیا اور ان کے بہت سے افسروں کو قتل کر دیا، اس نے احمد پاشا صدر اعظم کو جو باغیوں کا منتخب کردہ تھا، معزول کر دیا اور اس عہدہ پر اپنے بہنوئی داماد حسن پاشا کو مامور کیا لیکن سازشوں نے حسن پاشا کی صدارت کو بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہنے دیا اور وہ بھی معزول کر دیا گیا، اس کے بعد متعدد اشخاص صدر اعظم مقرر ہوئے اور تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد علاحدہ کر دیے گئے، چنانچہ اس عہد کے ابتدائی پندرہ سالوں میں بارہ صدر اعظم یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ پیٹر اعظم کی خارجی پالیسی کی طرف جیسی توجہ کرنی چاہیے تھی، دولت علیہ نہ کر سکی اور روس کی طاقت بڑھتی ہی چلی گئی۔

روس سے جدید معاہدہ | ۱۷۰۰ء میں روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان جو معاہدہ تھا، پیٹر اس پر دیانت داری کے ساتھ قائم نہ تھا، وہ اپنی مملکت کے جنوبی صوبوں میں جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا، احمد ثالث نے تخت نشینی کے بعد پیٹر کو اس امر کی شکایت لکھ بھیجی لیکن

سلطنت کے اندرونی اختلال کی وجہ سے جوینی چچی کی سرکشی کے باعث شروع میں پیدا ہو گیا تھا، وہ کسی جنگی مظاہرہ کے لیے تیار نہ تھا، روس بھی سویڈن سے قوت آزمائی کر رہا تھا اور دولت عثمانیہ سے کوئی نئی جنگ چھیڑ دینا اس کی مصلحت کے بھی خلاف تھا، چنانچہ ۱۷۵۷ء میں دونوں سلطنتوں میں ایک جدید معاہدہ ہوا اور جنگ کچھ دنوں کے لیے پھر ملتوی ہو گئی، تاہم دولت علیہ روس کی نقل و حرکت سے غافل نہ تھی اور بحر اسود کے ساحل پر پیٹر جوئے قلعے تعمیر کر رہا تھا، ان کو توشویش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

چارلس | پیٹر کی زیادہ تر توجہ فی الحال سویڈن کی جانب تھی، جس کا فرماں روا چارلس دو از دہم نہایت بہادری کے ساتھ روس کی پوری طاقت کا مقابلہ کر رہا تھا، ترکوں کو چارلس کے ساتھ بہت ہمدردی تھی لیکن روس کے ساتھ جو معاہدہ ہو چکا تھا اس کی وجہ سے وہ چارلس کی مدد کرنے سے معذور تھے، ۸ جولائی ۱۷۵۹ء کو پلٹوا (Paltowa) کے مقام پر چارلس کو سخت شکست ہوئی اور اس نے بھاگ کے سلطنت عثمانیہ کے حدود میں پناہ لی، سلطان احمد ثالث نے اس کا استقبال شاہانہ احترام کے ساتھ کیا لیکن اس کی حمایت میں پیٹر سے جنگ شروع کر دینے پر تیار نہ ہوا، البتہ جب پیٹر نے یہ خواہش کی کہ چارلس کو پناہ نہ دی جائے تو سلطان نے صاف جواب دے دیا کہ آئین شرافت کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور پیٹر کی دھمکیوں کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔

روس سے اعلان جنگ | پلٹوا کے معرکہ کے بعد پیٹر نے لیوونیا (Livonia) کو فتح کیا جس سے بحر بالٹک میں داخل ہونے کی راہ کھل گئی، اس کے بعد وہ دولت علیہ کی طرف متوجہ ہوا اور بحر اسود میں دخل حاصل کرنے کے لیے کریمیا پر حملہ کی تیاری کرنے لگا، ازف کے قلعہ اور بحر ازف کے شمالی مشرقی ساحل پر اس کا قبضہ پہلے سے تھا، اس نے تگنروگ (Taganrog) اور دوسرے قلعوں کو جن سے کریمیا پر زور پڑتی تھی، مستحکم کر لیا، سلطان پیٹر کی ان جنگی تیاریوں کو دیکھ رہا تھا، دونوں سلطنتوں کے تعلقات چارلس کے قیام کی وجہ سے اور

زیادہ کشیدہ ہو گئے تھے، وہ برابر سلطان کوروس سے جنگ کرنے کے لیے ابھارتا رہا تھا، سلطان پر ابتدا میں اس ترغیبوں کا اثر نہ پڑا لیکن جب خان کریمیانے آستانہ میں حاضر ہو کر ان تمام خطرات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا جو پیٹر کی تیاریوں نے پیدا کر دیے تھے تو بالآخر مجبور ہو کر اس نے ۲۸ نومبر ۱۷۷۱ء کو روس سے جنگ کا اعلان کر دیا، ۲۵ فروری ۱۷۷۱ء کو پیٹر کی طرف سے بھی ماسکو کے سب سے بڑے کلیسا میں ترکوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا گیا، اس نے اس جنگ کو ایک مذہبی جنگ قرار دیا جس کا مقصد یورپ سے ترکوں کو نکال دینا تھا، روسی علم کے ایک جانب صلیب کی تصویر بنی ہوئی تھی اور دوسری جانب یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے ”خدا اور مسیحیت کے لیے“۔

مئی ۱۷۷۱ء میں صدر اعظم بلط جی محمد پاشا عثمانی فوجوں کے ساتھ مولڈیویا کی طرف روانہ ہوا، جس کا امیر دولت علیہ سے غداری کر کے پیٹر سے مل گیا تھا اور پیٹر اس کی مدد سے بلقان کی سلاوی قوموں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف ابھار رہا تھا، چنانچہ پیٹر بھی اپنی فوج لے کر مولڈیویا میں داخل ہوا، روسی فوجوں کی تعداد عثمانی فوجوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی، تاہم پیٹر اپنے جوش میں آگے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ دریائے پرتھ کو عبور کر کے اس کے ساحل پر خیمے نصب کر دیے، وہاں پہنچ کر اسے اپنی غلطی معلوم ہوئی، کیوں کہ اس کے ایک بازو پر دریائے پرتھ اور دوسرے پر ایک وسیع دلدل تھا اور سامنے کی پہاڑیوں پر بلط جی محمد پاشا اپنی فوجوں کے ساتھ قابض تھا، روسی فوجیں عثمانی توپوں کی زد میں آ چکی تھیں، جن سے بچ کر دریا کو عبور کرنا ممکن نہ تھا۔

زار کا حال زار | پیٹر کو اپنے سپاہیوں کی ہلاکت اور اپنی گرفتاری کا پورا یقین تھا، اس موقع پر اس نے جو خط روسی سینٹ (مجلس قومی) کے نام ماسکو روانہ کیا تھا، اس سے اس کی بے چارگی اور مایوسی کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتا ہے:

”میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ جھوٹی خبر سے فریب کھا کر اور اپنی کسی غلطی کے بغیر میں اپنے کو اس حالت میں پاتا ہوں کہ ترکی فوج نے مجھے خود میرے لشکر میں بند کر رکھا ہے، ہمارے سامان رسد کی فراہمی منقطع کر دی گئی ہے اور ہمیں ہر لمحہ ہلاک یا قید ہو جانے کا خطرہ ہے، بجز اس کے کہ خدا کسی غیر متوقع طریقہ پر ہماری مدد کرے، اگر میں ترکوں کے ہاتھ گرفتار ہو جاؤں تو پھر تم مجھے اپنا زار اور فرماں روانہ سمجھنا اور نہ میرے کسی حکم کی پرواہ کرنا جو میری طرف سے تمہارے پاس پہنچایا جائے، خواہ تم میرے خط کو پہچان ہی کیوں نہ لو بلکہ خود میری آمد کے منتظر رہنا، اگر میں ہلاک ہو جاؤں اور تمہیں میری وفات کی تصدیق شدہ اطلاع ملے تو اس وقت تم میرا جانشین اس شخص کو منتخب کر لینا جو تم میں سب سے زیادہ اہل ہو۔“

صلح نامہ پر تھ | پیٹر اور اس کی فوج کی حالت ایسی ہی تھی، روسی تمام تر ترکوں کے رحم و کرم پر تھے، اگر ترک چاہتے تو انہیں قتل کر ڈالتے یا گرفتار کر لیتے، ایسے نازک وقت میں جب خود پیٹر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور وہ مایوس ہو کر اپنے خیمہ میں پڑا ہوا تھا، اس کی بیوی کیتھرائن نے کمال ذکاوت اور دانش مندی سے ایک ایسی راہ نکالی جس سے پیٹر اور اس کی فوج کو سلامتی کے ساتھ روس واپس چلے جانے کا موقع مل گیا، اس نے اپنے تمام زیورات اور جو کچھ نقد لشکر میں جمع ہو سکا، سب اکٹھا کر کے صدر اعظم کے نائب کے پاس عثمانی لشکر میں بھیجا اور درخواست کی کہ صلح کی گفتگو کے لیے جنگ چند دنوں تک ملتوی کر دی جائے، نائب کی سفارش سے صدر اعظم بلطجی محمد پاشا اس گفتگو کے لیے راضی ہو گیا، پیٹر کے حریف چارلس دوازہم کا نمائندہ کانٹ پونیاٹوسکی (Count Poniatowski) اور خان کریسیا عثمانی لشکر میں موجود تھے اور دونوں نے ایسے نادر موقع پر جب کہ پیٹر ان کی مٹھی میں آچکا تھا، صلح کی نہایت شدید مخالفت کی لیکن صدر اعظم نے ان کی مخالفت کے باوجود ایسے شرائط پر صلح کر لی جو اس کی دانست میں سلطنت عثمانیہ کے لیے نہایت مفید تھے، چنانچہ

۲۱ جولائی ۱۸۱۷ء کو صلح نامہ مرتب ہو گیا، صلح نامہ میں دفعات کو درج کرنے سے پہلے یہ الفاظ لکھے گئے ”اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فتح مند اسلامی فوج نے زارروس کو اس کی تمام فوجوں کے ساتھ دریائے پرتھ کے قریب گھیر لیا ہے اور زارروس نے صلح کی درخواست کی ہے اور اسی کی درخواست پر مندرجہ ذیل دفعات مرتب اور منظور کی جاتی ہیں:

۱- زارروس نے قلعہ ازف اور اس کے ملحق علاقوں سے اپنا قبضہ اٹھالینا منظور کیا اور ان کو اسی حالت میں سلطنت عثمانیہ کے حوالہ کر دینے کا وعدہ کیا جس حالت میں اس نے ان پر قبضہ کیا تھا۔

۲- زارروس نے منظور کیا کہ اس کا نیا شہر تکر وگ جو بحر ازف پر واقع تھا، نیز اس علاقہ کے بعض دوسرے قلعے جو اس نے تعمیر کرائے تھے، سب مسمار کر دیے جائیں اور پھر کبھی تعمیر نہ ہوں، علاوہ بریں کمنسکی (Kermienki) میں اس نے جو توپیں اور فوجی سامان اکٹھا کیے تھے، وہ سب باب عالی کو دے دیے جائیں۔

۳- زار نے معاہدہ کیا کہ آئندہ وہ اہل پولینڈ اور ان قزاقوں کے معاملات میں جو پولینڈ یا خان کریمیا کے محکوم ہیں، دخل نہ دے گا اور ان کے علاقوں سے روسی فوجیں ہٹا لے گا۔

۴- جو تھی دفعہ میں تجارت کو آزاد قرار دیا گیا لیکن یہ شرط رکھی گئی کہ آئندہ کوئی روسی سفیر قسطنطنیہ میں مقیم نہ ہوگا، کریسی لکھتا ہے کہ اس شرط کی وجہ غالباً وہ سازشیں تھیں جو روس یونانیوں اور دولت عثمانیہ کی دوسری عیسائی رعایا سے کرتا رہتا تھا۔

۵- اہل روس ان مسلمانوں کو آزاد کر دیں جن کو انہوں نے دوران جنگ میں یا جنگ سے قبل گرفتار کر لیا ہے۔

۶- شاہ چارلس کو روس سے ہو کر اپنے ملک سویڈن جانے کی اجازت دی گئی اور زار نے معاہدہ کیا کہ راستہ میں اس سے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے گی، اس دفعہ میں

اس امر کی بھی سفارش کی گئی کہ روس اور سویڈن باہم صلح کر لیں۔

۷۔ باب عالی کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ آئندہ وہ اہل روس کو کوئی نقصان نہ پہنچائے گا اور اسی طرح اہل روس کی طرف سے معاہدہ ہوا کہ وہ سلطان کی رعایا اور ماتحتوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں گے۔

جب اس صلح نامہ کی خبر قسطنطنیہ پہنچی اور معلوم ہوا کہ پٹیراس طرح قبضہ میں آکر صاف نکل گیا تو سلطان سخت برہم ہوا، بلط جی محمد پاشا کو واپسی پر صدارت کے عہدے سے علاحدہ کر دیا گیا اور اس نے نائب عثمان اور رئیس آفندی عمر کوجن کے متعلق خیال تھا کہ یہ صلح ان ہی کی کوششوں سے عمل میں آئی ہے، سلطان نے قتل کر دیا، اس نے صلح نامہ کے منظور کرنے سے بھی انکار کر دیا اور روس سے پھر جنگ کی تیاری شروع کر دی لیکن بعض وزرائے سلطنت اور زیادہ تر سفیر برطانیہ سر سٹن (Sir R. Sutton) کے مشورہ سے سلطان جنگ سے باز رہا اور دو سال بعد زار روس کے ساتھ ایک دوسرا صلح نامہ مرتب کیا گیا جس میں بلط جی محمد پاشا کے صلح نامہ کی تمام دفعات شامل تھیں۔

بلط جی کا جرم | اکثر مورخین نے بلط جی کے صلح نامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس پر بددیانتی کا الزام عائد کیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس نے کیتھرائن کی رشوت قبول کر کے دولت علیہ کے مفاد کو نظر انداز کر دیا اور زار روس اور اس کی پوری فوج پر قابو پانے کے بعد ان کو یوں ہاتھ سے نکل جانے دیا، لارڈ ایورسلے نے صدر اعظم کی مدافعت میں جو باتیں پیش کی ہیں ان سے یہ الزام دور ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ جو شخص صدارت عظمیٰ کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہو اور اسے دولت پیدا کرنے کے لیے بڑے سے بڑے مواقع حاصل ہوں وہ کیتھرائن کی پیش کردہ نہایت حقیر رقم کے لیے اپنی ذات اور اپنے ملک کو فروخت کر دینے پر آمادہ ہو گیا ہو، یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ زارنیہ نے وہ تحائف

صدر اعظم کے نائب کی خدمت میں بھیجے ہوں، تاکہ وہ سفارش کر کے صلح کی گفتگو کی اجازت حاصل کر لے، بلط جی نے جن شرائط پر صلح کی ان سے بہتر شرائط اس کے خیال میں ممکن نہ تھے، یہ صحیح ہے کہ وہ زار روس اور اس کی فوج کو گرفتار اور ہلاک کر سکتا تھا لیکن اس سے روسیوں میں نہایت سخت اشتعال پیدا ہو جاتا اور وہ انتقام کے لیے کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھتے، یہ بات قابل لحاظ ہے کہ سلطان نے عثمان اور رئیس آفندی کو قتل کر دیا لیکن بلط جی محمد پاشا کو جس کی دستخط سے صلح نامہ کا نفاذ ہوا تھا، صرف معزول کر دیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے بلط جی کو پہلے ہی سے صلح کے اختیارات دے رکھے تھے، بظاہر سلطان کا قصد علاقہ ازف سے آگے بڑھ کر سلطنت روس میں اپنے مقبوضات کا دائرہ بڑھانے کا نہ تھا، پھر جنگ کو جاری رکھنے میں ان سے بہتر کن شرائط پر صلح ہو سکتی تھی؟

بعض مورخین کا خیال ہے کہ بلط جی محمد پاشا نے جن شرائط پر صلح کی تھی وہ روس کے لیے اس درجہ باعث تنگ تھے کہ اس عار کو دور کرنے کے لیے روس کی طرف سے جنگ کا پھر چھیڑا جانا لازمی اور ناگزیر تھا لیکن خود پیٹر کا خیال اس سے مختلف تھا، رہائی کے بعد اس نے نئی جنگ کے لیے کوئی آمادگی ظاہر نہیں کی، برخلاف اس کے معاہدہ پر تھ کے دو سال بعد اس نے دولت عثمانیہ کے ساتھ ایک دوسرا معاہدہ بھی کیا جس کی دفعات روس کے لیے ویسی ہی سخت تھیں، اس نے اپنے عہد کی بقیہ مدت میں کوئی معاہدہ شکنی نہ کی بلکہ چند سالوں کے بعد سلطنت ایران کے ایک بڑے حصہ کی تقسیم کے لیے دولت علیہ کے ساتھ ایک نئے معاہدہ میں شریک ہو گیا، پچیس سال تک روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان پھر کوئی جنگ پیش نہیں آئی۔

۱۷۱۵ء میں صدر اعظم داماد علی پاشا نے موریا پر حملہ کیا جو معاہدہ کارلووئز کی رو سے سلطنت عثمانیہ سے چھین کر جمہوریہ وینس کو دے دیا گیا تھا، معاہدہ مذکور کے وقت

دولت علیہ اس قدر کم زور ہو گئی تھی کہ وہ اس قدیم مقبوضہ کے تحفظ سے بالکل معذور تھی لیکن اب جب کہ اس کی طاقت بہت کچھ بڑھ چکی تھی اور خیال تھا کہ سلطنت آسٹریا جس کی حمایت سے جمہوریہ وینس موریا پر قبضہ پانے میں کامیاب ہوئی تھی، اس جنگ میں دخل نہ دے گی، موریا کو واپس لے لینے کا موقع بہت اچھا تھا، معاہدہ کارلوٹز میں جمہوریہ وینس بھی شریک تھی، اس لیے باب عالی بغیر کسی معقول عذر کے اس پر حملہ نہیں کر سکتا تھا، اتفاق سے نقص عہد خود وینس کی طرف سے پیش آیا، اس نے مونٹی نیگرو کے باشندوں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کرنے میں مدد پہنچائی، داماد علی پاشا کے لیے جو اپنی جنگ جوئی اور شجاعت میں مشہور تھا اور کافی ہوا اور وہ فوج جو روس کی جنگ کے لیے تیار کی گئی تھی، موریا کے محاذ پر بھیج دی گئی، جنگ کی ابتدا محاصرہ کورنٹھ سے ہوئی، تین ہفتہ کی مدافعت کے بعد ۷ جولائی ۱۷۷۱ء کو کورنٹھ نے ہتھیار ڈال دیے، اس کے بعد عثمانی فوج دو حصوں میں تقسیم ہو کر پورے دریا میں پھیل گئی اور جمہوریہ وینس کے تمام قلعوں کو مثلاً موڈن، کورن اور رینو یکے بعد دیگرے فتح کر لیا، صرف ایک سوا یک روز کی جنگ میں سارا موریا فتح ہو گیا، وہاں کے یونانی باشندوں نے اہل وینس کو بالکل مدد نہ دی، برخلاف اس کے انہوں نے اپنے سابق آقاؤں کے ظلم و تعدی سے بچنے کے لیے ترکوں کا استقبال کیا۔

آسٹریا سے جنگ | داماد علی پاشا کا قصد تھا کہ موریا کی فتح کے بعد کارنوا اور بحر یونان کے دوسرے جزیروں پر بھی جو وینس کے زیر حکومت تھے، قبضہ کر لے، مگر اس موقع پر چارلس ششم شہنشاہ آسٹریا درمیان میں آ گیا اور اوائل ۱۷۷۱ء میں اس نے دولت علیہ کے خلاف جمہوریہ وینس سے اتحاد کر لیا، چارلس کا یہ فعل باب عالی کے لیے سخت اشتعال کا باعث ہوا اور صدر اعظم داماد علی پاشا نے اسے معاہدہ کارلوٹز کی خلاف ورزی قرار دے کر دیوان سلطنت میں جنگ کی تجویز پیش کی، آسٹریا کے مقابلہ میں سابق شکستوں کی یاد ہنوز

اتنی تازہ تھی کہ اس مسئلہ پر بہت زیادہ بحث و مباحثہ ہوا لیکن بالآخر مفتی اعظم نے صدر اعظم کی تجویز کے موافق رائے دی اور آسٹریا کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا گیا، داماد علی پاشا ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ روانہ ہو کر بلغراد پہنچا، بلغراد سے پوری فوج پیٹر وارڈین کی طرف روانہ ہوئی اور وہیں ۱۰ اگست ۱۷۱۷ء کو آسٹریا کی فوج سے مقابلہ ہوا، جس کا امیر عسکر مشہور سپہ سالار شہزادہ یوجین تھا، ابتدا میں عثمانیوں کو نمایاں کام یابی ہوئی لیکن شہزادہ یوجین کے مخصوص دستہ نے جو اس وقت تک محفوظ رکھا گیا تھا، دفعۃً حملہ آور ہو کر جنگ کا نقشہ بدل دیا اور ترکوں کے قدم اکھڑ گئے، داماد پاشا نے یہ دیکھ کر اپنے سرداروں کی ایک جماعت ساتھ لی اور جہاں لڑائی گھمسان ہو رہی تھی ٹوٹ پڑا لیکن اس کی حیرت انگیز شجاعت اور جاں بازی فوج کے اکھڑے ہوئے قدم کو نہ روک سکی اور وہ خود ایک کاری زخم کھا کر گر گیا، اس کے ساتھی اسے اٹھا کر کارلوونزلے گئے جو پیٹر وارڈین سے تھوڑے فاصلہ پر واقع تھا لیکن وہ اس زخم سے جاں بر نہ ہو سکا اور وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔

داماد پاشا کے زخمی ہونے کے بعد ترکوں کی ہمت پست ہو گئی اور وہ میدان چھوڑ کر بلغراد کی طرف بھاگے، یوجین نے ان کے خیموں پر قبضہ کر لیا، مال غنیمت میں ایک سو چالیس توپیں بھی ہاتھ آئیں۔

اس کے بعد یوجین نے تمیسوار کا رخ کیا، جو ہنگری میں ترکوں کا آخری اہم قلعہ تھا، چنانچہ پیٹر وارڈین کی لڑائی کے بیس روز بعد اس نے تمیسوار کا محاصرہ کر لیا، پانچ ہفتہ کے محاصرہ کے بعد ۲۵ نومبر ۱۷۱۷ء کو قلعہ نے ہتھیار ڈال دیے، اس سال آسٹریا سے پھر کوئی جنگ نہیں ہوئی، اس درمیان میں وینس سے بھی لڑائی کا سلسلہ جاری رہا، چونکہ عثمانی فوجوں کا بڑا حصہ آسٹریا سے جنگ کرنے میں مصروف تھا، اس لیے وینس کے مقابلہ میں زیادہ کام یابی نہ ہو سکی اور کارنو کا محاصرہ اٹھالینا پڑا۔

دوسرے سال ۱۷۱۷ء میں صدر اعظم خلیل پاشا کے زیر قیادت ایک دوسری

زبردست فوج آسٹریا کے مقابلہ میں قسطنطنیہ سے روانہ ہوئی، شہزادہ یوجین نے آگے بڑھ کر بلغراد کا محاصرہ کر لیا، تین ہفتہ کے بعد عثمانی فوجیں نمودار ہوئیں اور اس نے خود محاصرہ کرنے والوں کو گھیر لیا، یوجین کے لیے یہ وقت نہایت نازک تھا، بلغراد کا محصور عثمانی دستہ اس کے سامنے تھا اور خلیل پاشا کی پوری فوج اس کے پشت پر تھی، اس میں شبہ نہیں کہ اگر خلیل پاشا فوراً ہی حملہ کر دیتا تو کام یابی یقینی تھی لیکن اس نے تاخیر سے کام لیا اور آسٹریا کی فوج کے گرد ایک حصار قائم کرنے کی کوشش کی، یوجین سمجھتا تھا کہ اگر یہ حصار قائم ہو گیا تو سامان رسد کا فراہم ہونا محال ہو جائے گا اور پھر اس کے لیے کچھ عرصہ کے بعد ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہ جائے گا، اس خطرہ کو پیش نظر رکھ کر اس نے غیر معمولی جرأت سے کام لیا اور ۱۶ اگست ۱۷۱۷ء کو خلیل پاشا کی فوج پر دفعۃً خود حملہ کر دیا، خلیل پاشا اس غیر متوقع اور اچانک حملہ کے لیے تیار نہ تھا، عثمانیوں کے پیرا کھڑ گئے اور اپنی کثرت کے باوجود انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی، ان کے بیس ہزار سپاہی مقتول اور زخمی ہوئے، ایک سو تیس تو ہیں اور آلات حرب کا ایک نہایت وافر ذخیرہ دشمنوں کے ہاتھ آیا، دوسرے روز بلغراد اور اس کے فوجی دستہ نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور قلعہ یوجین کے حوالہ کر دیا۔

بلغراد کی فتح کے بعد آسٹریا کی فوجیں آگے بڑھ کر سرویا اور مغربی ولاچیا کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئیں، انہوں نے سرویا کے باشندوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی مگر بارہ ہزار سے زیادہ آدمیوں نے ان کا ساتھ نہ دیا کیوں کہ سرویا کے لوگ ترکی حکومت کے مقابلہ میں آسٹریا کی حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے، اسی وجہ سے دریائے ڈینیوب کے جنوبی علاقوں پر آسٹریا کا یہ قبضہ عارضی ثابت ہوا، بائیس سال کے بعد عثمانیوں نے بلغراد کو پھر فتح کر لیا اور آسٹریا والوں کو سرویا سے نکال باہر کیا۔

معاهدہ پساووویچ | بلغراد کی شکست کی سزا میں خلیل پاشا صدارت کے عہدہ سے علاحدہ

کر دیا گیا اور اس کی جگہ ابراہیم پاشا جو سلطان کا داماد تھا صدر اعظم مقرر ہوا، وہ ارکان سلطنت کی اس جماعت کا ہم نوا تھا جو آسٹریا سے انتقام لینے کی خواہاں تھی لیکن انگلستان اور ہالینڈ کے سفیروں نے پھر مصالحت کی گفتگو شروع کر دی اور اس اصول پر صلح کر ادینی چاہی کہ ہر فریق اپنی موجودہ فتوحات پر قابض رہے، یہ شرط آسٹریا کے لیے تو مفید تھی لیکن دولت علیہ کے لیے سخت نقصان دہ تھی، بہر حال کچھ تامل کے بعد سلطان آخر میں راضی ہو گیا اور صلح نامہ مرتب کرنے کی کارروائی شروع ہوئی، سرویا کے ایک چھوٹے سے گاؤں سپاروویچ (Pussarowitch) میں ایک کانگریس منعقد کی گئی اور وہاں ۲۲ شعبان ۱۱۳۰ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۸۱۷ء کو ایک معاہدہ مرتب ہوا جو ”معاہدہ سپاروویچ“ کے نام سے مشہور ہے۔

اس معاہدہ کی رو سے آسٹریا کو نہ صرف تمیسوار اور اس کا علاقہ مل گیا اور اس طرح ہنگری کا وہ حصہ بھی جو معاہدہ کارلوونز کے بعد سلطنت عثمانیہ کے زیر حکومت رہ گیا تھا، اس کے قبضہ میں آ گیا، بلکہ ولاچیا اور سرویا کا ایک بڑا حصہ، بوسنیا کے بعض علاقے، نیز بلغراد، سمندریا، رمنک اور بہت سے دوسرے شہر اس کے ہاتھ آئے، لیکن جمہوریہ وینس کو جس کی حمایت میں آسٹریا نے ہتھیاراٹھائے تھے، پورا موریا دولت عثمانیہ کے حوالے کر دینا پڑا اور اگرچہ ڈلماشیا کے چند چھوٹے چھوٹے قلعوں پر اس کا قبضہ باقی رکھا گیا، تاہم اسے ساحل ایڈریاتک کے بعض غیر مفتوحہ علاقوں سے دست بردار ہو جانا پڑا تا کہ سلطنت عثمانیہ اور جمہوریہ رگوسا کے تعلقات میں روک نہ پیدا ہو اور دولت علیہ وینس کے دست برد سے رگوسا کا تحفظ کر سکے، کارنوا اور بحر یونان کے دوسرے جزیروں پر وینس کا قبضہ قائم رہا، سلطنت عثمانیہ کی طرف سے اس بات کا معاہدہ کیا گیا کہ الجزائر، تونس، طرابلس اور رگوسا کے بحری ڈاکوؤں کا سدباب کر دیا جائے گا اور ہنگری کے باغیوں کو آسٹریا کی جدید سرحد کے قریب رہنے کی ممانعت کر دی جائے گی۔

جنگ ایران | ۱۸۰۷ء میں روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان ”دائمی صلح“ کے لیے ایک

معاهدہ مرتب ہوا، جہاں تک روس کا تعلق ہے یہ معاہدہ اس اتحاد کا نتیجہ تھا جو اس کے بعض سابق حلیفوں نے اس وقت اس کے خلاف قائم کر لیا تھا اور جس کی شرکت کی دعوت آسٹریا اور انگلستان کے سفیروں نے باب عالی کو بھی دی تھی، پیٹر نے اتحاد کے آئندہ خطرات کا اندازہ کر کے باب عالی کو اس سے علاحدہ رکھنے کی کوشش کی اور صلح نامہ مذکور کے ذریعہ بظاہر ہمیشہ کے لیے اسے اپنا حلیف بنا لینا چاہا، لیکن یہ ”دائمی صلح“ دو ہی سال کے بعد معرض خطر میں آگئی اور قریب تھا کہ دونوں فریق سلطنت ایران کے بعض حصوں کی تقسیم پر باہم دست و گریباں ہو جائیں، شاہ عباس صفوی کی وفات کے بعد ہی دولت ایران کا زوال شروع ہو گیا اور اس کی حالت روز بروز زیادہ خراب ہوتی گئی، اس کی ہم سایہ حکومتیں موقع کی منتظر تھیں، چنانچہ ۱۶۲۲ء میں افغانی سردار امیر محمود نے پچاس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ایران پر حملہ کر دیا اور بہ آسانی اصفہان پر قابض ہو گیا، شاہ حسین کے لڑکے طہماسپ نے تخت و تاج کی واپسی کے لیے زار روس اور باب عالی سے مدد کی درخواست کی، پیٹر نے بحر کا پیسن اور بحر اسود کے ساحلی علاقوں کے معاوضہ میں مدد کا وعدہ کیا اور ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے ایک فوج بھی روانہ کر دی، پیٹر کا یہ اقدام باب عالی کے لیے تشویش اور برہمی کا باعث ہوا اور قریب تھا کہ دونوں سلطنتوں میں جنگ چھڑ جائے لیکن سفیر فرانس کی وساطت سے جنگ کی نوبت نہ آئی اور ۱۶۲۳ء میں دونوں کے درمیان ایک صلح نامہ ہو گیا جس کے رو سے شمالی ایران کا ایک بڑا حصہ فریقین نے باہم تقسیم کر لیا، باب عالی کو جارجیا، اریواں، تبری اور باکو کے صوبے دیے گئے اور روس نے شروان اور بحر کا پیسن کے بعض ساحلی علاقوں کو اپنے لیے منتخب کیا، روس ان علاقوں پر صلح نامہ کی رو سے پہلے ہی قبضہ کر چکا تھا، دولتِ علیہ کو اپنے حصہ پر قبضہ کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کرنی پڑی، ایرانیوں نے مقابلہ کیا لیکن ترک مدائن، ادیوان، تبری اور بعض دوسرے علاقوں کو یکے بعد دیگرے فتح کرتے گئے اور شاہ طہماسپ کو مجبوراً صلح کرنی پڑی، تھوڑے دنوں کے بعد امیر

محمود نے شاہ طہماسپ کو شکست دے کر ایران کے تحت پر پھر قبضہ کر لیا اور سلطنت عثمانیہ کی مخالفت سے بچنے کے لیے مذکورہ بالا صوبوں پر باب عالی کی سیادت تسلیم کر لی، ۱۷۲۵ء میں امیر محمود کا انتقال ہو گیا اور اس کا ایک عزیز شاہ اشرف تحت نشین ہوا، ۱۳ اکتوبر ۱۷۲۵ء کو شاہ اشرف اور باب عالی کے درمیان ایک جدید صلح نامہ ہوا لیکن اسی سال ایک ایرانی سردار نادر گلی خان نے شاہ طہماسپ کی حمایت میں اصفہان پر چڑھائی کی اور متعدد معرکوں میں افغان کو شکست دی، شاہ اشرف قتل ہوا اور شاہ طہماسپ پھر تخت پر بیٹھا، طہماسپ نے تخت پر آتے ہی باب عالی سے ایرانی صوبوں کی واپسی کا مطالبہ کیا اور سلطان کے انکار پر نادر خان کی سرکردگی میں سلطنت عثمانیہ کے مقابلہ میں فوجیں روانہ کیں، نادر خان کے میدان میں آتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا اور عثمانی فوجوں کے قدم اکھڑنے لگے، قسطنطنیہ میں خبر پہنچی کہ ایرانی فوج سلطنت عثمانیہ پر حملہ آور ہو رہی ہے، اس خبر سے دفعۃً پایہ تخت میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور نینی چری کے ایک دستہ نے پطردنا خلیل کی سیادت میں علم بغاوت بلند کر دیا، تھوڑے ہی عرصہ میں یہ وبا تمام فوج میں پھیل گئی۔

فوج کی بغاوت اور سلطان کی معزولی | فوج کی بغاوت کا ظاہری سبب تو وہ شکست تھی جو نادر خان کے مقابلہ میں عثمانیوں کو ہوئی لیکن ممکن ہے کہ باب عالی کی امن پسندانہ پالیسی بھی نینی چری کی جنگجو طبیعت کے لیے ناقابل برداشت رہی ہو، اگرچہ بعض سرحدی علاقوں میں وقتاً فوقتاً شورشیں ہوتی رہیں، تاہم صدر اعظم ابراہیم پاشا کی وزارت کا دور جو ۱۷۱۸ء سے ۱۷۳۰ء تک قائم رہا، سلطنت کے لیے غیر معمولی طور پر امن و سکون کا زمانہ تھا، شاید یہی امن پسندی ابراہیم پاشا کے قتل اور پھر سلطان کے عزل کا باعث ہوئی، باغیوں نے ابراہیم پاشا، قبودان پاشا (امیر البحر) اور مفتی اعظم کے خلاف یہ الزام قائم کیا کہ یہ لوگ عجمیوں سے صلح کرنا چاہتے ہیں اور اس جرم کی بنا پر سلطان سے ان کے قتل کا مطالبہ کیا، سلطان نے خود اپنی جان کو خطرہ سے خالی نہ دیکھ کر صدر اعظم اور قبودان پاشا کو قتل کر دیا، البتہ مفتی اعظم کے

قتل سے انکار کر دیا، لیکن اب باغیوں کی جرأت اور بڑھ گئی اور انہوں نے سلطان کو بھی تخت چھوڑنے پر مجبور کیا، احمد ثالث اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پا کر خاموشی کے ساتھ تخت سے دست بردار ہو گیا اور اپنے بھتیجے محمود کو محل سے بلا کر اپنی جگہ بٹھا دیا، اس کے بعد وہ محل کے اس حصہ میں چلا گیا جہاں محمود اب تک نظر بند تھا اور وہیں چند سال کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

سلطان احمد ثالث نے ستائیس سال حکومت کی، اس طویل مدت میں سلطنت عثمانیہ کو آسٹریا، روس، وینس اور ایران سے متعدد معرکے پیش آئے لیکن معاہدہ پساوویچ کے رو سے مقبوضات کا جو حصہ ہاتھوں سے نکل گیا تھا، ازف اور موریا کی واپسی اور ایرانی فتوحات نے نہ صرف ان کی تلافی کر دی بلکہ بہ حیثیت مجموعی سلطنت کے رقبہ میں اضافہ کر دیا، باوجود متعدد جنگوں کے خزانہ آخر وقت تک پڑھا، حالاں کہ نہ کوئی غیر معمولی ٹیکس جاری کیا گیا اور نہ رعایا کو جبر و تشدد کی شکایت ہوئی۔

پہلا مطبع | احمد خود بھی صاحب علم تھا اور علوم و فنون کی سرپرستی شاہانہ طریقہ پر کرتا تھا، چنانچہ اسی کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں مطبوعوں کا رواج ہوا اور پہلا مطبع قسطنطنیہ میں قائم کیا گیا لیکن مفتی اعظم نے مطبوعوں کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی تھی کہ قرآن مجید طبع نہ کیا جائے۔

ولاچیا اور مولڈیویا کے یونانی حکام | اسی عہد میں ولاچیا اور مولڈیویا کی حکومتوں میں بھی ایک خاص تبدیلی عملی میں آئی، اب تک ان ریاستوں کی حکومت وہیں کے کسی ممتاز امیر کے سپرد کر دی جاتی تھی لیکن چوں کہ اے اے میں مولڈیویا کے امیر نے دولت عثمانیہ سے غداری کر کے پیٹر اعظم کا ساتھ دیا تھا اور پیٹر کی حمایت میں سلطانی قومن کو بغاوت پر آمادہ کرنا چاہا تھا، اس لیے باب عالی نے اس کے بعد سے ولاچیا اور مولڈیویا کی حکومتوں پر ان دولت مند یونانی امراء کو مقرر کرنا شروع کیا جو قسطنطنیہ کے ایک خاص حصہ فنار میں رہا کرتے تھے، مگر یہ نظام دولت علیہ کے حق میں بہت مضرت ثابت ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلطان محمود اول کے عہد میں اس کے نقصانات ظاہر ہونے لگے۔

محمود اول

۱۱۴۳ھ تا ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۳۰ء تا ۱۷۵۴ء

احمد ثالث کے تخت سے کنارہ کش ہو جانے کے بعد باغیوں اور اعیان سلطنت نے سلطان مصطفیٰ ثانی کے لڑکے محمود کو تخت پر بیٹھایا لیکن چند ہفتوں تک محمود صرف نام کا سلطان تھا اور اصل حکومت باغیوں کے سردار پطردنا خلیل کے ہاتھ میں تھی، اس نے سلطنت کے بہت سے اعلیٰ عہدہ داروں کو برطرف کر دیا اور ان کی جگہ اپنی جماعت کے آدمیوں کو مقرر کر لیا، ایک یونانی بوچرینا کی (Yanaki) نے گذشتہ بغاوت میں اسے کچھ روپے قرض دیے تھے، اس احسان کے معاوضہ میں اس نے دیوان کو مجبور کر کے اسے مولڈیویا کا حاکم مقرر کر لیا لیکن بالآخر پطردنا خلیل اور اس کے ساتھیوں کی دست درازیاں ناقابل برداشت ہو گئیں اور سلطان کے وفادار افسروں نے ان سرکشوں کے استیصال کا عزم کر لیا، نئی چری اور دوسرے فوجی دستوں نے بھی جو سلطان احمد ثالث کے معزول کرنے میں شریک تھے، پطردنا خلیل کی مخالفت پر آمادگی ظاہر کی اور اس شرط کے ساتھ کہ ان سے ان کی گذشتہ سرکشی اور بغاوت کے متعلق باز پرس نہ کی جائے گی، سلطان محمود کی حمایت کا وعدہ کر لیا، چنانچہ ایک روز پطردنا خلیل اور اس کے اکیس ساتھ دیوان میں بلائے گئے اور وہیں سلطان کے سامنے انہیں قتل کر دیا گیا، تین روز کے اندر ان کا دوست ینا کی اور اس کے سات ہزار ساتھی بھی قتل کر دیے گئے اور اس طرح تقریباً دو ماہ کی شورش کے بعد یہ بغاوت فرو ہوئی۔

جنگ ایران | پایہ تخت میں امن قائم ہونے کے بعد ایران سے جنگ چھڑ گئی اور عثمانی فوج شاہ طہماسپ کی فوج پر متعدد معرکوں میں غالب آئی، یہ دیکھ کر طہماسپ نے صلح کی درخواست کی اور ۱۰ جنوری ۱۳۳۲ء کو دونوں سلطنتوں کے درمیان ایک صلح نامہ مرتب ہوا، جس کے رو سے تبریز، اردہان، ہمدان اور لورستان، ایران کو واپس کر دیے گئے اور سلطنت عثمانیہ نے داغستان، جارجیا، ناخ شیوان، ایوان اور قفقلیس کے علاقے پائے لیکن یہ صلح عارضی ثابت ہوئی، نادر خان نے جو شاہ طہماسپ کی طرف سے سیستان، آذربایجان، مازندران اور خراسان کا حاکم تھا، اس کی شدید مخالفت کی، اس نے اپنی فوج کے ساتھ اصفہان پر چڑھائی کی اور شاہ طہماسپ کو تخت سے اتار کر اس کے لڑکے عباس ثالث کو تخت پر بیٹھایا اور عباس کی نابالغی کے زمانہ تک اپنے کو اس کا مدار المہام قرار دیا، مدار المہام کی حیثیت سے اس نے پہلا کام یہ کیا کہ صلح نامہ کو مسترد کر دیا، پھر وہ عثمانی علاقہ کی طرف بڑھا اور بغداد کا محاصرہ کر لیا، صدر اعظم عثمان پاشا بغداد کی مدد کے لیے روانہ ہوا، ۹ جولائی ۱۳۳۳ء کو دریائے دجلہ کے کنارے سخت معرکہ ہوا، جس میں نادر خان کو نہایت کاری زخم آیا اور اس کے ساتھی اسے میدان جنگ سے اٹھالے گئے، بغداد ایرانیوں کے محاصرہ سے آزاد ہو گیا، اسی سال عثمان پاشا ایرانیوں کے مقابلہ کے لیے پھر آگے بڑھا اور انہیں شکست دی لیکن تیسرے معرکہ میں جو کرکود کے قریب نادر خان سے پیش آیا تھا، ترکوں کو فاش شکست ہوئی اور خود عثمان پاشا ایک جاں باز سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مارا گیا، عثمان پاشا کے بعد ترکوں نے نادر خان کے مقابلہ میں متعدد بار شکست کھائی، بالآخر دولت عثمانیہ کی طرف صلح کی گفتگو شروع ہوئی، اس درمیان میں یکم دسمبر ۱۳۳۵ء کو نادر خان نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور عباس ثالث کو تخت سے برطرف کر کے خود ایران کا بادشاہ بن بیٹھا، نامہ و پیام کے ایک طویل سلسلہ کے بعد شرائط صلح طے ہو گئے اور ۱۷ اکتوبر ۱۳۳۶ء کو فریقین نے صلح نامہ پر دستخط کر دیے، دونوں سلطنتوں کے حدود وہی قرار پائے جو ۱۶۳۹ء

میں سلطان مراد رابع کے معاہدہ میں قائم کیے گئے تھے، ان حدود کے ماوراء باب عالی نے تمام مفتوحہ علاقے سلطنت ایران کو واپس کر دیے۔

روسی خطرہ | دولت عثمانیہ نے ایران کے ساتھ صلح کرنے میں صرف اس وجہ سے عجلت کی تھی کہ روس کی فوجیں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں، روس نے دولت علیہ اور ایران کی جنگ کو اپنے مفاد کے موافق سمجھ کر اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور بجائے اس کے کہ بحر کاہین کے ان ایرانی علاقوں پر قبضہ رکھنے کی کوشش کرتا جو پیٹر اعظم اور سلطان احمد ثالث کے معاہدہ کے مطابق ۱۷۲۳ء میں اسے حاصل ہوئے تھے، اپنی پوری توجہ عثمانی علاقوں کی جانب مبذول کرنی چاہی جن کا حصول اسے نسبتاً زیادہ آسان نظر آتا تھا، اسی غرض سے اس نے ۱۷۳۵ء میں نادر خان سے صلح کر لی اور بحر کاہین کے وہ تمام علاقے جو معاہدہ مذکورہ کے رو سے اسے حاصل ہوئے تھے، سلطنت ایران کو واپس کر دیے۔

دولت عثمانیہ کے خلاف روس کا جارحانہ اقدام حقیقتاً اس ناعاقبت اندیشانہ طرز عمل کا نتیجہ تھا جو زرائع سلطنت نے مغربی حکومتوں سے متعلق اختیار کر رکھا تھا، وہ حتی الوسع دوسری حکومتوں کی آویزش سے بچنا چاہتے تھے لیکن تاریخ کے اس سبق سے چشم پوشی کر رہے تھے کہ جو سلطنت دشمنوں سے گھری رہنے کے باوجود ان سے کنارہ کش رہنا چاہتی ہے، وہ آخر کار اس وقت میدان جنگ میں آنے پر مجبور ہوتی ہے جب کامیابی کے اکثر مواقع ہاتھ سے نکل چکے ہیں، سلطنت عثمانیہ کے وزراء روس اور آسٹریا کی دشمنی سے بے خبر نہ تھے مگر وہ اپنی طرف سے تصادم پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے، چنانچہ جب پولینڈ کی جنگ جانشینی میں باب عالی کو گذشتہ معاہدوں کی بنا پر جائز طور پر مداخلت کا حق حاصل ہوا تب بھی غیر جانب داری کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

قبضہ پولینڈ | پولینڈ تقریباً ایک صدی سے خلفشار اور بد امنی کا شکار ہو رہا تھا اور روس، آسٹریا اور پریشیا کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں، پیٹر اعظم کی خارجی سیاست کے دو نہایت

اہم جزو تھے، پولینڈ اور دولت عثمانیہ وہ ان دونوں کو فتح کر کے روس کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت بنا دینا چاہتا تھا لیکن جہاں تک سلطنت عثمانیہ کا تعلق تھا، یہ ایک ایسا نصب العین تھا جس کی حقیقت خود اس کے ذہن میں خواب سے زیادہ نہ تھی، چنانچہ واقعہ پر تھ نے اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور ترکوں کے محاصرہ سے زندہ اور سلامت نکل آنا ہی اسے اپنی سب سے بڑی کام یابی نظر آئی، تاہم وہ آخر وقت تک اپنے مقصد کے حصول کے لیے تیاریاں کرتا رہا اور اگر ۱۷۷۷ء میں وہ وقت نہ پا گیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ معاہدہ پر تھ کی تنسیخ کے لیے زور آزمائی کرتا، پھر بھی اس نے اپنے جانشینوں کے لیے جو وصیت نامہ چھوڑا، اس میں دولت عثمانیہ اور پولینڈ کی نسبت خصوصیت کے ساتھ تاکید درج کی اور اس کے بعد اس کے تمام جانشینوں نے اس وصیت کی تکمیل کو سلطنت کا اہم ترین مقصد قرار دیا، پولینڈ اپنے اندرونی اختلال اور کم زوریوں کی وجہ سے روس سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا تھا، خصوصاً جب کہ آسٹریا اور پریشیا بھی اس کے خلاف روس سے متحد ہو گئے تھے، یہ اتحاد ۱۷۷۲ء میں ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعہ عمل میں آیا تھا، جو حقیقتہً روس، آسٹریا اور پریشیا کے درمیان پولینڈ کی تقسیم کا دیا چہ تھا۔

۱۷۷۳ء میں پولینڈ کے فرماں روا آگسٹ ثانی کا انتقال ہو گیا، یہ شخص روس کے زیر اثر تھا اور روس اور آسٹریا نے اسی کے لڑکے آگسٹ ثالث کو تخت پر بیٹھانا چاہا لیکن اہل پولینڈ نے مخالفت کی اور ایک ملکی رئیس اسٹانسلاس کو منتخب کر لیا، اسٹانسلاس کو فرانس کی حمایت حاصل تھی، کیوں کہ وہ شاہ لوئی پانزدہم کا خسر بھی تھا، علاوہ بریں فرانس کی سیاسی مصلحت اس امر کی مقتضی بھی تھی کہ پولینڈ کو روس اور آسٹریا کی دست برد سے محفوظ رکھا جائے، کیوں کہ پولینڈ کی کم زوری سے آسٹریا کو قوت پہنچنے کا اندیشہ تھا اور آسٹریا کی دشمنی لوئی چہارم کے عہد سے فرانس کی سیاست کا ایک ضروری عنصر تھی، اسی بنا پر اسٹانسلاس کے انتخاب کے بعد جب روسی اور آسٹروی فوجیں پولینڈ میں داخل ہوئیں اور اسٹانسلاس کو

مجبوراً تخت چھوڑ کر بھاگنا پڑا تو فرانس نے آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور فرانسینی سفیر مقیم قسطنطنیہ نے باب عالی سے درخواست کی کہ اس حق صریح کی مدافعت کی غرض سے جو پولینڈ کو اپنے فرماں روا کے انتخاب میں حاصل ہے، نیز اس ضمانت کی بنا پر جو فاکزن (Falksen) اور قسطنطنیہ کے سابق معاہدوں کے رو سے دولت علیہ کو پولینڈ کی آزادی اور استقلال کی نسبت سپرد کی گئی ہے، آسٹریا اور روس کی اس بے جا مداخلت کے خلاف احتجاج کے طور پر اس جنگ میں فرانس کا ساتھ دے، سفیر فرانس نے پولینڈ کا استقلال قائم رکھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ پولینڈ روس اور دولت علیہ کے درمیان بطور ایک آہنی دیوار کے ہے اور اسی سلسلہ میں اس نے دولت علیہ سے متعلق روس کی سیاست کو بھی واضح طور پر بیان کیا لیکن وزراء نے اس کی تمام جھٹوتوں کو نظر انداز کر دیا اور بشیر آغا کے زیر اثر جو سلطان محمود اول کا معتد خاص اور حقیقہ سلطنت کے تمام حل و عقد کا ذمہ دار تھا، عدم مداخلت کے اصول پر بدستور قائم رہے۔

جنگ روس | اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ روس نے پولینڈ کی جنگ جانشینی سے فارغ ہو کر خود سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات پر حملہ کر دیا، پیٹرا اعظم کی تدبیر یہ تھی کہ ترکی پر پولینڈ کی راہ سے حملہ کیا جائے، اب چون کہ پولینڈ روس کے زیر اثر آچکا تھا اور باب عالی نے اس اقتدار کو روکنے کی کوئی سعی نہیں کی تھی، اس لیے روسی حملہ کا سدباب ناممکن تھا، روس واقعہ پر تھکا داغ ذلت مٹانے کے لیے بیتاب تھا، اس کے جاسوس پیٹرا اعظم کے زمانہ ہی میں بلخاریا، سرویا اور رومانیہ میں پہنچ گئے تھے اور عیسائی رعایا کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھار رہے تھے۔

دولت علیہ سے اعلان جنگ کے لیے کسی عذر کی تلاش زیادہ دشوار نہ تھی، جنگ کا فیصلہ اسی وقت ہو گیا تھا جب روس کی عنان حکومت ۱۷۳۰ء میں ملکہ اینی کے ہاتھ میں آئی، پانچ سال کی تاخیر صرف مناسب موقع کے انتظار میں گوارا کی گئی، چنانچہ ۱۷۳۵ء میں جب عثمانی فوجیں ایران میں مصروف پیکل تھیں اور تاتاری دستے ان کی کمک کے لیے کوہ قاف

کے علاقوں سے گزر رہے تھے تو روس نے اس نزاع کی بنا پر جو کہ قاف کے شمالی صوبوں سے متعلق دولت علیہ سے چلی آ رہی تھی، ان دستوں کی مزاحمت کی اور تاری علاقوں پر حملہ کر دیا، باب عالی نے روس کے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا، روس نے اس کے جواب میں تاری قبائل کی شکایتوں کا دفتر کھول دیا، نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ مئی ۱۷۳۶ء میں قسطنطنیہ میں خبر پہنچی کہ زار نیہ اپنی کی فوج نے مارشل میونخ (Munich) کی قیادت میں ایزف کے قریب دو قلعوں پر قبضہ کر کے خود اذف کا محاصرہ بھی کر لیا ہے، مجبوراً دولت علیہ نے ۲۸ مئی ۱۷۳۶ء کو روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

روسی فوج کے سپہ سالار اعظم مارشل میونخ نے یہ جنگ نہایت بلند حوصلوں کے ساتھ شروع کی تھی، وہ قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس نے زار نیہ سے وعدہ کیا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر رہے گا، قسطنطنیہ کی راہ میں پہلا سنگ گراں کریمیا تھا، اس کو ہٹا کے بحر اسود پر روسی اقتدار کا قائم کر لینا اس مہم کا پہلا مرحلہ تھا، چنانچہ مارشل میونخ چون ہزار سپاہیوں کے ساتھ کریمیا کی طرف بڑھا اور پیریکوپ (Perekop) کے قلعہ بند شہر کو فتح کرتا ہوا جو براعظم اور کریمیا کی درمیانی خاکنائے پر واقع تھا، کریمیا میں داخل ہو گیا اور پہنچتے ہی قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا، اس زمانہ میں کریمیا نہایت دولت مند ملک تھا، ترکی کے ساتھ اس کی تجارت بہت بڑھی ہوئی تھی، چنانچہ کوسلوف (Koslof) سے جو کریمیا کے مغربی ساحل کی خاص بندرگاہ تھی ہر سال دو لاکھ مویشی اور بکثرت غلہ استنبول بھیجا جاتا تھا، مشرقی ساحل کا شہر کافہ غلاموں کی تجارت کی غالباً دنیا میں سب سے بڑی منڈی تھی۔

شہر کوسلوف اپنی تجارت اور دولت کے لحاظ سے تمام کریمیا میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، ۱۷ جون ۱۷۳۶ء کو روسیوں نے اسے فتح کر کے لوٹ لیا، وہاں سے میونخ باغچہ سرائے کی طرف بڑھا جو خوائین کریمیا کی قدیم جائے سکونت تھی، باغچہ سرائے کا تاری دستہ

صرف تھوڑی دیر مقابلہ کر کے پسپا ہو گیا، کریمسی لکھتا ہے کہ تب میونخ نے اپنے روسی اور قزاق سپاہیوں کو اس شہر کے سامنے لاکر کھڑا کیا، جس کی مدافعت کرنے والا کوئی باقی نہ رہ گیا تھا، پھر اپنی فوج کے ایک چوتھائی حصہ کو چند مقررہ گھنٹوں کے لیے بھیجنا شروع کیا تاکہ شہر کے اندر جا کر لوٹ مار کرے، اس وحشیانہ اور ظالمانہ کام کی تکمیل پوری طرح کی گئی، دو ہزار مکانات اور تمام پبلک عمارتیں برباد ہو گئیں، خوانین کا وسیع محل، وہ عالی شان کتب خانہ جسے سلیم گرائی نے قائم کیا تھا اور وہ جسے کریمیا کے جیسویٹ (Jesuit) مشن نے قائم کیا تھا، سب جل کر خاک سیاہ ہو گئے، اس کے بعد روسیوں نے سیفر و پولس (Simpherolis) پر حملہ کیا جو باغچہ سرائے کے شمالی مشرق میں واقع تھا، اس کے باشندے اور اس کی دولت سپاہیوں کی درندگی اور لوٹ مار کے حوالہ کر دی گئی اور اس کی عمارتیں شعلوں کی نذر کر دی گئیں، کریمیا کی تمام مہم میں میونخ کی فوج نے سفاکی و درندگی، سببیت و بربریت کی انتہا کر دی، روسیوں نے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ذرا بھی رحم نہیں کیا، جہاں روسی فوجوں کی مطلق مزاحمت نہیں کی گئی، وہاں بھی انہوں نے شہروں اور قصبوں میں آگ لگا دی اور باشندوں کو تہ تیغ کر ڈالا، قدیم یادگاریں بے رحمی کے ساتھ مٹا دی گئیں، کتب خانے اور مدرسے شعلوں کی نذر کر دیے گئے اور قومی عمارتیں اور عبادت گاہیں قصداً اور عمداً برباد کر ڈالی گئیں، پوری مہم (جو بغیر کسی اعلان جنگ کے شروع کر دی گئی تھیں) خالص سیتھین درندگی کی روح کے ساتھ ترتیب اور انجام دی گئی۔

اس درمیان میں اور سمتوں میں بھی روس کی دوسری فوجیں بڑھتی جا رہی تھیں، چنانچہ تھوڑے دنوں کے محاصرہ کے بعد جنرل لاسکی نے ازف کو فتح کر لیا اور کلبرن (Kilburn) کے تاتاری دستہ نے جنرل لیونٹو (Leontieu) کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، بقول کریمسی ”جنگ کے پہلے سال میں روس کا فریب اور اس کی طاقت تقریباً ہر جگہ کامیاب رہی“ البتہ نومبر ۱۸۳۶ء میں جب میونخ کی فوجیں موسم سرما کی شدت سے بچنے کے لیے

کریمیا سے نکل آئی تھیں تو فتح گرانی جدید خان کریمیا یوکرین پر حملہ آور ہوا اور وہاں کے روسی دستہ کو شکست دے کر تیس ہزار روسی قیدیوں کے ساتھ کریمیا لوٹ آیا۔

آسٹریا کا فریب | دولت علیہ اب جنگ کو ختم کر دینا چاہتی تھی اور اس نے فرانس، سویڈن اور آسٹریا کے سفیروں کے ذریعہ روس سے صلح کی متعدد بار کوششیں کیں، روس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ سلطنت عثمانیہ کی موجودہ مشکلات سے فائدہ اٹھانے کے لیے آسٹریا خود بھی بیتاب ہے، اس نے صلح کے بجائے جنوری ۱۸۵۳ء میں آسٹریا سے ایک خفیہ معاہدہ کر لیا جس کی اہم ترین دفعہ یہ تھی کہ دونوں سلطنتیں متحد ہو کر ترکی پر حملہ آور ہوں گی، مگر چونکہ آسٹریا اپنے ارادہ سے باب عالی کو بے خبر رکھنا چاہتا تھا اور خوب تیار ہو کر اسی طرح اچانک حملہ کرنا چاہتا تھا جس طرح بغیر کسی اعلان جنگ کے روس نے ازف اور کریمیا پر چڑھائی کی تھی، اس لیے باب عالی کی خواہش پر اس نے بظاہر روس سے صلح کرانے کی کوشش کی اور ۱۸۵۳ء کے اوائل میں بمقام نیمی روف (Nemirof) ایک مجلس منعقد کی، جہاں روس اور آسٹریا کے سفیروں نے دولت عثمانیہ کے وکلاء سے صلح کی گفتگو شروع کی، جس کا سلسلہ نومبر ۱۸۵۳ء تک قائم رہا لیکن باب عالی کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی اور صلح نہ ہو سکی، روس اور آسٹریا کی طرف سے صلح کے جو شرائط پیش کیے گئے وہ اس درجہ سخت تھے کہ دولت علیہ کے لیے ان کا تسلیم کرنا قطعاً محال تھا، روس کے مطالبات یہ تھے کہ وہ تمام سابق صلح نامے جو باب عالی اور اس کے درمیان ہو چکے ہیں، منسوخ قرار دیے جائیں، کریمیا، گیوبان اور وہ تمام علاقے جن میں تاریخی قبائل آباد ہیں، اس کے حوالے کر دیے جائیں، ولایچیا اور مولڈویا کا استقلال تسلیم کر کے انہیں روس کی حفاظت اور سیادت میں دے دیا جائے، باب عالی فرماں روئے روس کے لیے ”شہنشاہ“ کا لقب تسلیم کرے اور روسی جہازوں کو بحر اسود، باسفورس اور دردنیاں سے ہو کر بحر روم میں آنے جانے کی آزادی دے دی جائے، مذکورہ بالا مطالبات کے علاوہ روس نے ایک کروڑ چالیس لاکھ

روبل کا مطالبہ بھی پیش کیا، آسٹریا نے اپنے لیے بوسنیا اور سرویا کے سارے علاقوں کو صلح کی قیمت قرار دی، عثمانی وکلاء نے ان اہانت آمیز شرائط کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور صلح کی یہ مجلس ایک طویل نشست کے بعد ناکام ہو کر برخاست ہو گئی۔

لیکن ناکامی صرف اسی حد تک تھی جہاں تک ترکوں کا تعلق تھا، روس اور آسٹریا کی کامیابی میں کوئی شبہ نہ تھا، اس لیے ان کا مقصد ترکوں کو صلح کے فریب میں مبتلا رکھ کر آئندہ مہم کے لیے خفیہ طور پر تیار ہونا تھا اور وہ پوری طرح حاصل ہو گیا، چنانچہ صلح کی گفتگو ہنوز جاری ہی تھی کہ روس اور آسٹریا دونوں نے سلطنت عثمانیہ کے مختلف حصوں پر حملہ کر دیا، ۳۱ اگست ۱۸۷۷ء کے اوائل میں مارشل میونخ نے ستر ہزار سپاہ کے ساتھ اوکزاکوف (Oczakoff) پر حملہ کر دیا، جو بحر اسود کے شمالی ساحل پر ایک نہایت اہم عثمانی قلعہ تھا اور جنرل لاسکی چالیس ہزار روسیوں کو لے کر کریمیا میں داخل ہوا اور میونخ کی قائم کردہ مثال کے مطابق قتل و غارت گری شروع کر دی، اوکزاکوف کے ترکی دستے نے، جو بیس ہزار آزمودہ کار سپاہیوں پر مشتمل تھا، نہایت جاں بازی کے ساتھ مدافعت کی لیکن بد قسمتی سے محاصرہ کے چند ہی دنوں بعد قلعہ کے سب سے بڑے بارود خانہ میں آگ لگ گئی، جس سے چھ ہزار ترک سپاہی ہلاک ہو گئے، سرعسکر اس واقعہ سے گھبرا گیا، خصوصاً یہ دیکھ کر قلعہ کے اندر شعلے زیادہ تیز ہو رہے ہیں اور ان سے مزید نقصان کا اندیشہ ہے اور باہر روسی فوج تازہ حملہ کے لیے تیار ہو رہی ہے، اس نے صلح کا سفید علم بلند کر کے اس شرط کے ساتھ ہتھیار ڈال دیے کہ وہ اور اس کی سپاہ فوجی قیدی خیال کی جائے گی لیکن روسیوں نے اس شرط کی قطعاً پرواہ نہ کی اور قلعہ میں داخل ہو کر بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا، بالآخر مارشل میونخ کو سرعسکر اور اس کے سپاہیوں کی حفاظت کے لیے روسی فوج کا ایک دستہ قلعہ میں روانہ کرنا پڑا لیکن اس وقت تک عثمانی دستہ کا ایک بہت بڑا حصہ قتل ہو چکا تھا اور صرف تین ہزار ترک سرعسکر کے ساتھ میونخ کے لشکر میں زندہ پہنچ سکے، روسی فوج کو بھی اس معرکہ میں بہت زیادہ نقصان پہنچا، چنانچہ اوکزاکوف میں ایک مضبوط دستہ متعین کرنے کے

بعد میونخ پوکرین کولٹ آیا اور اس سال کسی دوسری ہم پروانہ ہونے کی ہمت نہیں کی، جنرل لاسکی ۲۳ جولائی ۱۹۳۷ء کو کریمیا میں داخل ہو گیا تھا، قرہ سو بازار کے قریب تاتاریوں کو شکست دے کر اس نے تمام ملک میں قتل و خون ریزی کا بازار گرم کر دیا اور ایک ماہ کی قتل و غارت گری اور آتش زنی کے بعد جب بہیمیت اور بربریت کی پیاس کسی قدر کم ہوئی تو اگست میں واپس چلا گیا، کریمیا کا بیان ہے کہ روسی فخر کرتے تھے کہ اس مختصر سے حملہ میں انہوں نے چھ ہزار مکانات، اڑتیس مسجدیں، دو گرجے اور پچاس چکیاں جلا ڈالیں۔

آسٹریا کی شکست | اسی سال (۱۹۳۷ء) میں آسٹریا نے بھی جس کے وکلاء نیچی روف کی کانگریس میں ترکوں کو صلح کی گفتگو میں مصروف رکھے ہوئے تھے، بغیر کسی اعلان جنگ کے دفعۃً نیش پر حملہ کر دیا اور جولائی ۱۹۳۷ء میں ایک فوج فیلڈ مارشل سکندر روف (Seckendorf) کی سرکردگی میں سر دیا کوروانہ کی اور دوسری بوسنیا میں بھیجی، نیش پر قبضہ پانے کے بعد سکندر روف نے اپنی فوج کا ایک حصہ وین کی فتح کے لیے روانہ کیا لیکن عثمانیوں کو اس شہر کے استحکام کا موقع مل گیا تھا، اس لیے آسٹروی فوجیں جن پر شہزادہ یوجین کی سابق فتوحات کا نشہ ہنوز طاری تھا، پے در پے حملوں کے باوجود اس مہم میں کامیاب نہ ہو سکیں، اس شکست کا پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ آسٹریا کے جنرل آپس ہی میں جھگڑنے لگے اور پھر ان کی باہمی مخالفتوں سے فوج میں جو کم زوری رونما ہونے لگی تھی، اس میں وبا اور سامان رسد کی قلت نے اور اضافہ کر دیا، برخلاف اس کے ترک صدر اعظم زیر سیادت حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، ان کی فطری دلیری فرانس کے مشہور ماہر حرب بونیوال (Bouneval) کی معیت و مشورہ سے جو مسلمان ہو کر عثمانی فوجوں کے نظام و تربیت کا نگران مقرر ہو گیا تھا اور زیادہ موثر ہو گئی، سکندر روف نے شکست کھا کر اپنی یقینہ فوجوں کے ساتھ ہنگری کا رخ کیا، ترکوں نے نیش کو واپس لے لیا اور آسٹروی علاقہ کے متعدد حصوں میں داخل ہو گئے، بوسنیا کی مہم کا نتیجہ بھی ایسا ہی رہا، وہاں کے مسلمان باشندوں نے بہادری کے ساتھ آسٹریا کی فوجوں کا

مقابلہ کیا اور آخر کار انہیں بوسنیا سے نکال باہر کیا۔

دوسرے سال شہنشاہ آسٹریا نے نئے جزیروں کی سرکردگی میں تازہ فوجیں روانہ کیں اور پھر ترکوں کی طرف سے بھی ایک نیا صدر اعظم یغان محمد پاشا ان کے مقابلہ میں بڑھا اور پیش قدمی کر کے میڈیا پر قبضہ کر لیا، جو ہنگری کے علاقہ میں تھا اور پھر آگے بڑھ کر دریائے ڈینیوب کے ساحل پر اورسوا (Orsova) کے اہم قلعہ کا محاصرہ کر لیا، میڈیا سے قریب کورینا کے مقام پر آسٹروی فوجوں کو ایک لڑائی میں عارضی کام یابی نصیب ہوئی، (۴ جولائی ۱۷۳۸ء) لیکن فوراً ہی صدر اعظم تازہ فوجوں کے ساتھ پہنچ گیا اور غنیمت کو بھگا کر سمندریا پر قبضہ کر لیا، ۱۵ اگست ۱۷۳۸ء کو اورسوانے بھی ہتھیار ڈال دیے، آسٹروی فوجیں بھاگ کر بلغراد میں پناہ گزیں ہو گئیں۔

روس کے مقابلہ میں ترکوں کی یہ کام یابی کوئی شان دار نہ تھی، تاہم ۱۷۳۸ء میں انہوں نے روسیوں کو بحر اسود کے ساحل پر آگے بڑھنے سے روک رکھا، مارشل میونخ نے دریائے نیپر اور دریائے بوگ کو عبور کر کے چند ترکی اور تاتاری دستوں کو شکست دی لیکن جب بندر کے محاصرہ کی غرض سے دریائے نیسٹر تک پہنچا تو وہاں اس کا سامنا ایک مضبوط عثمانی لشکر سے ہوا، جو بندرگاہ کی راہ میں حائل تھا اور جس پر غلبہ پانا اس کے لیے ناممکن ثابت ہوا، متعدد چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں جن میں سے ایک میں ساسی گرائی نے بیس ہزار تاتاری اور اسی قدر عثمانی سپاہ کی مدد سے روسیوں کو سخت شکست دی، میدان جنگ میں روسی فوج کو جو نقصان پہنچا، اس سے زیادہ نقصان وبا اور سامان رسد کی قلت نے پہنچایا اور میونخ کے لیے اپنی بقیہ سپاہ کے ساتھ یوکرین لوٹ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا، اسی سال جنرل لاسکی نے تیس پینتیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ کریمیا پر پھر حملہ کیا، یہ تیسرا حملہ تھا، پہلے دو حملوں میں چون کہ روسیوں نے ملک کو حتی الامکان پوری طرح تباہ کر دیا تھا، اس لیے جنرل لاسکی کو سامان رسد کی فراہمی میں سخت دشواریاں پیش آئیں اور اسے مجبوراً بہت جلد کریمیا سے نکل جانا پڑا۔

مشرقی تجویز | ۳۰ء کے موسم سرما میں فرانس کی وساطت سے صلح کی گفتگو پھر چھیڑی گئی، دولت علیہ جنگ ختم کرنے کی غرض سے بہت کچھ نقصان برداشت کرنے پر تیار تھی لیکن روس کا نشانہ فتح کسی طرح صلح کی اجازت نہ دیتا تھا اور اس نے ایسے شرائط پیش کیے جن کا قبول کرنا دولت علیہ کے لیے قطعاً محال تھا، زارنیہ اور روس کی وزارت حرب پر مارشل میونخ کا اثر بہت زیادہ تھا اور میونخ ہی کی مخالفت نے صلح کی تمام کوششوں کو ناکام کر دیا، اس نے زارنیہ کو یقین دلایا کہ یورپ میں سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا جو تعداد میں اپنے مسلمان حکمرانوں سے کئی گنا زیادہ ہے، ترکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہے اور اس کی نگاہیں زارنیہ روس کی طرف لگی ہوئی ہیں، جسے وہ اپنا جائز فرماں روا تسلیم کرتی ہے، اس نے اس بات پر زور دیا کہ عیسائی رعایا کے جوش سے فائدہ اٹھانے اور قسطنطنیہ کی طرف بڑھنے کا بس یہی موقع ہے کہ ابھی روسی فتوحات کا اثر رعایا کے دلوں پر تازہ ہے، بہت ممکن ہے کہ ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہ آئے، زارنیہ نے میونخ کی اس ”مشرقی تجویز“ (Oriental Project) کو منظور کیا اور اس کی ہدایت کے مطابق سلطنت عثمانیہ کے یورپین صوبوں میں اپنے جاسوس روانہ کیے تاکہ عیسائی رعایا کو دولت علیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کریں۔

۳۹ء میں میونخ نے جنگ کا سلسلہ پھر شروع کیا اور مولڈویا کی سرحد میں داخل ہونے کے لیے اس نے پوڈولیا کی راہ اختیار کی جو اس وقت مملکت پولینڈ کا ایک صوبہ تھا، پولینڈ اس جنگ میں کسی فریق کا شریک نہ تھا لیکن میونخ اس طرح پوڈولیا میں داخل ہوا جیسے کسی دشمن کے ملک میں داخل ہوتے ہیں، راستہ میں روسی فوجوں نے جی بھر کے لوٹ مار کی اور یوں اس صوبہ کو ویران کرتے ہوئے مولڈویا کی سرحد کو عبور کر کے خوزیم کے مقام پر ایک ترکی لشکر کو شکست دی، اس کے بعد میونخ یا سی کی طرف بڑھا جو مولڈویا کا پایہ تخت تھا اور اس پر قبضہ کر لیا، پھر اس نے بندر کارخ کیا اور چاہتا تھا کہ بندر اور اس علاقہ کے دوسرے قلعوں کو فتح کرنا ہو جنوب کی طرف یورپین ترکی قلب میں داخل ہونے کی کوشش

کرے لیکن اثنائے راہ میں اسے اپنے حلیف آسٹریا کی تباہ کن شکست کی اطلاع ملی اور معلوم ہوا کہ آسٹریا نے بہت دبا کر سلطنت عثمانیہ سے صلح کر لی ہے۔

آسٹریا کی فیصلہ کن شکست | واقع یہ تھا کہ اسی درمیان میں آسٹریا کی فوجوں نے پھر سرویا پر حملہ شروع کر دیا تھا والیس (Wallis) اور ناپیرگ (Neiperger) آسٹریا کے دو نئے اور مشہور جزلوں نے ایک زبردست فوج کے ساتھ پیٹروارڈین سے نکل کر جنوب کا رخ کیا، ادھر صدر اعظم الحاج محمد پاشا تقریباً دو لاکھ سپاہ لے کر ان کے مقابلہ کے لیے آ رہا تھا، سمندریا اور پیٹروارڈین کے درمیان کروٹزکا (Krotzka) کے مقام پر دونوں فوجوں کا سامنا ہوا، آسٹریا کو سخت شکست ہوئی اور اس کی فوجوں نے بھاگ کر بلغراد میں پناہ لی، عثمانیوں نے تعاقب کیا اور بلغراد پر گولہ باری شروع کر دی۔

صلح نامہ بلغراد | والیس اور ناپیرگ کا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا، ان کی ہمت چھوٹ گئی اور بقول ایورسلے وہ صلح کے لیے ویسے ہی بے چین تھے جیسے اس مہم کی ابتدا میں لاف زن اور آمادہ جنگ نظر آتے تھے، بالآخر سفیر فرانس ولینوف (Villeneuve) کی وساطت سے شرائط صلح طے ہو گئے اور آسٹریا نے اپنے حلیف روس سے مشورہ کا انتظار بھی نہیں کیا، اس نے بلغراد اور بوئینیا، سرویا اور ولاچیا کے تمام علاقے جو صلح نامہ پہا روویچ کے وقت اسے دیے گئے تھے، دولت علیہ کو واپس کر دیے، اس صلح نامہ پر یکم ستمبر ۱۷۳۹ء کو فریقین کے دستخط ہو گئے، آسٹریا کی طرف سے ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ دولت علیہ روس کے ساتھ بھی صلح کر لے، چنانچہ مارشل میونخ کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی، میونخ کو آسٹریا کی شکست اور بلغراد کے صلح نامہ کا حال معلوم کر کے سخت غصہ آیا لیکن اب اس کے لیے بھی صلح کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیوں کہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ الحاج محمد پاشا کی عظیم الشان فوج کا مقابلہ آسٹریا کی مدد کے بغیر ممکن نہیں، زارنیہ کو بھی مجبوراً صلح کے لیے آمادہ ہونا پڑا اور میونخ کے تمام منصوبے جو اس نے قسطنطنیہ کی فتح کی نسبت باندھ رکھے تھے، دفعۃً خاک میں مل گئے، روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان جو

شرائط صلح ۱۸ ستمبر ۱۷۹۷ء مطابق ۱۴ جمادی الآخر ۱۱۵۳ھ میں طے ہوئے ان کی رو سے مولڈیویا اور کریمیا کی تمام فتوحات اور شہر اوکزاکوف سے روس دست بردار ہو گیا، نیز اس نے معاہدہ کیا کہ شہر ازف مسمار کر دیا جائے گا، ازف کا علاقہ دونوں سلطنتوں کے درمیان حد فاصل قرار پایا، صلح نامہ کی تیسری دفعہ میں یہ شرط خاص طور پر رکھی گئی کہ بحر ازف یا بحر اسود میں روس کا کوئی بیڑا رہنے نہ پائے گا ورنہ وہ ان سمندروں کے ساحل پر کوئی جہاز تعمیر کر سکے گا، بحر ازف اور بحر اسود میں روس کی جنگی جہاز ترقی جہازوں کا داخلہ بھی ممنوع قرار دیا گیا اور تجارتی اغراض کے لیے صرف جہازوں کے استعمال کی اجازت دی گئی۔

صلح نامہ بلغراد دولت علیہ کے لیے ایک عظیم الشان کام یابی تھی، اس نے معاہدہ پیرا وویچ کی اہانت کا داغ دھو دیا اور آسٹریا اور روس کو ترکوں کے عزم شجاعت سے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی، یورپین مونیخین اس صلح نامہ کو فرانس کی حکمت عملی کی ایک نمایاں کام یابی قرار دیتے ہیں اور اس کے تکملہ کا سہرا ولینوف کے سر باندھتے ہیں، بلاشبہ ولینوف کی وساطت سے کام لیا گیا لیکن اس سے پہلے بھی دوران جنگ میں اس نے کئی بار صلح کی کوشش کی تھی، مگر ہر کوشش بے سود اور ناکام ثابت ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ اصل حکمت عملی قوت کی ہے، دنیا نے ہمیشہ سے صرف اسی حکمت عملی کو تسلیم کیا ہے اور تاریخ کا ہر صفحہ اسی کی کار فرمائی کا شاہد ہے، بلغراد کا صلح نامہ صرف کروٹوں کی فیصلہ کن جنگ کا نتیجہ تھا، ورنہ دنیا کی کوئی طاقت آسٹریا اور روس کو ان شرائط کے منظور کرنے پر راضی نہیں کر سکتی تھی۔

سوئڈن سے معاہدہ | ولینوف کو رسوخ باب عالی میں حاصل تھا، اسے کام میں لا کر اس نے ۱۷۹۰ء میں دولت عثمانیہ اور سوئڈن کے درمیان بھی ایک معاہدہ کرادیا، جس کے رو سے فریقین روس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کے پابند ہو گئے، فرانس کی خارجی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ پولینڈ میں روس کے اثر کو قائم ہونے سے روکا جائے، چنانچہ اس معاہدہ کی غرض بھی یہی تھی لیکن چند ہی سالوں کے بعد جب روس، پرشیا اور آسٹریا نے متحد

ہو کر پولینڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تو نہ فرانس کو مدافعت کی جرأت ہوئی اور نہ دولت علیہ اس غارت گری کو روک سکی۔

فرانس کے لیے مخصوص مراعات | ولینوف کی کوشش سے فرانس کو جو مخصوص فائدہ پہنچا وہ یہ تھا کہ باب عالی نے ۱۶۷۳ء کے معاہدہ کی تجدید کر کے ان تمام حقوق کا تحفظ کر دیا جو فرانسیسی تاجروں کے لیے سلطنت عثمانیہ میں حاصل تھے، نیز ۱۷۱۷ء ۱۷۱۸ء کے معاہدہ کے ذریعہ بعض جدید حقوق کے اضافہ کے ساتھ قدیم حقوق میں بھی فرانس کے حسب خواہ ترمیم کر دی، سلطان نے محمد سعید کو اپنا خاص سفیر بنا کر شاہ فرانس کے پاس روانہ کیا تاکہ وہ سلطان کی طرف سے تجارتی مراعات کو پیش کرے، شاہ فرانس نے سلطان کے شایان شان اعزاز کے ساتھ سفیر کا استقبال کیا اور اس کی واپسی پر دو جنگی جہاز اور کچھ فرانسیسی توپچی سلطان کی خدمت میں بھیجے تاکہ عثمانی فوجوں میں وہ جدید طریقے جاری کریں جنہیں فرانس کے ممتاز ماہر فن حرب لو فوانے فرانسیسی فوجوں میں رائج کیا تھا۔

یورپین حکومتوں کی باہمی لڑائیاں | صلح نامہ بلغراد کے بعد تقریباً تیس سال تک سلطنت عثمانیہ اور اس کی ہم سایہ سلطنتوں کے درمیان کوئی جنگ پیش نہیں آئی، جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ باب عالی موقع پانے کے باوجود جارحانہ اقدام سے اجتناب کرتا رہا لیکن بڑا سبب یہ تھا کہ آسٹریا اور روس جو اس کی سب سے بڑی دشمن سلطنتیں تھیں، خود اپنے جھگڑوں میں مبتلا تھیں اور انہیں متحد ہو کر سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کی فرصت نہ تھی، ۱۷۴۰ء میں آسٹریا کے شہنشاہ چارلس ششم کا انتقال ہو گیا اور اس کی لڑکی میریا تھریسا (Maria Theresa) تخت پر بیٹھی لیکن آسٹریا کی تقریباً تمام ہم سایہ عیسائی مملکتوں نے میریا کی مخالفت کی اور فرانس کی سرکردگی میں آٹھ سال تک اس جنگ کو جاری رکھا جو آسٹریا جنگ جانشینی (War of Austrian Succession) کے نام سے موسوم ہے اور جو بالآخر صلح نامہ ایلا شپیل (۱۷۶۳ء) کے سکہ پر میریا کے حق میں ختم ہوئی، اسی طرح ۱۷۵۶ء سے ۱۷۶۳ء تک ”جنگ ہفت سالہ“ کا

سلسلہ قائم رہا جس نے یورپ کی سلطنتوں کو باہمی نزاعات میں مصروف رکھا، دولت علیہ نے ان میں سے کسی جنگ میں بھی حصہ نہیں لیا، حالاں کہ اپنے قدیم دشمن آسٹریا کی پریشان حالی سے فائدہ اٹھا کر ہنگری کے سابق عثمانی مقبوضات کو واپس لے لینے کا یہ بہت اچھا موقع تھا، برخلاف اس کے وہ نہایت دیانت داری کے ساتھ معاہدہ بلغراد کی پابندی پر قائم رہی، یورپ کے قانون سیاست کے رو سے اس کی یہ خاموشی انتہائی غیر دانش مندی پر مبنی تھی لیکن جو قانون سیاست سے بلند تر اصول یعنی اخلاق کا پابند ہے، وہ اسی خاموشی کا متقاضی تھا، باب عالی نے نہ صرف ان جنگوں کی شرکت سے اجتناب کیا بلکہ اپنے اثر سے محاربین میں صلح کرانے کی بھی امکانی کوشش کی، دشمن کی کم زوری سے فائدہ نہ اٹھانے میں دولت علیہ نے جس بلندی اخلاق کا ثبوت دیا، اس کا اعتراف یورپین مورخین بھی کرتے ہیں۔

مختلف شورشیں | جہاں تک یورپ کی سلطنتوں کا تعلق تھا، ۶۸ء تک دولت عثمانیہ سے کوئی جنگ نہیں ہوئی لیکن ۴۳ء میں ایران سے پھر لڑائی چھڑ گئی، جو تین سال تک جاری رہنے کے بعد ۴۶ء میں تقریباً ان ہی شرائط پر ختم ہوئی جن پر سلطان مراد رابع کے عہد میں ایران اور باب عالی کے درمیان صلح نامہ ہوا تھا، اس جنگ کے علاوہ سلطنت کے مختلف حصوں میں وقفوف مقامی پاشاؤں کی بغاوتیں بھی برپا ہوتی رہیں جن سے کامل امن و سکون قائم نہ ہوسکا، دورد راز صوبوں کے والی کبھی کبھی مطلق العنان ہو جاتے تھے اور حکومت کو بعض اوقات ان کی سرکشی سے چشم پوشی کرنی پڑتی تھی، بغاوت کا سب سے زیادہ اثر مصر کے صوبہ میں تھا، جو بتدریج دولت علیہ کے قبضہ و اقتدار سے نکلا جا رہا تھا۔

ایک سیاسی غلطی | ولاچیا اور مولڈویا کے صوبوں میں بعض ترکی خاندانوں کو مخصوص امتیازات حاصل تھے جن میں سب سے زیادہ اہم امتیاز وہاں کی زمینوں کا لگان وصول کر کے باب عالی میں پیش کرتا تھا، چون کہ سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوت و وقفوف مقاماً رونما ہوتی رہتی تھی، اس لیے ان خاندانوں کی سرکشی کے اندیشہ سے باب عالی نے وہ

امتيازات ان سے لے کر قسطنطنیہ کے دولت مند تاجروں کو دے دیے، ان میں زیادہ تر یونانی تاجر تھے، جنہوں نے اپنی دولت کے معاوضہ میں بڑے بڑے القاب حاصل کر لیے تھے، ولاچیا اور مولڈیویا کے شریف ترک خاندانوں کی جگہ پر یہی دولت مند تاجر سرکاری مال گزاری وصول کرنے کے لیے مقرر کیے گئے، ان لوگوں نے رعایا کے ساتھ نہایت سختی اور تشدد کا برتاؤ کیا اور ترک شرفاء پر بڑے مظالم کیے، یہاں تک کہ قدیم ترک خاندان یکے بعد دیگرے ختم ہوتے گئے اور ان کے بجائے تاجروں کے نئے خاندان قائم ہو گئے، ان کی سختی اور تشدد کا سب سے زیادہ مضر نتیجہ یہ ہوا کہ عام رعایا برگشتہ ہو کر روس کی طرف مائل ہو گئی۔

وہابی تحریک | سلطنت کی مختلف شورشوں میں ایک نہایت اہم شورش وہابی تحریک کی تھی، جس کا آغاز اسی عہد میں شیخ عبدالوہاب نجدی نے کیا تھا، اس تحریک میں ابن سعود امیر نجد کی حمایت سے بہت کچھ قوت آگئی تھی اور باب عالی کو اس کے فرو کرنے میں خاصی کاوش کرنی پڑی لیکن سلطان محمود کے عہد میں اس کا اثر بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی گیا اور اس کے جانشینوں کی کوششیں بھی اس کے استیصال میں ناکام رہیں تا آن کہ سلطان محمود ثانی کے عہد میں محمد علی پاشا والی مصر نے اس فرقہ کی سیاسی قوت کو توڑ کر اس کے آخری امیر کو گرفتار کر لیا اور اسے ۱۸۱۸ء میں قسطنطنیہ روانہ کر دیا جہاں وہ قتل کر دیا گیا۔

وفات | ۲۷ صفر ۱۱۶۸ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۷۵۴ء کو سلطان محمود اول نے وفات پائی، اس کو تعمیرات سے بہت دل چسپی تھی، اس نے قسطنطنیہ نیز مختلف صوبوں میں متعدد عظیم الشان عمارتیں بنوائیں ”جامع نور عثمانی“ کی تعمیر اسی نے شروع کی تھی، اس نے چار کتب خانے بھی پایہ تخت میں قائم کیے، وہ اپنے عدل و حلم اور تمام رعایا کے ساتھ یکساں انصاف کرنے میں خاص طور پر مشہور تھا۔

عثمان ثالث

۱۱۶۷ھ تا ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء تا ۱۷۷۵ء

سلطان محمود خاں اول کی وفات پر اس کا بھائی عثمان خاں ثالث تخت نشین ہوا، اس نے صرف تین سال حکومت کی اور اپنے مختصر عہد میں سلطان محمود ہی کے سیاسی اصولوں کا پابند رہا، چنانچہ ہم ساری حکومتوں سے کوئی آویزش نہیں ہوئی، آسٹریا کی جنگ جانشینی کے بعد ۱۷۶۷ء میں ”جنگ ہفت سالہ“ شروع ہو گئی، جس نے یورپین حکومتوں کو دو مخالف جماعتوں میں تقسیم کر کے سات سال تک وسط یورپ کو میدان کارزار بنائے رکھا، دولت عثمانیہ کے لیے یہ دوسرا نادر موقع تھا، جب وہ دشمنوں کی باہمی جنگ سے فائدہ اٹھا سکتی تھی، مگر عثمان ثالث اس جنگ میں اخلاق و شرافت کے اسی اصول پر قائم رہا جس کی مثال محمود اول نے آسٹریا کی جنگ جانشینی کے موقع پر پیش کی تھی، سلطنت کے اندرونی نظم و نسق میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، اس عہد میں کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔

۱۶ صفر ۱۱۷۷ھ مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۷۷۵ء کو سلطان عثمان ثالث نے وفات پائی۔

مصطفیٰ ثالث

۱۱۸۷ھ تا ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۵۷ء تا ۱۷۵۸ء

عثمان ثالث کے بعد مصطفیٰ ثالث تخت پر آیا، یہ سلطان احمد ثالث کا لڑکا تھا، تخت نشینی کے وقت اس کی عمر پچاس سال کی تھی اور یہ طویل مدت امور سلطنت سے علاحدہ محل کے ایک حصہ میں بسر ہوئی تھی، تاہم فطری اہلیت نے تجربہ کی کمی بہت کچھ پوری کر دی تھی اور اگر روس سے جنگ نہ چھڑ گئی ہوتی تو کوئی شبہ نہیں کہ اس کی فرض شناسی اور تدبیر سے سلطنت کو بہت فائدہ پہنچتا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ مصطفیٰ نام کے جتنے سلطان ہوئے ان سب کے عہد میں سلطنت عثمانیہ کو بہت زیادہ نقصان پہنچا اور اس کے مقبوضات کے اہم حصے دشمنوں کے ہاتھوں میں چلے گئے، تاہم مصطفیٰ ثالث کے عہد کے ابتدائی چھ سال جب انصراہ حکومت صدر اعظم راغب پاشا کے ہاتھ میں تھا، دولت علیہ کی خوش حالی اور ترقی کے سال تھے۔

راغب پاشا | راغب پاشا سلطان محمود اول کے آخری دور میں صدر اعظم رہ چکا تھا، اپنی غیر معمولی لیاقت، تدبیر اور حسن انتظام کے لحاظ سے وہ صدر اعظم صوقولٹی پاشا اور وزرائے کو پریلی کا ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے، اپنی وفات تک اس نے دولت علیہ کو دوسری سلطنتوں کی آویزش سے محفوظ رکھا اور قیام امن کے ساتھ پوری توجہ سلطنت کی فلاح و بہبود پر صرف کرتا رہا، اس نے سلطنت کے مختلف صیغوں کی اصلاح کی، اوقاف کی نگرانی کا خاص طور پر اہتمام کیا، شفا خانے بنوائے اور اپنی جیب خاص سے ایک کتب خانہ عام قائم کیا، گرائی اور

قط کے سد باب کے لیے اس نے اندرون ملک میں ذرائع حمل و نقل کو آسان بنا دینے کی ایک ایسی تجویز اختیار کی جس کی تکمیل نہایت درجہ مفید ثابت ہوتی لیکن اسے پورا کرنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا، وہ تجویز یہ تھی کہ خلیج نائیکومیڈیا کے مشرقی سرے سے ایک نہر نکال کر جھیل سبنجا (Sabandja) میں ملا دی جائے اور دوسری نہر جھیل سبنجا سے نکال کر دریائے سقاریہ میں ملا دی جائے، جو بحر اسود میں گرتا ہے، اس طرح باسفورس سے گزرے بغیر خلیج نائیکومیڈیا سے بحر اسود تک آمد و رفت ہو جاتی، ان دو بڑی نہروں سے چھوٹی چھوٹی نہروں کا سلسلہ قائم کر دیا جاتا جن سے ملک کے ایک حصہ کی چیزیں دوسرے حصوں تک بہت آسانی کے ساتھ منتقل کی جاسکتی تھیں، تجارتی فائدہ کے علاوہ سبنجا میں ترکی بحریہ کا بھی ایک محفوظ اور مضبوط مرکز قائم کیا جاسکتا تھا، یہ تجویز کوئی نئی نہیں تھی، مصطفیٰ ثالث سے قبل سلیمان اعظم، مراد ثالث اور محمد رابع نے بھی اس کو عملاً شروع کر دیا تھا لیکن تکملہ کسی سے بھی نہ ہوسکا، کرلیسی کا بیان ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے قیام سے پہلے بھی دو بار پتھیا کے فرماں رواؤں نے اور ایک بار شہنشاہ ٹریجن (Trajan) نے اسی تجویز کو اختیار کیا تھا، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے فوائد کے احساس کے باوجود اس کی تکمیل کسی نے بھی نہ کی، حالاں کہ نہ فاصلہ زیادہ تھا اور نہ زمین ایسی تھی جس کی کھدائی دشوار ہوتی۔

پرشا سے اتحاد | راغب پاشا کی خارجی سیاست اہم ترین مقصد یہ تھا کہ دولت عثمانیہ کو روس اور آسٹریا کی دشمنی سے محفوظ رکھنے کی غرض سے دوسری عیسائی مملکتوں سے اتحاد قائم کیا جائے، آسٹریا کی جنگ جانشینی اور پھر جنگ ہفت سالہ کے بعد پرشا کا شمار یورپ کی نہایت طاقت ور مملکتوں میں ہونے لگا تھا اور اس کے فرماں روا فریڈرک ثانی سے روس اور آسٹریا دونوں حد درجہ بغض و عناد رکھتے تھے، راغب پاشا نے اسی بنا پر پرشا کی دوستی کو بہت ضروری خیال کیا اور اس کے لیے شروع ہی سے کوشش کرتا رہا، بالآخر ۱۷۹۷ء میں باب عالی اور پرشا کے درمیان ایک معاہدہ اتحاد مرتب ہو گیا اور فریڈرک ثانی کے سفیر نے قسطنطنیہ

میں اس پر دستخط کر دیے، فریڈرک کو دولت عثمانیہ سے اتحاد کرنے میں روس اور آسٹریا کی دشمنی سے قطع نظر اس وجہ سے بھی تامل نہ ہو کہ اس کے برعکس صورت اختیار کرنے میں اسے کوئی خاص فائدہ نظر نہ آتا تھا، کیوں کہ اس کا ملک ہر طرف عیسائی مملکتوں سے گھرا ہوا تھا اور اگر سلطنت عثمانیہ کا کوئی علاقہ نکل بھی جاتا تو اس سے پرشا کی مملکت میں اضافہ ہونے کا امکان نہ تھا، اسی قسم کا اتحاد سوئڈن، نیپلز اور ڈنمارک سے بھی پہلے ہی قائم کر لیا گیا تھا، راغب پاشا چاہتا تھا کہ پرشا سے دوستی کا جو معاہدہ ہوا ہے، اسے مستحکم کرنے کے لیے اس شرط کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ فریقین جارحانہ اور مدافعانہ جنگوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہیں گے لیکن اس مسئلہ میں گفتگو کرنے کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ۱۶۳۷ء میں راغب پاشا کا انتقال ہو گیا اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

فریڈرک کا تقض عہد | راغب پاشا کی وفات کے بعد سلطان نے انتظام حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لیا، وہ ایک نہایت جفاکش اور لائق فرماں روا تھا اور سلطنت کی فلاح و بہبود کا دل سے خواہاں تھا لیکن اپنے وزیروں اور فوج کے بڑے بڑے افسروں کے انتخاب میں اکثر غلطی کر جاتا جو سلطنت کے لیے مضر ثابت ہوتی، اتفاق یہ ہے کہ اس کے ہم عصر فرماں رواؤں میں دو ایسے تھے جو اپنی غیر معمولی لیاقت اور طاقت کے اعتبار سے یورپ کے عظیم ترین فرماں رواؤں میں شمار کیے جاتے تھے، یعنی کیتھرائن ثانیہ جس نے ۱۶۳۷ء میں اپنے شوہر زار کو قتل کرا کے روس کے تخت پر قبضہ کر لیا تھا اور فریڈرک ثانی جو اپنے کارناموں کی وجہ سے تاریخ میں فریڈرک اعظم کے نام سے مشہور ہے، یہ صحیح ہے کہ فریڈرک اور باب عالی کے درمیان دوستی کا ایک معاہدہ ہو چکا تھا لیکن یہ معاہدہ اسی وقت تک قائم رہا جب تک اس کی پابندی فریڈرک کی ہوس و خود غرضی کے لیے روک نہ بنی، جون ہی اس نے محسوس کیا کہ پرشا کے اغراض اس معاہدہ کے مسترد کر دینے ہی سے پورے ہو سکتے ہیں، اس نے بلا تامل اسے توڑ کر دولت عثمانیہ کے دشمنوں سے رشتہ اخوت جوڑ لیا۔

کیتھرائن ثانیہ | کیتھرائن ثانیہ ایک فوجی بغاوت کے بعد تخت پر آئی تھی، جن فوجی سرداروں نے اس کے شوہر زار روس کو قتل کر کے اسے تخت پر بیٹھایا تھا، وہ مزید قتل و غارت گری کے لیے بیتاب تھے اور ان کی نگاہیں ہر کم زور مملکت کی طرف اٹھتی تھیں جس پر روس کی دست اندازی آسانی سے ممکن تھی، اس مقصد کے لیے انہوں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ پہلے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے اندرون ملک میں خانہ جنگی شروع کر دیتے اور پھر کم زور جماعت کی حمایت کے بہانہ سے دخل اندازی کرنے لگتے اور جب خود ان ہی کی پیدا کی ہوئی بد امنی ان کی کوششوں سے ترقی کر جاتی تو قیام امن کے دعوے کے ساتھ روسی فوجیں اس ملک میں داخل کر کے اس پر قبضہ کر لیتے، کیتھرائن کے عہد کے ابتدائی سالوں میں یہ تدبیر خصوصیت کے ساتھ پولینڈ میں عمل میں لائی گئی، پر شا بھی اس غارت گری میں روس کا شریک ہو گیا، فریڈرک ثانی کو روس اور آسٹریا کے خلاف دولت عثمانیہ کے اتحاد کی خواہش باقی نہ رہی، بلکہ اس نے ۱۶۷۱ء میں کیتھرائن کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا، جس کے روسے فریقین پابند ہو گئے کہ ایک دوسرے کے مقبوضات کا تحفظ کریں گے اور عہد کیا کہ اگر کسی فریق پر حملہ ہو گیا تو دوسرا فریق دس ہزار پیدل اور ایک ہزار سواروں سے اس کی مدد کرے گا لیکن اگر روس پر ترکوں نے حملہ کیا یا پر شا پر فرانسیسیوں نے تو مدد بجائے فوج کے نقد کی شکل میں ہوگی، اس معاہدہ کی ایک خفیہ دفعہ بھی تھی جس کا تعلق پولینڈ سے تھا اور اس کے نکتہ کے چند ہی روز بعد دونوں حکومتوں کے درمیان پولینڈ کی تقسیم کی نسبت ایک تازہ معاہدہ بھی ہو گیا، جس میں میریا تھریسیا بھی شریک کی گئی، روس اور پرشانی فوجوں نے پولینڈ پر قبضہ کر لیا اور کیتھرائن کے ایک سابق آشنا اسٹانسلاوس پونیاٹوسکی (Stanislans Poinatowski) کو بچھر پولینڈ کے تخت پر بیٹھایا گیا، حالانکہ پولینڈ کے باشندے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرنے پر کسی طرح راضی نہ تھے، روسی جنرل رپن (Repin) نے وارسا میں ڈکلیئر کی حیثیت اختیار کر لی، باب عالی نے روس اور پرشا کی اس ظالمانہ کارروائی کے خلاف سخت احتجاج کیا، مگر ان

سلطنتوں نے مطلق پرواہ نہ کی، برخلاف اس کے روس نے اپنے طرز عمل سے ظاہر کر دیا کہ وہ باب عالی کو جنگ پر مجبور کر دینا چاہتا ہے، اس نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے کریمیا، موریا، مونٹی نگر اور جار جیا کے علاقوں میں دولت علیہ کے خلاف بغاوت پھیلانے کی کوشش کی، اس کے علاوہ جب پولینڈ کے وطن پرستوں کے حدود میں پناہ گزین ہوئی تو روسی جنرل وٹسمین (Wessmann) نے بلطہ تک اس کا تعاقب کیا، جو بسرابیا کی سرحد پر خان کریمیا کے علاقہ میں واقع تھا اور شہر پر گولہ باری کر کے اسے برباد کر دیا۔

اعلانِ جنگ | روس کی مذکورہ بالا کارروائیوں سے مجبور ہو کر سلطان نے ۶ اکتوبر ۱۷۶۸ء کو قسطنطنیہ میں ایک دیوان منعقد کیا اور اراکین سلطنت سے اس باب میں مشورہ کیا، سب نے بالاتفاق روس کی دراز دستوں کی بنا پر جنگ کی رائے دی اور پولینڈ کے ساتھ اس کے طرز عمل کو معاہدہ بلنغراد کی خلاف ورزی قرار دے کر جنگ کو ضروری قرار دیا، البتہ صدر اعظم محسن زادہ پاشا تنہا شخص تھا جس نے اس رائے کی مخالفت کی، اصول کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے کہ دولت علیہ اس وقت جنگ کے لیے کافی طور پر تیار نہ تھی اور پوری تیاری کے بغیر لڑائی چھیڑ دینا کسی طرح مناسب نہ تھا، اس مخالفت کی بنا پر جو بعد کے واقعات سے بالکل حق بہ جانب ثابت ہوئی، وہ صدارت کے عہدہ سے برطرف کر دیا گیا اور اس کی جگہ امین محمد پاشا جو سلطان کا داماد تھا، صدر اعظم مقرر ہوا، دیوان کے فیصلہ کے مطابق ۶ اکتوبر ۱۷۶۸ء کو اعلانِ جنگ کر دیا گیا۔

آغازِ جنگ | اعلانِ جنگ میں عجلت کی گئی، موسم سرما میں ایشیا کی فوجوں کو منتقل کرنا بہت دشوار تھا اور اسی وجہ سے ۱۷۶۹ء کے موسم بہار تک عثمانی فوجیں اکٹھا نہ ہو سکیں لیکن یہ تاخیر روس کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی، اس نے سلطنت عثمانیہ کے شمالی علاقوں پر حملہ شروع کر دیا، اعلانِ جنگ کے وقت ترکی قلعوں کی حالت بھی قابل اطمینان نہ تھی، نہ ان کی قلعہ بندی مستحکم تھی اور نہ سامانِ رسد کافی مقدار میں جمع تھا، موسم سرما میں باب عالی نے ہر کمی کو

پورا کرنے کی کوشش کی، مگر وقت تنگ تھا، موسم بہار میں باقاعدہ جنگ شروع ہونے تک بھی پوری تیاری نہ ہو سکی۔

ابتدائی فتح | بہر حال جنگ کے ابتدائی دور میں کریم گرائی، خان کریمیا نے روسیوں کو عاجز کر دیا، جنوری ۱۶۹۷ء میں اس نے بلطہ میں ایک لاکھ تاتاری سپاہیوں کا ایک زبردست لشکر تیار کر کے دریائے بوگ کو عبور کیا اور دو ہفتہ تک روس کے جنوبی علاقوں کو تاخت و تاراج کرتا رہا، اس مہم میں بیرون دی توت (Baron de Tott) مشہور فرانسسیسی ماہر حرب بھی اس کے ساتھ تھا، جسے شاہ فرانس نے عثمانی فوجوں کی تنظیم و تربیت کے لیے باب عالی میں بھیجا تھا، جنوبی روس کی لشکر کشی کے بعد کریم گرائی کریمیا کو واپس آ گیا اور ایک ہی ماہ کے اندر اس کا انتقال ہو گیا، لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے یونانی طبیب نے اسے زہر دے دیا، یہ طبیب امیر ولاچیا کا آدمی تھا، اس کی وفات پر سلطان نے دولت گرائی کو کریمیا کا خان مقرر کیا لیکن کریم گرائی کی لیاقت و شجاعت سے اسے کوئی مناسبت نہ تھی۔

روس کی تیاریاں | اسی درمیان میں کیتھرائن نے پانچ فوجیں میدان جنگ کو روانہ کیں، پہلی فوج نے شہزادہ گالٹزن (Galitzen) کی سرکردگی میں مولڈویا پر حملہ کر کے خوزیم کا محاصرہ کر لیا، دوسری فوج جنرل رومانزوف (Romarzoff) کے زیر قیادت دریائے نیپر اور بحر اظف کے درمیان روسی قلعوں کے استحکام اور اظف اور تگروک کے قلعوں کی از سر نو تعمیر کے لیے روانہ ہوئی، جو معاہدہ بلغراد کے رو سے مسمار کر دیے گئے تھے، تیسری فوج دس گیارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ پولینڈ پر قبضہ کرنے کے لیے بڑھی تاکہ اس طرف سے ترکوں کو مدد نہ مل سکے، چوتھی نے قبارطہ اور کیوبان کے تاتاری علاقوں کا رخ کیا اور پانچویں تفلیس کی طرف روانہ ہوئی تاکہ وہاں سے شہزادگان جا رجیا کے ساتھ مل کر اراضِ روم اور طرابزون پر حملہ کرے، ساتھ ہی موئی نگر و کی عیسائی رعایا کے پاس روپیہ، سامان حرب اور فوجی افسر روانہ کیے گئے کہ انہیں ترکوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کریں۔

امین پاشا کی نااہلی | روس کی ان تیاریوں کے باوجود امین پاشا ۶۹ء تک مقابلہ کے لیے روانہ نہ ہو سکا اور روانہ ہونے کے بعد بھی خودیہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کوچ کس سمت کو ہونا چاہیے، اس نے فوجی افسروں کو مشورہ کے لیے جمع کیا اور فن حرب سے اپنی عدم واقفیت کا اعتراف صاف الفاظ میں کرتے ہوئے فوج کی نقل و حرکت سے متعلق ان کی رائے دریافت کی، اس نے کہا:

”مجھے جنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے، فوج کی نقل و حرکت کا فیصلہ آپ لوگوں پر ہے،

اور یہ آپ ہی بتائیں گے کہ افواج عثمانیہ کی کامیابی کے لیے بہترین تدبیریں کیا ہوں گی،

آپ لوگ بلا تکلف اپنے خیالات ظاہر کریں اور اپنے مشورہ سے میری رہ نمائی کریں۔“

افسران فوج کو سپہ سالار کے اس اعتراف نااہلی پر سخت تعجب ہوا لیکن ان کے لیے

اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بحث و مباحثہ کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کریں، چنانچہ

متعدد افسروں نے مختلف رائے پیش کیں، آخر میں صرف اس پر اتفاق ہو سکا کہ دریائے

ڈینیوب کو عبور کر کے مولڈیویا میں داخل ہو جائیں اور پھر جیسی صورت مناسب ہو اس کے

مطابق عمل کریں، چنانچہ فوج نے دریائے ڈینیوب کو عبور کیا، پھر دریائے پرتھ کے ساحل پر

خاند ہی پہنچی جو خوزیم اور باسی کے درمیان واقع ہے، وہاں سامان رسد کی قلت اور پسوؤں

اور چھھروں کی کثرت نے سپاہیوں کو پریشان کر دیا اور امین پاشا نے مجبور ہو کر بندر کارخ کیا

لیکن اس طرف بھی وہی دشواریاں پیش آئیں جن سے خاند ہی میں دوچار ہونا پڑا تھا، اس

درمیان میں شہزادہ گالٹرن پوڈولیا سے تازہ افواج لے کر ترکوں کے مقابلہ کی تیاریاں کر رہا

تھا، روس نے پولینڈ کو مجبور کر کے اس سے دولت عثمانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تھا

جس کے جواب میں باب عالی نے بھی بادل ناخواستہ پولینڈ کے خلاف ہتھیار اٹھالیے،

خوزیم کے قریب روسی اور عثمانی فوجوں میں متعدد چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں جن میں

صدر اعظم امین پاشا اور گالٹرن دونوں نے اپنی نااہلی کا پورا پورا ثبوت دیا، سلطان نے امین

پاشا کو معزول کر کے واپس بلا لیا اور اگست ۶۹ء میں اسے قتل کر دیا، امین پاشا کا جانشین صدر اعظم علی پاشا ایک بہادر افسر تھا، سالار عسکر ہونے کے بعد اس نے روسی فوجوں پر خوزیم کے قریب متعدد حملے کیے اور پولینڈ میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن آخر کار اسے ہزیمت ہوئی اور ۱۸ ستمبر ۶۹ء کو خوزیم نے ہتھیار ڈال دیے، ترکی فوجوں نے پسپا ہو کر دریائے ڈینوب کی طرف کوچ کیا، کیتھرائن نے بھی گالٹزن کو اس کی نالائقی کی بنا پر واپس بلا لیا اور اس کی جگہ رومانزوف کی روسی فوجوں کا سپہ سالار اعظم مقرر کیا، جس نے تھوڑے ہی دنوں میں تمام مولڈویا پر قبضہ کر لیا۔

موریا میں روس کی شکست | لیکن اس کام یابی سے کیتھرائن کے حوصلوں کی تشفی نہ ہوئی، اس کی ”مشرقی تجویز“ کا اہم ترین مقصد ترکوں کو یورپ سے نکال دینا تھا، یہی مقصد پیٹر اعظم کے پیش نظر بھی تھا اور مارشل میونخ کی تمام سرگرمیاں بھی صرف اسی کے لیے تھیں، یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے روسی فوجوں کی فتوحات کے علاوہ عیسائی رعایا کو بھی دولت علیہ کے خلاف برگشتہ کر دینا بہت ضروری تھا، چنانچہ کیتھرائن نے عمان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اپنے آدمیوں کو خفیہ طور پر راہبوں کے لباس میں یونان اور یورپین ترکی کے جنوبی علاقوں میں بھیجنا شروع کر دیا تھا تا کہ عیسائی رعایا کو علم بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کر رکھیں، موریا کی یونانی رعایا میں کیتھرائن کے فرستادوں کی کوششیں خاص طور پر کام یاب ہوئیں اور ان لوگوں نے اصرار کے ساتھ کیتھرائن سے مدد کی درخواست کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر بالکل تیار ہیں، یہ وقت دولت علیہ کے لیے مختلف پریشانیوں کا وقت تھا، ایک طرف اگر کریمیا اور دریائے ڈینوب کے ساحلی علاقوں پر روسی فوجیں غالب آرہی تھیں تو دوسری طرف مصر کے والی علی بیگ نے تقریباً خود مختاری حاصل کر لی تھی، پھر شام میں بھی بغاوت پھیلی ہوئی تھی، روس نے باغیوں کی مدد کر کے ان کی ہمتوں کو اور بھی بڑھا دیا اور کیتھرائن کو توقع ہو گئی کہ ایک ہی کوشش میں یونان، مصر اور شام

تینوں صوبے سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل جائیں گے، یونان والوں کے اصرار پر اس نے ایک بحری جنگی بیڑا الکسیز اور لوف (Alexisorloff) کر سرکردگی میں روانہ کیا جو فروری کے اثناء میں ساحل موریا کے سامنے نمودار ہوا، باغیوں نے روسی فوج کا پر جوش استقبال کیا اور اس علاقہ کے ترک باشندوں پر جن کی تعداد نسبتاً بہت کم تھی، شدید ترین مظالم توڑے، محسن زادہ پاشا سابق صدر اعظم موریا کا حاکم تھا، اس نے نہایت استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا اور بالآخر یونانی باغیوں اور ان کے روسی حلیفوں کو میدان جنگ میں شکست دی، روسی دستہ شکست کھا کر اپنے جہازوں پر بھاگا اور فوراً لنگر اٹھا کر یونانیوں کو خیر باد کہتا ہوا روانہ ہو گیا، واپسی میں جزائر موڈن و کورن پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا، ۷ جولائی کے اثناء کو جزیرہ سیوس (Seios) کے قریب ایک عثمانی بیڑہ سے مقابلہ ہوا، ترکوں کو شکست ہوئی لیکن اس جنگ میں عثمانی بیڑے کے ایک افسر حسن الجزازی نے اپنی حیرت انگیز شجاعت کا لوہا غنیم سے بھی منوالیا، اس نے اپنا جہاز روسی امیر البحر کے جہاز کے قریب لے جا کر گولہ باری شروع کر دی اور دشمن سے گھرے ہونے کے باوجود کمال بے خوفی کے ساتھ لڑتا رہا، یہاں تک کہ دونوں جہازوں میں آگ لگ گئی۔

عثمانی جہازوں کی بربادی | عثمانی بیڑہ شکست کے بعد شسمہ (Tehesma) کی چھوٹی سی بندرگاہ میں پناہ گزیں ہوا، جہاں روسی امیر البحر الفنسٹن (Elphinstone) نے اس کا محاصرہ کر لیا، الفنسٹن ایک انگریز افسر تھا جس کی خدمات روس نے حاصل کر لی تھیں، اس کے علاوہ اور بھی متعدد انگریز روسی بیڑہ کے ذمہ دار عہدوں پر مامور تھے، ان ہی میں سے ایک نے جس کا نام ڈگڈیل (Dugdale) تھا، الفنسٹن اور ایک دوسرے انگریز افسر گریگ (Gregg) کے مشورہ سے عثمانی بیڑہ کو برباد کر دینے کی ایک نہایت خطرناک تدبیر اختیار کی، وہ اپنے جہاز کو لے کر شسمہ کی بندرگاہ میں داخل ہوا، جہاں عثمانی جہاز ایک دوسرے سے

ملے ہوئے محصور کھڑے تھے اور جب ان کے قریب پہنچ گیا تو ایک جہاز میں آگ لگا دی، آگ لگنے سے قبل ہی اس جہاز کے تمام روسی سپاہی اپنی جان بچانے کے لیے پانی میں کود پڑے تھے اور اس کو تنہا چھوڑ دیا تھا لیکن ڈگڈیل نے اس کی پرواہ نہ کی اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر عثمانی بیڑہ کے ایک جہاز میں آگ لگا دی، یہ آگ فوراً ہی دوسرے جہازوں تک پھیل گئی اور چوں کہ بندرگاہ کے تنگ ہونے کی وجہ سے تمام جہاز پاس ہی پاس کھڑے ہوئے تھے، اس لیے پورا بیڑا دیکھتے ہی دیکھتے جل کر برباد ہو گیا، صرف ایک جہاز باقی رہ گیا جسے روسیوں نے گرفتار کر لیا اور پھر شمسہ کے شہر، قلعہ اور توپ خانہ پر بھی انہوں نے قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد الفنسٹن نے چاہا کہ روسی بیڑہ کے ساتھ فوراً دردنیاں کوروانہ ہو جائے اور بحر مارمورا میں داخل ہو کر قسطنطنیہ پر گولہ باری شروع کر دے لیکن اورلوف نے اس تجویز پر عمل کرنے میں پس و پیش اور تاخیر کی، ترکوں نے اس کی اطلاع پاتے ہی دردنیاں کے دونوں ساحلوں پر دو دو توپ خانے آمنے سامنے نصب کر دیے اور اس مورچہ بندی کے بعد روسی جہازوں کے لیے دردنیاں میں داخل ہونا ناممکن ہو گیا۔

حسن کی حیرت انگیز کامیابی | ادھر سے مایوس ہو کر اورلوف روسی بیڑہ کے ساتھ جزائر لمنوس پہنچا اور وہاں اپنی فوجیں اتار کر جزیرہ کے خاص قلعہ کا محاصرہ کر لیا، دو ماہ کے محاصرہ کے بعد قلعہ کے ترکی دستہ نے بعض شرائط پر ہتھیار ڈال دینا منظور کیا لیکن اسی درمیان میں حسن الجزائری نے باب عالی سے اس بات کی اجازت حاصل کر لی کہ قسطنطنیہ کے چار ہزار اوباشوں کی ایک فوج مرتب کر کے لمنوس کو روسی بیچہ سے چھڑا لینے کی کوشش کرے، جب اس سے کہا گیا کہ ایسی فوج سے یہ مہم سرنہ ہو سکے گی تو اس نے جواب دیا کہ اگر حملہ ناکام رہا تو بھی اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ دارالسلطنت کے بد معاشوں میں چار ہزار کی کمی ہو جائے گی، چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۷۷۰ء کو علی الصباح اس عجیب و غریب فوج کے ساتھ لمنوس کے مشرقی

ساحل پر اتر کر اس نے محاصرہ کرنے والوں پر اچانک حملہ کر دیا، روسیوں کا اکثر حصہ قتل ہو گیا، بقیہ اپنی جان لے کر بھاگا اور جہازوں پر سوار ہو کر فوراً روانہ ہو گیا، اس مہم کی حیرت انگیز کامیابی کے بعد سلطان نے حسن کو عثمانی بحریہ کا قبودان پاشا مقرر کیا، حسن نے ایک تازہ بیڑا مرتب کر کے چند ہی روز کے بعد بندر مونڈریسو (Mondreso) کے قریب روسی بیڑہ کو پھر شکست دی، اور لوف کو مجبوراً اپنے جہاز لے کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔

علی بیگ کی بغاوت | اس وقت مصر اور شام میں بغاوت برپا تھی، اور لوف نے باغی مملوکوں کے سردار علی بیگ کی مدد کے لیے چار ہزار روسی فوجی سپاہی شام میں اتارے، عکہ کے عامل شیخ طاہر نے بھی علی بیگ کا ساتھ دیا، چنانچہ شیخ طاہر اور روسی فوج کی مدد سے اس نے غزہ، بیت المقدس، یافا اور دمشق وغیرہ شام کے متعدد بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا، وہ چاہتا تھا کہ اس کے بعد اناطولیہ پر حملہ آور ہو لیکن مصر کے ایک مملوک امیر ابو ذہب نے جو علی بیگ کا عزیز تھا، خود اس کے خلاف بغاوت کر دی جس کے مقابلہ کے لیے علی بیگ کو مصر واپس جانا پڑا، علی بیگ کو شکست ہوئی اور وہ مع اپنے چار سو روسی مددگاروں کے ساتھ مارا گیا، ابو ذہب نے علی بیگ اور روسی امراء کے سر کاٹ کر قسطنطنیہ بھیج دیے۔

ترکوں کی مسلسل شکست | اس درمیان میں دریائے ڈینیوب کے ساحلی علاقوں میں روس سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور عثمانی فوجوں کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں، ۱۷۷۰ء میں روسی سپہ سالار رومانزوف نے تمام مولڈوویا کو تاراج کر ڈالا، صدر اعظم خلیل پاشا تیس ہزار عثمانی سپاہ اور تاتاریوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ مقابلہ کے لیے آگے بڑھا، کرنال کے مقام پر دونوں فوجیں مقابل ہوئیں، میدان روسیوں کے ہاتھ رہا اور ترک اپنی توپیں اور بہت کچھ سامان چھوڑ کر منتشر ہو گئے، ۱۷۷۱ء کے آخر تک دریائے ڈینیوب کے شمال میں عثمانی قلعے تھے، سب پر روس کا قبضہ ہو گیا، صدر اعظم کی فوج میں صرف دو ہزار سپاہی باقی رہ گئے، آئندہ سال (۱۷۷۱ء) عثمانی اقتدار کے لیے اور زیادہ برباد کن ثابت

ہوا، شہزادہ ڈول گورو کی (Dolgoruki) اسی ہزار روسی ملور ساٹھ ہزار تاتاری سپاہ کے ساتھ، جو کیتھرائن کی فوج میں شامل ہو گئے تھے، کریمیا پر حملہ آور ہوا، سلیم گرائی خان کریمیا نے شروع میں تو مقابلہ کیا لیکن جلد ہمت ہار گیا اور ملک کو روسیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر قسطنطنیہ روانہ ہو گیا، اس کے یوں بھاگ کھڑے ہونے سے تاتاریوں کی ہمت چھوٹ گئی اور بہتوں نے اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر اناطولیہ میں پناہ لی، جو باقی رہ گئے، انہوں نے روسی فاتحوں سے صلح کر لینی چاہی، ڈول گورو کی نے نہایت ہوشیاری سے کام لیا اور وعدہ کیا کہ زارنہ کی زیر سیادت اہل کریمیا کی آزادی برقرار رکھی جائے گی اور کریمیا کے شاہی خاندان کا ایک رکن وہاں کا فرماں روا مقرر کر دیا جائے گا، اس وعدہ کی بنا پر تاتاریوں نے زارنہ کی وفاداری کا حلف لیا اور اپنے اڑتالیس نمائندوں کو سلیم گرائی کے دہلیزوں کے ساتھ کیتھرائن کے دربار میں سینٹ پیٹرس برگ روانہ کیا، اس کے بعد کافہ، کرش اور نی قلعہ کے قلعوں نے اپنے دروازے روسیوں کے لیے کھول دیے، کریمیا میں جو ترکی دستہ متعین تھا، اس نے روسی فوج کا مقابلہ کیا لیکن اس کی تعداد غنیم کے مقابلہ میں اس قدر کم تھی کہ مقاومت بے سود ثابت ہوئی اور شکست کے بعد ترکی سرعسگر گرفتار ہو کر سینٹ پیٹرس برگ بھیج دیا گیا، سارے کریمیا پر روس کا تسلط قائم ہو گیا، اسی سال روسی فوجوں نے یکے بعد دیگرے ولاچیا اور مولڈیویا پر بھی قبضہ کر لیا اور خوزیم اور یاسی کے اہم قلعے بھی فتح کر لیے، البتہ اوکزاکوف اور کلبرن کی مدافعت میں عثمانی فوجیں کامیاب رہیں اور محسن زادہ پاشا نے روسیوں کو شکست دے کر گرجیوو (Giurgevo) کے قلعہ پر جو دریائے ڈینیوب کے ساحل پر واقع تھا، دوبارہ قبضہ کر لیا مگر جارجیا اور منگولیا سے ترکوں کو پسپا ہونا پڑا۔

یورپ کی خدائی | روسی فوجوں کی ان فتوحات سے اب آسٹریا اور پرشا کی حکومتیں متردد نظر آنے لگیں، کیوں کہ روس کی بڑھتی ہوئی طاقت خود ان کے لیے خطرناک ہو رہی تھی، چنانچہ دونوں نے کوشش شروع کی کہ کسی طرح دولت عثمانیہ اور روس میں صلح ہو جائے، اس

جنگ میں یورپین حکومتوں کی سیاست مکرو فریب کا ایسا نمونہ تھی، جس کی مثال صرف یورپ ہی کی تاریخ میں مل سکتی ہے، اس اجمال کی تفصیل کے لیے سطور ذیل ملاحظہ ہوں۔

فرانس | حکومت فرانس دولت عثمانیہ کی دوست اور روس کی دشمن تھی، اس کی خارجی سیاست کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ دولت علیہ سے مل کر روس کے دائرہ اقتدار کو بڑھنے سے روکے، خصوصاً پولینڈ کو اس کی زد سے محفوظ رکھے لیکن اس کے باوجود وہ روس سے ترکوں کی حمایت میں جنگ کرنے کے لیے تیار نہ تھا، برخلاف اس کے اس کی پالیسی یہ تھی کہ جنگ سے علاحدہ رہ کر سلطنت عثمانیہ اور روس کو باہم لڑادے، تاکہ دونوں ایک ہی وقت میں کم زور ہو جائیں، فرانس کے وزیر اعظم شوازیل (Choiseul) نے دسمبر ۱۷۶۹ء میں ایک خط پر فرانس کو نتر (Kunitz) وزیر اعظم آسٹریا کو اس مضمون کا لکھا کہ ترکی اور روس کی جنگ جتنے ہی عرصہ تک قائم رہے، فرانس اور آسٹریا کے اتحاد کے لیے مفید ہے، کیوں کہ اس صورت میں دونوں حریف یکساں طور پر کم زور ہو جائیں گے اور اگر زمانہ نے مساعدت کی تو اس سے ہمیں بے شمار فوائد حاصل ہوں گے، نہ صرف یہ کہ اس جنگ کے جاری رکھنے میں حکومت فرانس اپنا فائدہ دیکھ رہی تھی بلکہ روس کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لیے باب عالی کو اپنی ترغیبوں سے مجبور بھی اسی نے کیا، چنانچہ جب کینتھرائن کے ایجنٹ یونان، کریٹ، بوسنیا اور مونٹی نگرو میں پہنچ کر عیسائی رعایا کو دولت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے لگے تو فرانس کے سفیر ورجینز (Vergennes) نے اس بات پر زور دیا کہ روس کی ان کارروائیوں کا جواب دیا جائے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد جب اہل پولینڈ کی ایک جماعت روس کے مظالم سے تنگ آ کر سلطنت عثمانیہ کی سرحد میں پناہ گزیں ہوئی اور روسی دستوں نے وہاں اس کا تعاقب کیا تو باب عالی کو اعلان جنگ پر آمادہ کرنے میں زیادہ دخل سفیر فرانس ہی کے مشورہ کو تھا، حکومت فرانس کے نزدیک یہ جنگ اتنی اہم اور ضروری تھی کہ اس نے اپنے سفیر کو اس عظیم الشان خدمت کے

صلیہ میں تین ملین کی گراں قدر رقم پیش کی تھی، مگر ورجینز نے اس رقم کو واپس کر دیا اور لکھا کہ اعلان جنگ ہو گیا ہے، میں نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی، تین ملین کی رقم جو میرے کام کے لیے بھیجی گئی ہے واپس کرتا ہوں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

انگلستان | فرانس کی دشمنی تو چھپی ہوئی تھی لیکن انگلستان کا طرز عمل واضح طور پر مخالفانہ تھا، گو بظاہر وہ بھی اپنے کو دولت عثمانیہ کی حیثیت سے پیش کر رہا تھا، چنانچہ جیسا کہ مصطفیٰ کامل پاشا نے لکھا ہے، اٹھارہویں صدی میں انگلستان کی سیاست دولت عثمانیہ کی نسبت دو رخی تھی، ایک طرف تو وہ روسیوں کو جنگ میں پوری مدد دے رہا تھا اور دوسری طرف دولت عثمانیہ کی دوستی کا دم بھر رہا تھا، تا کہ اس کے رازوں سے واقف ہو کر حکومت روس کو باخبر کرتا رہے، انگلستان کی اس پالیسی کے مختلف اسباب تھے، چند ہی سال قبل انگلستان نے فرانس کو شکست دے کر ہندوستان پر قبضہ کیا تھا، جس کی وجہ سے فرانس اس کا سب سے بڑا دشمن تھا اور چوں کہ فرانس دولت عثمانیہ کا حلیف تھا، اس لیے قدرتا انگلستان روس کی جانب مائل ہوا، روس اور انگلستان کے اتحاد میں اس وجہ سے بھی سہولت ہوئی کہ ابھی تک روس کی توجہ ہندوستان کی جانب مبذول نہیں ہوئی تھی اور انگلستان کو روس کی طرف سے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا تھا، علاوہ بریں ان دونوں سلطنتوں میں تجارتی تعلقات بھی تھے، روس کی درآمد تمام تر انگلستان سے ہوتی تھی، اگر انگلستان روس کا ساتھ نہ دیتا تو ان تجارتی تعلقات کا منقطع ہو جانا یقینی تھا لیکن چوں کہ اسی زمانہ میں انگلستان اپنی سلطنت کے اندرونی خلفشار میں مبتلا تھا، یعنی ایک طرف امریکہ کے نوآباد کار آزادی اور خود مختار حکومت کا مطالبہ کر رہے تھے اور دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی تسلط قائم کرنے کی جدوجہد جاری تھی، اس لیے روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ میں وہ کوئی نمایاں حصہ نہ لے سکا، تاہم اس کے متعدد جنگی جہاز روسی بیڑہ میں شامل تھے اور بہت سے انگریز افسر روسی جہازوں اور فوجوں میں کام

کر رہے تھے، پھر بھی جیسا کہ اوپر بیان ہوا وہ دولت علیہ کی دوستی کے پردہ میں روس کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا اور اعلانیہ دشمنی کو اپنے مقصد کے خلاف سمجھتا تھا، اس لیے اس نے ۱۸۰۷ء میں باب عالی کے سامنے اپنی خدمات روس سے صلح کرانے کے لیے پیش کیں، اس کے جواب میں باب عالی نے سفیر برطانیہ کو یہ لکھا کہ ”یہ کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ انگلستان اپنی وساطت سے صلح کرانے کی تجویز پیش کر رہا ہے، حالاں کہ اس کے جہاز روسی بیڑہ میں شامل ہو کر ہم سے جنگ کر رہے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ اس کی یہ تجویز صرف روس کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے ہے، پس انگلستان کو چاہیے کہ اپنی پالیسی صاف طور پر ظاہر کر دے تاکہ باب عالی کو معلوم ہو جائے کہ وہ کس کے ساتھ ہے“، اس جواب کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کو معلوم ہو گیا کہ باب عالی اس کی دورخی پالیسی سے واقف ہے، چنانچہ اس نے شرمندہ ہو کر اپنے جہاز اور افسر روس سے واپس بلا لیے لیکن یہ اس وقت ہوا جب لڑائی قریب ختم کے تھی، پھر بھی انگلستان روس کے ساتھ حق دوستی کچھ نہ کچھ ادا کرتا رہا، چنانچہ جب باب عالی نے پرشا اور آسٹریا سے یہ خواہش کی کہ وہ درمیان میں پڑ کر صلح کرادیں تو برطانوی سفیر نے ایک جاسوس کی طرح اس کی اطلاع حکومت روس کو دے دی تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں، کیونکہ ان کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے جنرل رومانوف کو ہدایت کی کہ وہ صدر اعظم کو لکھے کہ روس باب عالی کے ساتھ صلح کی گفتگو کرنے کے لیے تیار ہے، بشرطیکہ سفیر روس اور برسکوف جو اعلان جنگ کے وقت قسطنطنیہ میں قید کر لیا گیا تھا، آزاد کر دیا جائے اور پرشا اور آسٹریا صلح کے مقابلہ میں نہ پڑنے دیا جائے کیوں کہ ایسی صورت میں فرانس بھی دخل دے گا اور اس کی مداخلت زارنیہ کو قطعاً منظور نہیں ہے، روس کے ساتھ انگلستان کی شرکت کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ دوران جنگ میں جب فرانسیسی وزیر اعظم شوازیل نے اپنی مجلس میں یہ تجویز پیش کی کہ روسی بیڑوں پر ضرب لگائی جائے تو قبل اس

کے کہ خود فرانس کی مجلس میں یہ تجویز منظور کر دی جائے، برطانوی وزارت نے یہ اعلان کیا کہ روس کے خلاف ہر کارروائی انگلستان کی اہانت اور دشمنی تصور کی جائے گی، اسی کے ساتھ حکومت فرانس کا بھی اس تجویز کو منظور کر دینا یہ واضح کر دیتا ہے کہ دولت عثمانیہ کے ساتھ اس کی دوستی کی حقیقت کیا تھی۔

پرشا | فریڈرک اعظم بھی روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، مگر اس طرح کہ دولت عثمانیہ کو نقصان نہ پہنچنے پائے اور وہ روس سے جنگ کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھا بلکہ اس کا حلیف ہونے میں اپنا فائدہ دیکھ رہا تھا، اس کی خارجی سیاست کے دو اہم جزو تھے، پولینڈ کی تقسیم اور سلطنت عثمانیہ کی بقاء، پولینڈ کی سرحد مملکت پرشا سے ملی ہوئی تھی، اور پرشا کو اپنے حدود کی توسیع کا موقع صرف پولینڈ ہی میں حاصل تھا جس پر روس کے فریب و استبداد کا تسلط قائم تھا، گو حکومت بظاہر حکومت پولینڈ کے ہاتھ میں تھی، فرانس پولینڈ کی تقسیم کا سخت مخالف تھا اور چون کہ آسٹریا فرانس کا حلیف تھا، اس لیے فریڈرک کے لیے ضروری تھا کہ تقسیم پولینڈ کا لالچ دے کر آسٹریا کو فرانس کی دوستی سے علاحدہ کرے، آسٹریا اور روس کی شرکت کے بغیر فریڈرک کے لیے اپنا مقصد حاصل کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ جب روس اور دولت عثمانیہ کی جنگ شروع ہوئی تو فریڈرک نے اس بات کی کوشش کی کہ آسٹریا کو فرانس کے اتحاد سے علاحدہ کر کے پرشا، روس اور آسٹریا کا ایک اتحاد تلاش پولینڈ کی تقسیم کے لیے قائم کرے لیکن جب فریڈرک کے سفیر نے روسی وزیر اعظم سے اس مسئلہ میں گفتگو کی تو مؤخر الذکر نے یہ جواب دیا کہ اتحاد تلاش کا مقصد سلطنت عثمانیہ کی تقسیم بھی ہونا چاہیے، فریڈرک اس کے لیے راضی نہ تھا، بظاہر تو اس میں پرشا کا فائدہ تھا لیکن جیسا کہ مصطفیٰ کامل پاشا فرماتے ہیں فریڈرک پرشا کا حقیقی فائدہ دولت عثمانیہ کی بقاء اور استقلال میں دیکھتا تھا، وہ اپنی بصیرت سے یہ دیکھ رہا تھا کہ پرشا اور روس کی دوستی ایک روز ختم ہو جائے گی اور اس

وقت سلطنت عثمانیہ کا قیام بطور ایک قلعہ اور چٹان کے ہوگا، جو روس کو آگے بڑھنے سے روکے گی اور جس کی قوت پر پرشا اعتماد کرے گا، بہر حال حکومت روس کے اس جواب کے باوجود فریڈرک نے تقسیم پولینڈ کی تجویز ترک نہ کی، بلکہ اس مقصد کے لیے اس نے آسٹریا سے ایک مخفی اتحاد کرنا چاہا، انخفا کا اہتمام صرف اس غرض سے کیا گیا کہ حکومت روس کو تشویش پیدا ہو جائے اور وہ پرشا کے ساتھ اتحاد کرنے کی ضرورت محسوس کرے، چنانچہ شہر نیس میں فریڈرک نے میریا تھریسیا اور اس کے لڑکے جوزف ثانی سے جو انتظام سلطنت میں اب اپنی ماں کا شریک تھا، ملاقات کی اور اگست ۱۷۹۶ء میں آسٹریا اور پرشا کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ ہو گیا، روس چوں کہ اس معاہدہ کے مضمون سے ناواقف تھا، اس لیے اس کو یہ خطرہ ہوا کہ اس معاہدہ میں مسئلہ شرقیہ کا فیصلہ اس کے مفاد کے خلاف کیا گیا ہے، چنانچہ جیسا کہ فریڈرک نے پیش بینی کی تھی، روس کو بھی پرشا کے ساتھ اتحاد کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور ۱۲ اکتوبر ۱۷۹۶ء کو اس نے ۱۷۹۶ء کے معاہدہ کی تجدید کر دی جس کے رو سے روس اور پرشا آٹھ سال کے لیے حلیف بن گئے تھے، فریڈرک کی خواہش پر اس تازہ معاہدہ کی مدت ۱۷۹۰ء تک بڑھادی گئی۔

اس کے بعد فریڈرک نے یہ چاہا کہ روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان صلح کرادے، باب عالی کی طرف سے بھی صلح کے لیے پرشا اور آسٹریا کی وساطت کی خواہش کی گئی لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا سفیر انگلستان نے باب عالی کی اس خواہش کی اطلاع حکومت روس کو کر دی اور کیتھرائن نے پرشا اور آسٹریا کی وساطت قبول کرنے سے انکار کر دیا، اسی اثنا میں روسی فوجیں بندر اورا کرمان وغیرہ پر قابض ہو گئیں اور ان فتوحات سے روس کے حوصلے بہت بڑھ گئے، چنانچہ جب فریڈرک نے دولت عثمانیہ اور روس میں صلح کرانے کے لیے کیتھرائن سے اصرار شروع کیا تو اس نے ۲۰ ستمبر ۱۷۹۰ء کو فریڈرک کو ایک خط لکھا جس میں صلح کے شرائط حسب ذیل قرار دیے۔

ازف اور کارباردا پر روس کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے اور ولاچیا اور مولڈیویا کی حکومتیں دولت عثمانیہ کی فرماں روائی سے آزاد کر دی جائیں یا یہ دونوں صوبے تاوان جنگ کے طور پر چوتھائی صدی کے لیے روس کو دے دیے جائیں، بسراپیا اور کریمیا کے تاتاریوں کی خود مختاری تسلیم کر لی جائے، بحر اسود میں روسی جہازوں کو آزادی حاصل ہو، یونانی مجمع الجزائر میں سے ایک جزیرہ روس کو دے دیا جائے اور ان تمام یونانیوں کے لیے جنہوں نے دوران جنگ میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کی تھی، عام معافی کا اعلان کر دیا جائے۔

مذکورہ بالا شرائط معلوم کرنے کے بعد فریڈرک نے اپنے بھائی پرنس ہنری کو جو سینٹ پیٹرس برگ میں مقیم تھا، ۳ جنوری ۱۸۷۷ء کو یہ لکھا کہ ”روس کے شرائط صلح نے مجھے حیرت زدہ کر دیا ہے اور میں انہیں ترکوں اور اہل آسٹریا کے سامنے پیش کرنے سے معذور ہوں، کیوں کہ وہ قطعاً ناقابل قبول ہیں“ پھر ۵ جنوری ۱۸۷۷ء کو اس نے خود کیتھرائٹ کو بھی ایک خط لکھا کہ اگر وہ آسٹریا کے ساتھ جنگ کرنے سے بچنا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ ازف اور گاربادا کے لینے اور بحر اسود میں جہاز رانی کی آزادی حاصل کرنے پر قناعت کرے، فریڈرک خوب جانتا تھا کہ ولاچیا اور مولڈیویا پر روس کا قبضہ آسٹریا کو کسی طرح گوارا نہ ہوگا، کیوں کہ ان ہی صوبوں پر خود آسٹریا کی نظریں بھی لگی ہوئی تھیں۔

آسٹریا | اس جنگ میں حکومت آسٹریا کی پالیسی سب سے زیادہ پرفریب تھی، وہ روس کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہو کر دولت عثمانیہ سے اتحاد بھی کرنا چاہتی تھی اور اس اتحاد سے فائدہ اٹھا کر سلطنت عثمانیہ کے بعض علاقوں پر قبضہ بھی کر لینا چاہتی تھی، چنانچہ وہ کبھی دولت علیہ کی طرف مائل ہوتی اور کبھی روس کی طرف، علاوہ بریں وہ دولت علیہ کو فرانس کے اتحاد سے جو خود اس کا حلیف بھی تھا، علاحدہ کر دینا چاہتی تھی کیوں کہ اس اتحاد کی صورت میں وہ باب عالی کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی، فرانس اس وقت مالی معاوضہ میں دولت عثمانیہ کی مدد اپنے

جہازوں سے کرنے پر آمادہ تھا لیکن آسٹریا کے سفیر مقیم قسطنطنیہ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور عثمانی وزراء کو سمجھایا کہ خشکی کی لڑائی میں بحری بیڑے مفید نہ ہوں گے اور یہ کہ فرانس کا مقصد دراصل دولت علیہ کی مدد کرنا نہیں ہے بلکہ روس کی دشمنی میں وہ ایک طویل مدت تک جنگ کو جاری رکھنا چاہتا ہے، عثمانی وزراء نے اس رائے کی صحت کو تسلیم کر کے فرانس کی تجویز نامنظور کر دی، آسٹریا کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں روس کا تسلط کریسیا پر ہو گیا، جس کی وجہ سے باب عالی کو آسٹریا کے ساتھ اتحاد کرنا بہت غنیمت معلوم ہوا اور اس نے عجلت سے کام لیا، چنانچہ ۶ جولائی ۱۷۹۷ء کو دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا، جس کے شرائط حسب ذیل تھے:

- ۱- روس کے مقابلہ میں آسٹریا دولت عثمانیہ کی مدد کرے گا۔
- ۲- سلطنت عثمانیہ کا کوئی حصہ آسٹریا علاحدہ نہ ہونے دے گا۔
- ۳- دولت عثمانیہ کی عزت کے خیال سے آسٹریا پولینڈ کے استقلال کی حفاظت کرے گا۔

۴- اس کے معاوضہ میں دولت عثمانیہ نے عہد کیا کہ وہ ایک کروڑ تیرہ لاکھ پچاس ہزار فلورن کی رقم آسٹریا کو ادا کرے گی۔

- ۵- نیز ولاچیا کو چک کا علاقہ آسٹریا کے حوالہ کر دے گی اور
- ۶- سلطنت عثمانیہ میں آسٹریا کی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے ہر طرح سے مدد کرے گی۔

اس معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ فریقین اسے مخفی رکھیں گے، خصوصاً فرانس سے جو اس وقت آسٹریا کا حلیف تھا۔

سفیر آسٹریا نے جب اس معاہدہ کی نقل اپنی حکومت کے پاس دستخط کے لیے بھیجا تو کونتر دولت عثمانیہ کی طرف سے مطمئن ہو گیا اور اب اسے روس کو دھمکی دینے کا ایک اچھا

آلہ ہاتھ آ گیا، اس کا مقصد روس پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے علاقوں پر قبضہ کرنا آسٹریا کو شریک کیے بغیر آسان نہ ہوگا، کونتر اس میں کام یاب رہا، کیہ تھرائن نے اپنے ایک خاص سفیر کو سلطنت عثمانیہ کی تقسیم سے متعلق مندرجہ ذیل تین تجویزیں لے کر حکومت آسٹریا کے پاس بھیجا۔

۱- سرویا، بوسنیا، ہرزیکوینا، البانیا اور مقدونیا پر آسٹریا قبضہ کر لے اور سلطنت عثمانیہ کے بقیہ حصے مع قسطنطنیہ کے روس کے لیے چھوڑ دے۔

۲- ولاچیا، سرویا، بلغاریا اور ہرزیکوینا کو آسٹریا لے لے اور مقدونیا، البانیا، رومانیہ، اکثر جزائر یونان، ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ روس کو دے دے، کریمیا اور موریا خود مختار حکومتیں کر دی جائیں۔

۳- ترکوں کو دریائے ڈینوب کے شمالی علاقوں پر باقی رکھا جائے، سرویا، بوسنیا اور ہرزیکوینا کے صوبے آسٹریا کو دے دیے جائیں، بحر اسود کے ساحلی علاقوں پر روس کا قبضہ ہو جائے اور تاتاری صوبے آزاد رہیں۔

روسی سفیر نے تقسیم پولینڈ سے متعلق بھی بعض تجویزیں پیش کیں، حکومت آسٹریا نے باوجود اس معاہدہ کے جو اس نے ابھی حال میں باب عالی سے کیا تھا اور جس نے سلطنت عثمانیہ کے تحفظ و استقلال کا ذمہ لیا تھا، نیز پولینڈ کی تقسیم کے روکنے کا عہد کیا تھا، روس کے پیش کردہ شرائط پر گفتگو شروع کر دی، برخلاف اس کے باب عالی نے جو معاہدہ آسٹریا سے کیا تھا، اس پر وہ دیانت داری کے ساتھ قائم رہا اور ۲۵ جولائی ۱۷۷۱ء کو اس رقم کی ایک قسط جس کی ادائیگی معاہدہ مذکور میں اس نے اپنے ذمہ لی تھی، حکومت آسٹریا کے پاس روانہ کر دی، حکومت آسٹریا نے اس رقم کو تولے لیا مگر باب عالی کے تقاضوں کے باوجود معاہدہ پر دستخط کرنے سے گریز کرتی رہی، کونتر چاہتا تھا کہ روس کے ساتھ ایک ایسا

معاہدہ ہو جائے جس سے آسٹریا کو اس سے زیادہ فائدہ پہنچے، جتنا دولت عثمانیہ سے اتحاد کرنے میں پہنچتا تھا، اس کو یہ بھی خوف تھا کہ اگر وہ ترکوں کے ساتھ اتحاد کر لے گا تو روس اور پرشاپولینڈ کو باہم تقسیم کر لیں گے اور اسے کچھ نہ دیں گے، بہر حال جب باب عالی کی طرف سے اس معاہدہ پر دستخط کرنے کا اصرار ہوا تو کونتر نے ۴ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو ایک مخلصانہ تحریر باب عالی میں بھیجی اور اسے اطمینان دلایا کہ حکومت آسٹریا اپنے معاہدہ پر وفاداری کے ساتھ قائم ہے لیکن معاہدہ پر دستخط کرنا اب بھی نال گیا۔

اسی اثنا میں برطانوی سفیر مقیم قسطنطنیہ کو اس خفیہ معاہدہ کی نقل ہاتھ آگئی، اس نے اس کی ایک نقل فریڈرک اعظم اور کیتھرائن کے پاس بھیج دی، فریڈرک نے اپنے سفیر کو ہدایت کی کہ باب عالی کو حکومت آسٹریا کی خود غرضیوں سے متنبہ کر دے اور یہ ظاہر کر دے کہ وہ دولت عثمانیہ کو کس قدر نقصان پہنچانا چاہتی ہے، اس نے اپنے سفیر مقیم پیرس کو بھی لکھا کہ وزارت فرانس کے سامنے یہ تجویز پیش کرے کہ روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان صلح کرانے کے لیے ایک کانفرنس قسطنطنیہ میں منعقد کی جائے، فریڈرک کا مقصد یہ تھا کہ آسٹریا نے دولت علیہ اور فرانس کے ساتھ جو غداری کی ہے، وہ یورپین سلطنتوں کے سامنے کھل جائے، مگر وزارت فرانس اس کانفرنس کی تحریک کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوئی۔

اس درمیان میں جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور روسی فوجوں میں فتوحات کے باوجود کم زوری کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، خصوصاً پولینڈ میں یہ آثار زیادہ نمایاں تھے، روس کی مالی حالت بھی روز بہ روز زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی، ان حالات کو دیکھتے ہوئے کیتھرائن اب جنگ کو ختم کرنے پر مائل ہوئی، چنانچہ اس نے ۲ دسمبر ۱۸۵۷ء کو فریڈرک کے پاس ایک خط بھیجا جس میں یہ لکھا کہ حکومت روس مولڈیویا اور ولاچیا کے مطالبہ سے دست بردار ہوتی ہے لیکن اس کے معاوضہ میں یہ چاہتی ہے کہ دولت عثمانیہ بندر اور اوکرنا کوف کے شہر اس کے حوالے کر دے، اسی خط میں کیتھرائن نے تقسیم پولینڈ سے متعلق فریڈرک کی تجویز

بھی منظور کر لی، اس شرط کے ساتھ کہ اگر آسٹریا روس سے جنگ کرے تو فریڈرک روس کی مدد کے لیے بیس ہزار فوج ولاچیا اور مولڈویا کے صوبوں میں روانہ کرے۔

تقسیم پولینڈ | اس مسئلہ میں فریڈرک اور کیتھرائن کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی، اس کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ پرشا اور روس پولینڈ کی تقسیم پر متحد ہو گئے، اس اتحاد کی وجہ سے آسٹریا کے سامنے صرف دو صورتیں رہ گئیں، یا تو وہ ان معاہدوں کو پورا کرے جو اس نے فرانس اور دولت عثمانیہ کے ساتھ کیے تھے اور پولینڈ کو تقسیم نہ ہونے دے یا پھر روس اور پرشا سے مل کر خود بھی پولینڈ کی تقسیم میں شریک ہو جائے اور فرانس اور دولت علیہ کے معاہدوں کی پروا نہ کرے، کونتر نے یورپین حکومتوں کے اس اصول کی بنا پر کہ سیاست میں عہد و پیمان کوئی چیز نہیں، دوسری صورت اختیار کی، چنانچہ ۲۸ جنوری ۱۷۹۷ء کو اس نے حکومت روس کو لکھا کہ آسٹریا نے تقسیم پولینڈ کی تجویز نیز سلطنت عثمانیہ سے متعلق کیتھرائن کے مطالبات کو منظور کر لیا ہے اور یہ توقع ظاہر کی ہے کہ پولینڈ کی طرح سلطنت عثمانیہ کی تقسیم بھی عمل میں آئے گی اور آسٹریا کو بھی اس تقسیم میں حصہ ملے گا، اپنی حکومت کی اس غداری پر خود میر یا تھر یسیانے بھی نفرین کرتے ہوئے اقرار کیا کہ ”آسٹریا نے جو سیاست اختیار کی وہ شرافت، سلطنت کی عزت، عہد و پیمان اور عقیدہ کے بالکل مخالف تھی“، بہر حال کونتر کی اس پالیسی کی وجہ سے تقسیم پولینڈ کی تجویز پر روس، پرشا اور آسٹریا کا اتفاق ہو گیا اور اس بد قسمت ملک کی جو پہلے ہی سے روس کے فریب اور دراندازیوں کا شکار اور اس کے پیدا کیے ہوئے فتنوں کی وجہ سے جماعتوں کے باہمی نزاعات میں مبتلا تھا، پہلی تقسیم ۱۷۹۷ء میں ہو گئی، باب عالی نے جب یہ دیکھا کہ حکومت آسٹریا اس کے ساتھ فریب کر رہی ہے تو اس نے معبودہ رقم کی آئندہ قسط نہیں بھیجی، کونتر نے اس چیز کو دولت عثمانیہ اور آسٹریا کے اتحاد کی شکست کا سبب قرار دیا، حالانکہ جس معاہدہ کی بنا پر یہ اتحاد قائم ہوا تھا، اس پر کونتر نے آخر وقت تک دستخط

نہیں کیے تھے اور نہ حکومت آسٹریا کی طرف سے معاہدہ کی کوئی شرط پوری کی گئی تھی، برخلاف اس کے باب عالی کو جس نے دیانت داری کے ساتھ رقم مذکور کی ایک قسط آسٹریا کو ادا کر دی تھی اور آسٹریا نے اسے بلا تامل قبول بھی کر لیا تھا، اسی معاہدہ کے فریب میں مبتلا رکھ کر کونتر نے نہ صرف پولینڈ بلکہ سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے متعلق بھی کیتھرائن سے مراسلت شروع کر دی تھی۔

صلح کانفرنس | جب دولت عثمانیہ کو یہ معلوم ہوا کہ روس ولاچیا اور مولڈویا کے صوبوں سے دست بردار ہو کر صلح کے لیے آمادہ ہے تو وہ بھی راضی ہو گئی اور دونوں حکومتوں کے نمائندے شرائط صلح طے کرنے کے لیے ۱۰ جون ۱۷۷۲ء کو شہر توکشانی میں جمع ہوئے، بیس روز کی گفت و شنید کے بعد تاتاریوں کی آزادی کے مسئلہ کے علاوہ اور تمام شرائط پورے ہو گئے، ترک نمائندے اس بات پر زور دے رہے تھے کہ تاتاریوں کا دولت عثمانیہ کے زیر اقتدار رہنا ضروری ہے، کیوں کہ سلطان کو بہ حیثیت خلیفۃ المسلمین کے ان پر فرماں روائی کا حق حاصل ہے، حکومت روس نے اس مطالبہ کو منظور نہ کیا، چنانچہ اسی بات پر کانفرنس شکست ہو گئی، چند مہینوں کے بعد روس نے ایک دوسری کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی اور دولت علیہ نے اسے منظور کر لیا، چنانچہ یہ کانفرنس بخارست میں منعقد ہوئی اور شرائط صلح پر مہینوں بحث و مباحثہ ہوتا رہا، اس کانفرنس میں روس اس بات پر راضی تھا کہ تاتاری کو دولت عثمانیہ کے زیر سیادت رہنے دیا جائے لیکن وہ کرش اور ایچی قلعہ کو چھوڑنے پر کسی طرح تیار نہ ہوا اور دولت علیہ ان دونوں قلعوں سے دست بردار ہونے پر راضی نہ ہوئی، بالآخر ۱۵ فروری ۱۷۷۳ء کو روسی سفیر اور برسکوف نے کیتھرائن کی طرف سے مندرجہ ذیل شرائط صلح باب عالی میں پیش کر کے الٹی میٹم دیا کہ اگر یہ شرائط قبول نہ کیے گئے تو جنگ از سر نو شروع کر دی جائے گی۔

۱- روس تاتاریوں کی آزادی کا محافظ قرار دیا جائے اور کرش اور ایچی قلعہ کے

قلعوں پر روس کا قبضہ قائم رکھا جائے۔

۲۔ بحر اسود اور بحر الجین میں روس کے تجارتی اور جنگی جہازوں کو آمد و رفت کی پوری آزادی حاصل ہو۔

۳۔ مذکورہ بالا قلعوں کے علاوہ کریمیا کے تمام دوسرے قلعے تاتاریوں کو واپس کر دیے جائیں۔

۴۔ مولڈیویا کا امیر گریگوری غیکا (Gregory Ghika) جو اس وقت روسیوں کے قبضہ میں تھا، پھر مولڈیویا کا موروثی فرماں روا مقرر کر دیا جائے اور وہ ہر تین سال میں ایک بار اپنی ریاست کی ایک سال کی آمدنی بطور خراج باب عالی کو پیش کرتا رہے۔

۵۔ روس کا ایک مستقل نمائندہ قسطنطنیہ میں مقیم رہے۔

۶۔ کلبرن پورے مالکانہ حقوق کے ساتھ روس کو دے دیا جائے اور اوکزاکوف کا قلعہ مسمار کر دیا جائے۔

۷۔ باب عالی روس کے فرماں رواؤں کے لیے ”پادشا“ کا لقب نیز سلطنت عثمانیہ کے ان عیسائی باشندوں کی حمایت کا حق تسلیم کرے جو کلیسائے یونان سے تعلق رکھتے ہوں۔
بخارسٹ کا نفرنس کی ناکامی | سلطان اور وزراء سلطنت صلح کے خواہاں تھے اور مذکورہ

بالا شرائط میں سے دفعہ اول کے علاوہ ہر دفعہ منظور کر لینے پر آمادہ تھے، دفعہ اول میں بھی روس بالآخر اس بات پر راضی ہو گیا تھا کہ تاتاریوں پر دولت علیہ کی سیادت قائم رکھی جائے، البتہ وہ کرش اور بنی قلعہ چھوڑنے کو تیار نہ ہوا اور یہی مسئلہ کانفرنس کی ناکامی کا سبب بن گیا، باب عالی نے صورت حال سے مجبور ہو کر اور تمام شرائط منظور کر لیے، مگر کرش اور بنی قلعہ سے دست بردار ہونا اسے کسی طرح منظور نہ تھا، جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مفتی اعظم اور سلطنت کے تمام علماء نے اس شرط کے قبول کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا تھا، نیز دیوان

میں بھی اس کی مخالفت شدت سے کی گئی تھی، علماء کی مخالفت کے باوجود اس شرط کو قبول کر کے اگر صلح کر لی جاتی تو اس سے قسطنطنیہ میں بغاوت برپا ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا، چنانچہ کرش اور نئی قلعہ کے تنازعہ پر بخارسٹ کی صلح کانفرنس بھی شکست ہوئی اور جنگ ازسرنو شروع کر دی گئی۔

محسن زادہ پاشا | نوکشیانی اور بخارسٹ کانفرنسوں کے دوران قیام میں صلح کا جو وقفہ میسر آ گیا تھا، اس سے فائدہ اٹھا کر صدر اعظم محسن زادہ پاشا نے استحکام سلطنت کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، ۱۸۶۷ء میں جنگ شروع ہونے سے پیش تر بھی وہ صدر اعظم رہ چکا تھا لیکن چونکہ اس نے سلطان کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا تھا کہ پوری طرح تیار ہونے سے قبل جنگ شروع کر دینا دولت عثمانیہ کے لیے مضر ہوگا، اس لیے مصطفیٰ نے اسے صدارت کے عہدہ سے معزول کر دیا تھا، اس کے بعد وہ موریا کا سرعسکر مقرر ہوا اور وہاں اس نے روسیوں اور یونانیوں کو زبردست شکست دے کر موریا میں عثمانی تسلط کو ازسرنو قائم کر دیا، اس شان دار کام یابی کے صلہ میں سلطان نے اسے صوبہ و دین کا سرعسکر مقرر کیا، جو شمال کا سرحدی صوبہ ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا، وہاں بھی محسن زادہ پاشا کی لیاقت خاص طور پر نمایاں رہی، دوران جنگ میں سلطان مصطفیٰ کو احساس ہوا کہ محسن زادہ پاشا کو صدارت کے عہدہ سے معزول کرنے میں اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی، چنانچہ ۱۸۶۷ء کے آخر میں اس نے دوبارہ اس کو صدر اعظم مقرر کیا، محسن زادہ پاشا نے نوکشیانی اور بخارسٹ کی کانفرنسوں میں صلح کے لیے انتہائی کوشش کی تھی لیکن پندرہ ماہ کی اس معتمد فرصت میں جب کہ شرائط صلح پر گفتگو اور مراسلت ہوتی رہی، اس نے عثمانی فوجوں کی تنظیم و استحکام میں بھی کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا اور ہر ممکن ذریعہ سے ان کے اندر دشمن کے مقابلہ کے لیے ایک تازہ جوش پیدا کرنے کی کوشش کی، پیہم شکستوں نے فوج کے اخلاق بھی خراب کر دیے تھے، سپاہیوں میں ایک طرف تو لوٹ مار کی عادت پیدا ہو رہی تھی اور دوسری طرف

وہ دشمن کی قوت سے مرعوب ہونے لگے تھے، محسن زادہ پاشا نے لوٹ مار کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں اور جن افسروں نے دشمن کے مقابلہ میں بزدلی دکھا کر اپنی فوج کے سامنے ایک بری مثال قائم کی تھی، انہیں قتل کرادیا، اس نے شکست خوردہ دستوں کو ازسرنو منظم کیا اور اہل بوسنیا اور سلطنت کے دوسرے جنگ جو قبائل سے تازہ فوجیں تیار کیں، اس نے دریائے ڈینوب کے ان قلعوں کو جو اس وقت تک ترکوں کے قبضہ میں رہ گئے تھے، خصوصاً سلسٹر یا کوتازہ دستوں اور سامان رسد سے خوب مستحکم کر لیا اور شوملہ کو اپنا فوجی مستقر بنایا۔

معرکہ سلسٹر یا ۱۷۳۳ء کے موسم بہار میں جنگ پھر چھڑ گئی، روسی اور عثمانی فوجوں کے درمیان متعدد معرکے ہوئے جن میں کبھی ایک اور کبھی دوسرے فریق کو فتح ہوئی لیکن ان فتوحات سے روس کو کوئی خاص فائدہ نہ ہوا، کیوں کہ سلسٹر یا، وارنا اور شوملہ کے مضبوط اور اہم قلعوں پر ترک ابھی تک بدستور قابض تھے، آخر کار جنرل رومانوف نے دریائے ڈینوب کو عبور کر کے سلسٹر یا کا محاصرہ کر لیا، سلسٹر یا کے سرعصر عثمان پاشا نے آگے بڑھ کر رومانوف کو دریا عبور کرنے سے روکنے کی کوشش کی تھی، مگر جنرل وائسمین کے حملہ نے اسے کام یاب نہ ہونے دیا اور اس کی فوج بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتی ہوئی سلسٹر یا میں واپس آ گئی، اس کے بعد رومانوف نے شہر پر گولہ باری شروع کی، ستر توپیں پیہم گولے برسارہی تھیں، یہاں تک کہ دیواروں میں کئی جگہ رخنے پیدا ہو گئے اور روسی فوجیں شہر کے اندر داخل ہونے کے لیے پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہوئیں، چھ گھنٹہ تک نہایت سخت معرکہ رہا، ترک حیرت انگیز جاں بازی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن رومانوف مسلسل تازہ دستے اپنی فوج کی مدد کے لیے بھیجتا جاتا تھا، آخر کار ترکوں کو پسپا ہونا پڑا اور روسی شہر کے اندر پہنچ گئے، مگر یہ کام یابی عارضی تھی، شہر کے اندر ترکوں نے عثمان پاشا کے زیر قیادت جس دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا اس نے رومانوف کی آنکھیں کھل گئیں، آبادی کے تمام

مرد دشمن کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے ہر ہر قدم پر روسیوں کو آگے بڑھنے سے روکا اور ایسی شدت سے لڑے کہ روسی بھاگ کھڑے ہوئے پر مجبور ہوئے، ان کے آٹھ ہزار سپاہی مارے گئے اور ایک ہزار زخمی ہوئے، عثمان پاشا کے اس کارنامہ کے صلہ میں سلطان نے اسے ”غازی“ کا لقب عطا کیا۔

روسی مظالم | اس کے بعد روسیوں نے قرہ سو کے مقام پر عثمانی لشکر پر حملہ کیا اور اسے شکست دی، اس کام یابی سے ان کے حوصلے بڑھ گئے اور رومانوف نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ وارنا کی طرف روانہ کیا اور دوسرا شوملہ کی طرف، شوملہ کے راستہ میں بازار جیک کا غیر محفوظ شہر پڑتا تھا، جس کا تقریباً پورا فوجی دستہ اور اکثر باشندے شہر خالی کر کے چلے گئے تھے، روسیوں نے اسے نہایت آسانی سے فتح کر لیا لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے ”فتح کی سہولت نے ان کو شہر کی باقی ماندہ آبادی کے ساتھ جو تقریباً تمام ترکم زور اور بوڑھے مردوں، بے کس عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھی، انتہائی وحشیانہ سلوک کرنے سے باز نہیں رکھا“ عورتیں، بوڑھے اور بچے سب کے سب دیواروں سے ٹکرائے گئے۔

روس کی شکست | لیکن روسیوں کو ان مظالم کی سزا بہت جلد مل گئی، جب شوملہ میں قرہ سو کی شکست اور بازار جیک کی تباہی کی اطلاع پہنچی تو صدر اعظم نے فوجی افسروں کی ایک مجلس منعقد کر کے مشورہ کیا، رئیس آفندی (وزیر خارجہ) عبدالرزاق نے اپنی خدمات پیش کیں، چنانچہ وہ واصف آفندی (ترک مورخ) مفتی فلوپو پولیس اور صرف چار سو آدمیوں کے دستہ کے ساتھ جو تقریباً تمام تر اسی کے ملازم تھے، روسیوں کے مقابلہ کے لیے روانہ ہو گیا، راستہ میں اس نے عثمانی فوج کے منتشر دستوں کو جو شکست کے بعد گرد و نواح کے علاقوں میں پھیل گئے تھے، از سر نو جمع کیا اور انہیں لے کر ریجہ کے مقام پر روسی فوج کے مقدمہ الحیش کو شکست دی، اس کے بعد وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہوا دفعہ بازار جیک کے روسی دستوں پر ٹوٹ پڑا، روسی اس اچانک حملہ سے ایسا بدحواس ہوئے کہ اپنا تمام سامان

چھوڑ کر بھاگے، یہاں تک کہ ترکوں نے علاوہ اسلحہ اور گولہ بارود کے ذخیرہ کے بقول قان ہیمر چولہے پر چڑھی ہوئی گوشت کی دیکچھوں پر بھی قبضہ کر لیا، اسی درمیان میں روسیوں کو دارنا میں بھی سخت شکست ہوئی، ان کے دو ہزار آدمی مارے گئے اور مال غنیمت میں دس توپیں اور سامان کی سو گاڑیاں ترکوں کے ہاتھ آئیں، دارنا کی جنگ اور بازار جیک پر دو بارہ قبضہ ۱۷۷۳ء کی مہم کے آخری معرکے تھے، اس مہم میں ترکوں کی کامیابی کا پلہ بہ نسبت روسیوں کے بہت بھاری تھا۔

وفات | ۲۵ دسمبر ۱۷۷۳ء کو سلطان مصطفیٰ ثالث کا انتقال ہو گیا۔

مصطفیٰ اپنے اکثر پیش روؤں کی طرح ایک بلند علمی ذوق رکھتا تھا، اس نے بہت سے مدارس اور خانقاہیں قائم کیں اور تعلیم کو ترقی دی، ملکی اصلاحات کی ضرورت وہ شدت سے محسوس کرتا تھا اور اس سلسلہ میں اس نے بعض اہم اصلاحات جاری کیں، مثلاً حرم کے اخراجات میں بہت کچھ تخفیف کردی، صیغہ اوقاف کا کام قزلراغاسی کے ہاتھ سے نکال کر صدر اعظم کے سپرد کر دیا اور مالیات کی درستگی کی کوشش کی لیکن جب سے روس کی جنگ کا سلسلہ شروع ہوا، مصطفیٰ کی ساری توجہ سلطنت کے تحفظ کی جانب مبذول رہی اور اندرونی اصلاحات کا کام ملتوی ہو گیا، پھر بھی اس کا یہ کارنامہ کم قابل قدر نہیں کہ اس نے بعض اصلاحات کو عمل میں لا کر سلیم ثالث اور محمود ثانی کے لیے ایک عمدہ مثال قائم کر دی۔

عبدالحمید اول

۱۱۸۷ھ تا ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۷۳ء تا ۱۷۹۱ء

مصطفیٰ ثالث کے بعد اس کا بھائی عبدالحمید تخت پر آیا، روس سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا، کیتھرائن نے سابق ہزیموں کی تلافی کے لیے کافی تیاریاں کر لی تھیں، برخلاف اس کے ترک اب جنگ کو ختم کر دینا چاہتے تھے، عام باشندوں کے علاوہ فوج کے افسر، وزراء اور خود سلطان بھی صلح کے خواہاں تھے، صرف علماء کی جماعت یہ عذر پیش کر رہی تھی کہ سلطان کے لیے بہ حیثیت خلیفۃ المسلمین کے تاتاریوں کو اپنی سیادت سے محروم کر دینا اور کرش اورینی کے قلعوں کو جو کریمیا کے اہم ترین قلعے تھے، روسیوں کے حوالے کر دینا کسی طرح مناسب نہیں لیکن ۱۷۷۳ء کی مہم کا آغاز ہی ترکوں کے لیے اس قدر خلاف توقع ہوا کہ علماء کے ان دلائل کے باوجود باب عالی کو صلح کا فیصلہ کر لینا پڑا۔

ترکوں کی شکست | ۱۳ اپریل ۱۷۷۳ء کو صدر اعظم محسن زادہ پاشا اپنے مستقر شوملہ سے نکل کر ہر سوا کی طرف بڑھا جہاں روسی فوجیں ایک نئے جنرل سوارو (Suwarrow) کی سرکردگی میں لڑائی کے لیے تیار کھڑی تھیں، سوارو نے ترکوں کے حملہ کا انتظار نہیں کیا، بلکہ خود پیش قدمی کر کے کوزلیجہ کے مقام پر صدر اعظم کی فوج پر حملہ آور ہوا اور اسے شکست دی، ترکی لشکر کا تمام سامان مع انتیس توپوں کے روسیوں کے ہاتھ آیا، محسن زادہ پاشا نے شوملہ واپس آ کر دیکھا کہ اس کے پچیس ہزار سپاہیوں میں سے صرف آٹھ ہزار باقی رہ گئے ہیں،

کچھ تو میدان جنگ میں کام آئے لیکن زیادہ تر ادھر منتشر ہو گئے تھے، اپنی قلیل جمعیت کے ساتھ روس کی فاتح فوج کا روکنا جو اب تیزی کے ساتھ شولہ کی طرف بڑھتی آرہی تھی محال تھا، بد قسمتی سے نئی چری نے عین اس نازک موقع پر بغاوت کر دی اور جب رئیس آفندی نے ان کو دشمن کے مقابلہ کے لیے مجتمع کرنے کی کوشش کی تو اس کا سراڑ ادا یا، اس حالت میں صدر اعظم نے اپنے ایک افسر کو روسی سپہ سالار رومانوف کے پاس بھیجا اور التوائے جنگ کی خواہش کی، رومانوف نے اس سے انکار کر دیا لیکن شرائط صلح پر گفتگو کرنے کے لیے صدر اعظم کو دعوت دی، چنانچہ محسن زادہ پاشا نے سلطان کی اجازت حاصل کرنے کے بعد دولت عثمانیہ کے وکلاء کو روانہ کیا تاکہ شہزادہ رپن سے جو سلطنت روس کا نمائندہ تھا، شرائط صلح کریں۔

صلح نامہ کینارجی | ۱۶ جولائی ۱۷۷۳ء کو کینارجی (Kainardji) کے مقام پر مجلس صلح منعقد ہوئی اور صرف سات گھنٹوں کی گفت و شنید کے بعد تمام شرائط فریقین کے درمیان طے ہو گئے، فوکشانی اور بخارسٹ کی صلح کانفرنسوں کی مدت اور نتائج کے مقابلہ میں کینارجی کا یہ صلح نامہ حد درجہ حیرت انگیز ہے لیکن جیسا کہ کریمی نے لکھا ہے کہ دونوں فریق اب جنگ کو ختم کر دینے کے دل سے خواہاں تھے، روس کا حال باوجود اس کی شان دار فتوحات کے سلطنت عثمانیہ سے کہیں زیادہ خراب تھا، دوران جنگ میں اس کا جانی اور مالی نقصان بہت زیادہ ہو چکا تھا اور اس کے سپاہیوں کی جتنی تعداد میدان جنگ میں کام آئی تھی اس سے زیادہ سامان رسد کی کمی اور وبائی بیماریوں سے ہلاک ہو گئی تھی، اس کے متعدد صوبے طاعون نے برباد کر ڈالے تھے، استراخان کے قریب کے ایک علاقہ حکومت روس کے مظالم کی وجہ سے تقریباً ویران ہو گیا تھا، وہاں کے چار لاکھ باشندے نقل مکان کر کے اے ایف میں سلطنت چین میں جا کر آباد ہو گئے تھے، علاوہ بریس پوگاشف (Pugatoheff) کے دعویٰ سلطنت سے خود روس کے اندر ایک ایسی شورش پیدا ہو گئی تھی جس نے چند ہی دنوں میں خانہ

جنگی کی شکل اختیار کر لی اور پوگاشف کے حامیوں نے ۱۷۷۳ء اور ۱۷۷۴ء میں جنوبی روس کے تمام علاقے تاراج کر ڈالے، پوگاشف نسلأً ایک روسی قزاق تھا، گذشتہ جنگ میں وہ روسی فوج کا افسر رہ چکا تھا، مگر کسی وجہ سے فوج سے علاحدہ ہو گیا، اور کچھ دنوں ادھر ادھر پھرتا رہا، پھر ۱۷۷۳ء میں دفعۃً اس نے اعلان کیا کہ میں کیتھرائن کا مقتول شوہر شہنشاہ پیٹر ثالث ہوں جسے تخت سلطنت کی خاطر کیتھرائن نے اپنے عاشقوں سے سازش کر کے اپنی دانست میں قتل کر دیا تھا، چوں کہ روس میں بہت سے لوگ کیتھرائن کی حکومت کے خلاف تھے، اس لیے وہ پوگاشف کے ساتھ ہو گئے، صلح کے لیے روس کی آمدگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تقسیم پولینڈ کا پہلا معاہدہ حال ہی میں ہوا تھا اور کیتھرائن اس بات کی سخت ضرورت محسوس کر رہی تھی کہ دولت عثمانیہ کی طرف سے مطمئن ہو کر پوری توجہ کے ساتھ پولینڈ پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کرے، کریمی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اگر یہ حالات پیش نظر رکھے جائیں تو پھر اس فیاضی اور عالی ہمتی کی حقیقت کھل جاتی ہے، جو روس نے بزعم خود سلطنت عثمانیہ کے ساتھ معاہدہ کینارجی میں برقی اور زیادہ سخت شرائط پر اسے مجبور نہ کیا، صلح نامہ کے شرائط تو چار روز قبل ہی طے ہو گئے تھے لیکن رومانوف نے دستخط کے لیے ۲۱ جولائی کی تاریخ مقرر کی جو معاہدہ پرتھ کے تکملہ کی تاریخ تھی، مقصد یہ تھا کہ آئندہ وہ تاریخ روسیوں کے بجائے عثمانیوں کی شکست و ذلت کی یادگار رہے، کینارجی کا مقام بھی اس وجہ سے منتخب کیا گیا تھا کہ وہیں ایک سال قبل روسی جنرل واتسیمین ترکوں کے ہاتھ سے جنگ میں مارا گیا تھا۔

صلح نامہ کینارجی اٹھائیس دفعات پر مشتمل تھا، ان میں دو خفیہ دفعات کا اضافہ بھی کیا گیا، جن کے رو سے باب عالی نے یہ وعدہ کیا کہ تین سال کے اندر چار ملین روپے حکومت روس کو ادا کرے گا اور کیتھرائن نے ذمہ لیا کہ روسی بیڑا بحر الکاہلین سے فوراً واپس بلا لیا جائے گا، اور دفعات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

روس تقریباً ان تمام عثمانی علاقوں سے دست بردار ہو گیا جن پر اس کی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا، کریمیا البتہ دولت علیہ کو واپس نہ ملا، بلکہ سرحد پولینڈ تک بسراہیا کا تاتاری علاقہ اس کے ساتھ شامل کر کے ایک مستقل تاتاری حکومت قائم کر دی گئی، جس کے خان کے انتخاب کا حق صرف تاتاریوں کو دیا گیا اور اس انتخاب میں روس اور باب عالی کی مداخلت ممنوع قرار دی گئی، اس دفعہ میں یہ تصریح خاص طور پر کر دی گئی تھی کہ کسی عذر کی بنا پر حکومت روس یا دولت عثمانیہ خان کریمیا کے انتخاب میں دخل نہ دے گی اور نہ مملکت مذکورہ کے خانگی، سیاسی، بلکی اور اندرونی معاملات میں مداخلت کرے گی، بلکہ دونوں قوم تاتار کو سیاسی اور ملکی حیثیت سے ان طاقتوں کے ہم پلہ تسلیم کریں گی، جو خود مختار ہیں اور صرف خدا کے زیر فرمان ہیں، تاہم کریمیا اور دوسرے تاتاری علاقوں میں سے روس نے کرش، یعنی قلعہ، ازف اور کلبرن کے قلعوں اور ان کے ملحق اضلاع پر اپنا قبضہ قائم رکھا، یہ استثنا اپنے اندر آئندہ خطرات کا بہت کچھ سامان رکھتا تھا، کیوں کہ ان علاقوں پر قابض رہنے سے روس کو کریمیا پر حملہ کرنے کا ہر وقت موقع حاصل تھا، تبارطہ کے دونوں علاقے بھی، اگرچہ وہاں کے باشندے مسلمان تھے، روس کو دیے گئے، باقی اور تمام عثمانی مقبوضات جو روس نے دوران جنگ میں فتح کر لیے تھے اور جن میں ولاچیا، مولڈویا، بسراہیا، جارجیا اور منگولیا شامل تھے، سلطنت عثمانیہ کو واپس کر دیے گئے، اوکرائف کے قلعہ اور ضلع پرترکوں کا قبضہ قائم رہا، ولاچیا اور مولڈویا کو دولت عثمانیہ کے حوالے کرتے ہوئے یہ تصریح کر دی گئی کہ وہاں کے باشندوں کے تمام باغیانہ جرائم جو دوران جنگ میں سرزد ہوئے تھے، معاف کر دیے جائیں گے، عیسائی رعایا کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی اور آئندہ ان پر زیادہ نرمی کے ساتھ حکومت کی جائے گی، دولت عثمانیہ کی طرف سے سفیر روس متعینہ قسطنطنیہ کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ بوقت ضرورت ان صوبوں کے حق میں باب عالی میں معروضات پیش کرے اور وعدہ کیا گیا کہ ان معروضات کی سماعت پوری توجہ کے ساتھ کی جائے گی۔

عام عیسائی رعایا کے متعلق جو دفعہ صلح نامہ میں شامل کی گئی وہ نہایت اہم تھی، اس کے رو سے حکومت روس کو سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی حمایت کا حق حاصل ہو گیا اور روس کے سفیروں کو باب عالی میں عیسائیوں کی طرف سے معروضات پیش کرنے کی اجازت دے دی گئی، یہ حق کسی دوسری مسیحی حکومت کو نہیں دیا گیا، روس کی رعایا کو بیت المقدس کی زیارت کی بھی عام اجازت دی گئی، یہ زائرین ہر قسم کے حصول سے معاف کر دیے گئے اور باب عالی نے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا۔

روس اور دولت عثمانیہ کے تجارتی جہازوں کو اس تمام سمندروں میں جو ان سلطنتوں کے کنارے واقع تھے، آمدورفت کی پوری آزادی دی گئی، اسی دفعہ میں روس کو یہ حق بھی دیا گیا کہ سلطنت عثمانیہ کے جس حصہ میں مناسب سمجھے اپنے قونصل مقرر رکھے لیکن دولت علیہ کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ اپنے قونصل سلطنت روس میں بھیجے، اس کے لیے صرف اسی قدر کافی سمجھا گیا کہ اس کی رعایا کو روس میں بری اور بحری تجارت کی اجازت دے دی گئی اور عثمانی تاجروں کے ساتھ مراعات کا وعدہ کیا گیا۔

صلح نامہ میں یہ بھی طے پایا کہ آئندہ ایک روسی سفیر قسطنطنیہ میں مقیم رہا کرے گا اور زار روس "بادشاہ" کے لقب سے پکارا جائے گا، باب عالی نے زار روس کے لیے "بادشاہ" کا لقب اس وقت تک تسلیم نہیں کیا تھا، معاہدہ کینارجی سے قبل دونوں سلطنتوں کے درمیان جتنے معاہدے اور صلح نامے ہو چکے تھے، سب کا لہدم قرار دیے گئے، علاوہ اس معاہدہ کے جو علاقہ ازف کے حدود اور سرحد کیوبان کے تعیین کے لیے ۷۰۰ میاں میں ہوا تھا، اس کی پابندی بدستور قائم رکھی گئی۔

صلح نامہ کی کسی دفعہ میں پولینڈ کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں آیا، حالانکہ ابتداءً جنگ کے من جملہ اور اسباب کے ایک اہم سبب قبضہ پولینڈ بھی تھا، ایک اور معنی خیز بات یہ تھی کہ اس صلح نامہ کی ترتیب میں کوئی دوسری حکومت شریک نہیں کی گئی، یہ کیترائن کی ایک

کھلی ہوئی کامیابی تھی۔

صلح نامہ کینارجی کی اہمیت | صلح نامہ کینارجی بہ لحاظ اپنے نتائج کے ان تمام صلح

ناموں سے زیادہ اہم ہے جو دولت عثمانیہ کے آغاز و زوال کے بعد باب عالی اور عیسائی حکومتوں کے درمیان اس سے قبل ہو چکے تھے، دولت علیہ کی فوجی قوت کا خوف یورپ کے دل سے صلح نامہ کارلووئز کے بعد ہی نکل گیا تھا لیکن صلح نامہ کینارجی نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ ترکوں کے لیے خود اپنے مقبوضات کا تحفظ بھی دشوار ہو گیا ہے، کریمیا اور دوسرے تاتاری علاقوں کا سلطنت عثمانیہ کے حدود سے نکل جانا دولت علیہ کے انحطاط و زوال کی ایک ناقابل انکار شہادت تھی، صلح نامہ کارلووئز کے بعد ہنگری کی عیسائی رعایا دولت عثمانیہ کی حکومت سے آزاد ہو گئی تھی لیکن کریمیا ایک خالص اسلامی صوبہ تھا اور اس کا ہاتھ سے نکل جانا ہنگری کی دست برداری سے بہت زیادہ اہم تھا، صلح نامہ کینارجی میں کریمیا کی آزادی صاف الفاظ میں تسلیم کر لی گئی تھی اور فریقین نے اس کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینے کا سختی سے عہد کیا تھا لیکن یہ آزادی محض روسی تسلط کا دیباچہ تھی، کریمیا کو دولت عثمانیہ سے آزاد کرانے کی کوشش کیتھرائن نے صرف اس غرض سے کی تھی کہ اس پر قبضہ کرنا آسان ہو جائے، چنانچہ صلح نامہ کے چند ہی دنوں بعد اس نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے کریمیا میں اندرونی خلفشار پیدا کرنا شروع کر دیا اور پھر اپنے ہی برپا کیے ہوئے فتنہ کو دبانے کی جیلہ سے اس نے اپنی فوجیں بھیج کر پورے ملک پر قبضہ کر لیا، اس صلح نامہ کی ایک دوسری اہم دفعہ جس کے نتائج دولت عثمانیہ کے لیے نہایت مضر تھے، وہ تھی جس میں روس کو سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی حمایت کا حق خصوصاً ان عیسائیوں کی جو کلیسائے یونان سے وابستہ تھے، دیا گیا تھا، یہ ایک ایسا حق تھا جو مستقبل میں دولت علیہ کے لیے اہم ترین خطرات سے پڑتا تھا، مصطفیٰ کامل پاشا فرماتے ہیں کہ:

”عیسائی رعایا کی حمایت سے متعلق جو شرط رکھی گئی اس سے دولت عثمانیہ ہمیشہ

کے لیے ایک آفت میں مبتلا ہو گئی، کیوں کہ اس کے بعد ہر یورپین سلطنت دولت علیہ کے معاملات میں عیسائیت کے نام پر دخل دینے لگی اور پھر جب کبھی دولت علیہ اور یورپ کی کسی حکومت میں جنگ ہوتی تو اس کا سبب مسیحیت اور اس کے حقوق قرار دیے جاتے۔“

بعض اصلاحات | صلح نامہ کیناراجی کا اخلاقی اثر ترکوں پر برا پڑا، وہ روس کی طاقت سے مرعوب نظر آنے لگے، تاہم ایک جماعت استقلال کے ساتھ سلطنت کی خدمت کے لیے مستعد رہی اور شکست و ہزیمت کی اس کاری ضرب سے بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی، اس جماعت کا سب سے زیادہ ممتاز فرد حسن پاشا الجزائر می تھا، سلطان کو اس پر کامل اعتماد تھا اور اس نے حسن پاشا کو تقریباً غیر محدود اختیارات دے رکھے تھے، حسن پاشا نے بری اور بحری فوجوں کو از سر نو منظم کرنے کے لیے بعض نہایت مفید اصلاحات جاری کرنی چاہیں لیکن جہاں تک بری فوج کا تعلق تھا، اسے کام یابی نہیں ہوئی، مینی چری اور سپاہی دستوں نے جدید آلات حرب اور اصلاح شدہ فوجی قواعد کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، البتہ بحریہ کی اصلاح میں حسن پاشا کی کوششیں ایک حد تک بار آور ہوئیں، ایک انگریز جہاز سازی کی مدد سے اس نے نئے طرز کے جنگی جہاز تعمیر کرائے اور الجزائر اور دوسری بربری ریاستوں نیز بحر ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل کی بندرگاہوں سے بہترین جہاز رانوں کو بلا کر ان جہازوں پر مقرر کیا، اس نے کپتانوں کو مجبور کیا کہ اپنے جہازوں کی دیکھ بھال ہمیشہ خود کرتے رہیں، اس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ لائق اور تجربہ کار جہاز رانوں کی کافی تعداد ضرورت ناگہانی کے لیے ہر وقت قسطنطنیہ میں موجود رہے، پہلے یہ دستور تھا کہ موسم سرما میں جہاز بندرگاہوں میں کھڑے کر دیے جاتے تھے اور جہاز رانوں کو رخصت کر دیا جاتا تھا، حسن پاشا نے اس دستور کے خطرہ کو ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ دارالسلطنت کو یوں غیر محفوظ چھوڑ دینے سے روسی جہاز بحر اسود کے بندرگاہوں سے نکل کر باسفورس پر آسانی

سے قابض ہو سکتے ہیں اور پھر وہ عثمانی بیڑہ کو اس کی بندرگاہوں میں فنا کر سکتے ہیں، چنانچہ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ جس طرح بری فوجوں کے لیے قسطنطنیہ میں بارکیں بنی ہوئی ہیں، جن میں وہ موسم سرما میں قیام کرتی ہیں، اسی طرح جہاز رانوں کے لیے بھی بارکیں بنوادی جائیں لیکن صدر اعظم اور دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں نے خفیہ طور پر اس تجویز کی پرزور مخالفت کی کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ دارالسلطنت میں اتنی بڑی بحری فوج کے قیام سے حسن پاشا کو کس قدر قوت حاصل ہو جائے گی، چونکہ صدر اعظم ان بارکوں کی تعمیر کے لیے روپیہ دینے میں برابر حیلے حوالے کرتا رہا، اس لیے مجبور ہو کر حسن پاشا نے خود اپنے ذاتی روپیہ سے جہاز رانوں کے لیے ایک مستقر مختصر بیاناہ پر تعمیر کرا دیا، اس نے جہاز کے افسروں کی فنی تعلیم کے لیے ایک بحری مدرسہ بھی قائم کیا لیکن اس کی یہ تمام تجویزیں سلطنت کے دوسرے عہدہ داروں کی مخالفت کی وجہ سے آخر کار ناکام رہیں، اسی مخالفت کی وجہ سے وہ نظام جاگیری کی اصلاح میں بھی کامیاب نہ ہو سکا، جو اہل دربار کی غیر دیانت داری کے باعث نہایت اہتر ہو رہا تھا اور جنگ کے موقعوں پر باب عالی کو اس کے فائدے سے بہت کچھ محروم رہنا پڑتا تھا۔

بغاوتوں کا استیصال | حسن پاشا کی ان تجویزوں کے ناکام رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے ان بغاوتوں کے فرو کرنے کی غرض سے جو گذشتہ جنگ کے دوران میں سلطنت کے مختلف صوبوں میں نمودار ہو گئی تھیں، اکثر پایہ تخت سے باہر رہنا پڑتا تھا، اور اس کے حریفوں کو اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل جاتا تھا، چنانچہ شام میں شیخ طاہر نے خود سری اختیار کر لی تھی، سلطان نے حسن پاشا کو اس کی تنبیہ کے لیے روانہ کیا، حسن پاشا نے عکہ کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا اور شیخ طاہر کو قید میں ڈال دیا، پھر اس نے مکہ کے ملحق علاقہ کو بھی سر کیا اور بغاوت کا فتنہ کچھ دنوں کے لیے فرو ہو گیا۔

دو ہی سال کے بعد ۱۷۷۸ء میں حسن پاشا کو موریا کی سرکشی دور کرنے کے لیے

جانا پڑا، ۱۸۰۷ء میں جب روسی جنرل اورلوف کی حمایت میں موریا کے یونانی باشندوں نے دولت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا تو البانی دستے ان کے مقابلہ میں بھیجے گئے تھے اور انہوں نے یونانیوں اور روسیوں کو شکست دے کر بھگا دیا تھا، یہ دستے امن قائم ہونے کے بعد وہیں رہ گئے تھے اور اب انہوں نے خود دولت علیہ کے خلاف سر اٹھایا، وہ ہر طرف لوٹ مار کرتے پھرتے تھے اور قتل و غارت گری میں ان کے یہاں یونانیوں اور ترکوں کی کوئی تفریق نہ تھی، حسن پاشا نے موریا پہنچ کر ان کو شکست دی اور وہاں سے نکال باہر کیا، اس کے بعد سلطان نے اسے موریا کا حاکم مقرر کر دیا، اس نے ازسرنو امن وامان قائم کیا اور زراعت و تجارت کو ترقی دی۔

کچھ دنوں کے بعد مصر میں مملوکوں کی بغاوت رونما ہوئی، سلطان نے حسن پاشا کو ان کی سرکوبی کے لیے بھی روانہ کیا، چنانچہ اس نے قاہرہ پر قبضہ کر لیا اور باغیوں کے زیر کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، اگر تھوڑی سی مہلت اسے اور مل گئی ہوتی تو وہ مصر کی بغاوت کا بھی استیصال کر دیتا لیکن ۱۷۷۷ء میں روس سے جنگ کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا اور سلطان نے اسے قسطنطنیہ واپس بلا لیا۔

کیتھرائن کے منصوبے | صلح نامہ کینارجی کی سیاہی ابھی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کیتھرائن نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ کی تیاریاں پھر شروع کر دیں، اس کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد تھا، یعنی ترکوں کو یورپ سے نکال کر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینا، یہ مقصد پیٹر اعظم کی وصیت کے مطابق حکومت روس کا اولین فرض قرار پا چکا تھا، چنانچہ جب ۱۷۶۸ء میں کیتھرائن نے اپنی فوجیں سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیں تو اس کی غرض یہ نہ تھی کہ چند قلعوں پر قابض ہو جائے اور بحر اسود میں روسی جہازوں کو آمد و رفت کی اجازت دے دی جائے، بلکہ وہ شروع سے آخر تک قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہی تھی لیکن حالات خلاف توقع پیش آئے، ترکوں کا عزم و استقلال ان کی شجاعت کے

مساوی ثابت ہوا اور روسی فوجوں کو بعض سخت شکستیں اٹھانی پڑیں، جان و مال کے شدید نقصان کے علاوہ پوگاشف کی پیدا کردہ خانہ جنگی نے بھی کیتھرائن کو صلح کے لیے مجبور کیا لیکن جب ۱۱ جنوری ۱۷۵۷ء کو پوگاشف گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا نیز پولینڈ کے ان صوبوں پر جواز روئے تقسیم روس کے ہاتھ آئے تھے، پوری طرح تسلط قائم ہو گیا تو کیتھرائن کے دل میں قسطنطنیہ کی فتح کا حوصلہ پھر جوش زن ہوا، چنانچہ یہ اسی حوصلہ کی ایک بین شہادت تھی کہ جب ۸ اگست ۱۷۸۷ء میں کیتھرائن کا دوسرا پوتا پیدا ہوا تو اس نے اس کا نام قسطنطین رکھا اور اس کی رضاعت اور پرورش و پرداخت کے لیے یونانی عورتیں مقرر کیں اور جب وہ لڑکا بڑا ہوا تو بڑے بڑے لائق یونانی اساتذہ سے اس کو تعلیم دلوائی، اس طرح شہزادہ نے یونانی زبان میں مہارت حاصل کر لی، ایک انگریز مسٹرائین (Eton) جو اس وقت سینٹ پیٹرس برگ میں مقیم تھا اور شہزادہ پوٹسکن اور حکومت روس کے دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں سے گہرے تعلقات رکھتا تھا، بیان کرتا ہے کہ شہزادہ قسطنطین کی ساری تعلیم اسی مقصد کو سامنے رکھ کر دی گئی تھی کہ وہ قسطنطنیہ کے تخت کا اہل ہو سکے اور اس وقت تک کسی شخص کو بھی زارنیہ کے اس ارادہ کے متعلق کوئی شبہ نہ تھا۔

اٹین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ۱۷۹۷ء میں کیتھرائن اور شہزادہ پوٹسکن نے ایک اسکیم مرتب کی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ کے نوآبادکاروں کے خلاف روس انگلستان کو پوری مدد دے اور اس کے معاوضہ میں انگلستان روس کی مدد کرے جب وہ پھر ترکوں پر حملہ آور ہو، چنانچہ اس اسکیم کے مطابق جزیرہ مائنورکا (Minorca) جو اس وقت انگریزوں کے قبضہ میں تھا، روس کو دیا جانے والا تھا تاکہ بحر روم میں روسی جہازوں کے لیے ایک اسٹیشن کا کام دے، نیز یونانی باغیوں کے جمع ہونے کے لیے ایک محفوظ مقام حاصل ہو جائے، پوٹسکن اس اسکیم کو برطانوی سفیر مقیم سینٹ پیٹرس برگ کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ

روس کے وزیر خارجہ کانٹ پائین (Count Panin) نے جو انگلستان کے مقابلے میں فرانس کا حامی تھا، درمیان میں پڑ کر اس معاملہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا، اٹین لکھتا ہے کہ اس اسکیم کی ناکامی پر پوٹسڈم مرتے وقت تک افسوس کرتا رہا اور وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ دولت عثمانیہ کے خلاف روس کی کامیابی انگلستان سے اتحاد کرنے پر منحصر ہے، خود کیتھرائٹ کا ذاتی خیال اس سے مختلف تھا۔

سلطنت عثمانیہ کی مجوزہ تقسیم | گذشتہ جنگ میں کیتھرائٹ کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ سے متعلق اپنے حوصلوں کو پورا کرنا آسٹریا کی شرکت کے بغیر ممکن نہیں، چنانچہ اس نے ترکوں سے لڑائی چھیڑنے سے پہلے شہنشاہ جوزف ثانی سے جو میر یا تھریسیا کی وفات (۱۷۸۰ء) کے بعد سلطنت آسٹریا کا مطلق العنان فرماں روا تھا دو ایک بار ملاقات کی اور اسے اپنا گرویدہ اور اپنی ”مشرقی تجویز“ کا پر جوش حامی بنا لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جون ۱۷۸۱ء میں دونوں کے درمیان خط و کتابت کے ذریعے سے ایک معاہدہ ہو گیا جس کے رو سے کیتھرائٹ اور جوزف نے مشرق ادنیٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا عہد کیا، اس معاہدہ میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا کوئی ذکر نہ تھا لیکن ستمبر ۱۷۸۲ء میں کیتھرائٹ نے جوزف کے سامنے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی ایک مستقل اسکیم پیش کی۔

اسکیم کی بنیاد اس مفروضہ پر تھی کہ روس اور آسٹریا متحد ہو کر ترکوں کو ان کے تمام یورپین مقبوضات سے نکال دیں گے اور ان کے نکل جانے کے بعد پھر ان علاقوں کی تقسیم میں کوئی دشواری باقی نہ رہے گی، مجوزہ تقسیم یہ تھی کہ اوکرائف دریاے یوگ اور دریاے نیسٹر کا درمیانی علاقہ اور بحر الجین کے دو جزیرے روس کو دے دیے جائیں، مولڈوویا، بسرابیا اور ولچیا کو متحد کر کے ڈاسیا کے نام سے ایک آزاد مملکت قائم کر دی جائے اور شہزادہ پوٹسڈم کو اس کا بادشاہ بنا دیا جائے، آسٹریا کے حصہ میں سرویا، بوسنیا، ہرزگووینا اور ڈالماسیا کے

صوبے رکھے گئے تھے، ڈلماشیا چوں کہ وینس کا مقبوضہ تھا، اس لیے اس کی تلافی کے لیے وینس کو موریا، قبرص (سائپرس) اور کریٹ دیے گئے، کیتھرائن کو یورپین حکومتوں میں سے مخالفت کا اندیشہ صرف فرانس کی طرف سے تھا، اس لیے فرانس کو راضی کرنے کے لیے مصر و شام کے صوبے اس کے سامنے پیش کیے جانے والے تھے لیکن اس اسکیم میں سب سے زیادہ دل چسپ حصہ وہ تھا جس میں ایک بازنطینی سلطنت کا نقشہ مرتب کیا گیا تھا یعنی تھریس، مقدونیا، بلغاریا، شمالی یونان اور البانیا کو ملا کر ایک نئی سلطنت قائم کی گئی تھی جس کا پایہ تخت قسطنطنیہ تھا اور کیتھرائن کا دوسرا پوتا شہزادہ قسطنطین اس سلطنت کا فرماں روا قرار دیا گیا تھا، چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا اس شہزادہ کی تعلیم و تربیت میں یہی مقصد کیتھرائن کے پیش نظر تھا، کیتھرائن کو اپنی اسکیم کی کامیابی پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے پہلے ہی سے اس نئی سلطنت کے لیے ایک سکے بھی ڈھلوالیا تھا، جس کے ایک طرف شہزادہ قسطنطین کے چہرے کی شبیہ تھی اور دوسری طرف ایک تمثیلی نشان تھا جو ہلال پر صلیب کی آئندہ فتح و نصرت کو ظاہر کرتا تھا، یورپین حکومتوں کے اس خطرہ کو دور کرنے کے لیے کہ مبادا سلطنت روس اور جدید بازنطینی سلطنت بعد میں ایک ہی فرماں روا کے زیر حکومت آجائیں، کیتھرائن کافی ضمانت دینے پر آمادہ تھی۔

شہنشاہ جوزف کو مذکورہ بالا اسکیم سے پورا پورا اتفاق نہ تھا، اس کا خیال تھا کہ اس تقسیم میں آسٹریا کا حصہ کم رکھا گیا ہے، وہ ڈلماشیا کے علاوہ اسٹریا (Istra) کا علاقہ بھی چاہتا تھا اور سرویا کے علاوہ ولاچیا کو چک کا بھی امیدوار تھا، اسے یہ بات بھی پسند نہ تھی کہ دریائے ڈینوب کے بقیہ علاقے سلطنت عثمانیہ سے نکل کر روس کے دائرہ اقتدار میں آجائیں، تاہم وہ سمجھتا تھا کہ کیتھرائن کی مخالفت کرنے سے بجز نقصان کے کچھ حاصل نہ ہوگا، اس لیے اس نے اس اسکیم کو منظور کر کے کیتھرائن کی دوستی کو قائم رکھا۔

کریمییا پر روس کا قبضہ | یہ اسکیم بہر حال کاغذ ہی تک محدود رہی اور کیتھرائن کے حوصلوں

کے باوجود عمل میں نہ آسکی لیکن ۱۷۸۳ء میں اس نے کریمیا پر قبضہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، باضابطہ قبضہ تو ۱۷۸۳ء میں ہوا مگر اس کے لیے کوشش صلح نامہ کینارجی کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھی، اس صلح نامہ میں حکومت روس نے عہد کیا تھا کہ وہ کریمیا کے اندرونی اور ملکی معاملات میں مداخلت نہ کرے گی اور نہ اس کے فرماں روا کے انتخاب میں کوئی دخل دے گی لیکن اس کے باوجود اس نے ”دوستانہ مشورہ“ کے طور پر کریمیا کے اندرونی معاملات میں ابتداء ہی سے دخل دینا شروع کر دیا تھا اور جب باب عالی نے احتجاج کیا کہ یہ ”معاہدہ کینارجی“ کی صریح خلاف ورزی ہے تو اس کا جواب یہ دیا کہ اہل کریمیا کے باہمی جھگڑوں سے خود روس کے سرحدی علاقوں پر مضراثر پڑنے کا اندیشہ ہے، تاتاریوں نے دولت گرائی کو اپنا خان منتخب کیا تھا، کیتھرائن نے اسے اپنے اثر میں لانے کی کوشش کی، مگر کام یاب نہ ہوئی، اس لیے اس نے اب یہ تدبیر اختیار کی کہ سازشوں کے ذریعہ سے دولت گرائی کے خلاف ملک میں شورش برپا کرادی اور پھر اس شورش کو فرو کرنے کے حیلہ سے اپنی فوجیں کریمیا میں روانہ کیں، روسی افسر برابر یہ اعلان کرتے جاتے تھے کہ ان کا مقصد ہرگز کریمیا کو فتح کرنا نہیں ہے، بلکہ وہ صرف امن قائم کرنے کے لیے آئے ہیں، بہر حال انہوں نے دولت گرائی کو تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا اور اس کی جگہ شاہین گرائی کو منتخب کر لیا، یہ شخص روس کے زیر اثر اور تاتاریوں میں حد درجہ نامقبول تھا، چنانچہ کیتھرائن کے حسب توقع بہت جلد اس کے خلاف شورش برپا ہو گئی اور تاتاریوں نے اسے تخت سے معزول کر دیا چاہا، چوں کہ باب عالی بھی شاہین کا مخالف تھا، اس لیے اس نے ۱۷۸۶ء میں ایک وفد سینٹ پیٹرس برگ روانہ کیا اور کیتھرائن سے مدد کی درخواست کی، کیتھرائن اسی موقع کا انتظار کر رہی تھی، اس نے شاہین کو اپنی سرپرستی کا اطمینان دلایا اور روسی سپہ سالار رومانزوف کو حکم دیا کہ فوجیں تیار رکھی جائیں تاکہ اگر ترک اس معاملہ میں روس کی مخالفت کریں تو ان کا مقابلہ کیا جائے لیکن باب عالی میں اس وقت روس سے جنگ

چھیڑنے کی قوت نہ تھی، البتہ کیوبان کے تاریقیائل نے روس کی اس خطرناک مداخلت کے خلاف ہتھیار اٹھائے لیکن جنرل سوارو نے شکست دے کر ان کا زور توڑ دیا، ۹ مئی ۱۸۱۲ء میں باب عالی اور روس کے درمیان ایک جدید معاہدہ ہو گیا، جس میں صلح نامہ کینارجی کی دفعات از سر نو تسلیم کی گئیں، حالاں کہ کریمیا کے ساتھ روس کا طرز عمل صلح نامہ مذکور کی کھلی ہوئی خلاف ورزی تھا، اس معاہدہ میں سلطان نے خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے شاہین گرائی کو کریمیا کا جائز فرماں روا بھی تسلیم کیا۔

لیکن شاہین گرائی زیادہ دنوں تک تخت پر نہ رہ سکا، پوٹسڈام نے اپنے ایجنٹ خان کے دربار میں متعین کر دیے، انہوں نے اس کو روسی رسم و رواج اور روسی لباس اختیار کرنے کی ترغیب دی، جس سے تاتاریوں کے قومی اور مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچا اور اس کے خلاف عام بے زاری پھیلنے لگی، ان روسیوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ شاہین کے خلاف جو شورش پھیل رہی تھی، اسے اپنی خفیہ کوششوں سے بہت بڑھا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا اعلانِ بغاوت پر آمادہ ہو گئی، اب شاہین کے ان روسی مشیروں نے اسے کیتھرائن سے فوجی مدد طلب کرنے کی رائے دی، وہ غریب ان کے ہاتھوں میں کچھ ایسا مجبور ہو رہا تھا کہ چارو ناچار اس کو روس سے مدد کی درخواست کرنی پڑی، چنانچہ فوراً روسی فوجیں کریمیا میں پہنچ گئیں اور بغاوت فرو کر دی گئی لیکن اب کیتھرائن کو تاتاریوں کی فلاح و بہبود کے لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ کریمیا بلا تاخیر سلطنت روس میں شامل کر لیا جائے، جن احساس ناشناسوں نے اس تجویز کی مخالفت کی انہیں بے دردی سے قتل یا جلا وطن کر دیا گیا اور شاہین گرائی کو مجبور کیا گیا کہ زارنیک کے حق میں کریمیا اور کیوبان کی مملکت سے دست بردار ہو جائے، اس سے ایک تحریر بھی اس مضمون کی حاصل کر لی گئی کہ اس کے خاندان کے وہ افراد جو رشاہتِ تخت و تاج کے مستحق ہوتے، آئندہ ہمیشہ کے لیے کریمیا کی فرماں روائی سے معزول کئے گئے۔

ظلم و فریب کی اس حیرت انگیز کارروائی کے لیے سند جواز بھی ویسی ہی بے نظیر

پیش کی گئی، چنانچہ تاتاریوں کے ملک پر اس طرح قبضہ کر لینے کے بعد کیتھرائن کی طرف سے جو اعلان اپریل ۱۸۳۱ء میں شائع کیا گیا، وہ اسی قسم کی خدا عیوں سے پر تھا جس کا نمونہ تقسیم پولینڈ کے موقع پر یورپ کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا، یعنی کریسیا اور کیوبان کو سلطنت روس میں شامل کر لینے کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ قوم تاتار کو طوائف الملو کی اور خانہ جنگی کے مصائب سے نجات دلائی جائے اور روس کے سایہ عاطفت میں پر امن زندگی کی نعمتوں سے بہرہ اندوز کیا جائے، مغربی یورپ میں کیتھرائن کے اس الطاف خسروانہ پر تحسین و آفریں کے نعرے بلند ہونے لگے لیکن خود تاتاریوں نے ان نعمتوں کی ناقدری کی اور ایک جماعت ملکی آزادی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، جنرل پولکن (جو شہزادہ پولسکن کا عزیز تھا) نے فوراً ہی ان کی تشبیہ کردی، قتل عام میں تیس ہزار تاتاری جن میں بوڑھے، بچے، عورتیں سبھی شامل تھے، تہ تیغ کر دیے گئے، روسیوں کے مظالم سے بچنے کے لیے ہزاروں وطن چھوڑ کر بھاگ گئے، بھاگنے والوں میں پچھتر ہزار آرمینی عیسائی بھی تھے، جن میں سے سات ہزار کے علاوہ باقی سب فاقہ کشی اور سردی کی شدت سے راستہ ہی میں ہلاک ہو گئے۔

فرانسیسی مورخ ژون کیئر اس سلسلہ میں روکیئر کا ذیل بیان نقل کرتا ہے:

”صلح نامہ کینارجی کے نتائج بہت جلد محسوس ہو گئے، مسقودی کارپردازوں کی سازشوں سے قرم میں فساد ہوا، دولت خراے معزول کیا گیا اور اس کی جگہ شاہین عزائے مقرر ہوا، جس نے آپ کو کیتھرائن کی سرپرستی میں دیا، امراء نے نئے خان قرم کے خلاف بغاوت کی، خان نے روس سے مدد کی درخواست کی، (۱۸۳۱ء) پولسکن نے فوراً ستر ہزار آدمیوں کے ساتھ قرم پر حملہ کر دیا لیکن اس کی فتح کو فتح کی دیوی نے شرف نہیں بخشا، قتل کے ساتھ یہ فتح حاصل ہوئی اور پھانسیوں کے ساتھ اس کا اعلان ہوا، خود خان کی آنکھوں کے سامنے کئی ہزار شریف تاتاری سنگ سار اور قتل کر دیے گئے، روسیوں نے بد قسمت شاہین

غرائے کو ایک زمانہ تک ٹال مٹول میں رکھا، آخر بے چارے کو اپنی سلطنت سے جس کی اس نے تحقیر کی تھی، دست کش ہونا پڑا، بعد ازاں روسیوں نے اس کو کالوگا میں قید کیا، اس کو سخت تکلیفیں دیں اور اس کے ساتھ نہایت وحیانشانہ برتاؤ کیا اور بالآخر اس کو ترکوں کے انتقام کے لیے سرحدی علاقے پر چھوڑ دیا، ترکوں نے اس کو پکڑا اور رہوڈس روانہ کیا، جہاں فرانسیسی قونصل کی مزامحت کے باوجود قتل کر دیا گیا۔“

کریمیا کے مذکورہ بالا واقعات کی خبر جب قسطنطنیہ پہنچی تو وہاں سخت اضطراب پیدا ہوا لیکن اس وقت دولت عثمانیہ کی فوجی قوت ایسی نہ تھی کہ روس کے خلاف فوراً اعلان جنگ کر دیا جاتا، فرانس کو بھی کیتھرائٹ کی اس کارروائی سے نہایت تشویش ہوئی، چنانچہ اس نے روس کے مقابلہ میں جس کی قوت اب خطرناک طور پر بڑھتی جا رہی تھی، مغربی حکومتوں کا ایک اتحاد قائم کرنا چاہا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس نے انگلستان کی طرف توجہ کی اور جون ۱۸۵۳ء میں فرانسیسی سفیر مقیم لندن نے انگلستان کے وزیر خارجہ مسٹر فاکس (Fox) سے مل کر کہا کہ شاہ فرانس کو سینٹ پیٹرس برگ کی وزارت سے یہ سرکاری اطلاع ابھی ملی ہے کہ روس نے کریمیا اور کیوبان پر قبضہ کر لیا، کیا انگلستان اس قسم کی فتح کو بے اعتنائی کے ساتھ دیکھتا رہے گا؟ فاکس نے جواب دیا کہ مجھے اس میں شبہ ہے کہ روس نے حقیقتاً ان صوبوں پر قبضہ کر لیا ہے، کیوں کہ فریڈرک ایسا ہونے نہ دے گا اور قبل اس کے کہ ایسا ہو وہ روس کے خلاف اعلان جنگ کر دے گا، اس کے بعد سفیر فرانس نے اس مسئلہ پر فاکس سے متعدد بار گفتگو کی اور انگلستان اور فرانس کے اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ اگر کیتھرائٹ کی فتوحات کو روکا نہ گیا تو بہت جلد روسی بیڑا بسفوس میں نظر آئے گا اور قسطنطنیہ پر بھی کیتھرائٹ کا قبضہ ہو جائے گا لیکن فاکس کی بے اعتنائی بدستور قائم رہی اور آخر میں ان تمام

۱۔ تاریخ دولت عثمانیہ از ڈاکٹر لٹون کیر (اردو ترجمہ) سلسلہ نصاب علمیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، جلد اول،

باتوں کا جواب اس نے یہ دیا کہ کریمیا سلطنت روس میں شامل کیا جا چکا ہے اور اس معاملہ میں مداخلت کرنے کا وقت اب باقی نہیں رہا، علاوہ بریس انگلستان اور زاریہ کے درمیان کچھ معاہدے ہو چکے ہیں جن کو توڑنا مناسب نہیں، فاکس کی طرف سے مایوس ہو کر سفیر فرانس نے خود جارج سوم شاہ انگلستان سے ملاقات کی اور اس کو روسی فتوحات کی اہمیت سمجھائی اور بتایا کہ آسٹریا اور روس مل کر سلطنت عثمانیہ کو باہم تقسیم کر لینا چاہتے ہیں، جس طرح کہ انہوں نے پولینڈ پر چھاپا مار کر اس کے بڑے حصہ کو تقسیم کر لیا، جارج سوم ان واقعات سے بہت متاثر ہوا اور اس نے کہا کہ اگر ایسا ہی ہوتا رہا تو چند دنوں میں یورپ مثل ایک جنگل کے ہو جائے گا جہاں زیادہ طاقت ور کم زوروں کو لوٹ لے گا اور کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکے گا لیکن جارج اپنی وزارت اور پارلیمنٹ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا اور یہ دونوں دولت عثمانیہ کے مخالف اور روس کے طرف دار تھے، علاوہ بریس چون کہ حال ہی میں امریکہ کی جنگ آزادی ختم ہوئی تھی اور اس میں فرانس کی اعانت سے امریکہ والوں نے انگلستان کو شکست دی تھی، اس لیے باوجود اس کے کہ فرانس اور انگلستان کی حکومتوں کے درمیان صلح نامہ ہو گیا تھا، انگریزوں میں اب بھی فرانس کے خلاف بے زاری کا جذبہ عام طور پر پھیلا ہوا تھا اور وہ اس کے ساتھ اتحاد کرنے پر آمادہ نہ تھے، چنانچہ مایوس ہو کر سفیر فرانس نے ۸ اگست ۱۷۸۳ء کو اپنی حکومت کو اطلاع دے دی کہ روس کے خلاف انگلستان کا تعاون حاصل ہونے کی کوئی امید نہیں۔

پرشا اور آسٹریا سے بھی فرانس کو ایسی ہی مایوسی ہوئی، فریڈرک نے ۱۷۵۶ء کے اس معاہدہ اتحاد کی شکایت کی جس کے روسے فرانس اور آسٹریا ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے اور حکومت فرانس کو جواب دیا کہ پرشا سے اتحاد کی خواہش کرنے سے پہلے اسے چاہیے کہ آسٹریا سے اپنے دوستانہ تعلقات منقطع کر دے، اسی طرح حکومت آسٹریا نے بھی جو سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے لیے روس سے سازش کر رہی تھی، سفیر فرانس کی گذارشات پر مطلق توجہ نہ کی۔

فرانس تنہا دولت عثمانیہ کی حمایت میں روس سے جنگ کرنے پر تیار نہ تھا، چنانچہ جب اس نے آخری طور پر باب عالی کو یہ اطلاع دی کہ مغربی حکومتوں سے مدد ملنی ممکن نہیں تو مجبوراً ۸ جنوری ۱۸۴۲ء کو روس سے ایک صلح نامہ کر لینے پر جس کے رو سے کریمیا اور کیوبان پر کیتھرائن کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔

قسطنطنیہ کا راستہ | لیکن کیتھرائن کا سب سے بڑا مقصد (یعنی قسطنطنیہ کی فتح) ابھی تک حاصل نہ ہوا تھا اور اس کی ساری توجہ اب اسی کے لیے وقف ہو رہی تھی، اس نے آسٹریا کے ساتھ باہمی امداد کا ایک جدید معاہدہ کیا اور اوائل ۱۸۴۷ء میں شہنشاہ جوزف کے ہم راہ کریمیا کے سفر کے لیے روانہ ہوئی، دوران سفر میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم پر اعلانیہ گفتگو ہوتی رہی، کیتھرائن کو قسطنطنیہ کی فتح کا اتنا یقین تھا کہ جب وہ شہر خرمن سے گزر رہی تھی تو شہر کے جنوبی دروازہ کی محراب پر یہ الفاظ جلی حروف میں لکھوا دیے تھے ”قسطنطنیہ کا راستہ“۔

اعلانِ جنگ | کیتھرائن حملہ کے لیے بالکل تیار تھی لیکن وہ چاہتی تھی کہ پیش قدمی کا الزام ترکوں کے سر رہے، اس غرض سے اس نے اپنے ایجنٹ خفیہ طور پر مولڈوویا، ولاچیا، یونان اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں میں پہلے سے بھیج دیے تھے تاکہ عیسائی رعایا کو بغاوت کے لیے آمادہ کر رکھیں، روسی قونصل بھی جو صلح نامہ کینارجی کے بموجب سلطنت کے مختلف حصوں میں مقرر کر دیے گئے تھے، رعایا کو بھڑکا رہے تھے، امیر ولاچیا نے اعلانیہ خود سری کر کے روس کے دامن میں پناہ لی تھی، باب عالی نے حکومت روس سے یہ مطالبہ کیا کہ امیر ولاچیا کو پناہ نہ دی جائے اور ان قونصلوں کو معزول کر دیا جائے جو دولت علیہ کے خلاف رعایا کو ابھار رہے ہیں لیکن کیتھرائن نے اسے نامنظور کر دیا اور اس کے جواب میں بسرابیا کے صوبہ اور اوکزاکوف اور اکرمان کے شہروں کا مطالبہ کیا، اس بنا پر کہ یہ علاقے پہلے خان کریمیا کے زیر نگیں تھے، جس کی مملکت اب روس میں شامل ہو گئی تھی، ترکوں کے صبر کا پیمانہ لب ریز ہو چکا تھا، وہ اس توہین آمیز برتاؤ کو اب مطلق برداشت نہیں کر سکتے

تھے، جس کے ذریعہ سے کیتھرائن انہیں جنگ کے لیے براہیختہ کر رہی تھی، مجبور ہو کر باب عالی نے ۱۵ اگست ۱۷۹۱ء کو روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

انگلستان کا فریب | مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر باب عالی کی طرف سے اعلان جنگ بہر حال ناگزیر تھا، تاہم اسے جنگ کی ترغیب دینے میں انگلستان کے ”دوستانہ مشوروں“ کو بھی بہت کچھ دخل تھا، سفیر فرانس نے دولت عثمانیہ کی حمایت میں انگلستان سے اتحاد کرنے کی جو کوشش کی اور مسٹر فاکس نے روس کی دوستی کا جیسا کھلا ہوا ثبوت دیا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، بالاس ہمہ انگلستان دولت علیہ کا ہمدرد بنا رہا اور دوستی کے پردہ میں دشمنی کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا، ایک طرف تو اس نے اس بات کی کوشش کی کہ فرانس اور دولت علیہ میں پھوٹ ڈال دے اور دوسری طرف اپنی مدد کا فریب دے کر باب عالی کو روس کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر آمادہ کر دیا، ڈون کیر انگلستان کی اس پالیسی پر لو الے کا حسب ذیل بیان نقل کرتا ہے:

”انگلستان نے جس کے مشورے، جس کا توسط، جس کی غیر جانب داری ترکی کے حق میں سم قاتل کا کام کر رہی تھی، باب عالی کے سامنے فرانس کے اغراض کو بری روشنی میں پیش کیا اور یہ اتہام لگایا کہ فرانس دراصل اس سے عیاری اور بے وفائی کو کام میں لا رہا ہے اور دیوان کو ترغیب دی کہ وہ فرانسیسی تجاویز صلح کو رد کر دے، روس سے سازش کر کے اس نے باب عالی کو باور کرایا کہ روس دراصل خوف سے پیچھے ہٹ رہا ہے اور یہ کہ اسے سابقہ فتوح کے واپس لینے کا وقت آ گیا ہے، اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ آسٹریا کو لڑائی سے باز رکھے گا، سویڈن اور ہسٹان (پولینڈ) کو اس کی طرف سے لڑائی پر آمادہ کرے گا اور اپنی بحری قوت سے پوری مدد کرے گا۔“

ترکوں کی ابتدائی شکست | اعلان جنگ کے بعد سلطان نے غازی حسن پاشا کو فوراً

مصر سے واپس بلا لیا، جہاں وہ مملوکوں کی بغاوت فرو کرنے میں مشغول تھا اور اسے بحر اسود اور ملحق علاقہ کی بری اور بحری فوجوں کی کمان دے کر اوکزاکوف روانہ کیا تاکہ وہاں سے کلبرن پر حملہ آور ہو جو دریائے عیسٹر کے دہانہ پر اوکزاکوف کے بالمقابل دوسرے ساحل پر واقع تھا، کلبرن میں روسی فوج کا سپہ سالار سوارو تھا، جو اپنے وقت کا بہت مشہور جنرل تھا، اس نے عثمانی فوج کے نصف حصہ کو بغیر کسی مزاحمت کے دریا عبور کرنے دیا اور پھر دفعۃً اس پر حملہ کر دیا، ساتھ ہی روسی اور عثمانی بیڑوں میں بھی جنگ چھڑ گئی، جس کی وجہ سے بقیہ ترکی دستے اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے کلبرن نہ پہنچ سکے اور چھ سات ہزار سپاہی جو کلبرن کے ساحل پر اتر چکے تھے، سوارو کے اچانک اور شدید حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے اور قریب قریب سب لڑتے ہوئے مارے گئے، بحری جنگ میں بھی ترکوں کو شکست ہوئی اور حسن پاشا کے جہازوں کا بیش تر حصہ برباد ہو گیا۔

آسٹریا کا فریب | اس کے بعد ۱۷۹۷ء کی بقیہ مدت میں پھر کوئی لڑائی نہیں ہوئی بلکہ موسم سرما کے مہینے فریقین نے آئندہ جنگ کی تیاریوں میں صرف کیے، ۱۷۹۸ء کے شروع میں سوڈن اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی، جس کی وجہ سے کیتھرائٹ کو روسی فوجوں اور جہازوں کا معتد بہ حصہ بحر بالٹک اور اس کے ساحلی علاقوں کی طرف روانہ کر دینا پڑا، ابھی تک آسٹریا نے دولت عثمانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان نہیں کیا تھا، حالاں کہ روس اور آسٹریا میں معاہدہ اتحاد ہو چکا تھا اور اس کے روس سے آسٹریا کو شروع ہی سے روس کا ساتھ دینا چاہیے تھا، وجہ یہ تھی کہ جب لڑائی شروع ہوئی اس وقت جوزف صوبہ بندر لینڈر کی شورش فرو کرنے میں مشغول تھا، چنانچہ جب تک ادھر سے کسی حد تک اطمینان نہ ہو چکا، اس نے دولت علیہ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا، برخلاف اس کے اس نے اپنے سفیر کے ذریعہ سے باب عالی میں یہ پیغام بھیجا کہ وہ روس اور دولت عثمانیہ میں صلح کر دینے کے لیے تیار ہے، لیکن ہمدردی اور دوستی کی یہ نمائش اسی وقت تک قائم رہی جب تک اسے اپنی سلطنت کی

اندرونی مشکلات کی طرف سے نجات نہ حاصل ہوئی، جوں ہی بندر لینڈر کی شورش ختم ہوئی اس نے دولت علیہ کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، اعلان جنگ سے قبل ہی جب کہ وہ بظاہر روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے باب عالی کو اس فریب میں مبتلا رکھ کر بلغراد پر قبضہ کر لینا چاہا، چنانچہ ۲ دسمبر ۱۷۷۷ء کی شب میں آسٹریں فوج کے ایک دستہ نے بلغراد پر اچانک حملہ کر دیا، چوں کہ بقیہ دستے وقت پر پہنچ نہ سکے تھے، اس لیے یہ حملہ ناکام رہا اور قریب تھا کہ پورا دستہ ترکوں کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا لیکن آسٹریں کمانڈر نے بلغراد کے سرعسکر سے معافی مانگ کر اپنے سپاہیوں کی جان بچائی، سرعسکر نے ان حملہ آوروں کو صحیح و سالم واپس چلے جانے کی بھی اجازت دے دی، باب عالی نے حکومت آسٹریا کے اس شرم ناک طرز عمل کی شکایت جو زف سے کی اور اسے وہ زمانہ یاد دلایا جب شہنشاہ چارلس ششم کی وفات پر یورپ کی مسیحی سلطنتیں جنگ جانشینی کو برپا کر کے آسٹریا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھیں اور میریا تھریسیا کو اس کے حق سے محروم کر دینے پر تلی ہوئی تھیں لیکن دولت علیہ نے آسٹریا کے مصائب سے فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا، حالاں کہ اسے چارلس کے فریب کا بدلہ لینے کا بہت اچھا موقع تھا بلکہ اس کے برخلاف وہ انتہائی دیانت داری کے ساتھ اپنے معاہدہ کی پابند رہی اور آسٹریا کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے قطعی طور پر انکار کر دیا لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے کہ حکومت آسٹریا پر حرص و ہوس کا اتنا غلبہ تھا کہ احسان مندی، ایمان داری اور وقار و عزت کے شریفانہ جذبات اس کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکے، چنانچہ ۱۰ فروری ۱۷۷۸ء کو جو زف نے دولت علیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

جو زف کو نہ صرف بوسنیا اور سرویا بلکہ مولڈویا اور ولاچیا کی فتح کا حوصلہ بھی تھا، چنانچہ اس مہم کے لیے اس نے دو لاکھ فوج اور دو ہزار توپیں فراہم کیں، طے یہ پایا کہ ایک روسی فوج مولڈویا میں داخل ہو کر آسٹریا کی فوج کے ساتھ آگے بڑھے گی لیکن چوں کہ اس زمانہ

میں سویڈن اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی، اس لیے کیتھرائن آسٹریا کی مدد کے لیے دس ہزار سے زیادہ فوج روانہ نہ کر سکی، اسی معذوری سے روسی بیڑا بھی حسب وعدہ بحرہین میں نہ پہنچ سکا، تاہم بحر اسود میں روس کا ایک طاقت ور بیڑا جنگ کے لیے تیار تھا اور روسی فوجیں بحر اسود اور بحر کاہین کے درمیانی علاقوں میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں، روس کی خاص فوج شہزادہ پوٹسکن کی سپہ سالاری میں دریائے بوگ کے قریب پڑی ہوئی تھی لیکن اگست ۱۸۸۷ء تک روسی فوجیں صرف تیاریوں میں مصروف رہیں اور کسی لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔

جوزف کی مصحکہ خیر شکست | باب عالی نے یہ دیکھ کر کہ روس کی طرف سے فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہے، ایک زبردست فوج آسٹریا کے مقابلہ میں روانہ کی، جس نے دریائے ڈینوب کو عبور کر کے منڈیا کے مقام پر آسٹریا فوج کو شکست دی، جوزف اس شکست خوردہ فوج کی مدد اور ہنگری کی حفاظت کے لیے اسی ہزار سپاہیوں کے ساتھ فوراً روانہ ہوا اور سلاطینیہ میں خیمے نصب کر دیے جہاں سے قریب ہی صدر اعظم کا لشکر پڑا ہوا تھا لیکن بالکل آخر وقت میں جب کہ عثمانی لشکر پر حملہ کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں جوزف کو اپنی کامیابی میں شبہ پیدا ہوا اور اس کی ہمت چھوٹ گئی، وہ ایسا گھبرایا کہ فوراً ہی کوچ کا فیصلہ کر لیا، اس خطرہ سے کہ مبادا ترکوں کو خبر ہو جائے اور وہ دفعہٴ حملہ کر دیں، واپسی نہایت خفیہ طور پر آدھی رات کو شروع ہوئی، آسٹریا فوج میں سخت اضطراب برپا تھا، وہ تیزی کے ساتھ تمیسوار کی طرف بھاگی جا رہی تھی، اتنے میں کسی طرف سے یہ خبر اڑ گئی کہ ترک پیچھا کرتے ہوئے آرہے ہیں اور عن قریب حملہ کیا چاہتے ہیں، اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ ساری فوج میں انتہا درجہ کی بدحواسی پھیل گئی، توپ خانے پیچھے تھے اور پوری رفتار کے ساتھ بھگائے ہوئے لائے جا رہے تھے، پیدل سپاہیوں نے یہ سمجھا کہ ترک سر پر آگئے، انہوں نے فوراً چھوٹے چھوٹے دستے قائم کر کے ہر طرف بے تحاشا گولیاں چلانی شروع کر دیں، جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ دستے خود ایک دوسرے ہی پر گولیاں چلا رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہی ہاتھوں سے

دس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے، اس کے بعد ترکوں نے پہنچ کر دراصل حملہ کیا، آسٹریا پہلے ہی سے ہمت ہار چکے تھے، مقابلہ نہ کر سکے اور سراسیمہ ہو کر بھاگے، ان کے توپ خانوں اور لاؤ لشکر کا بڑا حصہ ترکوں کے ہاتھ آیا، جوزف کا شوق سپہ سالاری پورا ہو گیا، اس نے پھر کسی فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لینے کی جرأت نہیں کی، یہ واقعہ ستمبر کا تھا، نومبر میں آسٹریا اور دولت علیہ کے درمیان تین مہینہ کے لیے عارضی صلح ہو گئی، اس ایک سال کی مہم میں آسٹریا کے تیس ہزار آدمی میدان جنگ میں اور چالیس ہزار بوائے بیاریوں سے ہلاک ہو گئے تھے۔

سقوط اوکزاکوف | اگست ۱۸۷۸ء میں پوٹسڈام نے اوکزاکوف کا محاصرہ شروع کر دیا تھا لیکن دسمبر تک یہ قلعہ فتح نہ ہو سکا، آخر میں عاجز آ کر اس نے جنرل سوارو کو مدد کے لیے بلایا، سوارو کے پہنچنے سے محاصرہ کی شدت بہت بڑھ گئی، آخری حملہ ۱۶ دسمبر کو ہوا، چار ہزار روسی ترکی بندوقوں کی بازہ سے ڈھیر ہو گئے لیکن سوارو تازہ دستے پے در پے آگے بھیجتا جاتا تھا، آخر میں روسیوں کی کثرت تعداد غالب آئی اور وہ قلعہ میں داخل ہو گئے، اندر پہنچنے کے بعد بھی ترکوں نے حیرت انگیز جاں بازی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، مگر روسی فوجوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو وہ زیادہ دیر تک روک نہ سکے، روسیوں نے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد قتل عام شروع کر دیا اور تین روز تک ناقابل ذکر درندگی کے ساتھ یہ خونیں کھیل کھیلتے رہے، بوڑھے، بچے اور عورتیں سب کے سب نہایت سفاکی سے تہ تیغ کر دیے گئے، چالیس ہزار کی آبادی میں سے صرف چند سو جانیں ”جن میں زیادہ تر بچے اور عورتیں تھیں“ روسیوں کی خون خوار تلواروں سے سلامت بچ سکیں، یہ قلیل تعداد بھی بعض روسی افسروں کی ذاتی کوششوں سے بچ سکی۔

اوکزاکوف کے محاصرہ میں اٹین، شہزادہ پوٹسڈام کے ساتھ تھا، ترکوں کی شجاعت اور سرفروشی کے مناظر تو اس نے پہلے بھی دیکھے تھے مگر اس موقع پر وہ ان کے صبر و استقلال کا مشاہدہ کر کے حیرت زدہ ہو گیا، وہ لکھتا ہے:

”ترکی عورتیں اور بچے (جن کی تعداد چار سو تھی) اوکزا کو قح کی فتح کے بعد جب شہر سے نکال کر روسی فوج کے پڑاؤ پر لائے گئے تو پہلی رات کو سب کے سب ایک خیمہ میں ٹھہرا دیے گئے، موجودہ حالات میں ان کے قیام کے لیے اس سے بہتر کوئی انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا، گو اس رات کو سخت برف باری ہو رہی تھی اور ان غریبوں کو سردی کی شدت اور کپڑوں کے نہ ہونے سے بے حد تکلیف تھی، ان میں بہتیرے زخموں کی شدید تکلیف میں بھی مبتلا تھے، چون کہ میں ترکی زبان بولتا تھا، اس لیے مجھے ان کی حفاظت اور نگرانی کی خدمت سپرد کی گئی، میں نے دیکھا کہ ان سبھوں پر کامل سکوت طاری ہے، کوئی عورت نہ روتی ہے نہ آہ و فغاں کرتی ہے، حالاں کہ ان میں شاید ہر ایک کا باپ یا بچہ یا شوہر قتل ہو چکا تھا، یہ عورتیں سکون اور استقلال کے لہجہ میں بات کرتیں اور جو سوالات میں ان سے کرتا ان کے جواب بغیر کسی اضطراب کے دیتی ہیں، میں حیرت میں تھا اور یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان کی یہ حالت بے حسی کا نتیجہ ہے یا اس بات کا کہ انہوں نے قسمت کے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے اور سنے ہیں اور یا پھر ان سب کا سب تسلیم و رضا کی وہ تعلیم ہے جو ان کا مذہب انہیں دیتا ہے اور آج بھی میں اس کا سبب معلوم کرنے سے ویسا ہی قاصر ہوں، ان میں سے ایک عورت خاموش لیکن غیر معمولی طور پر غمگین انداز میں بیٹھی ہوئی تھی، میرا جی چاہا کہ اسے کچھ تسلی دوں، چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ تو کیوں نہیں ہمت سے کام لیتی اور مصیبت کو ایک مسلمان کی طرح برداشت کرتی جیسے کہ تیری ساتھی عورتیں برداشت کر رہی ہیں، اس نے میرا جواب ان مؤثر الفاظ میں دیا ”میں نے اپنے باپ، اپنے شوہر اور اپنے بچوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا ہے، اب میرا ایک ہی بچہ رہ گیا ہے“ میں نے جلدی سے پوچھا کہ وہ بچہ کہاں ہے؟ ان نے سکون کے ساتھ جواب دیا کہ ”یہ ہے“ اور ایک بچہ کی طرف اشارہ کیا جو اس کے پہلو میں پڑا ہوا تھا اور جس نے اسی وقت دم توڑا تھا، میں اور وہ لوگ جو میرے ساتھ تھے، بے اختیار رو پڑے لیکن وہ ذرا بھی نہیں روئی، اس رات کو میں ان مصیبت زدہ

عورتوں اور بچوں کو زخموں اور سردی کی تکلیف سے مر رہے تھے اپنے گرم زمین دوز کمرے میں لے گیا اور جتنے آدمیوں کی اس میں گنجائش تھی، اتنوں کو وہاں ٹھہرایا، وہ لوگ بارہ روز میرے ساتھ رہے لیکن اس پوری مدت میں ان میں سے کسی ایک نے بھی نہ کوئی شکوہ کیا اور نہ اپنے شدید اندرونی صدمہ کو ظاہر ہونے دیا، بلکہ ہر عورت خواہ وہ بوڑھی ہو یا جوان اپنی سرگذشت مجھ سے اس طرح بیان کرتی تھی جیسے وہ کسی غیر متعلق آدمی کا قصہ کہہ رہی ہو، بغیر فریاد، بغیر ٹھنڈی سانسوں اور بغیر آنسوؤں کے۔^۱

سلطان کی وفات | دوسرے سال مارچ ۱۷۸۹ء میں صدر اعظم یوسف پاشا تازہ فوجوں کے ساتھ آسٹریا کی مہم پر روانہ ہوا، اس نے فوج کا ایک حصہ پیچھے چھوڑ دیا تاکہ ولاچیا اور مولڈویا میں غنیم کی نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی رہے اور خود نوے ہزار سپاہیوں کے ساتھ دریائے ڈینیوب کو عبور کر کے ٹرانسلوینیا میں داخل ہو گیا، وہاں سے اس کا قصد خود آسٹریا پر چڑھائی کرنے کا تھا لیکن ۷ اپریل ۱۷۸۹ء کو سلطان عبدالحمید کا انتقال ہو گیا اور سلیم ثانی کی تخت نشینی کے ساتھ ہی صدارت کے عہدہ پر بھی ایک دوسرا آدمی مقرر کیا گیا، نیا صدر اعظم و دین کا سابق والی تھا، فوجی لیاقت کے اعتبار سے وہ صدر اعظم کے عہدہ کا بالکل مستحق نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف پاشا کہ مہم فتح کردی گئی اور عثمانی فوجیں ٹرانسلوینیا سے واپس بلالی گئیں۔

سلیم ثالث

۱۲۰۳ھ تا ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۷ء

سلطان سلیم خاں ثالث ستائیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، وہ فطرتاً بہت ذہین اور حوصلہ مند تھا اور اس کے چچا سلطان عبدالحمید اول نے اس کی تعلیم و تربیت خاص توجہ کے ساتھ کی تھی، دولت عثمانیہ کے مروجہ دستور کے مطابق سلیم کو بھی عبدالحمید کے عہد حکومت میں نظر بند رہنا پڑا تھا لیکن یہ نظر بندی محض برائے نام تھی، سلطان مرحوم کی غیر معمولی شفقت نے اسے بہت زیادہ آزادی دے رکھی تھی، جس سے فائدہ اٹھا کر اس نے امور سلطنت سے متعلق بہت کچھ مفید معلومات حاصل کر لیے تھے، اس کے احباب میں ایک اطالوی طبیب لورنزو (Lorenzo) نامی تھا، اس کے ذریعہ سے اس نے مغربی یورپ کی سلطنتوں کے ملکی اور فوجی دستور و قوانین سے بھی کافی واقفیت حاصل کر لی تھی اور وہ اسباب بھی معلوم کر لیے تھے، جنہوں نے مغربی قوموں کو آل عثمان کے مقابلہ میں نمایاں طور پر فائق و ممتاز بنا دیا تھا، اس نے شاہ فرانس اور اس کے بعض وزراء سے خفیہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم کر رکھا تھا اور سلطنت عثمانیہ میں اصلاحات جاری کرنے کے بارہ میں ان سے مشورہ کیا کرتا تھا، اس کے والد مرحوم سلطان مصطفیٰ خان ثالث نے اس کے لیے اپنے عہد حکومت کی ایک سرگذشت چھوڑی تھی، جس میں اس عہد کے خاص خاص واقعات، ترکوں کے انحطاط و

زوال اور نظام سلطنت کے فساد و انتشار پر مفصل تبصرہ تھا اور آخر میں ان خرابیوں کو دور کرنے کی وصیت بھی درج تھی، چنانچہ تخت پر آنے سے پہلے ہی سلیم اصلاحات کے لیے تیار ہو چکا تھا اور زمام حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد غالباً سب سے پہلا کام یہی کرتا لیکن روس و آسٹریا سے جنگ کا سلسلہ ہنوز جاری تھا، اس لیے اس کو ساری توجہ اسی جانب مبذول کرنی پڑی اور اصلاحات کو مجبوراً کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دینا پڑا۔

جنگ کا سلسلہ | شہنشاہ جوزف گذشتہ تجربہ کی بنا پر نیز علالت کی معذوری سے خود میدان جنگ میں نہ آسکا اور آسٹریا فوج کی کمان مارشل لوڈن (Loudon) کے سپرد کی جو جنگ ہفت سالہ کا ایک آزمودہ کار اور مشہور جنرل تھا، لوڈن نے بوسنیا اور سرور پر حملہ کیا اور ان دنوں صوبوں میں اسے کام یابی ہوئی، سرویا کی عیسائی رعایا نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن بوسنیا کی مسلمان آبادی جاں بازی سے مقابلہ کرتی رہی، بہر حال بوسنیا اور سرویا کے بیش تر علاقوں پر لوڈن نے قبضہ کر لیا، آسٹریا کی ایک دوسری فوج شہزادہ کوبرگ (Coburg) کی سرکردگی میں جنرل سوارو کی روسی فوج کے ساتھ مولڈیویا کی طرف بڑھی، سلطان سلیم نے ان کے مقابلہ میں حسن پاشا کو سالار عسکر بنا کر روانہ کیا، حسن پاشا ایک بڑی فوج کے ساتھ شہزادہ کوبرگ کی طرف بڑھا جو مولڈیویا کی سرحد پر فوج کشانی میں پڑا ہوا تھا، کوبرگ کی شکست یقینی تھی اگر سوارو ۳۶ گھنٹے کے اندر ساٹھ میل کا دشوار گزار پہاڑی راستہ طے کر کے اس کی مدد کو عین وقت پر نہ پہنچ گیا ہوتا، اس نے ترکی حملہ کا انتظار نہ کیا بلکہ پہنچنے کے چند ہی گھنٹوں کے بعد خود حسن پاشا کے لشکر پر حملہ کر دیا، یہ حملہ پوری طرح کام یاب رہا، ترکوں کے پیرا کھڑ گئے اور ان کا تمام توپ خانہ اور بہت زیادہ سامان غنیم کے ہاتھ آیا، اس کے بعد سلطان نے ایک دوسری فوج روانہ کی، جس سے ۱۶ ستمبر ۱۷۹۱ء کو دریائے رینک کے قریب جنرل سوارو کی فوج سے سخت مقابلہ ہوا، اس معرکہ میں بھی ترکوں کو شکست ہوئی، ان پے در پے شکستوں سے قسطنطنیہ میں سخت شورش پھیلی اور لوگوں نے سارا الزام سالار

عسکر حسن پاشا کے سر عائد کر کے سلطان سے اس کے قتل کا مطالبہ کیا، حسن پاشا دولت علیہ کی خدمت میں بوڑھا ہو گیا تھا اور اس نے سلطنت کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے لیکن اس شورش کے فرو کرنے کے لیے سلیم کو مجبوراً اس کے قتل کا حکم دینا پڑا، اسی سال بلغراد اور سمندر یا پر بھی آسٹریا کا قبضہ ہو گیا، ۱۷۹۰ء میں آسٹریا اور روس کی فوجیں متحدہ طور پر قسطنطنیہ کی جانب بڑھنے والی تھیں لیکن دو وجوہ سے یہ مہم ناتمام رہی۔

آسٹریا سے صلح | پہلی بات تو یہ ہوئی کہ شہنشاہ جوزف نے اپنی وسیع سلطنت میں جو اصلاحات جاری کی تھیں، ان کے خلاف سلطنت کے تقریباً ہر حصہ میں بغاوت برپا ہو گئی اور اسے مجبوراً اپنی فوجیں اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے ترکوں کے مقابلہ سے ہٹا لینی پڑیں، دوسرا سبب یہ ہوا کہ ۱۷۹۰ء ہی میں جوزف کا انتقال ہو گیا اور اس کا جانشین اس کا بھائی گرانڈ ڈیوک لیوپولڈ (Leopold) ہوا، وہ شروع ہی سے اپنی سلطنت کے اندرونی خلفشار اور حکومت پر شاکی دراز دستوں کے اندیشہ سے دولت عثمانیہ سے ایک باعزت صلح کر لینے کا خواہش مند تھا، علاوہ بریں وہ دولت عثمانیہ کے خلاف روس سے اتحاد کرنے کو سلطنت آسٹریا کے لیے کچھ مفید نہیں خیال کرتا تھا، چنانچہ چند چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے بعد جن میں سے ایک میں آسٹرین فوج نے اور سوا پر قبضہ کر لیا اور دوسری میں گرجیوں کے قریب میدان ترکوں کے ہاتھ رہا، باب عالی اور آسٹریا کے درمیان عارضی طور پر صلح ہو گئی، جس کا نکتہ ۱۳ اگست ۱۷۹۱ء کو صلح نامہ سسٹوا (Sistva) کے ذریعہ کر دیا گیا، اس صلح نامہ کی ترتیب میں انگلستان، پرشا اور ہالینڈ کی وساطت کو خاص دخل تھا، اس کے رو سے آسٹریا نے وہ تمام علاقے جو دوران جنگ میں بوسنیا، سرویا اور ولاچیا کے صوبوں میں فتح کیے تھے اور جن میں بلغراد اور سمندریا کے اہم قلعے بھی شامل تھے، دولت عثمانیہ کو واپس کر دیے، صرف کروشیا کے ایک مختصر سے خطہ اور اور سوا کے قدیم شہر پراپنا قبضہ باقی رکھا۔

یونانیوں کی بغاوت | لیکن کیتھرائٹس نے دولت علیہ سے صلح کرنے میں انگلستان پر شا

اور ہالینڈ کی وساطت قبول کرنے سے قطعاً انکار کر دیا، حالاں کہ ان ہی کی مداخلت سے اسے سویڈن کے ساتھ صلح کرنی پڑی تھی، وہ اب تک قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہی تھی اور فخریہ کہتی تھی کہ اگر مغربی سلطنتیں اسے سینٹ پیٹرس برگ چھوڑنے پر مجبور کریں گی تو وہ قسطنطنیہ کو اپنا دارالسلطنت بنائے گی، اسی مقصد سے اس نے یونانیوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف بھڑکانے کی پوری کوشش کی اور ۱۸۸۷ء میں جنگ شروع ہونے سے قبل یونان کے ہر حصہ میں اپنے نمائندے بھیج کر وہاں کے باشندوں کو بغاوت کے لیے تیار کر دیا، چنانچہ ۱۸۹۰ء میں یونان کے چند ممتاز آدمیوں کا ایک وفد بھی اس کی خدمت میں سینٹ پیٹرس برگ حاضر ہوا اور ترکوں کے آزادی حاصل کرنے کے لیے اس سے فوجی مدد کی استدعا کی، کیتھرائٹ نے مدد دینے کا وعدہ کیا، پھر وفد شہزادہ قسطنطین کے پاس گیا، جسے کیتھرائٹ نے بازنطینی سلطنت کا پہلا تاج دار نام زد کیا تھا، قسطنطین نے ارکان وفد سے یونانی زبان میں کہا، جاؤ تم جیسا چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا، یونانیوں نے تیرہ جہازوں کا ایک بیڑا تیار کر رکھا تھا، کیتھرائٹ نے اس کے لیے توپیں فراہم کر دیں اور ایک یونانی افسر لہرو کو یزانی (Lambro Caviaziani) کو اس بیڑہ کا امیر البحر مقرر کیا لیکن جب بحر الجبلین میں عثمانی جہازوں سے مقابلہ ہوا تو پورا یونانی بیڑا شکست کھا کر غرق ہو گیا۔

سقوط اسماعیل | بحری جنگ کا یہ نتیجہ کیتھرائٹ کے لیے زیادہ تشویش کا باعث نہ ہوا کیوں کہ اس کی بری فوجیں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں، ۱۸۹۰ء کو سب سے بڑا معرکہ اسماعیل کی فتح تھی، جو بحر اسود سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر دولت عثمانیہ کا ایک نہایت اہم قلعہ تھا، روسی فوجوں کے بلغاریا میں داخل ہونے کے لیے اس قلعہ کی فتح نہایت ضروری تھی، پونٹس نے مہینوں اس کا محاصرہ جاری رکھا لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی، آخر میں اس نے یہ مہم جنرل سوارو کے سپرد کی، سوارو نے ۱۶ دسمبر کو کمان اپنے ہاتھ میں لی اور ۲۲ دسمبر کو روسی فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں، ترکی دستہ نے مدافعت میں جاں بازی کا حق ادا کر دیا،

روسیوں کو اصلی مقابلہ شہر میں داخل ہونے کے بعد پیش آیا، بقول کریسی ہر سڑک ایک میدان جنگ تھی اور ہر مکان ایک قلعہ تھا، آخر میں روسی ہر طرف قتل عام کرتے ہوئے ناف شہر میں پہنچے جہاں ترکوں اور تاتاریوں کا ایک دستہ عثمانی شجاعت کے حیرت انگیز جوہر دکھانے کے لیے اکٹھا ہو گیا تھا، دو گھنٹے نہایت سخت لڑائی ہوتی رہی، یہاں تک کہ اس دستہ کا ایک ایک سپاہی لڑتے ہوئے مارا گیا، اس جنگ میں چونتیس ہزار ترک ہلاک اور دس ہزار گرفتار ہوئے، روسیوں نے شہر میں داخل ہو کر درندگی کی جو مثال پیش کی اس سے خود سواروں کی نگاہیں بھی نا آشنا تھیں، چنانچہ اس نے اپنے ایک دوست سے بعد میں اعتراف کیا کہ اس ناقابل دید منظر کو دیکھ کر میری آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے تھے۔

صلح کی گفتگو | سلطان سلیم نے روس کے مقابلہ میں تازہ فوجیں روانہ کیں لیکن انہیں بھی شکست ہوئی، اس درمیان میں انگلستان، پرشا اور ہالینڈ صلح کے لیے برابر کوشش کر رہے تھے، شروع میں تو کیتھرائن نے ان کی مداخلت کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور شاہ پرشا کو یہ جواب لکھوایا کہ ”زارنیہ جنگ صلح میں صرف اپنی خواہش کی پابند ہے اور امور مملکت میں کسی کی مداخلت گوارا نہ کرے گی“، لیکن جب اکتوبر ۱۷۱۱ء میں جنگ کے سب سے بڑے محرک اور حامی پونٹن کا انتقال ہو گیا اور اتحادِ ثلاثہ (انگلستان، ہالینڈ اور پرشا) کی طرف سے بھی اصرار بڑھتا ہی گیا تو مجبوراً کیتھرائن نے صلح کے شرائط پر گفتگو کرنا منظور کر لیا، اتحادیوں نے روس کے سامنے بھی وہی شرط پیش کی، جس پر آسٹریا کو رضامند کیا گیا تھا، یعنی فریقین دوران جنگ کے تمام مفتوحات سے دست بردار ہو جائیں لیکن کیتھرائن کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئی اور صلح سے صاف انکار کر دیا، وہ کم از کم اوکرائف اور دریائے نیسٹر و دریائے بوگ کے درمیانی علاقہ پر اپنا قبضہ قائم رکھنا چاہتی تھی، اتحادی اس پر رضامند نہ تھے اور انہوں نے روس پر دباؤ ڈالنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

انگلستان کی نئی پالیسی

انگلستان کے لیے روس کی مخالفت ایک بالکل نئی چیز تھی، اٹھارہویں صدی کے پیش تر حصہ میں روس کے ساتھ اس کے تعلقات دوستانہ تھے اور اس نے کبھی ان جارحانہ تجاویز کی مخالفت نہیں کی جو دولت عثمانیہ کے خلاف حکومت روس کے پیش نظر تھیں اور جن پر وہ استقلال کے ساتھ عمل کرتی چلی آ رہی تھی، لارڈ چیتھم (Lord Chatham) وزیر اعظم برطانیہ جس کی سیاست خارجہ پر اب تک عمل درآمد تھا، ترکوں کی حمایت کا مستقل طور پر مخالف تھا، یہ اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۷۸۳ء میں کیتھرائن نے کریمیا کو زبردستی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تو انگلستان میں اس کے خلاف ایک آواز بھی بلند نہیں ہوئی، برخلاف اس کے چارلس فاکس نے جو اس وقت وزیر خارجہ تھا، علانیہ کہا کہ ”میری سیاست خارجہ ایک عمیق بنیاد پر قائم ہے، شمالی طاقتوں (بشمول روس) سے اتحاد رکھنا ہر روشن خیال انگریز کا ہمیشہ سے اصول رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا“ اسی بنا پر جب ۱۷۹۱ء میں انگلستان کے نوجوان وزیر اعظم مسٹر پیٹ (Pitt) نے حکومت کی قدیم سیاست سے جس پر خود اس کا باپ لارڈ چیتھم شدت سے عامل تھا، انحراف کر کے دولت عثمانیہ کی حمایت میں روس کو صلح کے لیے مجبور کرنا چاہا تو اور پارلیمنٹ سے ایک جنگی بیڑہ کی تیاری کے لیے روپیہ کی درخواست کی تاکہ اگر کیتھرائن اتحادیوں کی وساطت کو مسترد کر دے اور صلح کے لیے راضی نہ ہو تو اسے جنگی جہازوں کے ذریعہ راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے، تو انگلستان میں اس تحریک کی پر زور مخالفت کی گئی اور پارلیمنٹ میں فاکس نے جو اب مخالف پارٹی کا لیڈر تھا، نہایت شدت کے ساتھ اختلاف کیا، پیٹ نے اس بیڑہ کو پرشاکے تحفظ اور یورپ میں توازن قوت کے قائم رکھنے کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے اپنی تقریر میں اصلی زوران ہی دو مقاصد پر دیا، اس نے بتایا کہ ترکوں کی حمایت مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ ان مقاصد کے حصول میں دولت عثمانیہ کی بقا معین ہوتی تھی، پارلیمنٹ میں اس مسئلہ پر کئی بار بحثیں ہوئیں جن میں

مخالف پارٹی کے مقررہوں نے ترکی کو محض ایک وحشی ملک ٹھہرایا اور کہا کہ نہ یورپ کے نظام مملکت میں اسے کوئی دخل ہے اور نہ اس کے حشر کا کوئی اثر تو ازن قوت پر پڑ سکتا ہے، انہوں نے کیتھرائن کی فراخ دلی اور عالی ظرفی کی تعریف و تحسین میں واقعات کو نظر انداز کر دیا اور روس کی دراز دستیوں کی طرف سے جو خطرہ مسٹر پٹ نے یورپین مملکتوں سے متعلق ظاہر کیا تھا، اس کا خوب مضحکہ اڑایا، فاکس نے کہا کہ سلطنت عثمانیہ پر روس کا قبضہ ہو جانا ایک خلاف قیاس بات ہے اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو بہتر ہی ہوگا، اس کی جماعت کے ایک رکن مسٹر وہٹ بریڈ (Whotbread) تھے، انہوں نے فرمایا ”فرض کیجیے کہ زارنیہ کے قصد و ارادہ کی نسبت جو باتیں بیان کی جاتی ہیں وہ سب پوری بھی ہو جائیں اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے ترکوں کو ان کے تمام یورپین صوبوں سے نکال دے تو بھی کیا کوئی غیر جانب دار شخص اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اس واقعہ سے نوع انسانی کو بہت کچھ فائدہ پہنچے گا“، ۱۹۲۱ء کے مشن میں اس مسئلہ پر پھر بحث ہوئی اور مسٹر پٹ نے واضح طور پر بیان کیا کہ آئندہ انگلستان کی سیاست خارجہ کا بنیادی اصول یہ ہوگا کہ یورپ میں تو ازن کو قائم رکھا جائے اور اسی بنا پر جہاں تک ممکن ہو نہ سلطنت روس کی قوت کو بڑھنے دیا جائے اور نہ سلطنت عثمانیہ کی قوت کو گھٹنے دیا جائے۔^۱

فاکس وغیرہ کی شدید مخالفت کے باوجود پارلیمنٹ کے کثرت رائے سے پٹ کی تجویز منظور کر لی لیکن پٹ کو اس کا اندازہ بہ خوبی ہو گیا تھا کہ رائے عامہ روس سے جنگ کرنے کی مخالف ہے، چنانچہ اس نے اپنی تجویز واپس لے لی اور روس کے مقابلہ میں جنگی بیڑہ بھیجنے کا خیال ترک کر دیا لیکن وہ روس کی قوت کو بڑھنے دینے پر کسی طرح تیار نہ تھا، اس کے نزدیک روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان جلد سے جلد صلح ہو جانا نہایت ضروری تھا، اس غرض سے وہ کیتھرائن پر برابر دباؤ ڈالتا رہا۔

۱۔ کریسی، جلد ۲، ص ۳۰۸ ۲۔ ایضاً ص ۳۰۹۔

صلح نامہ یاسی | کیتھرائن بھی اب صلح کے لیے آمادہ معلوم ہوتی تھی، پولینڈ کے جو صوبے روس، آسٹریا اور پرشا کی غاصبانہ تقسیم کے بعد اہل ملک کے زیر حکومت باقی رہ گئے تھے، ان میں مہبان وطن نے کوئی اسکوکو (Kosciusko) کے زیر قیادت اصلاحات شروع کر دی تھیں، جو کیتھرائن کے مصالح کے منافی تھیں، وہ پولینڈ کی دوسری تقسیم کا عزم کر چکی تھی اور اب چاہتی تھی کہ ترکوں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد جنرل سوارو کو روس کی فتح مند اور آزمودہ کار فوجوں کے ساتھ پولینڈ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کرے، چنانچہ ۱۷۹۷ء کے وسط ہی سے صدر اعظم اور جنرل رپن میں صلح کی گفتگو شروع ہو گئی اور اگست میں تمام شرائط طے ہو گئے، ۹ جنوری ۱۷۹۲ء کو یاسی کے مقام پر فریقین میں باضابطہ طور پر ایک صلح نامہ مرتب ہو گیا، اس کی ترتیب و تکملہ میں کوئی دوسری حکومت شریک نہیں کی گئی، روس نے قلعہ اوکراکوف اور دریائے میسٹر اور دریائے بوگ کے درمیانی علاقہ کے علاوہ تمام فتوحات جو بسرابیا، مولدویا، ولاچیا اور کیوبان کے صوبوں پر مشتمل تھیں، دولت عثمانیہ کو واپس کر دیں اور دریائے میسٹر سلطنت روس کی نئی سرحد قرار پایا، جس کے مغرب کے تمام مفتوحہ علاقے سلطنت عثمانیہ کو واپس کر دیے گئے، یونان بدستور باب عالی کے زیر حکومت رہا، اس صلح نامہ کے رو سے کیوبان کا صوبہ بھی دولت علیہ کو واپس مل گیا لیکن اس علاقہ میں جو چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں ان پر زارنیہ کی سیادت تسلیم کر لی گئی۔

کیتھرائن کی موت | کیتھرائن نے یہ صلح محض حالات سے مجبور ہو کر کی تھی اور اس سے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ پولینڈ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد پوری تیاری کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کے یورپی اور ایشیائی صوبوں پر بیک وقت حملہ کر دے، چنانچہ چار سال کے اندر اس نے پولینڈ پر اپنا تسلط مکمل طور پر قائم کر لیا، ۱۷۹۳ء میں پولینڈ کی دوسری تقسیم عمل میں آئی جس میں کیتھرائن اور فریڈرک نے آسٹریا کو شریک نہیں کیا لیکن ۱۷۹۵ء میں جب یہ بد قسمت ملک آخری طور پر تقسیم کیا گیا تو اس لوٹ میں روس، پرشا اور آسٹریائیوں

شریک ہوئے، غرض پولینڈ کی طرف سے مطمئن ہو کر کیتھرائن نے سلطنت عثمانیہ پر حملہ کی تیاریاں فوراً شروع کر دیں، اس نے تین لاکھ فوج اور ایک زبردست فوجی بیڑہ تیار کیا تھا اور جنگ کا اعلان بہت جلد کرنے والی تھی لیکن قضائے مہلت نہ دی اور ۱۹۱۶ء میں اس کی موت کی وجہ سے یہ مہم جو دولت عثمانیہ کے لیے غالباً روس کی سابق جنگوں سے کہیں زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی ملتی ہو گئی۔

ملکی نظم و نسق | سلطان سلیم نے صلح نامہ یاسی کے بعد اپنی ساری توجہ ملکی اصلاحات پر مرکوز رکھنی چاہی کیوں کہ سلطنت کے ہر شعبہ خصوصاً محکمہ فوج کی حالت حد درجہ خراب تھی لیکن چند ہی سال کے بعد فرانس سے جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے اصلاحات کا کام جو شروع کر دیا گیا تھا ملتوی ہو گیا، اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ کے نظم و نسق کی جو حالت تھی اس کا اندازہ کر لیں کہ صفحات سے بہ خوبی ہوتا ہے، ہم اس کے بیان کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں:

پاشا | سلیم کی سلطنت میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کی چھبیس ولایتیں شامل تھیں، یہ ولایتیں ایک سو ترسٹھ علاقوں میں تقسیم تھیں جن کو لووا کہتے تھے، ہر لووا میں متعدد قضا یا ضلعے ہوتے تھے، ہر قضا اپنا انتظام خود کرتا اور وہ عموماً ایک شہر اور اس کے ماتحت علاقوں پر مشتمل ہوتا یا ایک صلیغ (ناجیہ) پر جس میں زیادہ تر چھوٹے چھوٹے قصبے یا گاؤں شامل ہوتے تھے، ولایت کا حاکم ایک پاشا ہوتا تھا جسے ”سہ اسپ دمہ“ نشان عطا ہوتا تھا، ایسے پاشا کا منصب ایک وزیر کے منصب کے برابر ہوتا، وہ اپنی ولایت کے ایک یا چند خاص لوواؤں پر براہ راست حکومت کرتا، بقیہ لوواؤں کے مقامی حکام پر وہ ایک عام سیادت رکھتا تھا، بہتر لوواؤں کی

۱۔ یہ عثمانی فوج کا نشان تھا، گھوڑے کی دم نیزہ کے سرے پر باندھ دی جاتی تھی اور پاشاؤں کے منصب کے لحاظ سے دسوں کی تعداد معین ہوتی تھی، چنانچہ درجہ اول کے پاشا ”پاشائے سہ نشان“ اور درجہ دوم و سوم کے ”پاشائے دو نشان“ یا ”پاشائے یک نشان“ کہے جاتے تھے۔

حکومت ایسے پاشاؤں کے سپرد تھی جو ”پاشائے دونشان“ تھے، ان ہی لوگوں اور ولایتوں کو عموماً پاشا لقب دیا جاتا تھا، عام طور پر پاشاؤں کا تقرر ہر سال ہوتا تھا لیکن اگر کوئی پاشا اتنا طاقت ور ہوتا کہ اسے برطرف کرنے میں باب عالی کو بغاوت کا اندیشہ ہوتا یا وہ دیوان عالی کے بعض وزراء کو رشوت کے ذریعہ سے اپنا حامی بنائے رکھتا تو ایک ہی شخص کئی سال تک بلکہ کبھی کبھی تمام عمر اپنے عہدہ پر مامور رہتا، بائیس لوگوں کے پاشا مدت العمر کے لیے مقرر ہوتے تھے۔

اعیان | انتظام کے سلسلہ میں پاشا کی مدد کے لیے باب عالی کی طرف سے دو یا تین آدمی مقرر کیے جاتے تھے، جن کا انتخاب اس ولایت (صوبہ) کے باشندے کرتے تھے، یہ لوگ اعیان کہلاتے تھے، کبھی کبھی اعیان کا عہدہ موروثی ہوتا تھا لیکن اس صورت میں یہ ضروری تھا کہ نئے اعیان کو اپنے مورث کی جگہ پر مقرر ہونے کے لیے باشندوں کی کثرت رائے حاصل ہو، عیسائی رعایا کے افسران ہی کی قوموں میں سے مقرر کیے جاتے تھے، جو ٹیکس ان کے ضلع پر لگایا جاتا تھا، اس کی تشخیص افراد پر یہی افسر کیا کرتے تھے۔

باب عالی کا ضعف | گواٹھار ہویں صدی کے آخر تک سلطنت عثمانیہ کے متعدد صوبے ہاتھ سے نکل گئے تھے، مثلاً ہنگری، ٹرانسلوینیا اور کریسیا میں اس کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا، نیز بحر اسود اور بحر ارف کے شمالی ساحلی علاقوں سے بھی اس کا قبضہ اٹھ چکا تھا، تاہم سلطنت کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا، وہ اس وقت بھی دنیا کی عظیم الشان سلطنتوں کا ہم پلہ تھا لیکن اس وسیع سلطنت کے بہترے صوبوں پر سلطان کی حکومت محض برائے نام تھی، باب عالی کی کم زوری اور مقامی حکام کی خود سری قریب قریب ہر جگہ نمایاں تھی، عرب میں وہابیوں کا زور تھا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ جن پر ابھی تک ان کا قبضہ نہ ہوا تھا، باقی سارا ملک ان ہی کے زیر تسلط تھا، مصر میں باب عالی کے حکام کا اقتدار ختم ہو چکا تھا، اگرچہ قاہرہ میں سلطان کا علم اب بھی لہرا رہا تھا، اسی طرح شام میں دروزیوں اور لبنان اور فلسطین کے پہاڑی باشندوں نے تقریباً خود مختاری حاصل کر لی تھی، یونان کے شمالی علاقوں کے بعض فرقے بھی

خود مختار ہو گئے تھے، موٹی نگر اور ہرزگووینا کا بھی یہی حال تھا، مولڈ یویا اور ولاچیا دولت عثمانیہ کو واپس کر دیے گئے تھے مگر یہ دونوں صوبے باب عالی سے زیادہ حکومت روس کے زیر اثر تھے، بغاوت اور خانہ جنگی بڑے بڑے پاشاؤں کا عام شیوہ تھا، مثلاً عکہ میں جزار پاشا نے محصول اور خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور سلطان کے آدمیوں کو جو یہ رقیس وصول کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے قتل کر دیا تھا، پاشائے بغداد کی خود سری بھی ایسی ہی تھی، چنانچہ کئی سال تک بغداد کی ولایت سے باب عالی کو کچھ بھی رقم وصول نہ ہوئی، ودین کا مشہور پاشا پزدان اوغلو سالوں انواج سلطانی کا مقابلہ کرتا رہا اور قریبی صوبوں پر ایک خود مختار فرماں روا کی طرح وقتاً فوقتاً حملے کیا کرتا تھا، ان کے علاوہ بہت سے دوسرے پاشاؤں کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی، ان تمام بغاوتوں اور شورشوں کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کے بہت کم حصہ میں امن و امان قائم تھا اور نہ عام طور پر رعایا بے اطمینان اور جان و مال کی طرف سے خطرہ میں مبتلا تھی۔

رعایا کے مصائب | جن صوبوں کے پاشا باب عالی کے مطیع و منقاد بھی ہوتے وہاں بھی رعایا کے مصائب تھوڑے نہ تھے، پاشاؤں کا تقرر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا عموماً سالانہ ہوا کرتا تھا اور اکثر رشوت کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا تھا، خود امیدوار کے پاس اس جلیل القدر عہدہ کی ”خریداری“ کے لیے کافی روپیہ مشکل سے ہوتا تھا، وہ عموماً کسی دولت مند یونانی یا ارمنی ساہوکار سے روپیہ قرض لیتا تھا اور وہ ساہوکار رھقیقہً اس پاشا بق کا مرتب ہوجاتا تھا، اس کا ایک معتمد ایجنٹ پاشا کے ساتھ سکریٹری کی حیثیت سے رہا کرتا تھا اور اکثر وہی صوبہ کا اصلی حکم راں ہوتا تھا، یہ عیسائی ایجنٹ اپنی ہم مذہب رعایا کو خصوصیت کے ساتھ بہت ستاتے تھے، چون کہ پاشا کو ہر سال اپنے عہدہ کی ”خریداری“ کے لیے روپیہ کی ضرورت ہوا کرتی تھی، اس لیے ساہوکار کی گرفت سے آزاد ہونا آسان نہ تھا، کبھی کبھی باب عالی کی طرف سے یہ مطالبہ بھی ہوتا تھا کہ امیدوار سرکاری مال گزاری کی بروقت ادائیگی کے لیے کسی ارمنی صراف (ساہوکار) کی ضمانت پیش کرے، اس سے ساہوکاروں کا اقتدار اور بھی

بڑھ گیا تھا اور ان کا دست ستم رعایا پر زیادہ دراز ہوتا جاتا تھا، ان ساہوکاروں کے ایجنٹ رعایا سے مال گزاری وصول کرنے میں بے حد سختی کرتے تھے اور وصول کردہ رقم کا زیادہ سے زیادہ حصہ خود دبا لینے کی کوشش کرتے تھے، نتیجہ یہ تھا کہ محاصل کا بہت تھوڑا حصہ باب عالی میں پہنچتا تھا، اعیان و ولایت جن کا فرض تھا کہ اپنے ہم وطنوں کو پاشا اور اس کے لٹیرے ساتھیوں کے مظالم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے، اکثر خود بھی شریک جرم ہو جاتے تھے، اعیان میں سے اگر کوئی ایمان دار شخص ان مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا تو پاشا اس کا سخت مخالف ہو جاتا اور جھوٹے الزامات عائد کر کے قاضی کی عدالت کے ذریعہ اسے تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرتا، اس خوف سے اعیان بھی پاشا کی مخالفت کرتے ہوئے ڈرتے تھے، سالانہ مال گزاری اگر پابندی کے ساتھ خزانہ سلطانی میں پہنچتی رہتی تو باب عالی کی طرف سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی کہ یہ رقم کن جائز یا ناجائز طریقوں سے وصول کی گئی ہے، البتہ اگر پاشا کے خلاف صوبوں کے باشندوں کی طرف سے پرزور شکایتیں باب عالی میں پہنچتیں اور تحقیقات کرنے پر وہ صحیح ثابت ہوتیں تو پاشا نہ صرف معزول کر دیا جاتا بلکہ اسے قتل کی سزا بھی دی جاتی لیکن اس سزا سے رعایا کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا، کیوں کہ مقتول پاشا کی تمام املاک بحق سلطانی ضبط کر لی جاتی اور اس کی جگہ پر کوئی دوسرا پاشا مقرر کر دیا جاتا، جو مذکورہ بالا وجوہ سے ساہوکاروں ہی کی گرفت میں رہتا اور وہ بھی عموماً وہی طریقے اختیار کرتا جو اس کے پیش رونے اختیار کیے تھے، ان تعدیوں کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ پاشا اپنی ولایتوں میں شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ رہا کرتے تھے جس کے قائم رکھنے کے لیے کافی روپیہ کی ضرورت ہوتی تھی، علاوہ بریں انہیں فوج بھی رکھنی پڑتی تھی جس کے اخراجات بھی صوبہ ہی کے باشندے پورے کرتے تھے۔

پاشا کے بعد بے اور آغا کا درجہ تھا، جو اپنے اپنے علاقوں میں ویسا ہی اختیار رکھتے تھے، جیسا پاشا اپنی ولایت میں رکھتا تھا، ان کے علاوہ تمام سلطنت میں ہزاروں چھوٹے

چھوٹے عمال تھے، جنہوں نے چار چار پانچ پانچ گاؤں میں مال گزاری کا ٹھیکہ باب عالی سے لے رکھا تھا، یہ لوگ رعایا سے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کی سختیاں بھی ساہوکاروں کے ایجنٹوں سے کم نہ تھیں۔

نظام جاگیری کی ابتری | سلطنت کا ضعف و اختلال نظام جاگیری کی ابتری سے اور بھی ترقی کر گیا تھا، بہتیرے صوبوں میں تقریباً خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں، سلیمان اعظم نے جن مضبوط بنیادوں پر نظام جاگیری کو قائم کیا تھا اور جاگیرداروں کو قابو میں رکھنے کے لیے جو ضوابط مقرر کیے تھے، وہ سب اٹھارہویں صدی کے اختتام سے پیش تر بدل چکے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے ہر حصہ خصوصاً ایشیائی صوبوں میں ایک بڑی تعداد خود سر جاگیرداروں کی پیدا ہو گئی تھی، جو نسلاً بعد نسل اپنی جاگیروں پر قابض چلے آتے تھے، یہ جاگیردار عموماً درہ بے کہے جاتے تھے، یہ لوگ صرف نام کے لیے سلطان اور پاشا کے مطیع تھے، ورنہ حقیقتاً بالکل آزاد تھے اور اپنے علاقوں میں جو چاہتے کرتے، باب عالی میں اتنی قوت نہ تھی کہ ان سے اپنے احکام کی تعمیل کر سکتا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ جس بد نظمی میں مبتلا تھی، اس کا اندازہ سر جان باب ہاؤس (Sir John Hobhouse) کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے جو موصوف کے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے، یہ بیان اگرچہ صرف ایک صوبہ البانیا سے متعلق ہے تاہم اس سے دوسرے صوبوں کے حالات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، سر جان لکھتے ہیں:

”البانیا میں تقریباً ہر قسم کی حکومت کے نمونے ملتے ہیں، بعض ضلعوں اور شہروں پر ایک شخص کی حکومت ہے، جس کا ترکی لقب بولو باشی یا یونانی لقب کپتان ہے، جو مسیحی یورپ سے لیا گیا ہے، بعض اپنے اکابر کے زیر حکومت ہیں اور بعض کسی کی حکومت تسلیم نہیں کرتے، بلکہ ہر شخص خود اپنے خاندان کا حاکم ہے، چند مقامات پر حکومت معرض تعطل میں ہے اور گویا ہر طوائف الملوکی کی حالت نہیں ہے، تاہم کوئی حاکم بھی نہیں ہے، ہمارے زمانہ

میں آر جیرو کاسٹرو (Argyro Castro) کے وسیع شہر کی یہی حالت تھی، مقصلات کے بعض علاقے ایسے ہیں جہاں ہر آغا یا بے جو گویا ہمارے قدیم تعلقہ داروں کا جواب ہو سکتا ہے، ایک چھوٹا سا سردار ہے اور گاؤں کے لوگوں پر ہر طرح کا حق رکھتا ہے، باب عالی کا احترام جس نے دولت عثمانیہ کے دور عظمت میں مملکت کو چھوٹی چھوٹی پاشائیوں اور مارتوں میں تقسیم کر دیا تھا، اب بہت کم رہ گیا ہے اور مختلف علاقوں کے حدود جو اس نے قائم کیے تھے، درہم برہم اور فراموش ہو چکے ہیں۔“

مرکزی حکومت | قسطنطنیہ کی برائے نام مرکزی حکومت میں صدر اعظم ملکی اور فوجی معاملات میں سب سے بڑا عہدہ دار تھا، مذہبی معاملات میں مفتی اعظم کا عہدہ سلطان کے بعد جو خلیفہ المسلمین بھی تھا، سب سے بڑا تھا، صدر اعظم کے ماتحت قائم مقام کے علاوہ جو نائب صدر کی حیثیت رکھتا تھا ایک اور وزیر تھا جس کا تعلق ملکی اور فوجی دونوں شعبوں سے تھا، امور خارجہ رئیس آفندی کے سپرد تھے، چاؤش باشی صدر اعظم کے دیوان عدالت کا نائب صدر اور دار السلطنت کی پولیس کا افسر اعلیٰ تھا، ان کے علاوہ نشانچی، دفتر دار اور متعدد دوسرے عہدہ دار تھے، ایک بہت بڑی تعداد حضور یوں اور ایسے لوگوں کی تھی جو بلحاظ اس امر کے کہ ان میں ضروری قابلیت ہے بھی یا نہیں سرکاری عہدوں پر مامور تھے اور سلطنت کی بد نظمی سے حتی الامکان پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

دیوان | دیوان سلطانی اب عموماً ڈیڑھ مہینہ میں ایک بار منعقد ہوتا تھا، صدر اعظم کے دیوان کا اجلاس نسبتاً جلد جلد ہوا کرتا تھا اور یہ بطور دیوان عدالت منعقد ہوتا، جس میں صدر اعظم کے علاوہ قبو دان پاشا، دونوں قضاة عسکر، نشانچی اور دفتر دار شریک ہوتے، اہم مواقع پر تقریباً چالیس ارکان کی ایک بڑی مجلس منعقد ہوتی، جس میں سلطنت کے تمام شعبوں کے اعلیٰ عہدہ دار شرکت کرتے، ناگہانی ضرورتوں کے موقع پر اراکین دیوان جب طلب کیے جاتے تو وہ مسئلہ زیر غور پر کھڑے کھڑے مشورہ کرتے، ایسی مجلس کا نام ”استادہ دیوان“ تھا۔

مخصوص مراعات | جماعت علماء اور خصوصاً اس کے پیشوا اعظم کی قوت پر بہ نسبت پہلے کے بڑھ گئی تھی اور برابر ترقی کرتی جاتی تھی، یہی حال اوقاف کی تعداد کا تھا، اشخاص کی ذاتی جائیدادوں کے علاوہ کہیں کہیں پورے پورے ضلع اور شہر مسجدوں اور دوسرے مذہبی اداروں پر وقف تھے، ان اوقاف کے متولی مقررہ ذرائع کے سوا جس کی مقدار عموماً بہت کم ہوتی تھی، ہر قسم کے محصولات اور مطالبوں سے بری تھے، ایسی ہی رعایتیں اکثر ان لوگوں کو بھی حاصل تھیں جو سلطانہ والدہ اور بعض دوسرے عالی مرتبہ اشخاص کے ذاتی علاقوں کے باشندے تھے، بہتیرے ضلع ایسے بھی تھے، جہاں عیسائی رعایا قدیم رواج یا شاہی فرمان کے بموجب بلا شرکت غیرے قابض تھی اور جہاں کسی ترک کے لیے جا کر آباد ہونا قطعاً ممنوع تھا، سلطنت کے مختلف حصوں میں مغربی اقوام کے لوگ آباد تھے، جو باب عالی کے سایہ عاطفت میں خود اپنے ملکی قوانین اور قونصلوں کے ماتحت آسودگی اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس عام بد نظمی کے دور میں بھی کچھ حکام ایسے تھے جو نہایت لیاقت اور عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرتے تھے، اسی طرح بعض پاشا بھی باوجود سخت گیر ہونے کے اپنی ولایتوں میں کامل طور پر امن و امان قائم کیے ہوئے تھے، اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ میں جو تھوڑی بہت تجارت اور خوش حالی پائی جاتی تھی، وہ ان ہی مراعات اور ایسے حکام اور پاشاؤں کی رہن منت تھی۔

فوج | فوج جو اندرونی بغاوتوں کو فرو کر کے سلطنت میں امن و امان قائم کرنے اور اسے بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ تھی، اس کی حالت حکومت کے ہر شعبہ سے زیادہ خراب تھی، اس کی دو قسمیں تھیں، تنخواہ دار اور غیر تنخواہ دار، تنخواہ دار فوج کا سب سے بڑا اور اہم ترین حصہ نئی چری تھی، اٹھارہویں صدی کے آخر میں ان کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار تھی، نئی چری دستے سلطنت کے مختلف شہروں میں رہتے تھے، جہاں انہوں نے ایک طرح کی فوجی حکومت قائم کر رکھی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف کاروبار بھی کرتے تھے، اگرچہ

سرکاری رجسٹر میں نئی چری کا شمار ایک لاکھ پچاس ہزار درج تھا لیکن ان کی تعداد دھقیقہ اتنی نہ تھی، سیکڑوں ہزاروں نام فرضی درج رجسٹر کر لیے گئے تھے، جن کی تنخواہیں باب عالی سے وصول کی جاتی تھیں، پھر بھی نئی چری کی تعداد بہت زیادہ تھی اور جنگ وامن دونوں حالتوں میں ان کی اہمیت دوسرے فوجی دستوں سے بڑھی ہوئی تھی، وہ اپنے مذہب میں نہایت سخت تھے اور چوں کہ انہیں معلوم تھا کہ سلاطین ان پر کامل اعتماد نہیں رکھتے، اس لیے وہ بھی ہر ایجا اور اصلاح کو حسد اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ہمیشہ رعایا کو ستانے اور باب عالی کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ رہا کرتے تھے۔

نئی چری کے علاوہ تو پچھوں کی فوج تھی، جس کی تعداد تیس ہزار تھی، یہ بھی نئی چری دستوں کی طرح سلطنت کے بڑے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، اور نہ اور قسطنطنیہ کے بوستانچی یعنی قصر سلطانی کے باغبانوں کا شمار بھی فوج میں تھا اور ان کا مسلح دستہ سلطان کے ”باڈی گارڈ“ کی خدمت انجام دیتا تھا، ان کے علاوہ باقاعدہ پیدل فوج کے دوسرے دستے بھی تھے، ”سپاہیوں“ اور اسلحہ داروں کے قدیم سوار دستے بھی اب تک قائم تھے، اگرچہ ان کی تعداد اور قوت میں بہت کچھ کمی ہو گئی تھی، بے ضابطہ فوج میں خصوصیت کے ساتھ دو دستے شامل تھے جو زعامت اور تیمار کے جاگیر دار جنگ کے موقعوں پر فراہم کرتے تھے لیکن جاگیروں میں جو فساد و انتشار پھیلا ہوا تھا اس کی وجہ سے ان دستوں کی تعداد اور فوجی قابلیت پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا اور نہ یہ یقین تھا کہ جتنے سپاہی جاگیر داروں کے علم کے نیچے جمع ہوں گے وہ آخر وقت تک جنگ میں شریک بھی رہیں گے، علاوہ بریں جنگ کے زمانہ میں کچھ نئے دستے بھرتی کر لیے جاتے تھے جن کو میری عسکری کہتے تھے، انہیں صرف لڑائی کی مدت کی تنخواہ دی جاتی تھی، جب کسی ترکی شہر کا محاصرہ ہوتا تو محاصرہ کے قائم رہنے تک اس شہر کے مسلمان باشندوں کا ایک فوجی دستہ بنا دیا جاتا اسے برلی نفرات کہتے تھے، ان کے علاوہ رضا کاروں کے بے ضابطہ دستے بھی تھے، جو لڑائی کے موقعوں پر عثمانی لشکر کے ساتھ ہو جاتے۔

سلطان کی باضابطہ اور بے ضابطہ فوجوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا، صوبوں میں پاشاؤں کے فوجی دستے بھی ہوتے تھے، جنہیں پاشا خود بھرتی کرتے تھے اور جن کی تنخواہیں وہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے، یہ دستے مستقل نہ تھے بلکہ صرف جنگ کی مدت تک رکھے جاتے تھے۔

ان مختلف ذرائع سے سپاہیوں کی ایک عظیم الشان تعداد علم سلطانی کے نیچے اکٹھا ہو جاتی تھی، چنانچہ جنگ کی ابتدا میں تین لاکھ آدمیوں تک غنیم کے مقابلہ میں روانہ کیے جاسکتے تھے اور اگر میدان عثمانیوں کے ہاتھ رہتا تو ان کے علاوہ بے اور بے شمار دوسرے رضا کار فوج میں شامل ہونے کے لیے تیار ملتے لیکن یہ انبوه زیادہ تر بے ضابطہ دستوں پر مشتمل ہوتا، جو نظم و تجربہ دونوں سے عاری ہوتے، یہ دستے بہت کچھ مہینے سے زیادہ کے لیے بھرتی کیے جاتے، شکست کے لیے پہلے ہی موقع پر وہ ہزاروں کی تعداد میں میدان جنگ چھوڑ کر منتشر ہو جاتے اور اپنے گھروں کو واپس جاتے ہوئے راستہ میں دشمن یا سلطان کے جو علاقے بھی ملتے، بلا امتیاز انہیں لوٹتے جاتے، ترک سپاہی اپنی فطری شجاعت اور مملکت تیغ زنی کی وجہ سے اب بھی ایک خوف ناک حریف تھا اور ترک سواروں کی طوفانی یورش خصوصاً ایسے علاقوں میں جہاں کوئی دوسری سوار فوج گزرنے کی جرأت بھی نہ کر سکتی، دشمن کے لیے اور بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی لیکن جہاں تک فوجی ضبط و نظم کا تعلق تھا، مسیحی یورپ کی فوجوں کے مقابلہ میں عثمانی فوج بالفاظِ نیپولین محض ایک ایشیائی بھیڑ تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ سوار اور پیدل دونوں فوجوں میں اسلحہ کے متعلق کوئی ضابطہ نہ تھا اور نہ ان کو باقاعدہ دستوں میں لڑنے کی تعلیم دی جاتی تھی، ہر سپاہی جو ہتھیار چاہتا، استعمال کرتا اور جب لڑائی شروع ہو جاتی تو جس طرح چاہتا لڑتا، فرانسیسی جنرل بویر (Boyer) اس زمانہ کے ترک سپاہی کی نسبت لکھتا ہے کہ:

”ان میں نہ کوئی ترتیب ہے نہ ثابت قدمی، وہ دستے بنا کر فوجی اصول کے

مطابق چل بھی نہیں سکتے، بے ترتیب ٹولیوں میں آگے بڑھتے ہیں اور دفعۃً غضب ناک ہو

کر نہایت شدت کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیتے ہیں۔“

بحریہ | بحریہ کی حالت غازی حسن پاشا کی کوششوں کے باوجود بری فوجوں سے بھی زیادہ خراب تھی۔

غرض اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ بحیثیت مجموعی اپنے زوال و پستی کی انتہا کو پہنچ گئی تھی، سلطان سلیم کی اصلاحی کوششوں سے اس کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا، یہ صحیح ہے کہ ان اصلاحات کی مخالفت شدت کے ساتھ کی گئی، یہاں تک کہ فوج نے علانیہ بغاوت کر دی اور سلیم کو اپنے تخت کی حفاظت کے لیے مجبوراً اصلاحات کو منسوخ کر دینا پڑا، گو اس کے باوجود وہ نہ صرف معزول کر دیا گیا بلکہ ایک سال کے بعد قتل بھی کر دیا گیا لیکن ان اصلاحات سے جو نئی روح پیدا ہو گئی تھی، وہ پھر کبھی فنا نہ ہوئی اور دولت عثمانیہ کے آئندہ فرماں رواؤں اور مدبروں نے سلیم ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی، سلطان محمود ثانی اور سلطان عبدالحمید اول کے اصلاحی کارناموں کا سنگ بنیاد سلیم ہی کے ہاتھوں سے رکھا گیا تھا۔

اصلاحات | سلیم نے اصلاحات کا آغاز صلح نامہ یاسی کے فوراً بعد کر دیا تھا، اس نے سلطنت کے ہر شعبہ کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ایک جامع اسکیم مرتب کی تھی، نظام جاگیری اس حد تک ابتر ہو چکا تھا کہ اسے منسوخ کر دینا ہی مناسب خیال کیا گیا، تجویز یہ تھی کہ موجودہ جاگیرداروں کے مرنے پر ان کی جاگیریں (زعامت اور تیماردنوں) ضبط کر لی جائیں اور آئندہ ان جاگیروں کی آمدنی سرکاری خزانہ میں جمع کی جائے اور اس سے ایک نئی فوج کے مصارف ادا کیے جائیں، ولایتوں کے اصلاح نظم و نسق کے لیے یہ قرار پایا کہ پاشاؤں کے اختیارات کم کر دیے جائیں، ہر ولایت کا حاکم تین سال کے لیے مقرر کیا جائے اور اس مدت کے خاتمہ پر اس کا دوبارہ تقرر صرف باشندگان ولایت کی رضامندی سے کیا جائے، ولایتوں سے متعلق ایک اور اصلاح بھی تجویز کی گئی، جس سے باشندوں کو

بہت فائدہ پہنچتا، وہ یہ کہ مال گزاری وصول کرنے کے لیے جو ٹھیکے لوگوں کو دیے جاتے تھے، وہ سب موقوف کر دیے جائیں اور آئندہ تمام مال گزاری صرف سرکاری خزانہ کے عمال کے ذریعہ سے وصول کی جائے، مرکزی حکومت میں صدر اعظم کے اختیارات کسی قدر محدود کر دیے گئے اور تمام اہم مسائل پر دیوان سے مشورہ کرنا اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔

تعلیم | سلیم نے رعایا کے ہر طبقہ میں تعلیم پھیلانے کی کوشش کی اور تمام سلطنت میں مدرسے قائم کیے، اس کی سرپرستی سے یونانیوں نے خاص طور پر فائدہ اٹھایا اور اپنے قدیم مدرسوں کو مستحکم کرنے کے علاوہ بہت سے جدید مدرسے بھی قائم کر لیے لیکن ان کی انقلاب پسند جماعت نے مدرسوں اور مطبعوں کے ذریعہ سے اپنی قوم میں دولت عثمانیہ کے خلاف شورش برپا کرنے کی کوشش کی، باوجود اس کے سلیم نے یونانی مدرسوں اور چھاپا خانوں کو بند نہیں کیا بلکہ قسطنطنیہ میں ایک مطبع قائم کر کے یونانی پادریوں کے ذریعہ سے اس فتنہ کا سد باب کرنا چاہا، سلطنت عثمانیہ میں پہلا مطبع سلطان احمد ثالث کے عہد میں قائم ہوا تھا، سلیم نے علوم کی نشر و اشاعت کے لیے متعدد مطبعے قائم کیے، اس کے حکم سے مصانیف (Tactics) اور استحکامات کے فن کی بہت سی کتابوں کے ترجمے فرانسیسی زبان سے ترکی زبان میں کر کے شائع کیے گئے، اس نے عثمانیوں کی سیاسی تربیت کی غرض سے یورپ کے خاص خاص پایہ تختوں میں مستقل سفارت خانے قائم کرنے چاہے، چنانچہ لندن، پیرس، وینا اور برلن میں ترکی سفارتیں قائم ہو گئیں اور سفیروں کے ساتھ عثمانیوں کی ایک جماعت روانہ کی گئی لیکن حکومت روس نے بعض جیلوں سے ترکی سفارت خانے کو اپنے یہاں قائم نہ ہونے دیا۔

فوج | سلیم نے سب سے زیادہ توجہ فوجی اور بحری اصلاحات پر کی، نئی چری کی خود سری پر نظر رکھتے ہوئے وہ خوب جانتا تھا کہ مذکورہ بالا اصلاحات کے جاری کرنے اور سلطنت کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک منظم اور وفادار فوج کی کتنی ضرورت ہے، پیٹر اعظم کی مثال بھی ہمیشہ اس کے پیش نظر تھی، جس نے یورپین فوجوں کے نمونہ کے مطابق

جدید فوجیں تیار کر کے اندرونی اور بیرونی دونوں دشمنوں کو شکست دے دی تھی، نئی چری کی سرکشی روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی، وہ سلطنت کے امن و امان کے لیے ایک مستقل خطرہ تھے، وہ اپنے نظام میں کسی اصلاح کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، یہی وجہ تھی کہ سلیم کو ایک ایسی فوج قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا جو یورپ کے جدید فوجی نظام کے مطابق مرتب کی گئی ہو اور جس پر پوری طرح اعتماد کیا جاسکے، گزشتہ جنگ میں جو قیدی گرفتار ہو کر آئے تھے، ان میں ایک ترک بھی تھا جو مدت سے روسی فوج میں ملازم تھا اور ترقی کر کے لفظیٹ کے عہدہ تک پہنچ گیا تھا، اس کا نام عمر آغا تھا، صدر اعظم یوسف پاشا اکثر اس سے روسیوں کے فوجی نظام پر باتیں کیا کرتا تھا، چنانچہ آغا عمر کی خواہش پر اس نے عثمانیوں کا ایک دستہ پوربین طرز پر مرتب کرنے کی اجازت دے دی، عمر آغانے اس دستہ کو یوربین طریقے سے مسلح کر کے تربیت دینا شروع کیا، جنگ کے خاتمہ پر جب یوسف پاشا قسطنطنیہ کو واپس ہوا تو عمر آغا اور اس کے نئے دستہ کو بھی ساتھ لایا اور ان کے لیے قسطنطنیہ سے قریب ایک گاؤں میں چھاؤنی بنوادی، جب سلیم کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے ایک روز خود جا کر اس دستہ کا معائنہ کیا اور دیکھتے ہیں عثمانی فوجوں پر اس کی برتری محسوس کر لی، اس نے نہ صرف اسے قائم رکھا بلکہ دیوان میں یہ تجویز پیش کی کہ نئی چری میں بھی یہ جدید نظام جاری کر دیا جائے، نئی چری نے اس کے خلاف بغاوت کر دی، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے سلیم کو بالآخر وعدہ کرنا پڑا کہ جدید نظام کی پابندی نئی چری پر عائد نہ کی جائے گی، تاہم عمر آغا کا دستہ بدستور قائم رکھا گیا۔

۱۷۹۶ء میں جنرل ڈوبائے (Dubayet) جمہوریہ فرانس کے سفیر کی حیثیت سے قسطنطنیہ آیا، وہ سلطان کو نذر دینے کے لیے متعدد توپیں اور چند فرانسیسی پوچی اور انجینیر بھی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا تاکہ عثمانی توپچی ان کی مدد سے یورپ کے جدید حربی اصولوں سے واقف ہو جائیں اور اپنے سلاح خانوں اور توپ ڈھالنے کے کارخانوں میں ضروری

اصلاحات جاری کر سکیں، اس کے ساتھ فرانسیسی پیدل اور سوار فوجوں کے بہت سے افسر بھی تھے، جنہیں وہ ”سپاہی“ (سوار) اور نی چری (پیدل) فوجوں کی تنظیم و تربیت کے لیے لایا تھا، سلیم نے اس تحفوں کو بہت خوشی کے ساتھ قبول کیا اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، چنانچہ توپ خانوں میں فرانسیسی توپچیوں کی مدد سے، بہت کچھ اصلاحیں کی گئیں اور سواروں کا ایک دستہ بھی یورپین طرز پر مسلح اور مرتب کر لیا گیا، لیکن نی چری نے برہم ہو کر یورپ کے اسلحہ اور جنگی طریقوں کے اختیار کرنے سے قطعی انکار کر دیا، مجبوراً فرانسیسی افسروں نے اسی فوج کو تعلیم دینے پر قناعت کی جو عمر آغا کی تربیت میں قائم کی گئی تھی، قسطنطنیہ پہنچنے کے چند ہی مہینوں کے بعد جنرل دوبائے کا انتقال ہو گیا اور اس کے بہتیرے افسر فرانس واپس چلے گئے لیکن قبو دان کو چک حسین پاشا نے نظام جدید کی قدر و اہمیت کا اندازہ کر کے کچھ افسروں کو اپنی ملازمت میں رکھ لیا اور اونچی اونچی تنخواہوں کا لالچ دے کر مسلمانوں کو عمر آغا کی فوج میں داخل ہونے کی ترغیب دی، ۱۷۹۸ء میں جس فرانس اور دولت علیہ کے درمیان جنگ چھڑی تو اس نئی فوج کی تعداد چھ سو تھی۔

بحریہ | کو چک حسین ۱۷۹۲ء میں قبو دان پاشا مقرر ہوا تھا، وہ بارہ سال تک اس عہدہ پر مامور رہا اور اس مدت میں اس نے ترکی بیڑہ اور سلاح خانہ کی نئی تنظیم کی، اس نے فرانسیسی اور انگریزی بیڑوں کے نمونہ پر عثمانی بیڑے کو از سر نو منظم کیا اور بہت سے نئے جنگی جہاز بنوائے، اس نے سویڈن اور فرانس کے ماہر انجینئروں کی ایک بڑی تعداد ہوائی اور ان کی مدد سے عثمانیوں کو جدید طرز کی توپیں ڈھالنا سکھائیں، سلطان عبدالحمید اول کے عہد میں بیرن دی توت کے زیر نگرانی ایک مدرسہ توپچیہ قسطنطنیہ میں قائم ہوا تھا، کو چک حسین پاشا نے اسے نئے سرے سے منظم کیا اور ایک جدید بحری مدرسہ قائم کیا، ان مدارس کے طلبہ کے لیے اس نے

۱۔ ”نظام جدید“ اس نئی فوج کا بھی نام تھا جو یورپ کے جدید فوجی نظام کے مطابق مرتب کی گئی تھی اور سلیم کی اصلاحات کا مجموعی نام بھی ”نظام جدید“ تھا۔

فن استیکامات سے متعلق فرانسیسی پروفیسر واپان اور دوسرے ماہرین فن کی کتابوں کے ترجمے ترکی زبان میں طبع کرائے اور مدرسہ توہنجیہ میں ایک کتب خانہ قائم کیا، جس میں وہ تمام اہم کتابیں جمع کیں جو یورپ میں جدید فنون جنگ اور ریاضیات پر لکھی گئی تھیں، اس کتب خانہ میں چار سو کتابیں تھیں، جن میں بہترین فرانسیسی مصنفین کی کتابوں کا انتخاب تھا فرانسیسی زبان کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا، جو بقول ژون کیر ”اس زمانہ کے لحاظ سے نہایت بے باکانہ بدعت تھی“ حسین پاشا نے بحری ڈاکوؤں کے استیصال کی بھی پوری کوشش کی، جنہوں نے بحر اسپین کو اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور تجارتی جہازوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، اس نے اپنے تقرر کے پہلے ہی سال میں لمبرڈو کویزیانی (Lambro Caviaziani) مشہور بحری ڈاکو کے بیڑہ کا قلع قمع کر دیا، اس کی سرگرمیوں سے ان ڈاکوؤں کی قوت بہت کچھ کم زور ہو گئی۔

نیپولین | اس درمیان میں انقلاب فرانس کے ہنگامے شروع ہو گئے تھے اور فرانسیسی فوجیں حریت، مساوات اور اخوت کے نعرے بلند کرتی ہوئی سرعت کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں، چند سال کے اندر نیپولین بونا پارٹ نے وینس کی قدیم جمہوریہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور پھر اپنی فاتح فوج کے ساتھ آسٹریا کی جانب بڑھا لیکن سلیم نے دولت عثمانیہ کے قدیم دشمنوں (وینس و آسٹریا) کے خلاف اس کے روایتی حلیف (فرانس) کے جارحانہ اقدام سے فائدہ اٹھانے کی مطلق کوشش نہیں کی، بلکہ اپنی توجہ تمام تر ملکی اصلاحات کی جانب رکھی، شاہ فرانس لوئی شانزدہم کے قتل سے وہ ضرور متاثر ہوا، لوئی کے ساتھ اس کے ذاتی تعلقات تھے، چنانچہ تخت نشینی سے پہلے بھی وہ اس سے خط و کتابت کیا کرتا تھا، پھر بھی اپنی سلطنت کی اندرونی حالت پر نظر رکھتے ہوئے نیز ان اصلاحات کی تکمیل کے لیے جو اس نے شروع کر دی تھیں، سلیم کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ یورپ کے اس ہنگامہ رست خیز سے الگ رہے، مگر اس کی یہ کنارہ کشی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی، ۱۷۹۷ء میں صلح نامہ کیمپونو رمیو (Campo Formio) کے رو سے جو آسٹریا اور جمہوریہ فرانس کے درمیان طے ہوا، جمہوریہ وینس کا خاتمہ

ہو گیا، خود وینس اور اس کے اطالوی مقبوضات کا ایک بڑا حصہ آسٹریا کے ہاتھ آیا اور بحر ایڈریاٹک کے مقبوضات جزائر آئیونین اور وہ شہر جو بحر ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر وینس کی ملک تھے، جمہوریہ فرانس کے قبضہ میں آئے، اس طرح فرانسیسی علاقے سلطنت عثمانیہ کی سرحد سے بالکل متصل ہو گئے، نپولین کی حیرت انگیز فتوحات نے جمہوریہ فرانس کے حوصلے بہت بڑھا دیے تھے، چنانچہ جزائر آئیونین کے حاصل کرنے کے بعد اسے عثمانی مقبوضات کی طرف بڑھنے کا خیال پیدا ہوا اور سلطنت عثمانیہ کے ضعف و اختلال نے اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچائی، بہتیرے صوبوں کے پاشا مثلاً علی پاشا والی باغینہ، عثمان پاشا (پیروان اوخلو) والی و دین اور جزائر پاشا والی عکہ قریب قریب خود مختار ہو چکے تھے، مصر محض نام کے لیے سلطان کے زیر حکومت تھا، ورنہ اصلی حکومت مملوکوں کی تھی، باب عالی کی طرف سے جو پاشا وہاں مقرر ہوتا تھا، اسے حقیقتاً مملوکوں کے مقابلہ میں کوئی اختیار حاصل نہ تھا، سر ویا اور یونان بغاوت کے جذبات سے لب ریز تھے اور صرف موقع کا انتظار کر رہے تھے، سارے یورپ کی طرح فرانس کی مجلس عاملہ (ڈائریکٹری) کو بھی یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ بہت قریب ہے اور وہ اس سلطنت کی تقسیم میں سب سے بڑا حصہ لینے کا قصد کر رہی تھی، اسی غرض سے نپولین نے اپنے فرستادے ان میں سے کئی صوبوں خصوصاً یونان میں روانہ کیے تھے اور وہاں کے باشندوں کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر وہ دولت علیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کریں گے تو فرانسیسی فوج ان کی مدد کرے گی، چنانچہ طولوں میں پینتیس ہزار آزمودہ کار فرانسیسی سپاہیوں کی ایک فوج تیار کی گئی، جنگی جہازوں کے علاوہ سواری اور بار برداری کے تین سو جہاز تھے، عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ حملہ سلطنت عثمانیہ کے کسی یورپین صوبہ پر ہوگا لیکن آخر وقت میں نپولین کی تحریک سے حکومت فرانس نے یہ فیصلہ کیا کہ مصر کی راہ سے انگلستان پر ضرب لگائی جائے، نپولین کو یہ امید تھی کہ وہ مصر کو فتح کرنے کے بعد ہندوستان پر حملہ کرے گا اور سلطنت برطانیہ کو برباد کر کے فرانس کے لیے ایک عظیم

الشان مشرقی سلطنت قائم کرے گا لیکن مصر دولت عثمانیہ کے زیر حکومت تھا اور مملوکوں کی سرکشی اور عملی خود مختاری کے باوجود سلطان کی فرماں روائی سے آزاد نہیں سمجھا جاتا تھا، دولت عثمانیہ اور فرانس کے درمیان دوستانہ تعلقات مدت سے قائم تھے، اس لیے مصر پر حملہ کرنے کا کوئی معقول عذر فرانس کے پاس نہ تھا، مگر نیپولین باب عالی کی کم زوری اور مملوکوں کی سرکشی سے پوری طرح واقف تھا، اس نے مصر پہنچ کر اپنی مہم کا مقصد یہ ظاہر کیا کہ میں سلطان کی حمایت اور اہل مصر کو مملوکوں کے مظالم سے نجات دلانے آیا ہوں، اسی مصلحت سے اس نے دولت عثمانیہ کے خلاف کوئی اعلان جنگ نہیں کیا۔

نیپولین کو حکومت فرانس کی طرف سے یہ خفیہ احکامات ملے تھے کہ مصر پر قبضہ کر کے جہاں تک ممکن ہو انگریزوں کو ان کے ایشیائی مقبوضات سے نکال دیا جائے، بحر احمر پر فرانسیسی تسلط مکمل طور پر قائم کر دیا جائے اور مالٹا پر قبضہ کر لیا جائے، ان احکام کے علاوہ خود نیپولین کی ذاتی اسکیم یہ تھی کہ ایشیا میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرنے کے بعد یونانیوں اور دوسرے عیسائی فرقوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارے، ترکوں کو شکست دے کر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لے اور پھر وہاں سے یورپ پر حملہ آور ہو۔

مالٹا | ۱۹ مئی ۱۷۹۸ء کو نیپولین نہایت خاموشی کے ساتھ طولون سے روانہ ہوا، اس کے ساتھ فرانس کے علما اور ماہرین فن کی ایک جماعت بھی تھی، جو مصر کے مطالعہ اور وہاں کے حالات کی اصلاح و ترقی کے اسباب پر غور کرنے کے لیے اس مہم میں شریک کی گئی تھی، نیپولین نے مہم کے اصلی مقصد کو یہاں تک خفیہ رکھا کہ فوج کو بھی اطلاع نہ دی، طولون سے روانگی کے تین ہفتہ بعد فرانسیسی بیڑا مالٹا پہنچا، مبارزین سینٹ جان کی وہ شجاعت جس نے سلیم اعظم جیسے فاتح کے حملہ کو بھی ناکام رکھا تھا، وہ صدیوں کے اندر عیش و عشرت کی نذر ہو چکی تھی، باہمی اختلافات نے ان کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دیا تھا، چنانچہ انہوں نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیے اور یہ اہم جزیرہ سلطنت فرانس میں شامل کر لیا گیا۔

اسکندریہ | مالٹا کی فتح کے بعد نپولین نے جزیرہ کویت کا رخ کیا، مگر یہ معلوم کر کے انگریز امیر البحر نیلسن (Nelson) اس کے تعاقب میں ہے، وہ فوراً اسکندریہ کی طرف روانہ ہو گیا اور اب پہلی بار اس نے فوج کو اس کی منزل مقصود سے آگاہ کیا، اس نے اپنے اعلان میں فوج کو یوں مخاطب کیا:

”سپاہیو! تم ایک ایسی فتح کے لیے جا رہے ہو جس کے اثرات دنیا کی تہذیب اور تجارت پر بے حساب ہوں گے، تم انگلستان پر موت کی ضرب لگانے سے پہلے ہی ایک نہایت یقینی اور کاری ضرب لگاؤ گے، ممالک جو تمام تر انگریزی تجارت کے حامی ہیں، تمہارے پہنچنے کے چند ہی دنوں بعد نیست و نابود ہو جائیں گے۔“

نیلسن کو جب طولوں سے فرانسیسی بیڑے کی روانگی کا علم ہوا تو یہ قیاس کر کے کہ نپولین مصر پر حملہ کرنا چاہتا ہے، خود بھی اپنے جنگی جہازوں کے ساتھ اسکندریہ کی طرف روانہ ہو گیا لیکن وہاں ۲۸ جون کو پہنچنے کے بعد اسے اطلاع ملی کہ فرانسیسی بیڑے کا کہیں پتہ نہیں، چنانچہ مایوس ہو کر وہ سسلی کو لوٹ آیا، اس کی واپسی کے دو ہی روز بعد یکم جولائی کو نپولین اسکندریہ پہنچا، وہاں کا مختصر تر کی دستہ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکا، ۷ ارمحرم ۱۲۱۳ھ مطابق ۲ جولائی ۱۷۹۸ء کو نپولین نے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔

اسکندریہ پر حملہ کرنے کا عذر نپولین اس کے سوا کچھ نہ پیش کر سکا کہ مصر پر اصلی حکومت مملوکوں کی ہے اور وہ انگریزی تجارت کے حامی ہیں، نیز یہ کہ انہوں نے فرانسیسی تاجروں کے ساتھ بدسلوکیاں کی ہیں، بہر حال اس نے باب عالی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مصر کا حملہ حقیقہً ایک دوستانہ فعل ہے، کیوں کہ اس سے مملوکوں کی قوت کا خاتمہ ہو جائے گا جنہوں نے عثمانی اقتدار کو محض نام کے لیے باقی رکھا ہے لیکن نپولین کی خاص کوشش

۱۔ سوانح نپولین اول از ڈاکٹر ہالینڈ روز، ۱۸۸۰ء، مطبوعہ لندن، ۱۹۱۹ء۔ (The Life of Napoleon By

یہ تھی کہ مصر کے عام باشندوں کی حمایت حاصل کی جائے، چنانچہ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مسلمان باشندوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی جائے، اس نے اعلان شائع کیا جس میں مملوکوں کے مظالم کا ذکر کرنے کے بعد اپنے کو اہل مصر کا حامی اور مددگار ثابت کرنا اور انہیں اس امر کا یقین دلانا چاہا کہ فرانسیسی مہم کا مقصد صرف یہ ہے کہ مصر کو مملوکوں کے پنجے سے نجات دلائی جائے، ایک طویل مدت سے جار جیا اور کوہ قاف میں خریدے ہوئے غلاموں کا گروہ دنیا کے سب سے زیادہ خوب صورت مقام کو اپنے مظالم کی آماج گاہ بنائے ہوئے ہے لیکن خداوند عالم جس کے اختیار میں سب کچھ ہے، ان کی سلطنت کے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے، اے اہل مصر! انہوں نے تم سے بیان کیا ہے کہ میں تمہارے مذہب کو برباد کرنے کی غرض سے آیا ہوں، ان کی باتوں کا یقین نہ کرو، انہیں یہ جواب دو کہ میں تمہارے حقوق کو دوبارہ قائم کرنے اور غاصبوں کو سزا دینے کے لیے آیا ہوں اور یہ کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ اور قرآن کی جتنی عزت مملوک کرتے ہیں، ان سے زیادہ میں کرتا ہوں، نہایت خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ہمارا ساتھ دیں گے، ان کی خوش حالی اور مرتبہ میں ترقی ہوگی لیکن سخت افسوس ہے ان کی حالت پر جو مملوکوں کے ساتھ ہو کر ہم سے لڑیں گے، ہر شخص مملوکوں کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کرے گا اور پکارے گا:

بزرگی اور عظمت ہے سلطان کے لیے اور عظمت ہے فرانسیسی فوج کے لیے جو سلطان کی حلیف ہے، مملوکوں پر لعنت اور اہل مصر کے لیے خوش قسمتی، نیپولین نے مصریوں کے اطمینان کے لیے اٹلی اور مالٹا کی فتوحات کا بھی حوالہ دیا، کیا ہم نے پوپ کو برباد نہیں کر دیا جو لوگوں کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کا حکم دیتا تھا؟ کیا ہم نے مبارزین مالٹا کو برباد نہیں کر دیا، اس لیے کہ وہ احمق خیال کرتے تھے کہ مسلمانوں سے جنگ کرنا خدا کی مرضی کے مطابق ہے؟

قاہرہ کی مہم | اسکندریہ میں ایک فوجی دستہ جنرل کلیبر (Kleber) کے زیر قیادت متعین کر کے نیپولین ایک ہفتہ کے اندر قاہرہ کی طرف روانہ ہو گیا، ریگستان میں دھوپ کی شدت فرانسسی فوج کے لیے ناقابل برداشت تھی، پیاس کی تکلیف سب سے زیادہ تھی، راستہ کے کنوؤں کو عربوں نے پتھر کے ٹکڑوں سے پاٹ دیا تھا اور تھوڑا سا پانی بھی بڑی مشکل سے دست یاب ہوتا تھا، نتیجہ یہ تھا کہ ایک ایک گھونٹ پانی کے لیے سپاہی آپس میں لڑ بیٹھتے تھے، اس فوج کا ایک اعلیٰ افسر بیان کرتا ہے کہ ایک گلاس پانی سونے کی تول بکتا تھا، سپاہیوں کے علاوہ افسروں میں بھی اس مہم کے شائد سے سخت برہمی تھی، ان حالات کے باوجود خود نیپولین کے عزم و استقلال میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا اور نہ اس کے بشرے سے خفیف سی پریشانی بھی ظاہر ہوتی تھی، ایک روز ایک فوجی دستہ، جس کا پیمانہ صبر لبر ریز ہو رہا تھا، ایک سپاہی نے بے خوف ہو کر نیپولین سے یہ سوال کیا کہ ”کیا آپ اسی طرح ہم لوگوں کو ہندوستان لے جائیں گے؟“ نیپولین نے فوراً جواب دیا کہ ”نہیں، میں تم جیسے سپاہیوں کے ساتھ اس مہم پر روانہ نہ ہوں گا“ سوال کرنے والا اور اس کے ساتھ اس جواب سے پانی پانی ہو گئے۔

جنگ اہرام | مراد بے اور ابراہیم بے نے جو مملوکوں کے سردار اور حقیقہ مصر کے اصلی حکم راں تھے، آگے بڑھ کر فرانسسی فوج کو روکنا چاہا، پہلے آٹھ سو مملوک سواروں کا ایک دستہ سامنے آیا، جسے نیپولین نے آسانی کے ساتھ منتشر کر دیا لیکن جب وہ قاہرہ کے قریب پہنچا تو ۷ صفر ۱۲۱۳ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۷۹۸ء انباتہ کے مقام پر مراد بے سے مقابلہ پیش آیا، جو دس بارہ ہزار سواروں کو لے کر پایہ تخت کی حفاظت کے لیے مستعد کھڑا تھا، اس معرکہ میں جو جنگ اہرام کے نام سے مشہور ہے (کیوں کہ اہرام مصر سامنے نظر آرہے تھے)، مملوکوں نے ایسی شجاعت دکھائی کہ فرانسسی متحیر رہ گئے لیکن ان کی حیرت انگیز شجاعت گولیوں کی باڑھ

کے سامنے کارگر نہ ہو سکی، علاوہ بریں فرانسیسی فوج کی تعداد تیس ہزار تھی اور یہ سب نہایت آزمودہ کار سپاہی تھے، برخلاف اس کے مراد بے کی فوج میں بارہ ہزار سے زیادہ آدمی نہ تھے، جن میں مملوک صرف پانچ ہزار تھے، باقی نو آموز فلاصین تھے، مراد بے کی شکست سے قاہرہ کا راستہ صاف ہو گیا اور چھ روز بعد نیپولین نے اس پر باضابطہ قبضہ کر لیا، دو ہفتہ تک قاہرہ میں قیام کرنے کے بعد وہاں کے ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر نیپولین ابراہیم بے کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اسے شکست دے کر شام کی طرف بھاگا دیا۔

جنگ نیل | اس درمیان میں نلس یہ معلوم کر کے کہ فرانسیسی بیڑہ مصر پہنچ چکا ہے، اسکندریہ کی طرف روانہ ہو گیا تھا اور پہنچتے ہی اے اے صرف مطابق کیم اگست کو اس نے فرانسیسی جہازوں پر جو خلیج ابو قیر میں لنگر انداز تھے، حملہ کر دیا، یہ لڑائی تاریخوں میں جنگ نیل کے نام سے مشہور ہے، نلسن کو شان دار فتح حاصل ہوئی، فرانسیسی امیر البحر مارا گیا، اس کے تقریباً تمام جہاز برباد ہو گئے یا گرفتار کر لیے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ نیپولین کی فوج جو قاہرہ پر قابض تھی، فرانس سے بالکل منقطع ہو گئی، نیپولین کو اس حادثہ کی اطلاع اس وقت ہوئی جب ابراہیم بے کو شکست دینے کے بعد ۱۹ اگست کو وہ قاہرہ واپس آیا، اس نے یہ خبر سن کر صرف اس قدر کہا ”اب ضروری ہے کہ یا تو ہم ان ہی ملکوں میں رہ جائیں یا قدامت کی طرح شان دار طریقہ سے یہاں سے نکلیں، انگریز ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ ہم اپنے قصد و ارادہ سے زیادہ کارنامے کر دکھائیں۔“

قیام مصر | نیپولین نے یہ دیکھ کر موجودہ صورت حال میں فرانس سے کمک نہیں پہنچ سکتی اور مصر میں مجبوراً قیام کرنا پڑے گا، ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے اس کی فوج کو خارجی مدد کی ضرورت باقی نہ رہی، طولوں سے اس کے ساتھ مختلف علوم و فنون کے اہل کمال آئے تھے، چنانچہ ان میں سے بعض نے سامان رسد کی دشواریاں دور کرنے کے لیے بڑے پیمانہ پر غلہ کی کاشت شروع کی اور غلہ پیسنے کے لیے بڑی بڑی پون چکیاں قائم کیں، بعض نے

انگور کے باغ لگائے اور سپاہیوں کے لیے ایک قسم کی جو کی شراب تیار کی، آلات اور مشینوں کی فراہمی کے لیے کارخانے قائم کیے گئے، زمین سے خام شورہ نکالا گیا اور شورہ کے کارخانوں میں فوج کی ضروریات کے لیے کافی بارود تیار کی گئی۔

علمی سرگرمیاں | علمی سرگرمیوں کا بھی یہی حال تھا، نپولین نے ایک کیمیاوی معمل قائم کیا جہاں فرانس کے مشہور علمائے سائنس برتھولے (Berthollet) اور مونج (Monge) تجربے کیا کرتے تھے، نپولین ان تجربوں کو دیکھنے کے لیے خود بھی ہفتہ میں کئی بار معمل میں جایا کرتا تھا، اس نے علمائے سائنس کی ایک مجلس ”ادارہ مصریہ“ کے نام سے قائم کی جس کا افتتاح ۲۲ اگست ۱۷۹۸ء کو ایک مملوک سردار کے محل میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ کیا گیا، مونج اس مجلس کا صدر اور نپولین نائب صدر تھا، اس مجلس میں متعدد علمی شعبے تھے، نپولین نے اپنا نام شعبہ ریاضیات میں درج کرایا، ارکان مجلس کے کارنامے علمی تجربات تک محدود نہ تھے، بلکہ ان کی سرگرمیوں کا کافی حصہ مصر کے آثار قدیمہ، وادی نیل کی پیمائش اور ارضیاتی تحقیقات پر مشتمل تھا، نپولین نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ”اصلی اور واحد فتوحات جن پر بعد میں افسوس اور پشیمانی نہیں ہوتی وہی ہیں جو جہالت پر حاصل کی جائیں“ مصر کے چند روزہ قیام میں اس نے جو کچھ کر دکھایا وہ اس کے تمام کارناموں میں اس قول کی بہترین شرح ہے۔

مصریوں سے میل جول | نپولین کی ان سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مصر میں گویا مستقل طور پر قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، ہلکی باشندوں سے میل جول بڑھانے کے لیے اس نے ان کے رسم و رواج میں اختیار کر لیے اور اپنی قوم کے بعض رواج ان میں جاری کیے، وہ کبھی کبھی مصری لباس بھی پہناتا تھا، اس نے مدرسے قائم کیے، سڑکوں اور نہروں کی مرمت کرائی اور نو جوان مصری عورتوں سے اپنے سپاہیوں کی شادی کر دی، فرانسیسی سپاہی بھی نئے ماحول سے جلد مانوس ہو گئے اور قاہرہ کے عیش و عشرت میں وطن کی یاد بھول گئے۔

قاہرہ کی بغاوت | لیکن نیپولین اگر یہ سمجھتا تھا کہ ان کارروائیوں سے اہل مصر فرانسیزی حکومت کو خوشی کے ساتھ قبول کر لیں گے تو اس کی غلط فہمی بہت جلد دور ہو گئی، ۲۱ اکتوبر ۱۷۹۸ء کو قاہرہ میں ایک زبردست بغاوت نمودار ہوئی، جس میں بہت سے فرانسیزی مارے گئے، تاہم مہمان وطن کی یہ کوشش بالکل ناکام رہی، ان سے نہایت خوف ناک انتقام لیا گیا، فرانسیزی مورخ ارنسٹ ہامیل (Ernest Hamel) لکھتا ہے:

”یہ بغاوت ہول ناک، وحشیانہ اور ظالمانہ طریقہ سے فرو کی گئی، دستے قائم کر کے فوج باغیوں پر ٹوٹ پڑی اور انہیں سچ مچ ذبح کر کے ڈال دیا، بونا پارٹ نے حکم دے دیا کہ تمام مسلح باشندے جو سڑک پر پائے جائیں قتل کر دیے جائیں، باغیوں نے جلد اطاعت قبول کر لی، اگر چنانچہ کے پانچ ہزار سے زیادہ آدمی قتل ہو گئے، فاتح (نیپولین) کی رحم دلی کی بہت کچھ تعریف کی گئی ہے لیکن اس رحم دلی کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے، ایک مقرر مدت تک میں قیدی روزانہ قتل کیے جاتے رہے، مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں وہشت بیٹھ جائے، ایک روز صبح کو فرانسیزی دستے خچروں کا ایک جھنڈ جن پر بورے لدے ہوئے تھے، ہنکاتے ہوئے قاہرہ میں لائے، اس وقت وہاں آدمیوں کا بڑا اڑھام تھا اور ہر شخص یہ معلوم کرنے کا مشتاق تھا کہ بوروں میں کیا چیز ہے، سپاہیوں نے بیک وقت تمام بورے کھول ڈالے اور ان کے اندر سے سیکڑوں سربرآمد ہوئے، آخر ان بد نصیبوں کا جرم کیا تھا؟ صرف یہ کہ وہ اپنے وطن کو آزاد کرانا چاہتے تھے، جسے دشمن نے حملہ کر کے برباد کر ڈالا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ ریگستان کے سیاہ باشندے یورپین تہذیب کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہ کریں گے۔“

اعلانِ جنگ | نیپولین کے حملہ کے وقت مصر اگرچہ عملاً مملوکوں کے زیر تسلط تھا، تاہم دولت عثمانیہ کی سیادت بدستور تسلیم کی جاتی تھی اور وہاں کا حاکم اعلیٰ باب عالی ہی کا فرستادہ

پاشا ہوا کرتا تھا، چوں کہ سلطنت عثمانیہ کی بحری طاقت قابل اطمینان نہ تھی اور سمندر کی راہ سے فرانسیسی فوجوں کی کمک روکی نہیں جاسکتی تھی، اس لیے سلیم کو اعلان جنگ کرنے میں کسی قدر تامل تھا لیکن مصر کی فتح سے ہندوستان پر بھی زد پڑتی تھی اور نپولین کی ”مشرقی سلطنت“ کی اسکیم اب مخفی نہ رہ گئی تھی، اس لیے انگلستان نے اس خطرہ کے سدباب کے لیے باب عالی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، اسی طرح روس نے بھی فرانس کی دشمنی میں دولت علیہ سے اتحاد کرنے کی خواہش کی اور اپنا جنگی بیڑہ اس کی مدد کے لیے پیش کیا، چنانچہ سلطنت عثمانیہ، انگلستان اور روس کے درمیان ایک اتحاد قائم ہو گیا اور باب عالی نے ۲۱ مئی ۱۸۰۸ء کو بعد ۲۱ مئی ۱۸۰۸ء (۲ ستمبر ۱۷۹۸ء) کو جمہوریہ فرانس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا، اس کے بعد روسی اور ترکی بیڑوں نے دردنیاں سے نکل کر جزائر آئونیوں پر قبضہ کر لیا، جو معاہدہ کیپیو فورمیو کے رو سے سلطنت فرانس میں شامل کر لیے گئے تھے، روس اور دولت عثمانیہ کا یہ پہلا اتحاد تھا جو ایک متفقہ جنگ کے لیے کیا گیا تھا، دونوں حلیف اب تک ایک دوسرے کے شدید ترین دشمن تھے۔

شام | سلیم نے شام اور جزیرہ روڈس میں فوجوں کی تیاری کا حکم دیا، شام کی فوج کا سپہ سالار خزار پاشا مقرر ہوا جو اپنی سابق خود سری کے باوجود اس وقت دولت عثمانیہ کی خدمت کے لیے آمادہ ہو گیا تھا، تجویز یہ تھی کہ شامی فوج صحرا کو عبور کر کے فرانسیسیوں پر مصر میں حملہ آور ہو اور اسی وقت مصطفیٰ پاشا روڈس کی فوج کے ساتھ خلیج ابوقیر کی طرف سے حملہ کرے لیکن بجائے اس کے کہ نپولین مصر میں ان حملوں کا انتظار کرتا، وہ پچیس ہزار سپاہیوں کو لے کر جن میں کچھ مملوک بھی شامل تھے، جنوری ۱۷۹۹ء میں شام کی طرف روانہ ہو گیا اور ۱۵ فروری کو العریش، ۲۵ فروری کو غزہ اور ۱ مارچ کو یافہ فتح کر لیا، یافہ کے ترکی دستے نے جس کی تعداد پانچ ہزار تھی، اس شرط پر ہتھیار ڈالے تھے کہ انہیں فوجی قیدی سمجھا جائے گا لیکن شہر پر قبضہ کرنے کے بعد نپولین نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور پورے دستے کو قتل

کرادیا۔

اس کے بعد وہ عکا کی طرف بڑھا جس کی فتح کے بعد پورے شام کی فتح میں کوئی روک باقی نہ رہ جاتی، ۲۰ مارچ کو محاصرہ شروع ہوا اور دو مہینے تک جاری رہا لیکن نیولین کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور یہ شہر فتح نہ ہو سکا، محصورین کی غیر معمولی شجاعت کے علاوہ ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ بحری سمت سے عکا کو مدد برابر پہنچ رہی تھی اور محاصرہ کے لیے جو بڑی بڑی توپیں نیولین نے سمندر کے راستے سے روانہ کی تھیں انہیں انگریز امیر البحر سرسڈنی اسمتھ نے چھین لیا تھا اور خود فرانسیسیوں کے خلاف استعمال کر رہا تھا، اس درمیان میں نیولین کو یہ اطلاع ملی کہ دمشق کی عثمانی فوج عکا کی مدد کے لیے روانہ ہو چکی ہے، اس نے جنرل کلیر کو ایک دستہ کے ساتھ روانہ کیا کہ اس فوج کو آگے بڑھنے سے روکے، جبل طاہور کے قریب فریقین کا مقابلہ ہوا اور ترکوں نے کلیر کے پورے دستہ کو گھیر لیا، اگر نیولین عین وقت پر اس کی مدد کے لیے نہ پہنچ جاتا تو کلیر مع اپنے سپاہیوں کے گرفتار ہو جاتا لیکن ۱۶ اپریل کو جبل طاہور پہنچتے ہی اس نے ترکوں کو شکست دے کر بھگا دیا، اس کے بعد وہ پھر عکا واپس آ گیا، ۷ مئی کو روڈس سے فوجی کمک پہنچی، جس سے محصورین کے حوصلے اور بڑھ گئے، اس کے بعد کلیر نے پوری قوت کے ساتھ ایک آخری حملہ قلعہ پر کیا، مگر وہ بھی اور حملوں کی طرح ناکام رہا، بالآخر مایوس ہو کر نیولین نے ۲۰ مئی کو محاصرہ اٹھا لیا اور مصر کی طرف روانہ ہوا، اس کی ”مشرقی سلطنت“ کی اسکیم ہمیشہ کے لیے درہم برہم ہو گئی، عکا کے طرف دیکھ کر اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ ”اس حقیر قلعہ سے مشرق کی قسمت وابستہ تھی۔“

جنگ ابو قیر | نیولین کے مصر پہنچنے کے بعد ہی روڈس کی پندرہ ہزار عثمانی فوج مصطفیٰ پاشا کے زیر قیادت خلیج ابو قیر میں داخل ہوئی اور آسانی کے ساتھ وہاں کے فرانسیسی دستہ کو شکست دے دی، یہ سن کر نیولین فوراً قاہرہ سے روانہ ہو کر ۲۵ جولائی کو ابو قیر پہنچا، مصطفیٰ پاشا پہلے سے تیار تھا، لڑائی گھمسان کی ہوئی اور ترک ایسی بہادری سے لڑے کہ فرانسیسیوں کے پیر

اکھڑ گئے لیکن فتح کے جوش میں انہوں نے منتشر ہو کر زخمی سپاہیوں کے سر کاٹنے شروع کر دیے، نپولین نے فوراً اس حالت سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تازہ دم دستوں کو جنرل میورا (Murat) کی سرکردگی میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا، میورا عثمانی سرعسکر کے خیمہ تک پہنچ گیا یہاں تک کہ دونوں میں دست بدست لڑائی ہونے لگی اور دونوں نے ایک دوسرے کو زخمی کیا، اس عرصہ میں ترک جو پہلے ہی منتشر ہو چکے تھے، فرانسیسیوں کے تازہ حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے اور بھاگ کھڑے ہوئے، بہتیرے جان بچانے کے لیے سمندر میں کود پڑے اور ان میں سے زیادہ تر ڈوب کر ہلاک ہو گئے، ایسی صورت میں مصطفیٰ پاشا کے لیے ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا، اس فتح نے عکا کی ناکامی کی کچھ تلافی کر دی اور مصر میں نپولین کا اقتدار قائم ہو گیا۔

مصر پر عثمانی تسلط | ان ہی دنوں فرانس سے جو اطلاعات موصول ہوئیں ان کے لحاظ سے نپولین نے جلد از جلد وہاں پہنچ جانا ضروری خیال کیا، چنانچہ مصر کا انتظام جنرل کلیر کو سپرد کر کے وہ ۲۲ اگست کو نہایت خفیہ طور پر اپنے بعض افسروں کے ساتھ اسکندریہ سے فرانس کو روانہ ہو گیا، کلیر نے سڈنی اسمتھ سے جو مصطفیٰ پاشا کی فوج کے ساتھ مصر آیا تھا، صلح کی گفتگو شروع کی اور بالآخر تھلہ مصر کا معاہدہ کر لیا لیکن جب برطانوی امیر البحر لارڈ کیتھ (Keith) نے اس امر پر اصرار کیا کہ فرانسیسی فوج کو اپنے ہتھیار رکھ دینے چاہیں تو کلیر نے غصہ سے معاہدہ چاک کر ڈالا اور اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا ”سپاہیو! اس گستاخی کا جواب فتوحات کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا“ چنانچہ وہ چھ ہزار کا ایک دستہ لے کر عثمانی فوج پر حملہ آور ہوا جو اوائل ۱۸۰۰ء میں صدر اعظم کے زیرِ کمان مصر پہنچی تھی اور ۲ مارچ کو ہیلپو پولس (Helio Polis) کی جنگ میں اسے شکست دی لیکن اس کے چند روز بعد کسی نے اسے قتل کر دیا، کلیر کا جانشین منو (Menou) اپنی فوجی لیاقت کے اعتبار سے اس کا ہم پلہ نہ تھا، جنگ ہیلپو پولس کے بعد ایک سال تک فرانسیسی فوج مصر پر قابض رہی، مارچ ۱۸۰۱ء

میں سربراہ کرومی (Abereromy) کی سرکردگی میں ایک انگریزی فوج مصر آئی، اس کے بعد ایک دوسری فوج جنرل بیرڈ (Baird) کے ساتھ پہنچی، فرانسیسی فوج کا کچھ حصہ قاہرہ میں تھا اور کچھ اسکندریہ میں، مارچ میں سربراہ کرومی نے اسکندریہ میں فرانسیسیوں کو شکست دی اور جون میں ترکی اور انگریزی فوجوں نے قاہرہ کے فرانسیسی دستہ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا، ستمبر میں فرانسیسی سپہ سالار نے مصر سے نکل جانے کا معاہدہ کیا، فرانسیسی فوج کو انگریزی جہازوں پر فرانس واپس جانے کی اجازت دی گئی اور مصر پر دولت عثمانیہ کا تسلط از سر نو قائم ہو گیا۔

فرانس سے صلح | مارچ ۱۸۰۲ء میں انگلستان اور فرانس کے درمیان معاہدہ امیان (Amiens) کے رو سے ایک عارضی صلح ہو گئی، ساتھ ہی فرانس اور دولت علیہ کے درمیان بھی صلح نامہ ہو گیا، نپولین نے فرانس کے تو نصل اول کی حیثیت سے مصر پر دولت عثمانیہ کی فرماں روائی تسلیم کر لی اور سلطان نے ان حقوق اور مراعات کی تجدید کی جو اہل فرانس کو اپنے سابق بادشاہوں کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں حاصل تھے۔

اندرونی شورشیں | ۱۸۰۲ء میں فرانس سے صلح ہو جانے کے بعد سلیم کو چار سال کے لیے جنگ سے مہلت مل گئی لیکن جہاں تک سکون کا تعلق تھا وہ اس مختصر فرصت میں بھی میسر نہ آیا، وہابیوں نے شام پر از سر نو حملہ شروع کر دیا تھا، ۱۲۱ھ (۱۸۰۲ء) میں انہوں نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر قبضہ کر کے تمام عرب پر اپنا تسلط قائم کر لیا، مصر میں فرانسیسی فوجوں کے چلے جانے کے بعد مالک کی خود سری بدستور شروع ہو گئی، باب عالی کی طرف سے جو فوجیں ان کے مقابلہ کے لیے بھیجی گئیں ان سے وہ عرصہ تک لڑتے رہے، شام میں جزار پاشا پھر خود مختار بن بیٹھا اور مرتے دم (۱۸۰۳ء) تک سرکشی پر قائم رہا، ودین میں پزدان اوغلو کی بغاوت باب عالی کی انتہائی کوششوں کے بعد بھی فرو نہ ہو سکی، یہاں تک کہ سلیم نے مجبور ہو کر ۱۸۰۶ء میں اس کی پوری مدت حیات تک کے لیے اسے ان تمام علاقوں کا حاکم تسلیم کر لیا جن پر وہ بہ اختیار خود قابض ہو گیا تھا اور بطور سند اس کو درجہ اول کے پاشا کا نشان

عطا کیا، غرض صلح کے زمانہ میں بھی سلطنت کے مختلف حصوں میں شورش برپا تھی۔

سرویہ | سب سے زیادہ نازک سرویہ کا حال تھا، اس وقت سرویہ کا والی حاجی مصطفیٰ پاشا تھا، وہ ایک نہایت رحم دل اور دردمند شخص تھا اور رعایا میں اس قدر مقبول تھا کہ عیسائی اسے ”اہل سرویہ کی ماں“ پکارتے تھے، اس کے عہد میں ہر طرف امن و امان تھا، تجارت ترقی پر تھی اور سب کے ساتھ یکساں عدل و انصاف ہوتا تھا لیکن سلیم کی فوجی اصلاحات نے سرویہ کے نئی چری دستوں کو اتنا برا بیچنے کیا کہ انہوں نے بغاوت کر کے تمام صوبہ میں قتل و غارت گری شروع کر دی، نتیجہ یہ ہوا کہ سرویہ کے باشندے عاجز آ کر ان کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور سلطانی فوجوں کی مدد سے ان کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا مگر اس کام یابی سے ان کے اندر آزادی کا حوصلہ پیدا ہو گیا اور اب انہوں نے وطنی آزادی کے لیے خود دولت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

اس جرات کے مختلف اسباب تھے، سلطنت عثمانیہ اور آسٹریا کی گذشتہ جنگ میں جس کا خاتمہ صلح نامہ سسٹوا پر ہوا تھا، جب آسٹریا کی فوجیں سرویہ میں داخل ہوئیں تو وہاں کی عیسائی رعایا نے حملہ آوروں کا خیر مقدم کیا اور فوجی دستے قائم کر کے دولت علیہ کے خلاف آسٹریا کو بہت کچھ مدد پہنچائی، صلح نامہ سسٹوا کے رو سے سرویہ پھر دولت عثمانیہ کو واپس مل گیا، عثمانی تسلط کے قائم ہونے پر عیسائی رعایا کے فوجی دستے توڑ دیے گئے لیکن پچھلی جنگ میں جو فوجی روح ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی وہ فنانہ ہوئی، اس روح کو حاجی مصطفیٰ نے بھی زندہ رکھنا چاہا، اس نے رعایا کو نئی چری کی غارت گری سے محفوظ رکھنے کے لیے سرویہ کسانوں کے مسلح دستے قائم کر دیے، تحریک آزادی کا ایک دوسرا سبب وہ شورشیں تھیں جو خود مختار حکومت قائم کرنے کے سلسلہ میں متعدد صوبوں میں برپا تھیں، سرویہ بھی ان شورشوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کے باشندوں میں بھی آزادی کا جذبہ پیدا ہو

گیا، یہ جذبہ انقلاب فرانس کی ہنگامہ خیزیوں سے اور بھی ترقی کر گیا لیکن ان اسباب کے باوجود سربیا میں قومی آزادی کی تحریک دفعۃً تیز نہ ہو جاتی اگر نینی چری نے اپنے مظالم سے وہاں کے باشندوں کو عاجز نہ کر دیا ہوتا۔

نینی چری کی قتل و غارت گری | یوں تو سلطنت کے ہر حصہ میں نینی چری کی خود سری بڑھی ہوئی تھی لیکن سربیا میں بالخصوص ان کی سرکشی کی کوئی انتہا نہ تھی، بلغراد اور دوسرے شہروں کے نینی چری دستے نہ صرف عیسائی رعایا میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیے ہوئے تھے، بلکہ اپنے ہم مذہب ”سپاہی“ جاگیرداروں پر بھی جن کو وہاں کی زمینیں سلطان کی طرف سے فوجی خدمات کے صلہ میں ملی تھیں، ان کا دست ستم اتنا ہی دراز تھا، چنانچہ عیسائی رعایا اور سپاہی جاگیردار دونوں نے نینی چری کے مظالم کے خلاف باب عالی میں فریاد کی، سلیم نے بیکر پاشا کو بلغراد کا والی مقرر کر کے روانہ کیا اور اسے حکم دیا کہ نینی چری دستوں کو بلغراد اور سربیا کے تمام علاقوں سے نکال دے، بیکر پاشا نے نینی چری سردار ولی احمد کو قتل کر کے انہیں سربیا سے نکال دیا، نینی چری نے پزدان اوغلو باغی و دین کے یہاں جا کر پناہ لی، پزدان اوغلو نے ان کی سفارش باب عالی میں کی اور اس بات کی اجازت دلوادی کہ اگر وہ امن و سکون کے ساتھ رہنے کا وعدہ کریں تو بلغراد واپس آسکتے ہیں لیکن سربیا میں داخل ہونے کے بعد ان کی غارت گری بدستور سابق پھر شروع ہو گئی، اس وقت حاجی مصطفیٰ پاشا نے جو بیکر پاشا کے بعد سربیا کا والی مقرر ہوا تھا، اہل سربیا کو نینی چری کے مقابلہ کے لیے ابھارا، چنانچہ سربوں نے پاشا اور سپاہی جاگیرداروں کی مدد سے باغیوں کو شکست دے کر بھگا دیا، اس واقعہ کی اطلاع جب قسطنطنیہ اور سلطنت کے دوسرے حصوں کے نینی چری دستوں کو پہنچی تو ان میں سخت برہمی پیدا ہوئی، علماء اور عام مسلمانوں کو بھی کفار کی مدد سے نینی چری کا سربیا سے نکالا جانا حد درجہ ناگوار ہوا، سلیم نے رائے عامہ سے مجبور ہو کر مصطفیٰ پاشا کو حکم دیا کہ نینی چری کو بلغراد واپس آنے کی اجازت دے دی جائے لیکن انہوں

نے سرویا میں آتے ہی اپنے دشمنوں سے پورا پورا انتقام لینا شروع کر دیا، چنانچہ بلغراد پہنچ کر انہوں نے مصطفیٰ پاشا کو قتل کر دیا اور پورے صوبہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے اپنی جماعت کے چار سرداروں کو ہر حصہ کا حاکم مقرر کیا، اپنی تعداد کو ناکافی دیکھ کر انہوں نے بوسنیا اور البانیا کے باغیوں کی ایک مسلح فوج بھی تیار کر لی اور اس کے بعد بے خوف ہو کر لوٹ مار کرنے لگے، یہاں تک کہ ان کے مظالم سے عیسائی رعایا اور مسلمان جاگیردار دونوں بالکل عاجز آ گئے، باب عالی کے پاس اس وقت اتنی فوج نہ تھی کہ انہیں قابو میں لاسکے، اس لیے اس نے صرف دھمکی سے کام نکالنا چاہا اور انہیں متنبہ کیا کہ اگر وہ اپنا ہاتھ نہ روکیں گے تو ان کی سرکوبی کے لیے غیر قوم اور غیر مذہب کے سپاہی متعین کر دیے جائیں گے، یہی چری نے یہ قیاس کر کے کہ ان سپاہیوں سے باب عالی کی مراد سرویا کے عیسائی باشندے ہیں، انہیں بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔

ینی چری کا استیصال | سرویا کے باشندوں میں آزادی کی روح اس سے پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی، انہوں نے فوجی تربیت بھی ایک حد تک حاصل کر لی تھی، سلطانی فوج کی مدد سے ایک بار وہ ان ہی نی چری دستوں کو شکست بھی دے چکے تھے، چنانچہ اب متفقہ طور پر انہوں نے اپنی قوم کے ایک کسان جارج پیٹروویچ (George Petrowitchsh) کو جو تاریخ میں عموماً قرہ جارج کے نام سے مشہور ہے، سپہ سالار مقرر کر کے نی چری کا مقابلہ شروع کیا، سپاہی جاگیرداروں نے بھی ان کی مدد کی اور باب عالی کی فوجیں بھی بکیر پاشا والی بوسنیا کی سرکردگی میں ان کی مدد کے لیے آگئیں، باب عالی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کی بار بلغراد کے نی چری دستوں کا کامل استیصال کر دیا جائے، عیسائی رعایا بھی انتہائی غمیض و غضب میں ان کی تیغ کشی پر آمادہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ نی چری کو شکست ہوئی، کچھ بھاگ کر پزدان اوغلو کے پاس پناہ گزیں ہوئے، بقیہ قتل کر دیے گئے۔

سرویا کا مطالبہ آزادی | نی چری کے استیصال کے بعد باب عالی نے حکم دیا کہ چوں کہ

ملک میں امن و امان قائم ہو گیا ہے، اس لیے سروی دستوں کے باقی رکھنے کی ضرورت نہیں رہی، وہ توڑ دیے جائیں لیکن عیسائیوں میں اب آزادی کا حوصلہ پیدا ہو چکا تھا، مینی جری کو شکست دے کر ان کی ہمتیں بہت بڑھی ہوئی تھیں، بلغراد اور چند دوسرے قلعوں کے علاوہ سرویا کے باقی تمام علاقوں پر ان ہی کا قبضہ تھا، چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ باب عالی کے حکم کی تعمیل میں ہتھیار رکھ کر اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے اور جاگیرداروں کے ماتحت زراعت اور دوسرے کاروبار میں بدستور سابق مشغول ہو جاتے، انہوں نے ملکی آزادی حاصل کرنے کے لیے خود دولت علیہ کے خلاف جنگ شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور فوجی مدد کے لیے ایک وفد اگست ۱۸۰۴ء میں زار روس کی خدمت میں بھیجا، زار نے انہیں مشورہ دیا کہ جنگ شروع کرنے سے قبل اپنے مطالبات باب عالی میں پیش کریں اور وعدہ کیا کہ باب عالی پر دباؤ ڈال کر ان کے مطالبات منظور کرانے کی کوشش کرے گا، چنانچہ اس ہدایت کے بموجب ۱۸۰۵ء میں اہل سرویا نے ایک وفد قسطنطنیہ بھیجا اور باب عالی سے یہ درخواست کی کہ آئندہ سرویا کے تمام قلعوں میں سروی دستے متعین کر دیے جائیں اور چوں کہ گذشتہ ہنگاموں میں پورا صوبہ سخت مصیبتوں میں مبتلا تھا، اس لیے خراج اور محاصل کا تمام بقایا معاف کر دیا جائے، ان میں سے پہلا مطالبہ نہایت اہم تھا، اس کے معنی یہ تھے کہ دولت عثمانیہ کے زیر سیادت انہیں حکومت خود اختیاری دے دی جائے۔

روس کی جنگی تیاریاں | اس وقت روس اور فرانس میں جنگ چھڑ چکی تھی اور روس باب عالی میں اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اس جنگ میں دولت عثمانیہ کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا، ۱۸۰۷ء کے بعد جب روس اور دولت علیہ میں اتحاد قائم ہوا تو سلیم نے روس کو بہت سی خاص مراعات دے دی تھیں، جن کو ترک نہایت خطرناک خیال کرتے تھے، مثلاً ۱۸۰۱ء میں فرانس سے صلح ہو جانے کے بعد بھی اس نے روسی جہازوں کے لیے باسفورس اور روز ڈا نیال سے گزرنے کی اجازت باقی رکھی، حالانکہ

یہ اجازت ابتداءً محض ضرورت جنگ کی بنا پر دی گئی تھی، قسطنطنیہ میں ترکوں نے اس اجازت کے قائم رکھنے پر اس قدر برہمی کا اظہار کیا کہ بالآخر مجبور ہو کر سلیم کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ اگر روس کسی ایسی حکومت سے برسرِ پیکار ہوگا جس کے تعلقات دولت عثمانیہ سے دوستانہ ہوں گے تو یہ اجازت منسوخ کر دی جائے گی، اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر روس نے جزائر آئیونین میں اپنی فوجی قوت بہت بڑھالی تھی اور ترک افسروں کے احتجاج کے باوجود البانیا کے باشندوں کو بھی اپنی فوج میں داخل کرنا شروع کر دیا تھا، ۱۸۰۴ء میں باب عالی نے روس سے یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ مولڈویا اور ولاچیا کے امیر اس کے مشوروں کے بغیر معزول نہ کیے جائیں گے اور تاجروں کے علاوہ دوسرے ترک ان علاقوں میں نہ رہ سکیں گے، یہ گویا مولڈویا اور ولاچیا کو روس کی سرپرستی میں دے دینا تھا، ۱۸۰۵ء میں روس نے بحر اسود کے جنوبی مشرقی ساحل پر اپنا اقتدار اس سے بھی زیادہ قائم کر لیا، باب عالی نے اسے دریائے فائیس (واقع منگریلیا) میں جہازوں کی آمد و رفت اور ان جہازوں کی حفاظت کے لیے دریائے مذکور کے ساحلوں پر قلعے تعمیر کر کے ان میں فوجی دستے رکھنے کی اجازت دے دی، پاشائے ارض روم کو حکم ملا کہ ان قلعوں کی تعمیر میں روسیوں کی مدد کرے نیز جنگ ایران کے سلسلہ میں جو اس وقت روس سے جاری تھی، ان کی اعانت کرے، اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر روس نے ان ضلعوں پر بھی قبضہ کر لیا جو دریائے فائیس سے کافی فاصلہ پر واقع تھے اور قلعہ انگریا (Anakria) پر قبضہ کر کے ایک دوسرا قلعہ بحر اسود کے ساحل پر تعمیر کر لیا۔

یہ سب تیاریاں مکمل ہونے کے بعد جب زار نپولین کے خلاف آسٹریا اور انگلستان سے اتحاد کرنے جا رہا تھا تو روسی سفیر اٹالینسکی (Italinski) نے اپنی حکومت کی طرف سے یہ مطالبات پیش کیے کہ باب عالی روس کے ساتھ فوراً ایک جارحانہ اور مدافعتی اتحاد کر لے، نیز اپنی تمام رعایا کو جو کلیسائے یونان کی پیرو ہوزار کی سرپرستی میں دے دے اور اس بات کا وعدہ کرے کہ جب کبھی ترکوں کی طرف سے ان کے ساتھ کوئی زیادتی ہوگی تو سفیر

روس کی درخواست پر باب عالی اس کی تلافی کرنے پر مجبور ہوگا، یہ مطالبات ٹھیک اس وقت پیش کیے گئے جب روس ہی کی تحریک پر سرویا کے وفد نے اپنے مطالبات باب عالی میں پیش کیے تھے، یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سرویا کے عیسائی یونانی کلیسا کے پیرو تھے۔

سلیم کے لیے روس کے یہ مطالبات ناقابل برداشت تھے، خصوصاً وہ جس کا تعلق عیسائی رعایا کی سرپرستی سے تھا کیوں کہ اس کی منظوری ہتھیقہ روس کی غلامی کے مترادف تھی لیکن اس خطرہ سے کہ روسی فوجیں جو بحر اسود کی بندرگاہوں میں جمع تھیں، آٹھ روز کے اندر قسطنطنیہ پہنچ سکتی ہیں، روس نے جو دستے جزائر آئیونین میں اکٹھا کر لیے تھے وہ فوراً البانیا میں داخل ہو کر البانی اور یونانی باغیوں کے ساتھ اور نہ پر چڑھائی کر سکتے تھے، جارجیا کی روسی فوجیں جو ایرانیوں کے مقابلہ میں فتح یاب ہو چکی تھیں، ایشیائے کوچک کی راہ سے دارالسلطنت کی طرف بڑھ سکتی ہیں اور سرویا کے عیسائیوں کو ملا کر روس بلغاریا پر قبضہ کر سکتا ہے، سلیم اور ارکان دیوان نے یہی مناسب خیال کیا کہ ان مطالبات پر گفت و شنید کا سلسلہ کچھ دنوں جاری رکھا جائے اور اس درمیان میں ان حملوں سے بچنے کے لیے جو تدبیریں ممکن ہوں، اختیار کی جائیں، چنانچہ اٹالسکی سے گفتگو شروع ہوئی اور اس کا سلسلہ کچھ عرصہ تک قائم رہا، اس فرصت میں سلیم نہایت سرگرمی کے ساتھ مدافعت کی تیاریاں کرتا رہا۔

سرویا کی آزادی | سلیم کو یقین تھا کہ روس سے جنگ ناگزیر ہے، اس لیے وہ سرویا کے مسئلہ کو جلد سے جلد طے کر لینا چاہتا تھا، آئندہ جنگ کے خیال سے وہ سرویا کے ساتھ برسر پیکار ہونا مناسب نہیں سمجھتا تھا لیکن چون کہ سرویا کی وفاداری پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا اور اس بات کا قوی احتمال تھا کہ لڑائی میں سرویا روس کا ساتھ دے گا نیز اس اندیشہ سے بھی کہ اگر سرویا کا مطالبہ منظور کر کے بلغراد اور دوسرے قلعوں سے ترکی دستے نکال لیے گئے تو قسطنطنیہ میں سخت شورش برپا ہو جائے گی، سلیم نے اس مطالبہ کو نامنظور کر دیا اور سروی وفد کو قید کر لینے کا حکم دیا، ساتھ ہی اس نے نیش کے پاشا کو سرویا کی بغاوت فرو کرنے کے لیے

روانہ کیا، قرہ جارج نے پاشا کی فوج کا سرحد پر مقابلہ کیا اور اسے شکست دی، اس کے بعد سلیم نے دونوں جہیں اور روانہ کیں، مگر اہل سرویا نے قرہ جارج کی سرکردگی میں انہیں بھی شکست دی اور بلغراد اور دوسرے سرودی قلعوں پر جن میں ترکی دستے متعین تھے، قبضہ کر لیا، اس طرح ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں سرویا کے عیسائیوں نے بغیر کسی بیرونی مدد کے تقریباً کامل خود مختاری حاصل کر لی۔

فرانس سے اتحاد | اس درمیان میں یورپ میں جنگ چھڑ چکی تھی اور ایک طرف فرانس اور دوسری طرف روس اور انگلستان، اس جنگ میں سلطنت عثمانیہ کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش کر رہے تھے، اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے روسی سفیر کا تقاضا بھی برابر جاری تھا، برخلاف اس کے فرانسیسی سفیر سلیم پر زور ڈال رہا تھا کہ وہ ان مطالبات کو مسترد کر دے اور نپولین کو شہنشاہ فرانس تسلیم کر کے فرانس کے ساتھ اتحاد قائم کر لے، روسی اور برطانوی سفیر نپولین کو شہنشاہ تسلیم کرنے کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے متفقہ طور پر باب عالی کو دھمکی دی کہ اگر ایسا کیا گیا تو جنگ کا اعلان فوراً کر دیا جائے گا، قسطنطنیہ میں دونوں فریق کی کوششیں ابھی جاری تھیں کہ نپولین نے آسٹریا اور روس کی فوجوں کو زبردست شکست دے کر باب عالی کے لیت و لعل کا ایک حد تک خاتمہ کر دیا، ان شکستوں کا فوری اثر یہ ہوا کہ پندرہ ہزار روسی فوج جو سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لیے سیاستوپول میں تیار رکھی گئی تھی، وسط روس میں واپس بلا لی گئی کیوں کہ وہاں کی فوجیں فرانسیسیوں کے مقابلہ میں مغرب کی جانب روانہ ہو رہی تھیں، نپولین کی ان فتوحات کا ایک دوسرا نمایاں اثر یہ ہوا کہ روسی سفیر کالب ولجہ بالکل بدل گیا اور اس کے مطالبات کی شدت باقی نہیں رہی، چنانچہ باب عالی کو اب روس کی طرف سے وہ خطرہ نہ رہا جو پہلے تھا اور وہ فرانس سے اتحاد کرنے پر مائل ہونے لگا۔

روس سے اعلان جنگ | ۲۶ دسمبر ۱۸۰۵ء کو معاہدہ پرسبرگ (Presburg) کے روس سے فرانس اور آسٹریا کے درمیان صلح ہو گئی، من جملہ اور علاقوں کے ڈلماشیا اور کروشیا کا

ایک حصہ فرانس کے ہاتھ آیا اور اب فرانسیسی اور عثمانی سلطنتیں ہم سرحد ہو گئیں، فرانسیسی سفیر نے اس صلح نامہ کی ایک نقل صدر اعظم کے سامنے پیش کی اور ان فوائد کو مفصل طور پر بیان کیا جو پولین کی دوستی سے دولت عثمانیہ کو حاصل ہو سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ باب عالی نے پولین کو فرانس کا شہنشاہ تسلیم کر لیا، ۱۸۰۶ء میں پولین نے جنرل سبستیان (Sebastiani) کو اپنا غیر معمولی سفیر بنا کر سلیم کے پاس بھیجا، سبستیان نے اس بات کی کوشش کی کہ دولت عثمانیہ اور روس میں جنگ چھڑ جائے تاکہ زار کو اپنی کچھ فوجیں پولینڈ سے ہٹالینی پڑیں جہاں وہ فرانس کی فاتح افواج کے مقابلہ میں فریڈرک ولیم، شاہ پرشاک کی مدد کر رہا تھا، چنانچہ سبستیان کی تحریک پر سلیم نے مولڈیویا اور ولاچیا کے امیروں کو جن کی نسبت تقریباً یقین تھا کہ وہ روس کے تنخواہ دار ایجنٹ ہیں اور اس سے سازش کر کے دولت علیہ کو نقصان پہنچا رہے ہیں، ان حکومتوں سے برطرف کر دیا، چون کہ یہ فعل ۱۸۰۲ء کے معاہدہ کے خلاف تھا، اس لیے روسی سفیر نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، سفیر برطانیہ نے بھی اس احتجاج میں روس کی ہم نوائی کی اور دونوں ملکوں نے باب عالی کو یہ دھمکی دی کہ عن قریب روسی فوجیں مولڈیویا میں داخل ہوں گی اور انگریزی بیڑہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے گا، سلیم نے معاہدہ مذکور کی خلاف ورزی کی تلافی کر دینی چاہی اور معزول شدہ امیروں کو دوبارہ مقرر کرنے کے لیے احکام جاری کیے لیکن اس سے قبل ہی روسی فوجیں مولڈیویا میں داخل ہو کر یاسی تک پہنچ چکی تھیں، زار الکزنڈر پہلے ہی سے جنگ کے لیے تیار تھا، مولڈیویا اور ولاچیا کے امیروں کی معزولی سے اس کو ایک بہانہ ہاتھ آ گیا اور اس نے فوراً بغیر کسی اعلان جنگ کے پینتیس ہزار فوج جنرل میکلسن (Michelson) کے زیر کمان ان صوبوں پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی، میکلسن تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا ۲۷ دسمبر ۱۸۰۶ء کو ولاچیا کے پایہ تخت بخارسٹ میں داخل ہو گیا، اب مجبور ہو کر باب عالی کو بھی روس کے خلاف اعلان جنگ کرنا پڑا۔

برطانیہ کا الٹی میٹم | حکومت برطانیہ نے روس کو پوری مدد دی، برطانوی سفیر مسٹر ارتھنٹاٹ

(Arbuthnot) نے باب عالی کو الٹی میٹم دیا کہ اگر روس اور انگلستان کے ساتھ دولت عثمانیہ فوراً اتحاد نہ کر لے گی اور فرانسیسی سفیر رخصت نہ کر دیا جائے گا تو روسی فوجیں نیز برطانیہ اور روس کے جنگی بیڑے حملہ کر دیں گے، رئیس آفندی (وزیر خارجہ) نے اربٹھناٹ کو اس کے جواب میں یہ لکھا کہ دولت علیہ نے ہمیشہ جنگ سے احتراز کیا اور صلح قائم رکھنے کی کوشش کی لیکن روس اس پر مجبور کرتا رہا، اس نے اپنے خط میں مولڈ یویا اور ولاچیا کے امیروں کا خاص طور پر حوالہ دیا کہ باوجود اس کے کہ سلطان نے انہیں معزول کر دیا تھا تاہم صرف روس کے مطالبہ پر اس نے اپنے سابق حکم کو منسوخ کر دیا اور انہیں دوبارہ مقرر کرنے کے لیے فرمان جاری کیا، سلطان نے یہ ذلت محض جنگ سے بچنے کی غرض سے گوارا کی لیکن روس نے اس کی پرواہ نہ کی اور بغیر کسی اعلان جنگ کے اپنی فوجیں مولڈ یویا اور ولاچیا میں روانہ کر دیں، آخر میں اس نے لکھا کہ ”اگر برطانیہ عظمیٰ روس کی مدد میں سلطان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے تو سلطان بھی قوت کا جواب قوت سے دے گا اور اس انتہائی نامنصفانہ حملہ سے بچنے کے لیے خدا کی ذات پر بھروسہ کرے گا اور اگر آخر کار ترکی کو فنا ہی ہونا ہے تو وہ اپنے پایہ تخت کی حفاظت کرنے میں فنا ہوگی اور اس وقت سب سے زیادہ خود انگریز قوم کو اس ناقابل تلافی نقصان کا تجربہ ہوگا جو سلطنت عثمانیہ کی تباہی سے واقع ہو کر رہے گا۔“

یہ جواب پاتے ہیں اربٹھناٹ فوراً قسطنطنیہ سے روانہ ہو کر برطانوی بیڑہ پر پہنچا جو امیر البحر ڈک ورتھ (Duckworth) کی سرکردگی میں جزیرہ ٹینڈوس کے قریب لنگر انداز تھا، ڈک ورتھ کو یہ ہدایت تھی کہ جلد سے جلد قسطنطنیہ پہنچ کر عثمانی بیڑہ کی سپردگی کا مطالبہ کرے اور اگر یہ مطالبہ پورا نہ کیا جائے تو عثمانی جہازوں میں آگ لگا کر قسطنطنیہ پر گولہ باری شروع کر دے، چنانچہ ۱۹ فروری ۱۸۰۷ء کو انگریزی بیڑہ بلا کسی نقصان کے دردنیاں میں داخل ہو گیا اور بحر مارمورا میں پہنچ کر ترکوں کے ایک بڑے اور چار چھوٹے جہازوں پر گولہ باری کر

کے انہیں ڈبو دیا، دردانیال کی مورچہ بندی اس قدر کم زور تھی کہ انگریزی بیڑہ کو اس سے گزرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی اور ترکی توپوں کی گولہ باری کے باوجود جنوبی ہوا سے فائدہ اٹھا کر اس نے آبنائے کو عبور کر لیا، ڈک ورتھ قسطنطنیہ سے چند میل کے فاصلہ پر لنگر انداز ہوا اور مندرجہ ذیل شرائط صدر اعظم کی خدمت میں بھیجے:

۱- باب عالی روس اور انگلستان سے اتحاد کر لے۔

۲- عثمانی بیڑہ اور دردانیال کے قلعے انگلستان کے حوالے کر دیے جائیں۔

۳- روس کو مولدویا اور ولاچیا دے دیا جائے۔

۴- سبستیانی کو رخصت کر دیا جائے اور فرانس سے جنگ کا اعلان کر دیا جائے۔

باب عالی نے دس روز تک ارجھناٹ اور ڈک ورتھ کو صلح کی گفتگو میں مصروف رکھا، اس فرصت میں انتہائی جوش و سرگرمی کے ساتھ قسطنطنیہ کی قلعہ بندی کا کام ہوتا رہا، دارالسلطنت کی پوری مسلمان آبادی سلیم اور جنرل سبستیانی کے زیر ہدایت دن رات کام کرتی تھی اور اس نے اپنے حیرت انگیز عزم و جاں فشانی سے قسطنطنیہ کو اتنے مستحکم طریقہ پر قلعہ بند کر لیا کہ برطانوی امیر البحر کو بے نیل و مرام واپس ہونے کا فیصلہ کرنا پڑا، اسے خطرہ پیدا ہوا کہ مبادا وہ خود اپنے تمام جہازوں کے ساتھ گرفتار ہو جائے، چنانچہ کیم مارچ کو اس نے لنگر اٹھانے کا حکم دیا اور ۳ مارچ کو دردانیال سے ہو کر واپس ہوا لیکن اب کی بار اس کا بیڑا بے مشکل سلامت گزر سکا، قدیم ترکی توپوں نے بھی آٹھ سو پونڈ کے سنگی گولے انگریزی جہازوں پر برسائے شروع کیے، جن سے کئی جہاز زخمی ہوئے اور دو ڈوب گئے اور چھ سو آدمی ہلاک ہوئے۔

مصر کی ناکام مہم | اس ذلت کی تلافی کے لیے برطانیہ نے پانچ ہزار فوج مصر پر حملہ کرنے کے کی غرض سے سسلی سے روانہ کی، یہ فوج ۱۸ مارچ ۱۸۰۱ء کو اسکندریہ کے قریب اتری اور آگے بڑھ کر شہر پر حملہ آور ہوئی، اسکندریہ میں اس وقت ساڑھے چار سو ترکوں کا

ایک دستہ متعین تھا جو مقابلہ نہ کر سکا اور ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا لیکن انگریزی فوج کی یہی پہلی اور آخری کامیابی تھی، اس کے بعد جوڑائیاں ہوئیں، ان میں سے ہر ایک میں اسے شکست ہوئی اور سیکڑوں آدمی تلف ہو گئے، آخر کار یہ معلوم کر کے کہ ایک زبردست عثمانی فوج قاہرہ سے روانہ ہو کر مقابلہ کے لیے آرہی ہے، جنرل فریزر (Fraser) نے صلح کا علم بلند کیا اور مصر سے نکل جانے کی یہ شرط پیش کی کہ تمام انگریز قیدی واپس کر دیے جائیں، یہ شرط منظور کر لی گئی اور ۲۵ ستمبر کو انگریزی بیڑہ ناکام و نامراد اسکندریہ سے روانہ ہو گیا۔

قسطنطنیہ اور مصر کی ان ناکامیوں سے برطانیہ کے اقتدار کو شدید صدمہ پہنچا۔

روس سے جنگ کا سلسلہ | ۱۸۰۲ء میں فرانس سے صلح ہو جانے کے بعد سلیم نے اصلاحات کا کام پھر شروع کر دیا تھا، دو تین سال کے اندر فوجی اصلاحات میں بہت ترقی ہو گئی تھی، فرانسیسی افسروں کی تربیت میں تو بچپوں نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اب ان کی اہمیت نئی چری سے بھی زیادہ ہو گئی تھی، عکا کی مدافعت میں عمر آغا کی چھوٹی سی فوج نے ایسے جوہر دکھائے کہ ”نظام جدید“ کی برتری کا اعتراف دوست اور دشمن سب نے کیا، اسی فوج نے بلغاریا اور رومیلیا کے ڈاکوؤں کا بھی استیصال کر دیا جن کے زبردست جتھے ان صوبوں کے امن و امان کے لیے ایک مستقل خطرہ تھے، ان ڈاکوؤں کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ انہوں نے نئی چری کے دستوں کو بھی شکست دے کر بھگا دیا تھا، سلیم نے ”نظام جدید“ کے دو دستے اور قائم کر کے فرانسیسی افسروں کے زیر نگرانی انہیں یورپ کے بہترین فوجوں کے نمونہ پر تعلیم دلوائی، اس نے ان کی تنخواہ کے لیے ایک علاحدہ فنڈ بھی قائم کیا، بعض پاشاؤں خصوصاً عبدالرحمن پاشا والی کرمانیہ نے بھی ان فوجی اصلاحات میں سلیم کی پر جوش تائید کی اور اپنے صوبوں میں بھی یہ اصلاحات شروع کیں، سلیم کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ ۱۸۰۵ء میں اس نے ایک فرمان جاری کیا کہ آئندہ نئی چری اور سلطنت کی دوسری فوجوں میں سے بہترین نوجوان منتخب کر کے ”نظام جدید“ میں داخل کیے جائیں، اس فرمان کے جاری ہوتے ہی

یہی چری نے علانیہ بغاوت کردی، اس وقت ان کی قوت بلغراد میں نوٹ چکی تھی لیکن دوسرے صوبوں میں وہ اب بھی طاقت ور تھے، چنانچہ اور نہ میں دس ہزار بی چری نے جمع ہو کر علم بغاوت بلند کر دیا اور اگست ۱۸۰۶ء میں ”نظام جدید“ کے جو دستے انہیں قابو میں لانے کے لیے روانہ کیے گئے تھے، ان کو شکست دے دی، سلطنت کے اور حصوں میں بھی ان کی شورشیں اس قدر بڑھیں کہ سلیم کو نہ صرف یہ فرمان منسوخ کر دینا پڑا بلکہ دوسری فوجی اصلاحات بھی فی الحال روک دینی پڑیں، مفتی اعظم صالح زادہ اسعد آفندی کے اثر سے بغاوت کا فتنہ جلد فرو ہو گیا، البتہ نی چری کے مطالبہ پر صدر اعظم حافظ اسماعیل پاشا معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ نی چری کا آغا ابراہیم علمی پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، ”نظام جدید“ کے خلاف شورش اتنی زیادہ تھی کہ ۱۸۰۶ء میں جب روس نے مولڈیویا اور ولاچیا پر چڑھائی کی تو باب عالی کو روسیوں کے مقابلہ میں ایک نئی فوج بھیجنے کی جرات نہیں ہوئی۔

خلیف سازش | فوجی اصلاحات کے روک دینے سے نی چری کی بغاوت اس وقت فرو ہو گئی لیکن اصلاحات کے خلاف جذبات اسی طرح برا بیچتے تھے، ۱۸۰۷ء کے شروع میں شیخ الاسلام اسعد آفندی کا انتقال ہو گیا، وہ سلیم کا ایک مخلص دوست اور اس کی اصلاحات کا پر جوش حامی تھا، اس کی موت سلیم کے لیے نہ صرف ایک ذاتی سانحہ تھی بلکہ اس کی معزولی اور کل اصلاحات کی منسوخی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی، علماء کی جماعت بہ حیثیت مجموعی پہلے ہی سے اصلاحات کی مخالف تھی، نیا مفتی اعظم عطاء اللہ آفندی بھی تمام تر نی چری کے زیر اثر تھا لیکن سلیم کی معزولی میں جس شخص نے سب سے زیادہ حصہ لیا وہ قائم مقام موسیٰ پاشا تھا، اس وقت صدر اعظم فوج کے ساتھ محاذ جنگ پر تھا اور موسیٰ پاشا قائم مقام کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں اس کی جگہ کام کر رہا تھا، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے مفتی اعظم نی چری اور دار السلطنت کے بعض دوسرے فوجی دستوں کے ساتھ سلیم کے خلاف ایک گہری سازش کی، ”نظام جدید“ کا ایک حصہ اس وقت باسفورس کے قلعوں کی

حفاظت پر متعین تھا، بقیہ فوج ایشیا میں تھی، باسفورس کے دستہ حفاظت میں دو ہزار خام سپاہی بھی تھے، جو ”یمیقی“ کہلاتے تھے اور ”نظام جدید“ کے سپاہیوں کے ساتھ اس غرض سے رکھے گئے تھے کہ بدترج ان سے متاثر ہوتے رہیں لیکن موسیٰ پاشا نے ان میں یہ افواہ اڑا دی کہ سلطان انہیں بہ جبر نظامی دستوں کے ساتھ ملا دینا چاہتا ہے، اس خبر سے ان میں سخت برہمی پیدا ہوئی، دوسری طرف اس نے یہ کیا کہ سلیم کو جو اس کی سازش سے بالکل بے خبر تھا، ترغیب دے کر ”یمیقیوں“ کے نام ایک حکم جاری کرایا کہ وہ نظامیوں کا سالباس اختیار کر لیں، سلطان کا فرستادہ محمد آفندی جوں ہی یہ حکم لے کر پہنچا، بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے، محمد آفندی کو تو اسی وقت باغیوں نے قتل کر دیا، اس کے بعد وہ دارالسلطنت کے نئی چری دستوں کو ساتھ لے کر وہ آت میدان میں جمع ہوئے اور وہاں نئی چری نے اپنے شور بے کی دیکیں الٹ دیں، یہ بغاوت کا اعلان تھا اور اس سے مقصود یہ تھا کہ وہ سب سلطان کا دیا ہوا کھانا نہ کھائیں گے۔

سلیم کی معزولی | موسیٰ پاشا نے چون کہ سلیم کو بالکل دھوکے میں رکھا تھا، اس لیے وہ اس صورت حال کے لیے مطلق تیار نہ تھا، باغیوں کا سردار قباقچی اوغلو جب آت کے میدان میں آیا، اس وقت بھی موسیٰ پاشا نے سلیم کو فریب دینے کی کوشش کی اور اسے اطمینان دلایا کہ یہ شورش بہت جلد فرو ہو جائے گی، چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ نظامی دستوں کو باسفورس سے طلب کر لیتا اور ان کے آنے تک اپنے پاؤں کی گاڑوں کی مدد سے محل کی حفاظت کرتا، اس نے باغیوں کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں راضی ہونا تھا نہ ہوئے، قباقچی اوغلو کے ہاتھ میں اصلاحات کے خاص خاص طرف داروں کی ایک فہرست تھی، اس میں وزراء، اکابر و اعیان بھی شامل تھے، یہ سب کے سب گھسیٹ کر آت کے میدان میں لائے گئے اور نہایت بے دردی سے قتل کر دیے گئے، دو روز تک قتل کا سلسلہ جاری رہا، اصلاحات کے تمام طرف دار مارے گئے یا بھاگ گئے، آخر میں سلیم نے یہ دیکھ کر کہ اب خود اس کے تخت پر حملہ

ہوا چاہتا ہے، ایک فرمان کے ذریعہ تمام اصلاحات منسوخ کر دیں لیکن باغیوں نے اس کی معزولی کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا، مفتی اعظم نے جو اس سازش میں شروع سے شریک تھا، اپنے فتوے سے اس فیصلہ پر قانون کی مہر بھی ثبت کر دی، ۲۲ ربیع الاول ۱۲۲۲ھ مطابق ۲۹ مئی ۱۸۰۷ء کو نبی چری موسیٰ پاشا کی سرکردگی میں قصر سلطانی میں داخل ہوئے، سلیم نے کوئی مزاحمت نہ کی، وہ نہایت وقار کے ساتھ تخت سے اترے اور محل کے اس حصہ میں چلا گیا جہاں شہزادہ مصطفیٰ اب تک نظر بند تھا، باغیوں نے مصطفیٰ کو لا کر تخت پر بیٹھا دیا، سلیم نے اپنی بقیہ مدت عمر جو صرف ایک سال اور رہ گئی تھی، سلطنت عثمانیہ کے آئندہ وارث شہزادہ محمود کو تربیت دینے میں گزار دی۔

مصطفیٰ رابع

۱۲۲۲ھ تا ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۷ء تا ۱۸۰۸ء

مصطفیٰ رابع تیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، اس نے صرف تیرہ مہینے حکومت کی لیکن یہ حکومت محض نام کی تھی، اصلی اقتدار ان باغیوں کو حاصل تھا جنہوں نے سلیم کو معزول کر کے اسے تخت پر بیٹھایا تھا، قبائلی اور غلو، باسفورس کے قلعوں کا حاکم مقرر ہوا، سلیم کی تمام اصلاحات منسوخ کر دی گئیں۔

ان واقعات کی خبر سے عثمانی فوجیں جو دریائے ڈینوب کے ساحلی علاقوں میں روس سے جنگ کر رہی تھیں بہت مطمئن اور مسرور ہوئیں لیکن صدر اعظم ابراہیم علمی پاشا نے جو اس وقت سپہ سالار تھا، اس بغاوت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا، اس پر نی چری نے اسے قتل کر دیا اور اس کی جگہ چلبی مصطفیٰ پاشا کو سپہ سالار اور صدر اعظم مقرر کیا۔

ابراہیم پاشا کے قتل اور چلبی مصطفیٰ کے تقرر سے فوج میں کم زوری اور انتشار پیدا ہو گیا، اگر روسی فوجوں کا بڑا حصہ اس وقت پرشایں نیولین سے جنگ کرنے میں مصروف نہ ہوتا تو اس کم زوری سے دولت عثمانیہ کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا لیکن اس کی خوش قسمتی سے اسی درمیان میں (۱۴ جون ۱۸۰۷ء) نیولین نے روسیوں کو فریڈ لینڈ میں ایسی زبردست شکست دی کہ اس کے اثر سے ڈینوب کی روسی فوجیں بھی پسپا ہونے لگیں۔

نیپولین کی غداری | اس کے بعد زار الکزنڈر نے نیپولین سے صلح کی درخواست کی لیکن قبل اس کے کہ فریقین ٹلسیٹ کے مقام پر شرائط صلح طے کریں، پرشا کے وزیر اعظم ہارڈنبرگ (Hardenberg) نے دونوں کے سامنے ایک دل چسپ اسکیم پیش کی، جس سے مقصود یہ تھا کہ نیپولین کی توجہ پرشا پر قبضہ کرنے کے بجائے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی جانب مائل ہو جائے، اسکیم یہ تھی کہ ولاچیا، مولڈوویا، بلغاریا اور روسیلیا کے صوبے روس کو دے دیے جائیں، یونان اور جزائر آئیونین پر فرانس قبضہ کر لے، بوسنیا اور سرویا، آسٹریا کی سلطنت میں شامل کر دیے جائیں، پولینڈ کو ازسرنو مرتب کر کے شاہ سیکسنی (Saxony) کو اس کا فرماں روا مقرر کر دیا جائے اور سیکسنی پر پرشا کی حکومت قائم کر دی جائے لیکن نیپولین پرشا کو شکست دے کر پامال کر چکا تھا، وہ ایک حقیر دشمن کی پیش کردہ اسکیم پر غور کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔

تاہم سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ خود اس کی ذاتی اسکیم کے لیے اہمیت سے خالی نہ تھا، اس وقت اس کا سب سے بڑا مقصد سلطنت برطانیہ کو نیست و نابود کر دینا تھا لیکن اس کا حصول روس کو برطانیہ کے اتحاد سے علاحدہ کیے بغیر محال تھا، فریڈ لینڈ کی شکست نے روس کی قوت بہت کچھ توڑ دی تھی اور زار اب صلح کا خواہش مند بھی تھا لیکن نیپولین سے مل کر اپنے سابق حلیف برطانیہ سے جنگ کرنے کے لیے الکزنڈر خاطر خواہ معاوضہ کا امیدوار تھا، نیپولین نے اسے منظور کر لیا، چنانچہ معاہدہ ٹلسیٹ (۷ جولائی ۱۸۰۷ء) کے خفیہ دفعات میں یہ طے پایا کہ باب عالی نیپولین کے پیش کردہ شرائط پر روس سے صلح نہ کرے گا تو فرانس اور روس متحد ہو کر ترکوں کو قسطنطنیہ اور روسیلیا کے علاوہ باقی تمام یورپین ولایتوں سے نکال دیں گے اور ان ولایتوں کو باہم تقسیم کر لیں گے، تقسیم کی شکل یہ تھی کہ فرانس، بوسنیا، البانیا، یونان اور مقدونیا پر قبضہ کر لے گا اور مولڈوویا، ولاچیا، بلغاریا اور دریائے مارٹیرا تک کے تمام علاقے روس کو دے دیے جائیں گے، آسٹریا کو راضی کرنے کی غرض سے سرویا کا صوبہ اس کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا،

الکونڈر کو قسطنطنیہ حاصل کرنے پر بھی اصرار تھا مگر نپولین نے اس سے قطعی انکار کر دیا، اس خفیہ معاہدہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نپولین ذاتی اغراض کے لیے اپنے حلیف سلطنت عثمانیہ کو قربان کر دینے پر کہاں تک آمادہ تھا، حالاں کہ روس سے دولت علیہ کی موجودہ جنگ زیادہ تر اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھی، بہر حال اگست ۱۸۰۷ء میں اس کی وساطت سے فریقین میں عارضی طور پر صلح ہو گئی۔

حالات آستانہ | اس درمیان میں دارالسلطنت کی حالت روز بہ روز زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی، حکومت کے تمام اختیارات مفتی اعظم اور قائم مقام موسیٰ پاشا کے ہاتھ میں تھے اور یہی دونوں سلطان کے نام سے حکم رانی کر رہے تھے لیکن چند دنوں کے بعد خود ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور مفتی اعظم نے قبائلی اوغلو سے سازش کر کے موسیٰ پاشا کو نہ صرف معزول بلکہ جلاوطن بھی کر دیا، اس کے بعد طاہر پاشا قائم مقام مقرر ہوا، مگر چون کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے اختیارات استعمال کرنا چاہتا تھا، اس لیے مفتی اعظم نے اسے بھی برطرف کر دیا، طاہر پاشا نے مصطفیٰ پاشا بیرقدار کے پاس جا کر پناہ لی جو روسیخ کا والی اور سلطان سلیم کے وفادار نمک خواروں میں تھا۔

سلطان مصطفیٰ کی تخت نشینی کے بعد بھی سلیم کے حامیوں کی ایک جماعت اسے دوبارہ تخت پر لانا چاہتی تھی، بیرقدار اس جماعت کا سردار تھا، چنانچہ طاہر پاشا کے آنے کے بعد اس نے اپنا ایک معتمد صدر اعظم چلبی مصطفیٰ پاشا اور دوسرے وزراء کے پاس بھیجا اور انہیں یہ سمجھایا کہ مفتی اعظم قبائلی اوغلو نے صرف اپنی قوت اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے فوج میں شورش برپا کر رکھی ہے اور فوج کے بھروسہ پر حکومت کے تمام نظم و نسق کے مالک بنے ہوئے ہیں، بیرقدار نے ابھی اپنے اصلی مقصد یعنی سلیم کو دوبارہ تخت پر بیٹھانے کی تجویز کو بالکل مخفی رکھا اور صدر اعظم وغیرہ پر محض یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ صرف مفتی اعظم اور قبائلی اوغلو کو سزا دینا چاہتا ہے، چون کہ صدر اعظم کے اختیارات بھی ان دونوں کی وجہ سے پامال

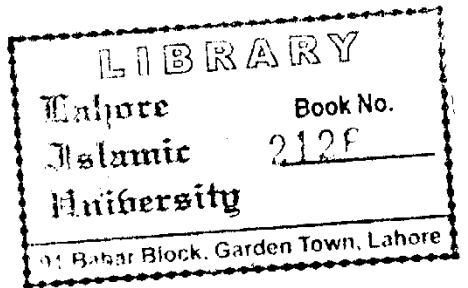
ہو رہے تھے، اس لیے وہ بیرقدار سے مل گیا اور قبائلی اوغلو کے قتل کے حکم دے دیا، چنانچہ وہ رات کے وقت اپنے محل میں قتل کر دیا گیا۔

سلیم کا قتل | اس اثنا میں بیرقدار ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ قسطنطنیہ کے قریب پہنچ چکا تھا، اس نے متعدد اعیان حکومت کو طلب کر کے باغی فوج کی بنیاد رکھی اور اس سلطنت میں امن وامان قائم کرنے کا حلف لیا، اس کے بعد وہ فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، سلطان مصطفیٰ نے یہ سمجھ کر کہ مظاہرہ مفتی اعظم اور یمتی فوج کے خلاف ہے، مفتی کو برطرف کر دیا اور اس فوج کو توڑ دینے کا حکم دیا، مگر بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ بیرقدار کا اصلی مقصد کیا ہے، چنانچہ محل کا پھانک بند کر لیا گیا اور شاہی دستہ مدافعت کے لیے تیار ہو گیا، بیرقدار نے حملہ کا حکم دیا اور تھوڑی دیر میں محل کے اندر داخل ہو گیا لیکن اسی درمیان میں مصطفیٰ نے سلیم اور اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ محمود دونوں کے قتل کا حکم دے دیا تھا، وہ جانتا تھا کہ ان کے بعد تنہا وہی سلطنت کا وارث باقی رہ جائے گا اور پھر کسی عثمانی کو اسے قتل یا معزول کرنے کی جرأت نہ ہوگی، چنانچہ قبل اس کے کہ بیرقدار محل کے اس حصہ میں پہنچ سکے جہاں سلیم نظر بند تھا، مصطفیٰ کے جلا دوں نے سلیم کا کام تمام کر دیا، سلیم اتنا طاقت ور تھا کہ وہ بغیر کسی ہتھیار کے ان جلا دوں کا مقابلہ کرتا رہا اور ان میں سے کئی ایک کو مار کر گرا دیا لیکن آخر میں قلب پر ایک کاری ضرب لگنے کی وجہ سے وہ سنبھل نہ سکا اور جلا دوں نے اس کے گلے میں پھندا ڈال کر اسے ختم کر دیا، اگر یہ مقابلہ چند منٹ اور جاری رہتا تو بیرقدار وہاں پہنچ گیا ہوتا اور سلیم کی جان بچ جاتی، جب بیرقدار نے محل میں داخل ہو کر سلیم کو ہر طرف تلاش کرنا شروع کیا تو جلا دوں نے اس کی لاش اس کے سامنے پھینک دی اور پکار کر کہا لو جسے تم تلاش کر رہے ہو وہ یہ ہے، بیرقدار اپنے بادشاہ کی لاش پر گر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، قبودان پاشا سعید علی قریب ہی کھڑا ہوا تھا، اس نے بیرقدار کا شانہ ہلا کر کہا کہ یہ وقت انتقام کا ہے رونے کا نہیں ہے، یہ سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس ایوان میں آیا، جہاں سلطان

مصطفیٰ اپنے عہد حکومت کے آخری لمحات نہایت سراپہ جنگی کی حالت میں گزار رہا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ تو یہاں کیا کرتا ہے، یہ جگہ اس شخص کے لیے خالی کر جو تجھ سے زیادہ اس کا مستحق ہے، بیرقدار نے اسے کھینچ کر تخت سے اتار دیا۔

مصطفیٰ نے سلیم اور محمود دونوں کے مار ڈالنے کا حکم دیا تھا، چنانچہ سلیم تو ختم کر دیا گیا لیکن محمود کی جان بچ گئی، اس کے ایک وفادار غلام نے اسے حمام کے آتش دان میں ایسی ہوشیاری سے چھپا دیا تھا کہ جلا داس کی تلاش میں آخر وقت تک ناکام رہے، یہاں تک کہ بیرقدار کے سپاہیوں کے محل میں داخل ہونے کے بعد جلا دوں کو خود اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور محمود کی تلاش سے مایوس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

مصطفیٰ کی معزولی | اسی روز ۳ جمادی الاول ۱۲۲۳ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۰۸ء میں سلطان مصطفیٰ کی معزولی اور شہزادہ محمود کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا، چند دنوں کے بعد مصطفیٰ قتل کر دیا گیا تاکہ پھر کوئی فتنہ برپا نہ ہو۔



Daulat-E-Usmania

Vol-1

Dr. Mohammad Uzair

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No. 19

Shibli Road, Azamgarh- 276 001 (U.P)

E-mail : shibli_academy@rediffmail.com

Website : www.shibliacademy.org



Rs. 200/-